تعارف

شام ہونے کو ہے اور ریت سمندر میں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے چمکتے ذرات سے بننے والی لہریں اب سراب کی صورت میں پیاسے مسافر کو حیران و سرگرداں کرنے کے قابل نہیں رہیں۔ شب کا دست سیاہ، ریگستان کو اندھیرے کی پرچھائیں میں تبدیل کر چکا ہے۔ دن بھر کی مسافت نے جس مسافر کو تھکن سے چور چور کر رکھا تھا، اچانک دور لاؤ کا شعلہ نظر آتا ہے، تھکے قدموں میں حرکت بیدار ہو جاتی ہے، تیز گامی آسان ہو جاتی ہے۔

نخلستان میں روشن الاؤ کے گرد، سامعین کے حلقہ میں، داستان گو ماضی کو زندہ رہا کر رہا ہے۔ وہ ماضی جس میں بادشاہ اور وزیر، شہزادے اور شہزادیاں، جن بھوت، چڑیلیں، پچھل پائیاں، جادوگر ــــــ طلسم، منتر اور اسم اعظم سے تحیر کی فضا کی تشکیل کی جاتی ہے۔

داستان کا الاؤ سرد ہو گیا مگر اس کی چنگاریوں نے ناول اور افسانہ کی صورت میں نیا روپ حاصل کیا تو اس کے بعض کردار و واقعات نے تلمیحات و علامات کی صورت میں حیات نو پائی۔

اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب ''مرأۃ العروس'' (1869) اور پریم چند کے درمیان عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول اور رتن ناتھ سرشار کا ''فسانہ آزاد'' آتا ہے جبکہ بیسویں صدی کا آغاز مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول ''مرا ؤ جان ادا'' (1901) سے ہوتا ہے اردو ناول میں حقیقت نگاری کی

کامیاب مثال قرار پاتا ہے۔ پریم کے تخلیقی شعور کی پختگی سے پہلے اردو ناول نصف صدی کا سفر طے کر چکا تھا۔

1880ء میں سرشار کے ''فسانہ آزاد'' کی جلد اول طبع ہمتی ہے اور اسی برس 31 جولائی کو ضلع بنارس کے ایک گاؤں مڈھوا ملہی میں منشی عجائب لال کائستھ کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے جسے دھنپت رائے کا نام دیا جاتا ہے مگر جو پریم چند کے اختیار کردہ نام سے دنیائے ادب میں شہرت حاصل کرتا ہے۔ ڈاکخانہ کے معمولی ملازم منشی عجائب لال کے گھر ہن نہ برستا تھا۔ بس لشٹم پشٹم گزر بسر ہو رہی تھی لیکن تنگ دستی کی تنگی کے باوجود بھی باپ نے بیٹے کو تعلیم دلوانے میں بخل سے کام نہ لیا۔ میٹرک (1899ء) کے بعد جونیئر ورنیکولر (1914ء) کا امتحان پاس کیا اور الہ آباد یونیورسٹی سے 1919ء میں گریجویشن کی۔ صدی کے آغاز (1900ء) سے گورنمنٹ ڈسٹرک مڈل سکول (بہرائچ) سے سرکاری ملازمت کا آغاز ہوا جو اکیس برس بعد استعفیٰ کی صورت میں ختم ہوئی۔

دھنپت رائے نے سرکاری ملازمت کی بنا پر نواب رائے / نواب رائے بنارسی / نواب رائے الہ آبادی کے قلمی نام اختیار کیے مگر 1910ء میں پریم چند کا نام اختیار کیا اور اسی سے معروف ہوئے۔ سرکاری ملازم سے مستعفی ہونے کے بعد قلم کو ذریعہ روزگار بنائے رکھا' اسی لیے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھا۔ اپنا ہندی پرچہ ''ہنس'' جاری کیا۔ کچھ کام فلموں کے لیے بھی۔ کیا طبع زاد اور ترجمہ شدہ افسانوی مجموعوں کی تعداد 26 جبکہ اردو ہندی ناولوں ں کی تعداد 29 ہے۔ ڈراموں کے متعدد مجموعے' علمی ادبی موضوعات پر کتب و مقالات' سوانح عمریاں

ان پر مستزاد۔ الغرض منشی پریم چند نے قلم نوازی کا حق ادا کر دیا۔

جہاں تک پریم چند کی ناول نگاری کا تعلق ہے تو محققین کے بموجب 1901ء میں ''ایک ماموں کا رومان'' کے نام سے ناول لکھنا شروع کیا مگر اس کے بارے میں مزید کوائف دستیاب نہیں۔ ''اسرار معبد'' نواب رائے الہ آبادی کے نام سے لکھا۔ اسے پریم چند کا پہلا ناول تسلیم کیا جاتا لیکن اولیت کے ضمن میں ''کشنا''، ''ہم خرما و ہم ثواب'' اور ''اسرار محبت'' کے نام بھی لیے جاتے ہیں۔

پریم چند کے ناولوں میں ''بازار حسن'' (1918)''، ''چوگان ہستی'' (1927)، ''گوشہ عافیت'' (1928ء) ''نرملا'' (1929)، ''میدان عمل'' (1932ء) ''گئو دان'' (1936ء) اور ''غبن'' نسبتاً زیادہ معروف و مقبول ہیں۔

پریم چند کی جس خصوصیت نے اردو ادب میں انہیں ممتاز مقام دلایا' وہ زود نویسی نہیں بلکہ وہ تصور حیات ہے جس نے اس تصور ادب کی تشکیل کی جو ترقی پسند ادب کی تحریک کے باقاعدہ آغاز سے تین دہائیاں قبل ان کی فکشن کی اساس استوار کر رہا تھا۔ آج پریم چند کی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اس وقت حقیقت نگاری پر مبنی سماجی اصلاحی کی بات کی جب ایسی سوچ محال تھی۔، انہوں نے عہد غلامی آزاد وطن کا خواب دیکھا۔ افسانوں کے پہلے مجموعہ ''سوز وطن'' (1909ء) کا نذر آتش کیا جانا اور قلمی نام اختیار کر کے سیاسی' سماجی موضوعات پر قلم اٹھانا بھی ان کی تخلیقی شخصیت کے باغیانہ رجحانات کا مظہر ہے.....انسان دوستی' سیاسی آزادی' سماجی اصطلاح' حقیقت نگاری پر مبنی اسلوب

اور کردار کی سیاسی و سفیدی مبنی انسانی نفسیات کا مطالعہ..... یہ ہیں وہ آدرش جو پریم چند کو مرغوب تھے اسی لیے جب 15 اپریل 1936ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں ان خیالات کا اظہار کیا تو یہ ان کی ذاتی سوچ اور تخلیقی نقطۂ نظر کے ترجمان تھے، پارٹی منشور کے نہیں:

''اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پرستی جس کی موت یقینی اور لازمی ہے، اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ ادب، جدید قسم کی ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پسند طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا مؤثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔''

پریم چند نے ادب میں جس مقصد پسندی کا پرچار کیا، انہوں نے اپنی فکشن کو اس کا ترجمان بنا دیا۔ ناول ہوں یا افسانے..... انہوں نے ہر دو اصناف میں

انسان دوستی پر مبنی سماجی حقیقت نگاری کا رویہ اپنایا۔اس ضمن میں محمد احسن فاروقی کی رائے قابل توجہ ہے جو''اردو ناول کی تنقیدی تاریخ''میں پریم چند کی ناول نگاری کے دو ادوار قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''ان کی تمام ناول نگاری دو صاف صاف دوروں میں تقسیم ہو جاتی ہ' پہلے دور کی ناولوں میں تین خاص ہیں۔ایک ''بیوہ''دوسری''بازار حسن''اور تیسری''نرملا۔''یہ تینوں ناولیں 1921ء سے پہلے لکھی گئیں اور ویلز (Wells) کی ناولوں یا شاؤ (Shaw) کے ڈراموں کی طرح ان کا مقصد سوشل ہے یعنی ہندو عورتوں کی حالت پر ہے اور ان کی پریشانیوں سے جذباتی ہمدردی دکھائی گئی ہے۔''(ص:261)محمد احسن فاروقی نے دوسرے دور کے ناولوں میں''گوشۂ عافیت''،''چوگان ہستی''،''میدان عمل''اور''گئودان''کو شامل کیا ہے۔

میں ذاتی طور پر تخلیقات کی زمانی درجہ بندی کے مقابلہ میں مقصد اور فن کے تحت معیار میں تبدیلی کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں کہ یوں کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقی زندگی کے مدوجزر کا مطالعہ زیدہ سودمند ثابت ہوتا ہے۔

پریم چند چند نے اگر سینکڑوں افسانے نہ لکھے ہوتے تو بھی وہ صرف''کفن''پر زندہ رہ سکتے تھے۔اسی طرح''گئودان''،''چوگان ہستی''اور''میدان عمل''کی بدولت بھی وہ زندہ ناول نگاروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔علی عباس حسینی کو''میدان عمل''میں گورکی اور ٹالسٹائی کے اثرات نظر آتے ہیں۔وہ''ناول کی تاریخ اور تنقید''میں لکھتے ہیں:''جن لوگوں نے ٹالسٹائی کی مشہور تصنیف''ریسرکشن''پڑھی ہے یا گورکی کی''مدر''دیکھی ہے'وہ بہت ہی آسانی سے پریم

چند کے اس ناول کے نقوش اول تلاش کر لیں گے، فرق صرف اتنا ہے کہ پریم چند میں گورکی کی حقیقت نگاری کم ہے اور ٹالسٹائی کی مثالیت و تصوریت (idealism) زیادہ۔'' (ص:296)

علی عباس حسینی صاحب کے خیال میں ''پریم چند کا یہ ناول اردو ادب میں ایک گوہر بے بہا کی آب و تاب رکھتا ہے۔ مصنف کے موقلم نے بعض بعض جگہ تو ایسی باریکیاں دکھائی ہیں کہ ان کے مثالیں مغربی شاہ کاروں میں بھی بمشکل دستیاب ہو سکیں گی۔'' (ص:297)

''گئودان'' کا سال اشاعت ہی پریم چند کا سال وفات بھی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند عمر بھر اس ناول کی تحریر کے لیے ہوم ورک کر رہے تھے۔ ان کا فنی نصب العین یعنی مقصدیت، کرداروں کی نفسیاتی چھان پھٹک، تجزیاتی نگاہ پر مبنی ماحول کی تصویر کشی، عہد غلامی کے ہندوستان کے پسماندہ سماج میں تضادات کو جنم دینے والے تضادات۔ الغرض ''گئودان'' ہندوستان کے ''موزیک'' کا دلکش منیچر ہے۔ ایک طرف زمیندار رائے صاحب اور ان کے پڑھے لکھے احباب ہیں تو دوسری جانب ان پڑھ کسان ہوری اور اس کی بیوی دھنیا اور ان کے بچے ہیں، پھر ہوری کا حاسد بھائی ہیرا ہے، سوبھے رام ہے۔ پھر چھنیا ہے گوبر ہے.....اگر چہ یہاں کرداروں کا اژدہام نہیں مگر پریم چند نے گنتی کے چند کرداروں کی شخصیت کے نقوش ابھارنے اور سنوارنے میں خصوصی کاوش سے کام لیکر ہر کردار کی اس کے مخصوص ماحول میں سیرت اجاگر کی ہے.....تاہم ہوری اور دھنیا دو ایسے کردار ہیں جنہوں نے ناول کے سخت سے سخت نقاد سے بھی کلمات تحسین حاصل کیے ہیں۔

ہوری بھولا سے ایک بے حد خوبصورت گائے خریدتا ہے جسے اس کا حاسد بھائی زہر دے کر مار دیتا ہے۔ یوں مقروض ہوری بالکل ہی برباد ہو جاتا ہے کہ یہ گائے بھی قرض لے کر خریدی گئی تھی۔ ادھر اس کا بیٹا چھنیا کو حاملہ کر کے شہر بھاگ جاتا ہے۔ اگرچہ ہوری اور دھنیا، چھنیا کو گھر لے آتے ہیں مگر اس کی سزا میں گاؤں والے اجتماعی جرمانہ عائد کر دیتے ہیں۔ اسی چکر میں دونوں بیل بھی جاتے ہیں۔ یوں ہوری مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اسی مزدوری کے دوران میں لو لگنے سے مر جاتا ہے۔

پریم چند نے بڑی بہارت سے ناول کا آخری اور ہوری کی موت کا منظر رقم کیا ہے:

''ہوری کو کچھ ہوش ہوا۔ موت قریب آ گئی تھی، آگ جل اٹھنے والی تھی، دھواں دور سا ہو گیا۔ دھنیا کو بیکسانہ انداز سے دیکھا، دونوں آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکل پڑے۔ کمزور آواز میں بولا:

''میرا کہا سنا ماپھ (معاف) کرنا دھنیا! اب جاتا ہوں، گائے کا ارمان من ہی من میں رہ گیا۔ اب تو یہاں کے روپے کریا کرم میں لگ جائیں گے، رومت دھنیا! اب کب تک جلائے گی؟ سب طرح کی درگت تو ہو گئی۔ اب مرنے دے۔''

اور اس کی آنکھیں پر بند ہو گئیں، اسی وقت ہیرا اور سوبھا ڈولی لے کر پہنچ گئے، ہوری کو اٹھا کر ڈولی پر لٹایا اور گاؤں کی طرف چلے۔

گاؤں میں خبر ہوا کی طرح پھیل گئی، سارا گاؤں جمع ہو گیا، ہوری چارپائی پر پڑا شاید سب کچھ دیکھتا تھا، سب کچھ سمجھتا تھا مگر زبان بند ہو گئی تھی۔ البتہ اس کی

آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو بتلا رہے تھے کہ موہ (رغبت) کا بندھن توڑنا کتنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو کچھ اپنے سے نہیں بن پڑا اسی کے دکھ کا نام تو موہ ہے۔ ادا کیے ہوئے فرائض اور پورے کیے ہوئے کاموں کا کیا؟ موہ تو ان بیکسوں کے چھوڑ جانے میں ہے جن کے ساتھ ہم اپنا فرض نہ نبھا سکے۔ ان ادھورے منصوبوں میں ہے جنہیں ہم پورا نہ کر سکے۔ مگر سب کچھ سمجھ کر بھی دھنیا امید کے مٹتے ہوئے عکس کو پکڑے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے مگر مشین کی طرح دوڑ دوڑ کر کبھی آم بھون کر پنا (جوشاندہ) بناتی اور کبھی ہری کے بدن پر گیہوں کے چوکر کی مالش کرتی۔ کیا کرے، پیسے نہیں ہیں ورنہ کسی کو بھیج کر ڈاکٹر بلاتی۔

ہیرا نے روتے ہوئے کہا ''بھابھی، دل کڑا کرو، گئو دان کرا دو، دادا چلے۔''

دھنیا نے اس کی طرف حقارت سے دیکھا، اب وہ دل کو اور کڑا کتنا کرے؟ اپنے شوہر کے ساتھ اس کا جو دھرم ہے کیا یہ اس کو بتانا پڑے گا جو زندگی کا ساتھی تھا، اس کے نام کو رونا ہی کیا اس کا دھرم ہے؟

اور کئی آوازیں آئیں ''ہاں! گئو دان کرا دو، اب یہی سمے ہے۔''

دھنیا مشین کی طرح اٹھی، آج جو تلی بیچ کر اس کے بیس آنے پیسے لائی تھی وہ ہوری کے ٹھنڈے ہاتھ پر رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے ہیرا سے بولی:

''مہراج! گھر میں نہ گائے ہے نہ بچھیا نہ پیسہ، یہی پیسے ہیں۔ آج ان کا گئو دان ہے۔

اور غش کھا کر گر پڑی!''

پریم چند ہوری کے گرد مصائب کا جو تانا بانا بن رہے تھے، وہ جان لیوا پھندا بن

جاتا ہے۔ یہ ہوری کی زندگی کا اختتام بھی ہے اور ناول کا بھی۔ آخری منظر ناول کا کلائمکس ہے مگر اس لحاظ سے بے حد اہم کے قاری پر ہوری کی محدود زندگی کی بے معنویت پوری طرح سے اجاگر ہو جاتی ہے۔ وہ بڑے شوق سے خوبصورت گائے قرض لے کر خریدتا ہے، حاسد بھائی جسے زہر دے کر مار دیتا ہے اور پھر آخری پونجی چند پیسے کریا کرم کے وقت گئودان کے کام آتے ہیں۔ اس انجام سے ذہن غلام عباس کے ''کتبہ'' کی طرف جاتا ہے۔ ذاتی مکان کی تعمیر کے بعد نیم پلیٹ کے طور پر نصب کرنے کے لیے سنگ مرمر کا جو پتھر خریدا جاتا ہے۔ وہ تمام عمر الماری میں بند رہتا ہے اور پھر بالآخر حسرت تعمیر لیے مر جانے والے کی قبر کا کتبہ بنتا ہے۔

پریم چند کے ناولوں کا مطالعہ ہمیں کسی نئی، پراسرار اور طلسمی دنیا میں نہیں لے جاتا، جہاں کا ہر منظر طلسم ہوشربا ہی ثابت ہوا اور جہاں کے مرد و زن شہزادوں شہزادیوں جیسی آب و تاب رکھتے ہوں۔ یہ میری آپ کی دیکھی بھالی دنیا ہے، یہ مرد و زن جانے پہچانے سے لگتے ہیں کہ یہ زندگی کے اس میلے کا حصہ ہیں جس میں، میں آپ بھی شامل ہیں لیکن پریم چند محدب شیشہ میں رکھ کر ان کا تجزیہ و تحسین کرتے ہیں ان کا زیرک مشاہدہ افراد کے کردار و عمل میں سیاہی اور سفیدی نمایاں ہی نہیں کرتا۔ بلکہ پس پردہ سماجی محرکات، اقتصادی عوامل اور اخلاقی اقدار پر روشنی بھی ڈالتا ہے۔ یوں پریم چند محض سماجی حقیقت نگار کی سطح سے بلند ہو کر سماجی فکر کی بلند سطح کو چھو لیتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر

گئودان

(1)

ہوری رام نے دونوں بیلوں کو سانی پانی دے کر اپنی بیوی دھنیا سے کہا ''گوبر کوا کھود نے بھیج دینا۔ میں نہ جانے کب لوٹوں۔ ذرا میری لاٹھی دے دے۔''

دھنیا کے دونوں ہاتھ گوبر سے بھرے تھے۔ اپلے تھاپ کر آئی تھی۔ بولی ''ارے، کچھ کھا پی لو تو۔ ایسی جلدی کیا ہے؟''

ہوری نے اپنے جھریوں سے بھرے ہوئے ماتھے کو سکوڑ کر کہا ''تجھے کھانے کی پڑی ہے۔ مجھے یہ فکر ہے کہ دیر ہوگئی تو مالک سے ملاقات نہ ہوگی۔ اسنان، پوجا کرنے لگیں گے تو گھنٹوں بیٹھے گزر جائیں گے۔''

''اس لیے تو کہتی ہوں، کچھ کھا پی لو اور آج نہ جاؤ گے تو کیا ہرج ہوگا۔ ابھی پرسوں تو گئے تھے۔''

''تو جو بات نہیں سمجھتی، اس میں ٹانگ کیوں اڑاتی ہے بھائی! میری لاٹھی دے دے اور اپنا کام دیکھ۔ یہ اسی ملتے جلتے رہنے کا پرساد ہے کہ اب تک جان بچی ہوئی ہے، نہیں تو کہیں پتہ نہ لگتا کہ کدھر گئے۔ گاؤں میں اتنے آدمی تو ہیں، کس پر بے دخلی نہیں آئی۔ کس پر قرقی نہیں آئی۔ جب دوسرے کے پاؤں تلے اپنی گردن دبی ہوئی ہو تو ان پاؤں کو سہلانے میں ہی خیریت ہے۔''

دھنیا اتنی سمجھدار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم نے زمیندار کے کھیت جوتے ہیں تو وہ اپنا لگان ہی تو لے گا۔ اس کی خوشامد کیوں کریں۔ اس کے تلوے کیوں سہلائیں۔ پھر بھی اپنے شادی شدہ زندگی کے ان بیس برسوں میں اسے اچھی طرح تجربہ ہو گیا تھا کہ چاہے کتنی ہی بچت کرو، کتنا ہی پیٹ، تن کاٹو، چاہے ایک کوڑی کو دانت سے پکڑو، مگر لگان بیباق ہونا مشکل ہے۔ پھر بھی وہ ہار ماننے والی نہیں تھی اور اس سلسلہ میں دونوں میاں بیوی میں جھگڑا چھڑا رہتا تھا۔ اس کی چھ اولادوں میں اب صرف تین زندہ ہیں۔ ایک لڑکا گوبر کوئی سولہ سال کا تھا اور دو لڑکیاں سونا اور روپا بارہ اور آٹھ سال کی تین۔ لڑکے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ اس کا دل آج بھی کہتا تھا کہ اگر ان کی دوادارو ہوتی تو وہ بچ جاتے، پر وہ ایک دھیلے کی دوا بھی نہ منگوا سکی تھی۔ اس کی عمر ہی بھی کیا تھی چھتیسواں ہی سال تو تھا۔ پر سارے بال پک گئے تھے۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ تمام جسم ڈھل گیا تھا۔ وہ خوبصورت گیہواں رنگ، سنولا گیا تھا اور آنکھوں سے بھی کم سوجھنے لگا تھا۔ پیٹ کی فکر کی وجہ سے کبھی بھی زندگی کو چین نہ ملا۔ اس غربت و پریشانی نے اس کی خود اعتمادی کو مایوسی میں بدل دیا تھا۔ جس گرہستی میں پیٹ کی روٹیاں بھی نہ ملیں اس کے لیے اتنی خوشامد کیوں؟ ان حالات سے اس کا دل برابر بغاوت کیا کرتا تھا اور دو چار گھرکیاں کھا لینے پر ہی اسے بے مقصد کا علم ہوتا تھا۔

ہار کر اس نے ہوری کی لاٹھی، مرزئی، جوتے، پگڑی اور تمباکو کا بٹوا لا کر سامنے پٹک دیا۔

ہوری نے اس کی طرف آنکھیں نکال کر کہا۔ ''کیا سسرال جانا ہے جو پانچوں

پوساک لائی ہے؟ سسرال میں بھی کوئی جوان سالی، سلج نہیں بیٹھی ہے جسے جا کر دکھاؤں۔''

ہوری کے گہرے سانولے، پچکے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سی جھلک پڑی۔ دھنیا نے شرماتے ہوئے کہا ''ایسے ہی تو بڑے سجیلے جوان ہو کہ سالی سلجھیں تمہیں دیکھ کر رجھ جائیں گی۔''

''جا کر سیسے میں منہ دیکھو۔ تم جیسے مرد ساٹھے پر پاٹھے نہیں ہوتے۔ دودھ گھی انجن لگانے تک کو تو ملتا نہیں، پاٹھے ہوں گے! تمہاری حالت دیکھ کر میں اور بھی سوکھی جاتی ہوں کہ بھگوان یہ بڑھاپا کیسے کٹے گا؟ کس کے دروازے پر بھیک مانگیں گے؟''

ہوری کی وہ لمحہ بھر کی مسکراہٹ اس طنز کی آنچ میں جھلس گئی۔ لکڑی سنبھالتا ہوا بولا۔ ''ساٹھ تک پہنچنے کی نوبت نہ آنے پائے گی دھنیا۔ اس سے پہلے ہی چل دیں گے۔''

دھنیا نے طنزیہ کہا۔ ''اچھا، رہنے دو، مت اسبھ منہ سے نکالو۔ تم سے کوئی اچھی بات بھی کہے تو لگتے ہو کوسنے۔''

ہوری کندھے پر لاٹھی رکھ کر گھر سے نکلے تو دھنیا دروازے پر کھڑی اسے دیر تک دیکھتی رہی۔ اس کے ان مایوسی بھرے الفاظ نے دھنیا کے چوٹ کھائے ہوئے دل میں خوف سے لرزہ طاری کر دیا تھا۔ وہ جیسے اپنے نسوانی وجود سے اپنے شوہر کو زندگی خیرات میں دے رہی تھی۔ اس کے دل کی گہرائی سے دعاؤں کا سمندر امنڈ کر ہوری کو اپنے اندر سمیٹے لے رہا تھا۔ مایوسی کے اس اتھاہ ساگر میں

سہا گ ہی وہ سہارا تھا جسے پکڑے ہوئے سا گر کو پار کر رہی تھی۔ ان بے مقصد الفاظ نے مقصد کے قریب ہونے پر بھی جیسے جھٹکا دے کر اس کے ہاتھ سے وہ تنکے کا سہارا چھین لینا چاہا بلکہ مقصد کے قریب ہونے کی وجہ سے ہی ان میں اتنی تکالیف کو برداشت کرنے کی طاقت آ گئی تھی۔ کانا کہنے سے کانے کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ کیا دو آنکھوں والے کو ہو سکتی ہے؟

ہوری قدم بڑھائے چلا جاتا تھا۔ پگڈنڈی کے دونوں اطراف اکھ کے پودوں کی لہراتی ہوئی ہریالی دیکھ کر اس نے دل میں کہا' بھگوان کہیں گو سے برکھا کر دیں اور ہانڈی بھی بھری رہے تو ایک گائے ضرور لوں گا۔ دیسی گائیں تو نہ دودھ دیں نہ ان کے بچھڑے ہی کسی کام کے ہوں۔ بہت ہوا تو تیلی کے کولہو میں چلیں۔ نہیں، وہ پچھائی گائے لے گا۔ اس کی خوب خدمت کرے گا۔ کچھ نہیں چار پانچ سیر دودھ ہو گا۔ گوبر دودھ کے لیے ترس ترس کر رہ جاتا ہے۔ اس عمر میں نہ کھایا پیا تو پھر کب کھائے گا؟ سال بھر بھی دودھ پی لے تو دیکھنے کے لائق ہو جائے۔ بچھڑے بھی اچھے بیل نکلیں گے۔ دو سو سے کم کی گائے نہ ہو گی۔ پھر گائے سے ہی تو دروازے کی رونق ہے۔ سویرے سویرے گائے کے درشن ہو جائیں تو کیا کہنا! نہ جانے کب وہ مبارک دن آئے گا!

ہر ایک بال بچوں دار آدمی کی طرح ہوری کے دل میں بھی گائے کی خواہش ایک مدت سے چلی آ رہی تھی۔ یہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب، سب سے بڑی آرزو تھی۔ بینک سود سے چین کرنے یا زمین خریدنے یا محل بنوانے کی بڑی خواہشات اس کے ننھے سے دل میں کیسے سما تیں!

جیٹھ کا سورج آموں کے جھرمٹ سے نکل کر آسمان پر چھائی ہوئی لالی کو اپنے گرم زور سے اور تیز کرتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا اور ہوا میں گرمی آنے لگی تھی۔ دونوں طرف کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اسے دیکھ کر رام رام کرتے اور عزت سے چلم پینے کو کہتے تھے' پر ہوری کو اتنا موقع کہاں تھا؟ اس کے اندر بیٹھی ہوئی عزت واحترام کی خواہش ایسی عزت پا کر اس کے سوکھے چہرے پر غرور کی جھلک پیدا کر رہی تھی۔ مالکوں سے ملت جلتے رہنے ہی کا تو یہ پرساد ہے کہ سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ نہیں اسے کون پوچھتا؟ پانچ بیگھے کے کسان کی بساط ہی کیا؟ یہ کم عزت نہیں کہ تین تین چار چار ہل والے مہتو بھی اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔

اب وہ کھیتوں کے بیچ کی پگڈنڈی چھوڑ کر ایک کھلیٹی میں آ گیا تھا جہاں برسات میں پانی بھر جانے کی وجہ سے تری رہتی تھی اور جیٹھ میں کچھ ہریالی نظر آتی تھی۔ آس پاس کے گاؤں کی گائیں یہاں چرنے آیا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی یہاں کی ہوا میں کچھ تازگی اور ٹھنڈ تھی۔ ہوری نے دو تین سانسیں زور سے لیں۔ اس کے دل میں آیا، کچھ دیر یہاں بیٹھ جائے۔ دن بھر تو لو لپٹ میں مرنا ہے ہی۔ کئی کسان اس گڈھے کا پٹہ لکھوانے کو تیار تھے۔ اچھی رقم دیتے تھے۔ پر خدا بھلا کرے رائے صاحب کا کہ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ زمین جانوروں کی چرائی کے لیے چھوڑ دی گئی ہے اور کسی دام پر بھی نہ اٹھائی جائے گی۔ کوئی مطلبی زمیندار ہوتا تو کہتا گائیں جائیں بھاڑ میں، ہمیں روپے ملتے ہیں، کیوں چھوڑیں؟ رائے صاحب ابھی تک پرانی روایات پر قائم تھے۔ جو مالک عوام کو نہ پالے' وہ بھی کوئی

آدمی ہے؟

اچانک اس نے دیکھا بھولا اپنی گائیں لیے اسی طرف چلا آ رہا ہے۔ بھولا اسی گاؤں سے ملے ہوئے پروے کا چرواہا تھا اور دودھ مکھن کا کاروبار کرتا تھا۔ اچھی رقم مل جانے پر کبھی کبھی کسانوں کے ہاتھ گائیں بیچ بھی دیتا تھا۔ ہوری کا دل ان گایوں کو دیکھ کر للچا گیا۔ اگر بھولا وہ آگے والی گائے اسے دے دے تو کیا کہنا! روپے آگے پیچھے دیتا رہے گا۔ وہ جانتا تھا گھر میں روپے نہیں ہیں۔ ابھی تک لگان نہیں چکایا جا سکا، بنسیر ساہ کا دینا بھی باقی ہے جس پر آنے روپے کا سود چڑھ رہا ہے لیکن غریبی میں جو ایک طرح غیر یقینی ہوتی ہے وہ بے شرمی جو تقاضے، گالی اور مار سے بھی خوفزدہ نہیں ہوتی' اس نے اسے بڑھاوا دیا۔ برسوں سے جو خواہش دل کو اکسا رہی تھی، اس نے اسے بے چین کر دیا۔ بھولا کے پاس جا کر بولا۔ ''رام رام بھولا بھائی، کہو کیا رنگ ڈھنگ ہیں؟ سنا ہے اب کے میلے سے نئی گائیں لائے ہو؟''

بھولا نے روکھائی سے جواب دیا۔ ہوری کے دل کی بات اس نے تاڑ لی تھی۔ ''ہاں دو بچھیاں اور دو گائیں لایا۔ پہلے والی گائیں سب سوکھ گئی تھیں۔ منڈی پر دودھ نہ پہنچے تو گجر (گزر) کیسے ہو؟''

ہوری نے آگے والی گائے کے پٹھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''دودھارتو معلوم ہوتی ہے۔ کتنے میں لی؟''

بھولا نے شان جمائی۔ ''اب بجار (بازار) بڑی تیج رہی مہتو، اس کے اسی روپے دینے پڑے۔ تیس تیس روپے تو دونوں کلوروں کے دیئے۔ تیس پر گابک

روپے کا آٹھ سیر دودھ مانگتا ہے۔''

''بڑا بھاری کلیجہ ہے تم لوگوں کا بھائی، لیکن پھر لائے بھی تو وہ مال یہاں دس پانچ گاؤں میں تو کسی کے پاس نکلے گی نہیں۔''

بھولا پر نشہ چڑھنے لگا۔ ''رائے صاحب اس کے سو روپے دیتے تھے۔ دونوں کلوروں کے پچاس پچاس روپے۔ لیکن ہم نے نہ دیئے۔ بھگوان نے چاہا تو سو روپے اسی بیان میں پیٹ لوں گا۔''

''اس میں کیا شک ہے بھائی! مالک کیا کھا کے لیں گے؟ نذرانہ مل جائے تو بھلے لیں۔ یہ تمہی لوگوں کا گردا ہے کہ مٹھی بھر روپے تقدیر کے بھروسے گن دیتے ہو۔ یہی دل چاہتا ہے کہ اس کے درسن کرتا رہوں۔ قابل رشک ہے تمہاری زندگی کہ تم گایوں کی اتنی خدمت کرتے ہو! ہمیں تو گائے کا گوبر بھی میسر نہیں۔ بچوں والے گھر میں ایک گائے بھی نہ ہو تو کتنی شرم کی بات ہے۔ سال کے سال گزر جاتے ہیں ہیں، گئورس کے درسن نہیں ہوتے۔ گھر والی بار بار کہتی ہے، بھولا بھیا سے کیوں نہیں کہتے! میں کہہ دیتا ہوں، ملیں گے تو کہوں گا۔ تمہارے سو بھاؤ سے بڑی پرسن رہتی ہے۔ کہتی ہے ایسا مرد ہی نہیں دیکھا جب باتیں کریں گے نیچی آنکھیں کر کے، کبھی سر نہیں اٹھاتے۔''

بھولا پر جو نشہ چڑھ رہا تھا، اسے اس بھرپور پیالے نے اور گہرا کر دیا۔ بولا ''بھلا آدمی وہی ہے جو دوسروں کی بہو بیٹی کو اپنی بہو بیٹی سمجھے۔'' جو نالائق کسی غیر عورت کو تاکے، اسے گولی مار دینا چاہئے۔''

''یہ تم نے لاکھ روپے کی بات کہہ دی بھائی۔ بس نیک وہی جو دوسروں کی آبرو

کو اپنی آبرو سمجھے۔''

''جس طرح مرد کے مر جانے سے عورت بیوہ ہو جاتی ہے، اسی طرح عورت کے مر جانے سے مرد کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے ہیں۔ میرا تو گھر اجڑ گیا مہتو، کوئی ایک لوٹا پانی دینے والا بھی نہیں۔''

گذشتہ برس بھولا کی عورت لو لگنے کی وجہ سے مر گئی تھی۔ یہ ہوری جانتا تھا لیکن پچاس برس کا ادھیڑ بھولا اندر سے اتنا نرم ہے، وہ نہ جانتا تھا۔ عورت کی خواہش اس کی آنکھوں میں روشن ہو گئی تھی۔ ہوری کو موقع مل گیا۔ اس کی کسانی عقل جاگ اٹھی۔

پرانی مثل جھوٹی تھوڑی ہے۔ ''بن گھرنی گھر بھوت کا ڈیرا۔ کہیں سگائی کیوں نہیں ٹھیک کر لیتے؟''

''تاک میں ہوں مہتو۔ لیکن کوئی جلدی پھنستا نہیں۔ سو پچاس خرچ کرنے کو بھی تیار ہوں۔ جیسی بھگوان کی مرضی۔''

''اب میں بھی فکر میں رہوں گا۔ بھگوان چاہیں گے جلدی گھر بس جائے گا۔''

''بس یہی سمجھ لو کہ ابر جاؤں گا بھیا! گھر میں کھانے کو بھگوان کا دیا ہوا بہت ہے۔ چار پسیری روز دودھ ہو جاتا ہے۔ لیکن کس کام کا؟''

''میری سسرال میں ایک مہریا ہے۔ تین چار سال ہوئے اس کا آدمی چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا۔ بیچاری پیسائی کر کے گزر کر رہی ہے۔ بال بچہ بھی کوئی نہیں۔ دیکھنے سننے میں اچھی ہے، بس لکشمی سمجھ لو۔''

بھولا کا سکڑا ہوا چہرہ جیسے چکنا گیا۔ امید میں کتنی خوشی ہے! بولا ''اب تو تمہارا

ہی آسرا ہے مہتو! چھٹی ہو تو چلو ایک دن دیکھ آئیں۔''

''میں ٹھیک ٹھاک کر کے تب تم سے کہوں گا۔ جلد بازی کرنے سے بھی کام بگڑ جاتا ہے۔''

''جب تمہاری مرضی ہو تب چلو۔ جلدی کا ہے کی؟ اس کبری رد ل للچایا ہو تو لے لو۔''

''یہ گائے میرے قبضہ کی نہیں ہے دادا۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ اپنا دھرم یہ نہیں ہے کہ دوستوں کا گلا دبائیں، جیسے اتنے دن گزرے ہیں ویسے اور بھی گزر جائیں گے۔''

''تم تو ایسی باتیں کرتے ہو، ہوری جیسے ہم تم دو ہیں۔ تم گائے لے جاؤ۔ دام جو چاہے دینا، جیسے میرے گھر رہی ویسے تمہارے گھر رہی۔ اسی روپے میں لی تھی۔ تم اسی روپے ہی دینا، جاؤ۔''

''لیکن میرے پاس نقد نہیں ہے دادا، سمجھ لو۔''

''تو تم سے نقد مانگتا کون ہے بھائی؟''

ہوری کی چھاتی گز بھر کی ہو گئی۔ اسی روپے میں گائے مہنگی نہ تھی۔ ایسا اچھا ڈیل ڈول، دونوں تھنوں میں چھ سات سیر دودھ۔ سیدھی ایسی کہ بچہ بھی دوھ لے۔ اس کا تو ایک ایک بچھڑا سو سو کا ہو گا۔ دروازے پر بندھے گی تو دروازے کی رونق بڑھ جائے گی۔ اسے ابھی کوئی چار سو روپے دینے تھے لیکن ادھار کو وہ ایک طرح سے مفت سمجھتا تھا۔ کہیں بھولا کی سگائی طے ہو گئی تو سال دو سال تو وہ بولے گا نہیں۔ سگائی نہ بھی ہوئی تو ہوری کا کیا بگڑتا ہے! یہی تو ہو گا کہ بھولا بار بار تقاضا

کرنے آئے گا، بگڑے گا، گالیاں دے گا، لیکن ہوری کو اس کی فکر نہ تھی۔ اس برتاؤ کا وہ عادی تھا۔ کسان کی زندگی کا تو یہ تحفہ ہے۔ بھولا کے ساتھ وہ فریب کر رہا تھا اور یہ سلوک اس کی شان کے خلاف تھا۔ اب بھی لین دین میں اس کے لیے لکھا پڑھی ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق نہ تھا۔ سوکھے بوڑھے کی پریشانیاں اس کے دل کو کمزور بنائے رہتی تھیں۔ خدا کا خوف ہمیشہ اس کے سامنے رہتا تھا۔ پر یہ فریب اس کی نظر میں فریب نہ تھا۔ یہ صرف مقصد کی حصولی تھی اور یہ کوئی بری بات نہ تھی۔ اس طرح کا فریب تو وہ دن رات کرتا رہتا تھا۔ گھر میں دو چار روپے پڑے رہنے پر بھی مہاجن کے سامنے قسم کھا جاتا تھا کہ ایک پائی بھی نہیں ہے۔ سن کو کچھ گیلا کر دینا اور روئی میں کچھ اور بنولا بھر دینا اس کی نظر میں جائز تھا اور یہاں تو صرف مطلب نہ تھا، تھوڑا سا منور نجن تھا۔ بوڑھوں کا بڑھاپا بھی پر مذاق ہوتا ہے اور ایسے بزرگوں سے اگر کچھ اینٹھ لیا جائے تو کوئی برائی یا پاپ نہیں۔

بھولا نے گائے کی رسی ہوری کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''لے جا مہتو، تم بھی کیا یاد کرو گے۔ بیاہتے ہی چھ سیر دودھ لے لینا۔ چلو، میں تمہارے گھر تک پہنچا دوں۔ شاید تمہیں انجان سمجھ کر راستے میں کچھ دق کرے۔ اب تم سے سچ کہتا ہوں، مالک نوے روپے دیتے تھے، پر ان کے یہاں گایوں کی کیا کدر (قدر) مجھ سے لے کر کسی حاکم حکام کو دے دیتے۔ حاکموں کو گائے کی خدمت سے مطلب؟ وہ تو محض خون چوسنا جانتے ہیں۔ جب تک دودھ دیتی رکھتے پھر کسی کے ہاتھ بیچ دیتے۔ کس کے پلے پڑتی کون جانے۔ روپے ہی سب کچھ نہیں ہیں بھیا۔ کچھ اپنا بھی دھرم تو ہے۔ تمہارے گھر آرام سے رہے گی تو یہ نہ ہوگا کہ تم آہ کھا کر سور رہو

اور گائے بھوکی کھڑی رہے۔ اس کی خدمت کرو گے، چمکارو گے، گائے ہمیں دعائیں دے گی۔ تم سے کیا کہوں بھیا، گھر میں چنگل بھر بھوسہ نہیں رہا۔ روپے سب بازار میں نکل گئے۔ سوچا تھا مہاجن سے کچھ لے کر بھوسہ کھلائیں گے۔ لیکن مہاجن کا پہلا ہی نہ چکا، اس نے انکار کر دیا۔ اتنے جانوروں کو کیا کھلائیں۔ یہی فکر مارے ڈالتی ہے۔ چنگی چنگی بھر کھلاؤں تو من بھر روز کا خرچ ہے۔ بھگوان ہی پار لگائیں تو لگے۔''

ہوری نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم نے ہم سے پہلے کیوں نہیں کہا؟ ہم نے ایک گاڑی بھوسہ بیچ دیا۔''

بھولا نے ماتھا ٹھوک کر کہا۔ ''اس لیے نہیں کہا بھیا کہ سب سے اپنا دکھ کیوں روؤں، بانٹتا کوئی نہیں، ہنستے سب ہیں۔ جو گائیں سوکھ گئی ہیں ان کا غم نہیں، پتی ستی کھلا کر جلا لوں گا۔ لیکن اب تو راتب بنا نہیں رہ سکتی۔ ہو سکے تو دس بیس روپے بھوسے کے لیے دے دو۔''

کسان پکا مطلبی ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں۔ اس کی گانٹھ سے رشوت کے پیسے بڑی مشکل سے نکلتے ہیں۔ بھاؤ تاؤ میں بھی چوکس ہوتا ہے۔ بیاج کی ایک ایک پائی چھڑانے کے لیے وہ مہاجن کی گھنٹوں خوشامد کرتا ہے۔ جب تک پکا بھروسہ نہ ہو جائے، وہ کسی کے بہکانے میں نہیں آتا۔ لیکن اس کی تمام زندگی قدرت سے عدم تعاون ہے۔ پیڑوں میں پھل لگتے ہیں، انہیں پبلک کھاتی ہے۔ کھیتی میں اناج ہوتا ہے، وہ دنیا کے کام آتا ہے۔ گائے کے تھن میں دودھ ہوتا ہے، وہ خود پی نہیں سکتی، دوسرے ہی پیتے ہیں۔ بادلوں سے پانی برستا ہے، اس سے زمین کی پیاس

بجھتی ہے۔ایسی حالت میں خودغرضی کوکہاں جگہ؟ ہوری کسان تھا اور کسی کے جلتے ہوئے گھر میں ہاتھ سینکنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

بھولا کی مصیبت بھری داستان سنتے ہی اس کی نیت بدل گئی۔رسی کو بھولا کے ہاتھ میں واپس دیتے ہوئے بولا۔''روپے تو دادا میرے پاس نہیں۔ہاں تھوڑا سا بھوسہ بچا ہے وہ تمہیں دوں گا، چل کر اٹھالو۔بھوسے کے لیے تم گائے بیچو گے اور میں لوں گا!میرے ہاتھ نہ کٹ جائیں گے؟''

بھولا نے غمگین لہجے میں کہا۔''تمہارے بیل بھوکے نہ مرین گے !تمہارے پاس بھی ایسا کونسا بہت سا بھوسہ ہے۔''

''نہیں دادا، اب بھوسہ اچھا ہو گیا تھا۔''

''میں نے تم سے ناحق بھوسہ کی بات کہی۔''

''تم نہ کہتے اور بعد کو مجھے معلوم ہوتا تو مجھے بڑا رنج ہوتا کہ تم نے مجھے اتنا غیر سمجھ لیا۔موقع پڑنے پر بھائی کی مدد بھائی بھی نہ کرے تو کام کیسے چلے!''

''مہتو یہ گائے لیتے جاؤ۔''

''تو بھوسے کے دام دودھ میں کٹوا لینا۔''

ہوری نے دکھ بھری آواز میں کہا۔''دام کوڑی کی اس میں کونسی بات ہے دادا۔ میں ایک دو دن تمہارے گھر کھالوں تو تم مجھ سے دام مانگو گے؟''

''لیکن تمہارے بیل بھوکے مریں گے کہ نہیں؟''

''بھگوان کوئی نہ کوئی سبب اور نکالیں گے۔اساڑھ سر پر ہے۔کڑوی بولوں گا۔''

''مگر یہ گائے تمہاری ہوگئی۔ جس دن مرضی ہو آ کر لے جانا۔''

''کسی بھائی کا نیلام پر چڑھا ہوا بیل لینے میں جو پاپ ہے، وہ اس وقت تمہاری گائے لینے میں ہے۔''

ہوری میں بال کی کھال نکالنے کی طاقت ہوتی تو وہ خوشی سے گائے لے کر گھر کی راہ لیتا۔ بھولا جب نقد روپے نہیں مانگتا تو صاف تھا کہ وہ بھوسے کے لیے گائے نہیں بیچ رہا ہے بلکہ اس کا کچھ اور مطلب ہے۔ لیکن جیسے پتوں کے کھڑکنے پر گھوڑا بلوا جھٹک جاتا ہے اور مارنے پر بھی آگے قدم نہیں اٹھاتا، وہی حالت ہو ری کی تھی۔ مصیبت کی چیز لینا گناہ ہے۔ یہ بات ہمیشہ سے اس کی روح کا حصہ بن گئی تھی۔

بھولا نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تو کسی کو بھیج دوں بھوسے کے لیے؟''

ہوری نے جواب دیا۔ ''ابھی میں رائے صاحب کی ڈیوڑھی پر جا رہا ہوں۔ وہاں سے گھڑی بھر میں لوٹوں گا، تبھی کسی کو بھیجنا۔''

بھولا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولا۔ ''تم نے آج مجھے ابار لیا ہوری بھائی! مجھے اب معلوم ہوا کہ دنیا میں اکیلا نہیں ہوں، میرا بھی کوئی ہمدرد ہے۔ ایک لمحہ کے بعد اس نے پھر کہا۔ ''اس بات کو بھول مت جانا۔''

ہوری آگے بڑھا تو اس کا دل خوش تھا، دل کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ کیا ہوا دس پانچ من بھوسہ چلا جائے گا۔ بیچارے کو پریشانی پڑ کر اپنی گائے تو نہ بیچنا پڑے گی۔ جب میرے پاس چارہ ہوگا، تب گائے کھول لاؤں گا۔ بھگوان کریں مجھے کوئی مہر یا مل جائے پھر تو کوئی بات نہیں ہے۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کبری گائے دم سے مکھیاں اڑاتی، سر ہلاتی، مستی بھری چال سے جھومتی چلی جاتی تھی جیسے باندیوں کے بیچ میں کوئی رانی ہو۔ کیسا مبارک وہ دن ہوگا جب یہ رانی اس کے دروازے پر بندھے گی!

(2)

سیمری اور بلاری دونوں اودھ صوبہ کے گاؤں ہیں۔ ضلع کا نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہوری بلاری میں رہتا ہے۔ رائے صاحب امر پال سنگھ سیمری میں۔ دونوں گاؤں میں صرف پانچ میل کا فرق ہے۔ پچھلے دنوں جنگ آزادی میں رائے صاحب نے خوب نام کمایا تھا۔ کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل چلے گئے تھے۔ تب سے ان کے علاقے کی آسامیوں کو ان سے گہری ہمدردی ہوگئی تھی۔ یہ نہیں کہ ان کے علاقے میں آسامیوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت کی جاتی ہو یا بیگار کی سختی میں کچھ کمی ہو مگر یہ تمام بدنامی مختاروں کے سر جاتی تھی۔ رائے صاحب کی نیک نامی پر کوئی داغ نہ لگ سکتا تھا۔ وہ بیچارے بھی تو اسی نظام کے غلام تھے۔ ضابطے کا کام تو جیسے ہوتا چلا آیا ہے، ویسا ہی ہوگا۔ رائے صاحب کی نیک نیتی اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکتی تھی۔ اسی لیے آدمی اور حقوق میں جو بھرکی بھی کمی نہ ہونے پر بھی ان کا وقار بڑھ گیا تھا۔ آسامیوں سے وہ ہنس کر بولتے تھے۔ یہی کیا کم بات ہے؟ سنگھ (شیر) کا کام تو شکار کرنا ہے۔ اگر وہ گرجنے اور غرانے کے بدلے میٹھی بولی بول سکتا تو اسے گھر بیٹھے من مانا شکار مل جاتا۔ شکار کی تلاش میں جنگل میں نہ

بھٹکنا پڑتا۔

رائے صاحب محبِّ وطن ہونے پر بھی حکام سے میل جول بنائے رکھتے تھے۔ان کی نذریں، ڈالیاں اور ملازمین کی دستوریاں جیسی کی تیسی چلی آتی تھیں۔ ادب وموسیقی کے رسیا تھے۔ڈرامہ کے شوقین، اچھے مقرر تھے۔اچھے ادیب، اچھے نشانے باز۔ان کی شریک حیات کو مرے آج دس سال ہو چکے تھے۔مگر دوسری شادی نہ کی تھی۔ہنس بول کر اپنے رنڈاپے کی زندگی کو بہلاتے رہتے۔

ہوری ڈیوڑھی پر پہنچا تو دیکھا، جیٹھ کے دسہرے کے موقع پر ہونے والے ''دھنش یگ'' کی بڑی زوروں سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔کہیں اسٹیج بن رہا تھا۔ کہیں منڈپ، کہیں مہمانوں کا مہمان خانہ، کہیں دکانداروں کے لیے دکانیں۔ دھوپ تیز ہوگئی تھی، پر رائے صاحب خود کام میں لگے ہوئے تھے۔اپنے والد سے ورثہ میں دولت کے ساتھ ساتھ رام کی عقیدت بھی پائی تھی اور ''دھنش یگ'' کو ناٹک کا روپ دے کر اسے صاف ستھرا دلچسپ تفریح کا ذریعہ بنا دیا تھا۔اس موقع پر ان کے یار دوست، حاکم و حکام سبھی مدعو ہوتے تھے اور دو تین دن علاقے میں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔رائے صاحب کا خاندان بہت بڑا تھا۔کوئی ڈیڑھ سو سردار ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔کئی چچا تھے۔درجنوں چچازاد بھائی، کئی سگے بھائی، بیسیوں رشتے کے بھائی۔ایک چچا صب رادھا کے عقیدت مند تھے اور برابر برندابن میں رہتے تھے۔''بھگتی رس'' کے کتنے ہی دیوان لکھ ڈالے تھے۔وقت وقت پر انہیں چھپوا کر دوستوں کی نذر کر دیتے تھے۔ایک دوسرے چچا تھے جو رام کے بڑے بھگت تھے اور فارسی زبان میں رامائن کا ترجمہ کر رہے تھے۔ریاست

سے سب کے وظیفے بندھے ہوئے تھے۔ کسی کو کوئی کام کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

ہوری منڈپ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اپنے آنے کی اطلاع کیسے دے کہ اچانک رائے صاحب ادھر ہی آ نکلے اور اسے دیکھتے ہی بولے۔ ''ارے! تو آ گیا ہوری، میں تجھے بلوانے والا تھا۔ دیکھ اب کی تجھے راجہ جنک کا مالی بننا پڑے گا۔ سمجھ گیا نا' جس وقت سری جانکی جی مندر میں پوجا کرنے جاتی ہے' اسی وقت تو ایک گلدستہ لیے کھڑا رہے گا اور جانکی جی کی نذر کرے گا۔ غلطی نہ کرنا اور دیکھ آسامیوں سے تاکید کر کے کہہ دینا کہ سب کے سب شگن کرنے آئیں۔ میرے ساتھ کوٹھی میں آ، تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

وہ آگے آگے کوٹھی کی طرف چلے، ہوری پیچھے پیچھے چلا۔ وہیں ایک گھنے پیڑ کے سائے میں وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور ہوری کو زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولے۔ ''سمجھ گیا میں نے کیا کہا؟ کارکن کو تو جو کچھ کرنا ہے وہ کرے ہی گا، مگر آسامی جس قدر دل سے آسامی کی باتیں سنتا ہے، کارکن کی نہیں سنتا۔ ہمیں ان ہی پانچ سات دنوں میں بیس ہزار کا بندوبست کرنا ہے۔ کیسے ہوگا سمجھ میں نہیں آتا۔ تم سوچتے ہوگے مجھ نکمے کے آدمی سے مالک کیوں اپنا دکھڑا رونے بیٹھے۔ کس سے اپنے من کی کہوں؟ نجانے کیوں تمہارے اوپر اعتماد ہوتا ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ دل میں مجھ پر ہنسو گے نہیں اور ہنسو بھی تو تمہاری ہنسی میں برداشت کر سکتا ہوں۔ البتہ ان کی ہنسی نہیں سہہ سکتا جو اپنے برابر کے ہیں کیونکہ ان کی ہنسی میں حسد، بغض اور طنز ہے اور وہ کیوں نہ ہنسیں؟ میں بھی تو ان کی تکلیف، مصیبت اور

پست حالی پر ہنستا ہوں، دل کھول کر تالیاں بجا کر۔ دولت اور ہمدردی میں بیر ہے۔ ہم بھی دان دیتے ہیں، دھرم کرتے ہیں، لیکن جانتے ہو کیوں؟ صرف اپنے برابر والوں کو نیچا دکھانے کے لیے۔ ہمارا دان اور دھرم محض غرور اور خالص غرور ہے۔ ہم میں سے کسی پر ڈگری ہو جائے، کسی کی قرقی ہو، بقایا مال گزاری کی علت میں حوالات ہو جائے، کسی کا جوان لڑکا مر جائے، کسی کی بیوہ بہو نکل جائے، کسی کے گھر میں آگ لگ ء، کوئی بیسوا کے ہاتھوں الو بن جائے یا اپنی آسامیوں سے پٹ جائے تو اس کے اور سبھی بھائی اس پر ہنسیں گے اور بغلیں بجائیں گے گویا انہیں کل دنیا کی دولت مل گئی اور ملیں گے بڑی محبت سے گویا ہمارے پسینہ کی جگہ خون بہائیں گے! ارے اور تو اور ہمارے چچا زاد، پھوپھا زاد، ماموں زاد اور خالو زاد بھائی جو اسی ریاست کی بدولت مزے اڑا رہے ہیں، شعر کہہ رہے ہیں اور جو کھیل رہے ہیں، شراب پی رہے ہیں اور عیاشی کر رہے ہیں، وہ بھی مجھ سے جلتے ہیں اور اگر آج مر جاؤں تو گھی کے چراغ جلائیں۔ میرے دکھ کو دکھ سمجھنے والا کوئی نہیں۔ ان کی نگاہوں میں مجھے دکھی ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں اگر روتا ہوں تو غم کا مضحکہ اڑاتا ہوں! اگر بیمار ہوتا ہوں تو مجھے سکھ ہوتا ہے۔ میں اگر اپنا بیاہ کر کے گھر میں جھگڑا نہیں بڑھاتا تو یہ میری خود غرضی ہے اور اگر بیاہ کر لوں تو وہ عیش پسندی ہوگی۔ اگر شراب نہیں پیتا تو میری کنجوسی ہے، شراب پینے لگوں تو وہ رعایا کا خون ہوگی۔ اگر عیاشی نہیں کرتا تو خشک مزاج ہوں۔ عیاشی کرنے لگوں تو پھر کہنا ہی کیا۔ ان لوگوں نے مجھے عیش و عشرت میں مبتلا کرنے کے لیے کم چالیں نہیں چلیں اور اب تک چلے جاتے ہیں۔ ان کی یہی خواہش ہے کہ میں اندھا ہو جاؤں

اور وہ لوگ مجھے لوٹ لیں اور میرا فرض یہ ہے کہ میں سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھوں، دب کچھ جان کر بھی گدھا بنا رہوں۔''

رائے صاحب نے گاڑی آگے بڑھانے کے لیے دو بیڑے پان کھائے اور ہوری کے منہ کی طرف تاکنے لگے۔ گویا اس کے دلی خیالات کو جاننا چاہتے ہوں۔

ہوری نے ہمت کر کے کہا۔ ''ہم سوچتے تھے کہ ایسی باتیں ہمی لوگوں میں ہوتی ہیں، پر جان پڑتا ہے کہ بڑے آدمیوں میں بھی ان کی کمی نہیں ہے۔''

رائے صاحب نے منہ پان سے بھر کر کہا۔ ''تم ہمیں بڑا آدمی سمجھتے ہو؟'' ہمارے نام بڑے ہیں مگر درشن چھوٹے! غریبوں میں اگر حسد یا دشمنی ہے تو مطلب کے لیے یا پیٹ کے لیے۔ ایسی حسد اور دشمنی کو میں قابل معافی سمجھتا ہوں۔ ہمارے منہ کا لقمہ کوئی چھین لے تو اس کے حلق سے انگلی ڈال کر نکالنا ہمارا دھرم ہو جاتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو دیوتا ہیں۔ بڑے آدمیوں کا حسد اور دشمنی صرف لطف اٹھانے کے لیے ہے۔ ہم اتنے بڑے آدمی ہو گئے ہیں کہ ہمیں مکاری اور کمینہ پن ہی میں پورا مزہ آتا ہے۔ ہم دیوتا پن کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں جب ہمیں اوروں کے رونے پر ہنسی آتی ہے۔ اسے تم تھوڑی ریاضت نہ سمجھو۔ جب اتنا بڑا کنبہ ہے تو کوئی نہ کوئی تو ہمیشہ ہی بیمار رہے گا اور بڑے آدمیوں کے روگ بھی بڑے ہوتے ہیں۔ وہ بڑا آدمی ہی کیا جسے کوئی چھوٹا عارضہ ہو؟ معمولی بخار بھی آجائے تو ہمیں سرسام کی دوا دی جاتی ہے، ذرا سی پھنسی بھی نکل آئے تو وہ زہر باد بن جاتا ہے۔ اب چھوٹے سرجن اور منجھلے سرجن اور بڑے سرجن تار سے بلائے جاتے ہیں، مسیح الملک کو لانے ندھلی آدمی بھیجا جا رہا ہے اور راج وید کو لانے کے

لیے کلکتہ۔ ادھر مندر میں درگا پاٹ ہو رہا ہے اور جوتشی مہاراج کا زائچہ دیکھ رہے ہیں اور جنتر منتر والے گرو اپنے کام میں مصروف ہیں ۔ راجہ صاحب کو جمراج (فرشتہ اجل) کہ منہ سے نکالنے کے لیے دوڑ لگی ہوئی ہے۔ حکیم اور ڈاکٹر اس تاک میں رہتے ہیں کہ کب ان کا سر دکھے اور کب ان کے گھر میں سونے کی برکھا ہو اور یہ روپے تم سے اور تمہارے بھائیوں سے وصول کیے جاتے ہیں، بھالے کی نوک پر! مجھے تو یہی تعجب ہوتا ہے کہ کیوں تمہاری آہوں کی آگ ہمیں بھسم نہیں کر ڈالتی مگر نہیں، تعجب کی کوئی بات نہیں، بھسم ہونے میں تو بہت دیر نہیں لگتی، تکلیف بھی ذرا ہی دیر کی ہوتی ہے۔ ہم جو جو اور انگل انگل کر کے جلتے جا رہے ہیں، اس بلا سے بچنے کے لیے ہم پولیس کی، حاکموں کی، عدالت کی اور وکیلوں کی پناہ لیتے ہیں اور خوبصورت عورت کی طرح سبھی کے ہاتھوں کا کھلونا بنتے ہیں۔ دنیا سمجھتی ہے ہم بڑے سکھی ہیں۔ ہمارے پاس علاقے، محل، سواریا، نوکر چاکر، قرض، بیسوائیں، کیا نہیں ہیں؟ مگر جس کے دل میں طاقت نہیں، خودداری نہیں وہ اور چاہے کٹھ ہوا انسان نہیں ہے۔ جسے دشمن کے خوف سے رات کو نیند نہ آتی ہو، جس کے دکھ پر سب ہنسیں اور رونے والا کوئی نہ ہو، جس کی چوٹی دوسروں کے پیروں کے نیچے دبی ہو، جو عیش و عشرت کے نشے میں اپنے کو بالکل بھول گیا ہو، جو حاکموں کے تلوے چاٹتا ہو اور اپنے ماتحتوں کا خون چوستا ہو، اسے میں سکھی نہیں کہتا۔ نیا کا سب سے بڑا بدنصیب جاندار ہے۔ صاحب شکار کھیلنے آئیں یا دورے پر، میرا فرض ہے کہ ان کی دم کے پیچھے لگا رہوں، ان کے ابروؤں پر شکن پڑی اور ہماری جان نکلی۔ انہیں خوش کرنے کے لیے ہم کیا نہیں کرتے مگر وہ سب کہنے

لگیں تو شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ ڈالیوں اور رشوتوں تک خوش کرنے کے لیے ہم کیا نہیں کرتے مگر وہ سب کہنے لگیں تو شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ ڈالیوں اور رشوتوں تک خیر غنیمت ہے، ہم سجدے کرنے کو بھی تیار رہتے ہیں۔ مفت خوری نے تو ہمیں بے ہاتھ پیر کا بنا دیا ہے۔ ہمی ۹ں اپنی مردیت پر ذرا بھی بھروسہ نہیں، صرف افسروں کے آگے دم ہلا ہلا کر کسی طرح انہیں مہربان رکھنا اور ان کی مدد سے اپنی رعایا پر رعب جمانا ہی ہمارا کام ہے۔ چاپلوسوں کی خوشامد نے ہمیں اتنا مغرور اور تنک مزاج بنا دیا ہے کہ ہم سے شرافت، عاجزی اور خدمت سب رخصت ہوگئی ہیں۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر سرکار ہمارے علاقے چھین کر ہمیں اپنی روز کے لیے محنت کرنا سکھا دے تو ہم پر بڑا احسان ہو اور یہ تو یقینی ہے کہ اب سرکار بھی ہماری حفاظت نہ کرے گی۔ اب ہم سے اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ علامات سے ظاہر ہے کہ ہمارا طبقہ بہت جلد مٹ جانے والا ہے۔ میں اس دن کا خیر مقدم کرنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ ایشور وہ دن جلد لائے! وہ ہمارے لیے اودھار (نجات) کا دن ہوگا۔ ہم موجودہ حالتوں کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ وہی ہمارا استیاناس کر رہی ہیں اور جب تک پونجی کی یہ بیڑیاں ہمارے پیروں سے نہ نکلیں گی تب تک یہ نحوست ہمارے سر پر منڈلاتی رہے گی۔ ہم انسانیت کا وہ درجہ نہ پا سکیں گے جس پر پہنچنا زندگی کا انتہائی مقصد ہے۔''

رائے صاحب نے پھر گلوری دان نکالا اور کئی بیڑے منہ میں رکھ لیے۔ کچھ اور کہنے والے تھے کہ ایک چپراسی نے آ کر کہا ''سرکار! بیگاروں نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب تک ہمیں کھانے کو نہ ملے گا ہم کام نہ کریں

گے۔ہم نے دھمکایا تو سب کام چھوڑ کر الگ ہو گئے۔''

رائے صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے، آنکھیں نکالے کر بولے۔''چلو میں ان بد معاشوں کو ٹھیک کرتا ہوں۔ جب کبھی کھانے کو نہیں دیا گیا تو آج یہ نئی بات کیوں؟ ایک آنہ روز کے حساب سے مزدور جو ہمیشہ ملتی رہی ہے، اسی مزدوری پر انہیں کام کرنا ہوگا، سیدھے کریں یا ٹیڑھے۔''

پھر ہوری کی طرف دیکھ کر بولے۔''تم اب جاؤ ہوری، اپنی تیاری کرو، جو بات میں نے کہی ہے اس کا خیال رکھنا۔تمہارے گاؤں سے مجھے کم از کم پانچ سو کی امید ہے۔''

رائے صاحب جھلاتے ہوئے چلے گئے۔ہوری نے دل میں سوچا کہ ابھی یہ کیسی کیسی دھرم کی باتیں کر رہے تھے اور یکا یک اتنے گرم ہو گئے۔

سورج سر پر آ گیا تھا۔اس کی تپش سے متاثر ہو کر پیڑوں نے اپنا پھیلاؤ سمیٹ لیا تھا۔آسمان غبار آلود ہو رہا تھا اور سامنے کی زمین کانپتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔

ہوری نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور گھر چلا۔شگون کے روپے کہاں سے آئیں گے۔یہی فکر اس کے سر پر سوار تھی۔

(3)

ہوری اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ابھی تک گوبر کھیت میں ایک گوڑ

رہا ہے اور دونوں لڑکیاں بھی اس کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ لو چل رہی تھی، بگولے اٹھ رہے تھے، زمین جل رہی تھی، جیسے قدرت نے ہوا میں آگ بھر دی ہو۔ یہ سب ابھی تک کھیت میں کیوں کام کے پیچھے جان دینے پر تلے ہوئے ہیں؟ وہ کھیت کی طرف چلا اور دور ہی سے چلا کر بولا۔ ''آتا کیوں نہیں گوبر، کیا کام ہی کرتا رہے گا؟ دوپہر ڈھل گئی، کچھ سوجھتا ہے کہ نہیں۔''

اسے دیکھتے ہی تینوں نے کدالیں اٹھا لیں اور ساتھ ہو لیے۔ گوبر سانولا، لمبا، اکہرے بدن کا نوجوان تھا جسے اس کام سے دلچسپی نہ معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر خوشی کی جگہ بے اطمینانی اور بے دلی تھی۔ وہ اس لیے کام میں لگا ہوا تھا کہ وہ دکھانا چاہتا تھا کہ اسے کھانے پینے کی کچھ فکر نہیں ہے۔ بڑی لڑکی سونا شرمیلی لڑکی تھی، سانولی، سڈول، تیز اور خوش۔ گاڑھے کی سرخ ساڑھی جسے وہ گھٹنوں سے موڑ کر کمر پر باندھے ہوئے تھی۔ اس کے ہلکے بدن پر کچھ لدی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی اور اسے پختگی کا رنگ دے رہی تھی۔ چھوٹی لڑکی روپا پانچ چھ سال کی چھوکری تھی، میلی، سر پر بالوں کا ایک گھونسلا سا بنا ہوا، ایک لنگوٹی کمر میں لگی ہوئی، بڑی شریر اور رونے والی۔

روپا نے ہوری کے پیروں سے لپٹ کر کہا۔ ''کاکا دیکھو میں نے ایک ڈھیلا بھی نہیں پھوڑا۔ بہن کہتی ہے جا پیڑ تلے بیٹھ، ڈھیلے نہ توڑے جائیں گے کاکا تو مٹی کیسے برابر ہوگی؟''

ہوری نے اسے گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''بہت اچھا کیا بیٹی، چل گھر چلیں۔''

کچھ دیر اپنی بے دلی کو دبائے رہنے کے بعد گوبر بولا۔ ''یہ تم روج روج (روز روز) مالکوں کی کھسامد (خوشامد) کرنے کیوں جاتے ہو۔ لگان نہ چکے تو پیادہ آ کر گالیاں سناتا ہے، بیگار دینی ہی پڑتی ہے۔ نجر نجرانہ (نذر نذرانہ) سب تو ہم سے بھرایا جاتا ہے، پھر کسی کی کیوں سلامی کرو؟''

اس وقت یہی خیالات ہوری کے دل میں بھی آ رہے تھے۔ مگر لڑکے کے با غیانہ جذبے کو دبانا ضروری تھا، بولا۔ ''سلامی کرنے نہ جائیں تو رہیں کہاں؟ بھگوان نے جب گلام (غلام) بنا دیا ہے تو اپنا کیا بس؟ اسی سلامی برکت ہے کہ دوارے (دروازے) پر جھونپڑی بنالی اور کسی نے کچھ نہ کہا۔ گھورے نے دوارے پر کھونٹا گاڑا تھا جس پر کارندہ نے دورو پے ڈانٹ (تاوان) لے لیے تھے۔ تلیا سے ہم نے کتنی مٹی کھودی، کارندہ نے کچھ نہیں کہا، دوسرا کھودے تو نجر (نذر) دینی پڑے۔ اپنے مطلب کے لیے سلامی کرنے جاتا ہوں۔ پاؤں میں سنیچر نہیں ہے اور سلامی کرنے میں کچھ سوکھ ملتا ہے۔ گھنٹوں کھڑے رہو تب مالک کو کہیں کھبر (خبر) ہوتی ہے۔ کبھی باہر نکلتے ہیں، کبھی کہلا دیتے ہیں، پھر صت (فرصت) نہیں ہے۔''

گوبر نے طنز سے کہا۔ ''بڑے آدمیوں کی ہاں میں ہاں ملانے میں تھوڑا بہت سکھ ملتا ہے، نہیں تو لوگ ممبری کے لیے کیوں کھڑے ہوں؟''

''جب سر پر پڑے گی تب معلوم ہوگا بیٹا، ابھی جو چاہے کہہ لو۔ پہلے میں بھی ایسا ہی سوچا کرتا تھا معلوم وہا کہ ہماری گردن دوسروں کے پاؤں تلے دبی ہوئی ہے، اکڑ کر نباہ نہیں ہوسکتا۔''

گوبر باپ پر اپنا غصہ اتار کر کچھ ٹھنڈا ہو گیا اور چپ چاپ چلنے لگا۔ سونا نے دیکھا کہ روپا باپ کی گود میں چڑھی ہے تو حسد ہوا۔ اسے ڈانٹ کر بولی۔ ''آپ گود سے اتر کر پاؤں پاؤں کیوں نہیں چلتی، کیا پاؤں ٹوٹ گئے ہیں؟''

روپا نے باپ کی گگردن میں ہاتھ ڈال کر ڈھٹائی سے کہا۔ ''نہ اتریں گے جاؤ۔ کاکا! بہن ہم کو چڑایا کرتی ہے کہ تو روپا ہے میں سونا ہوں۔ میرا نام کچھ اور رکھ دو۔''

ہوری نے سونا کو بناوٹی غصے سے دیکھ کر کہا۔ ''تو اسے کیوں چڑھاتی ہے سونیا؟ سونا تو دیکھے کو ہے، نباہ تو روپا سے ہوتا ہے۔ روپا نہ ہو تو روپے کہاں سے بنیں، بتا؟''

سونا نے اپنی بات رکھنے کے لیے کہا۔ ''سونا نہ ہو مہر کیسے بنے، نتھنی کہاں سے آوے، کنٹھا کیسے بنے؟''

گوبر بھی اس تفریحی بحث میں شامل ہو گیا۔ روپا سے بولا۔ ''تو کہہ دے کہ سونا تو سوکھی پتی کی طرح پیلا ہوتا ہے۔ روپا تو اجلا ہوتا ہے، جیسے چندرماں۔''

سونا بولی۔ ''بیاہ میں پیلی ساڑھی پہنی جاتی ہے، اجلی ساڑھی کوئی نہیں پہنتا۔''

روپا اس دلیل سے ہار گئی۔ گوبر اور ہوری کی کوئی دلیل اس کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ اس نے رونی آنکھوں سے ہوری کو دیکھا۔

ہوری کو ایک نئی بات سوجھ گئی۔ ''بڑے آدمیوں کے لیے ہے، ہم گریبوں (غریبوں) کے لیے تو روپا ہی ہے۔ جیسے جوکو راجا کہتے ہیں، گیہوں کو چمار، تو اسی لیے تا کہ گیہوں بڑے آدمی کھاتے ہیں اور جو ہم لوگ کھاتے ہیں؟''

سونا کے پاس اس زبردست دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔ ہار کر بولی۔ ''تم سب ایک ہو گئے، نہیں روپیا کو رلا کر چھوڑتی۔''

روپا نے ہاتھ مٹکا کر کہا۔ ''اے رام سونا چمار! اے رام سونا چمار!''

اس جیت کی اسے اتنی خوشی ہوئی کہ باپ کی گود میں نہ رہ سکی۔ زمین پر کود پڑی اور اچھل اچھل کر یہ رٹ لگانے لگی۔ ''روپا راجہ سونا چمار! روپا راجہ سونا چمار!''

یہ لوگ گھر پہنچے تو دھنیا دروازے پر کھڑی ان کی راہ دیکھ رہی تھی، خفا ہوں کر بولی۔ ''آج اتنی دیر کیوں کی، گوبر؟ کام کے پیچھے کوئی جان تھوڑے ہی دے دیتا ہے۔'' پھر شوہر سے گرم ہو کر کہا۔ ''تم بھی وہاں سے کمائی کر کے لوٹے تو کھیت پہنچے۔ کھیت کہیں بھاگا جاتا تھا؟''

دروازے پر کنواں تھا۔ ہوری اور گوبر نے ایک ایک کلسا پانی سر پر ڈالا، روپا کو نہلایا اور کھانا کھانے گئے۔ جو کی روٹیاں تھیں مگر گیہوں کی سی سفید اور چکی۔ ارہر کی دال تھی جس میں کچا آم پڑا تھا۔ روپا باپ کی تھالی میں کھانے بیٹھی۔ سونا نے اسے حسد بھری نگاہوں سے دیکھا، گویا کہہ رہی تھی۔ ''واہ رے دلارا!''

دھنیا نے پوچھا۔ ''مالک سے کیا بات چیت ہوئی؟''

ہوری نے لوٹا بھر پانی چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہی تحصیل وصول کی بات تھی اور کیا ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑے آدمی بڑے سکھی ہوں گے، رتی پوچھو تو وہ ہم سے بھی ادھک (زیادہ) دکھی ہیں۔ ہمیں اپنے پیٹ ہی کی پھکر (فکر) ہے، انہیں تمام پھکریں گھیرے رہتی ہیں۔''

رائے صاحب نے اور کیا کیا کہا تھا وہ ہوری کو یاد نہ تھا۔ اس کل بیان کا لب

لباب ہی اس کے حافظے میں باقی رہ گیا تھا۔

گوبر نے طنز سے کہا۔ ''اپنی ریاست دے دیتے؟ اپنے کھیت، بیل، ہل، کدال سب انہیں دینے کو تیار ہیں۔ کریں گے بدلہ؟ یہ سب ڈھونگ ہے، نری مٹ مردی! جسے دکھ ہوتا ہے وہ درجنوں مٹر نہیں رکھتا، محلوں میں نہیں رہتا حلوا پوری نہیں کھاتا اور نہ ناچ رنگ میں پھنسا رہتا ہے۔ آرام سے راج کا سکھ بھوگ رہے ہیں، اس پر دکھی بنتے ہیں!''

ہوری نے جھنجھلا کر کہا۔ ''اب تم سے حجت کون کرے بھائی؟ ریاست کسی سے چھوڑی جاتی ہے کہ وہی چھوڑ دیں گے۔ ہمیں کھیتی سے کیا ملتا ہے؟ ہر آدمی کے حساب سے ایک آنہ روج کی مجوری (مزدوری) بھی تو نہیں پڑتی جو دس روپے مہینہ کا بھی نوکر ہے وہ ہم سے اچھا کھاتا پیتا ہے، پر کھیتوں کو چھوڑا تو نہیں جاتا۔ کھیتی چھوڑ دیں تو اور کریں گے کیا؟ نوکری کہیں ملتی ہے! پھر مرجاد بھی تو پالنا ہی پڑتی ہے۔ کھیتی میں جو مرجاد ہے وہ نوکری میں تو نہیں ہے۔ اسی طرح جمنداروں (زمینداروں) کا حال بھی سمجھنا۔ ان کی جان کو بھی تو سینکڑوں لوگ لگے ہوئے ہیں۔ حاکموں کو رسد پہنچاؤ، ان کی سلامی کرو۔ عملوں کو کھس (خوش) کرو، تاریکھ (تاریخ) پر مال گجاری (مالگزاری) نہ چکاویں تو حوالات ہو جائے، کڑکی (قرقی) کی نوبت آجائے ہمیں تو کوئی حوالات نہیں لے جاتا۔ دو چار گالیاں یا جھڑکیاں ہی تو مل کر رہ جاتی ہیں۔''

گوبر نے احتجاج کیا۔ ''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہم لوگ دانے دانے کو محتاج ہیں۔ سمو چے بدن پر کپڑے نہیں ہیں، چوٹی کا پسینہ ایڑی تک جاتا ہے تب

بھی گجر (گزر) نہیں ہوتی۔ انہیں کیا، آرام سے گدا مسند لگائے بیٹھے ہیں، سینکڑوں نوکر چاکر ہیں، ہجاروں (ہزاروں) آدمیوں پر حکومت ہے، روپے چاہے نہ جمع ہوتے ہوں، پر سکھ تو سبھی طرح کا ملتا ہے۔ روپیہ لے کر آدمی اور کیا کرتا ہے؟''

''تو تمہاری سمجھ میں اور وہ برابر ہیں؟''

''بھگوان نے تو سب کو برابر ہی بنایا ہے۔''

''ہپ بات نہیں ہے بیٹا، چھوٹے بڑے بھگوان کے گھر سے بن کر آتے ہیں۔ دھن بڑی تپسیا سے ملتا ہے۔ انہوں نے پہلے جنم میں جیسا کام کیا' اس کا سکھ اٹھا رہے ہیں۔ ہم نے کچھ نہیں جمع کیا تو ملے کیا؟''

''یہ سب من کو سمجھانے کی باتیں ہیں، بھگوان سب کو برابر بناتے ہیں، یہاں جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے وہ چھوٹوں کو کچل کر بڑا بن جاتا ہے۔''

''یہ تمہارا بھرم ہے۔ مالک آج کل بھی نت چار گھنٹے بھگوان کا بھجن کرتے ہیں۔''

''کس کے بل پر یہ بھجن اور دان دھرم ہوتا ہے؟''

''آپنے بل پر۔''

''نہیں۔ کسانوں کے بل پر اور مجروں (مزدوروں) کے بل پر! یہ پاپ کا دھن پچے کیسے؟ اسی لیے دان ہمیں کوئی دونوں جون کھانے کو دے تو ہم آٹھوں پہر بھگوان کا بھجن ہی کرتے رہیں۔ ایک دن کھیت میں اوکھ گوڑنا پڑے تو ساری بھگتی بھول جائے۔''

ہوری نے ہا کر کہا۔ ''اب تمہارے منہ کون لگے بھائی؟ تم تو بھگوان کی لیلا میں بھی ٹانگ اڑاتے ہو۔''

تیسرے پہر گوبر کدال لے کر چلا تو ہوری نے کہا۔ ''جرا (ذرا) ٹھہر جاؤ بیٹا، ہم بھی چلتے ہیں تب تک تھوڑا بھوسہ نکال کر رکھے دو۔ میں نے بھولا کو دینے کے لیے کہا ہے۔ بیچارہ آج کل بہت تنگ ہے؟''

گوبر نے عدول حکمی کے انداز سے دیکھ کر کہا۔ ''اب ہمارے پاس بیچنے کو بھوسہ نہیں ہے۔''

''بیچتا نہیں ہوں بھائی، یوں ہی دے رہا ہوں۔ وہ سنکٹ (مصیبت) میں ہے۔ اس کی مدد تو کرنی ہی پڑے گی۔''

''ہمیں تو اس نے کبھی ایک گائے نہیں دے دی۔''

دھنیا مٹک کر بولی۔ ''گائے نہیں وہ تو وہ دے رہا تھا! انہیں گائے دے دے گا! آنکھیں آنجنے بھر کو کبھی دودھ تو بھیجا نہیں، گائے دے دے گا! بڑا دینے والا!''

ہوری نے قسم کھائی۔ ''نہیں جوانی کسم (قسم) اپنی بچھائیں گائے دے رہے تھے۔ ہاتھ تنگ ہے، بھوسہ چارہ نہیں رکھ سکے۔ اب ایک گائے بیچ کر بھوسہ لینا چاہتے تھے۔ میں نے سوچا سنکٹ میں پڑے آدمی کی گائے کیا لوں۔ تھوڑا سے بھوسہ دیئے دیتا ہوں۔ کچھ روپے ہاتھ آجائیں گے تو گائے لے لوں گا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے چکا دوں گا۔ ے کی ہے مگر ایسی کہ آدمی دیکھتا رہے۔''

گوبر نے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''تمہاری یہی دھرماتما پن تو تمہاری درگت کر رہا ہے۔ سا پھ (صاف) تو بات ہے۔ اسی روپے کی گائے ہے، ہم سے بیس کا بھوسہ

لے لیں اور گائے دے دیں۔ ساٹھ رہ جائیں گے۔ وہ ہم دھیرے دھیرے دے دیں گے۔''

ہوری رازدارانہ طور پر مسکرایا۔ ''میں نے ایسی چال سوچی ہے کہ گائے یوں ہی ہاتھ آ جائے۔ کہیں بھولا کا بیاہ ٹھیک کرنا ہے۔ بس دو چار من بھوسہ تو اپنا رنگ جمانے بھر کو دیتا ہوں۔''

گوبر نے حقارت سے کہا۔ ''تو تم اب سب کا بیاہ ٹھیک کرتے پھرو گے؟''

دھنیا نے تیکھی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''اب یہی ایک کام تو رہ ہی گیا ہے، نہیں دینا ہے ہمیں بھوسہ کسی کو۔ یہاں بھولی بھولا کسی کا ادھار نہیں کھایا ہے۔''

ہوری نے اپنی صفائی دی۔ ''اگر میری تدبیر سے کسی کا گھر بس جائے تو کون سی برائی ہے۔''

گوبر نے چلم اٹھائی اور آگ لینے چلا گیا۔ اسے یہ جھمیلا بالکل پسند نہ تھا۔

دھنیا نے سر ہلا کر کہا۔ ''جو ان کا گھر بسائے گا وہ اسی روپے کی گائے لے کر چپ نہ ہوگا، ایک تھیلی گنوائے گا۔''

ہوری نے پچاڑ دیا۔ ''یہ میں جانتا ہوں لیکن اس کی بھل منسی کو بھی تو دیکھو کہ مجھ سے جب ملتا ہے تیرا ہی بکھان کرتا ہے۔ ایسی لچھی ہے، ایسے سلیکے دار (سلیقے دار)۔''

دھنیا کے چہرے پر آب آ گئی۔ ''میں ان کے بکھان کی بھوکی نہیں۔ وہ اپنا بکھان دھرے رہیں۔''

ہوری نے محبت کی مسکراہٹ سے کہا۔ ''میں نے تو کہہ دیا کہ بھیا وہ ناک پر

مکھی بھی بیٹھنے نہیں دیتی، گالیوں سے تو بات کرتی ہے، پھر وہ یہی کہے جائے کہ عورت نہیں لچھمی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کے گھر والی بڑے کڑے سبھاؤ کی تھی۔ بیچارہ اس کے ڈر سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ کہتا تھا کہ جس دن تمہاری گھر والی کا منہ تڑکے دیکھ لیتا ہوں، اس دن کچھ نہ کچھ جرو (ضرور) ہاتھ لگتا ہے۔ میں نے کہا تمہارے ہاتھ لگتا ہوگا، یہاں تو روج دیکھتے ہیں، پر کبھی پیسے سے بھینٹ نہیں ہوتی۔''

''تمہارے بھاگ ہی کھوٹے ہیں تو میں کیا کروں۔''

''لگا اپنی عورت کی برائی کرنے کہ بھکاری کو بھیک تک نہ دیتی تھی، جھاڑو مارنے دوڑتی تھی، لالچن ایسی کہ نمک تک اوروں کے گھر سے مانگ لاتی تھی۔''

''مرنے پر کسی کی کیا برائی کروں، مجھے دیکھ کر جل جاتی تھی۔''

''بھولا گمکھور (غمخوار) تھا کہ اس کے ساتھ نباہ کیا اور رہوتا تو بس کھا کر مر جاتا۔ مجھ سے دس سال بڑے ہوں گے بھولا، پر رام رام پہلے ہی کرتے ہیں۔''

''تو کیا کہتے تھے کہ جس دن تمہارے گھر والی کا منہ دیکھ لیتا ہوں تو کیا ہوتا ہے؟''

''اس دن بھگوان کہیں نہ کہیں سے کچھ بھیج دیتے ہیں۔''

''بہوئیں بھی تو ویسی ہی چٹوری آئی ہیں۔ اب کی سبوں نے دو روپے کے کھربوجے (خربوزے) ادھار کھا ڈالے۔ ادھار مل جائے تو انہیں چنتا (فکر) نہیں ہوتی کہ دینا بھی پڑے گا یا نہیں۔''

''اور بھولا روتے کاہے کو ہیں۔''

گوبر آ کر بولا۔ ''بھولا دادا آ گئے، من دو من بھوسہ ہے، سوانہیں دے دو، پھر ان کا بیاہ کھوجنے نکلو۔''

دھنیا نے سمجھایا ''آدوارے پر بیٹھا ہے۔ اس کے لیے کھاٹ واٹ تو ڈال نہیں دی۔ اوپر سے لگے بھنبھنانے، کچھ تو بھلمنسی سیکھو، کلسا لے جاؤ، پانی بھر کر رکھ دو، ہاتھ منہ دھوئیں، کچھ شربت پانی کرا دو۔ مصیبت ہی میں تو آدمی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔''

ہوری بولا۔ ''شربت وربت کا کام نہیں، کون کوئی مہمان ہیں۔''

دھنیا نے بگڑ کر کہا۔ ''مہمان اور کیسے ہوتے ہیں؟ روج روج (روز روز) تمہارے دوارے پر نہیں آتے۔ اتنی دور سے دھوپ گھام میں آئے ہیں، پیاس لگی ہی ہوگی رو پیا! دیکھ ڈبے میں تماکھو (تمباکو) ہے کہ نہیں، گوبر کے مارے کاہے کو بچی ہوگی، دوڑ کر ایک پیسے کا تماکھو سیٹھانی کی دکان سے لے لے۔''

ہوری جب بھولا کا کھانچا اٹھا کر بھوسہ لانے اندر گیا تو دھنیا بھی پیچھے پیچھے چلی۔ ہوری نے کہا۔ ''نجانے کہاں سے اتنا بڑا کھانچا مل گیا۔ کسی بھڑ بھونجے سے مانگ لایا ہوگا۔ من بھر سے کم میں نہ بھرے گا۔ دو کھانچے دیئے تو دو من بھوسہ نکل جائے گا۔''

دھنیا خوش تھی، ملامت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''یا تو کسی کو نیوتہ نہ دو اور دو تو بھر پیٹ کھلاؤ۔ تمہارے پاس پان پھول لینے تھوڑے آئے ہیں کہ ٹوکری لے کر چلتے، دیتے ہی ہو تو تین کھانچے دے دو۔ بھلا آدمی اپنے لڑکوں کو کیوں نہیں لایا؟ اکیلا کہاں تک ڈھوئے گا۔ جان نکل جائے گی۔''

''تین کھانچے تو میرے دیئے نہ دیئے جائیں گے۔''

''تب کیا ایک کھانچا دے کر ٹالو گے؟ گوبر سے کہہ دو کہ اپنا کھانچا بھر کر ان کے ساتھ چلا جائے۔''

''گوبر اوکھ گوڑنے جا رہا ہے۔''

''ایک دن نہ گوڑنے سے اوکھ نہ سوکھ جائے گی۔''

''یہ تو ان کا کام تھا کہ کسی کو اپنے ساتھ لاتے۔ بھگوان کے دیئے دو دو بیٹے ہیں۔''

''نہ ہوں گے گھر پر، دودھ لے کر ہاٹ گئے ہوں گے۔''

''یہ تو اچھی دل لگی ہے کہ اپنا مال بھی دو اور اسے گھر تک پہنچا بھی دو۔ لاد دے، لدا دے اور لادنے والا ساتھ کر دے۔''

''اچھا بھائی کوئی مت جائے، میں پہنچا دوں گی، بڑوں کی سیوا کرنے میں لاج نہیں ہے۔''

''اور تین کھانچے انہیں دے دوں تو اپنے بیل کیا کھائیں گے۔؟''

''یہ تو سب نیوتا دینے سے پہلے ہی سوچ لینا تھا۔ نہ ہو تو تم اور گوبر دونوں چلے جاؤ۔''

''مروت ہمروت کی طرح کی جاتی ہے، اپنا گھر اٹھا کر نہیں دے دیا جاتا۔''

''ابھی جمیند (زمیندار) کا پیادہ آ جائے تو اپنے سر پر بھوسہ لاد کر پہنچاؤ گے، تم، تمہارا لڑکا اور لڑکی سب اور وہاں سایت (شاید) من دو من لکڑی بھی چیرنی پڑے۔''

''جمندار کی بات اور ہے۔''

''ہاں وہ ڈنڈے کے بل کام لیتا ہے نا۔''

''اس کے کھیت نہیں جوتتے؟''

''کھیت جوتتے ہیں تو لگان نہیں دیتے ہیں؟''

''اچھا بھائی، جان نہ کھا، ہم دونوں چلے جائیں گے۔ کہاں سے انہیں میں نے بھوسہ دینے کہ کہہ بھی دیا۔ یا تو چلے ہی گی نہیں اور اگر چلے گی تو دوڑنے لگے گی۔''

تینوں کھانچے بھوسے سے بھر دیئے گئے۔ گوبر کڑھ رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کے برتاؤ پر ذرا بھی اعتبار نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ جہاں جاتے ہیں وہیں کچھ نہ کچھ گھر سے دے آتے ہیں۔ دھنیا خوش تھی، رہا ہوری، وہ دھرم اور سوارتھ کے بیچ میں ڈوبتا اترتا جا رہا تھا۔

ہوری اور گوبر مل کر ایک کھانچا باہر لائے۔ بھولا نے فوراً اپنے انگوچھے کی گنڈلی بنا کر سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے رکھ کر ابھی آتا ہوں، ایک کھانچا اور لوں گا۔''

ہوری بولا۔ ''ایک نہیں ابھی دو اور بھرے دھرے ہیں۔ اب تمہیں نہ آنا پڑے گا۔ میں اور گوبر ایک کھانچا لے کر تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں۔''

بھولا متحیر ہو گیا۔ اسے ہوری اپنا بھائی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر معلوم ہوا۔ اسے اپنے دل میں ایک ایسی آسودگی کا احساس ہوا جس نے اس کی پوری زندگی کو تر و تازہ کر دیا۔

تینوں بھس لے کر چلے تو راہ میں باتیں ہونے لگیں۔

بھولا نے پوچھا۔ ''دسہرہ آ رہا ہے۔ مالکوں کے یہاں تو بڑ دھوم دھام ہوگی؟''

''ہاں تنبو، سامیانا گڑ گیا ہے۔ اب کی رام لیلا میں میں بھی کام کروں گا۔ رائے صاحب نے کہا ہے کہ مجھے راجہ جنک کا مالی بننا پڑے گا۔''

''مالک تم سے بہت کھس (خوش) ہیں۔''

''ان کی دیا ہے۔''

ایک لمحے کے بعد بھولا نے پھر پوچھا۔ ''سگن (شگون) کرنے کے لیے روپروں کا کچھ بندوبست کرلیا ہے؟ مالی بن جانے سے تو گلا نہ چھوٹے گا۔''

ہوری نے منہ کا پسینہ پوچھ کر کہا۔ ''اسی کی چنتا تو مارے ڈالتی ہے دادا، اناج تو سب کا سب کھلیان میں تل گیا۔ جمیندار نے اپنا لیا، مہاجن نے پنالیا، میرے لیے پانچ سیر اناج بچ رہا۔ یہ بھوسہ تو میں نے راتوں رات ڈھوکر چھپا دیا تھا، نہیں تو تنکا نہ بچتا۔ جمیندار کے بھی آدھے روپے دینے سے رہ گئے۔ سیٹھانی سے پھر روپے ادھار لیے تو کلام چلا۔ سب طرح کپھایت (کفایت) کرکے دیکھ لیا بھیا، کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارا جنم اسی لیے ہوا ہے کہ اپنا لوہو (لہو) بہا دیں اور بڑوں کا گھر بھریں۔ اصل کا دوگنا سود چکا پر اصل جیسی کی تیسی سر پر سوار ہے۔ لوگ کہتے ہیں سر دی گرمی میں تیرتھ برت میں ہاتھ باندھ کر خرچ کرو، لیکن راستہ کوئی نہیں دکھاتا۔ رائے صاحب نے بیٹے کے بیاہ میں بیس ہزار لگائے۔ ان سے کوئی کچھ نہیں پوچھتا۔ منگرو نے اپنے باپ کے کریا کرم میں پانچ ہزار لگائے۔ ان سے کوئی کچھ نہیں پوچھتا۔ ویسی ہی مرجاد تو سب کی ہے۔''

بھولا نے نرم لہجے میں کہا۔ ''بڑے آدمیوں کی برابری تم کیسے کر سکتے ہو بھائی؟''

''آدمی تو ہم بھی ہیں۔''

''کون کہتا ہے کہ ہم تم آدمی ہیں۔ ہم میں آدمیت کہاں؟ آدمی وہ ہے جس کے پاس دھن ہے، اکھتیار (اختیار) ہے، الم (علم) ہے۔ ہم لوگ تو بیل ہیں اور جتنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس پر ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے۔ اتفاق کا نام نہیں ہے۔ ایک کسان دوسرے کے کھیت پر نہ چڑھے تو کوئی جفا کیسے کرے، محبت تو دنیا سے اٹھ گئی۔''

بوڑھوں کے لیے ماضی کے عیش اور حال کی تکالیف اور مستقبل کی خرابی سے زیادہ دلچسپ اور کوئی موضوع نہیں ہوتا۔ دونوں دوست اپنے دکھڑے روتے رہے۔ بھولا نے اپنے بیٹوں کے کرتوت سنائے، ہوری نے اپنے بھائیوں کا رونا رویا اور تب ایک کنویں پر بوجھ رکھ کر پانی پینے کے لیے بیٹھ گئے۔ گوبر نے بنئے سے لوٹا مانگا اور پانی کھینچنے لگا۔

بھولا نے اپنائیت سے پوچھا۔ ''علیحدگی کے وقت تو تمہیں بڑا رنگ ہوا ہوگا۔ بھائیوں کو تو تم نے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔''

ہوری غمگین لہجہ میں بولا۔ ''کچھ نہ پوچھو دادا، یہی جی چاہتا تھا کہ کہیں جا کے ڈوب مروں۔ میرے جیتے جی سب کچھ ہو گیا۔ جن کے پیچھے اپنی جوانی دھول میں ملا دی، وہی میرے دشمن ہو گئے اور جھگڑے کی جڑ کیا تھی؟ یہی کے میری گھر والی ہار میں کام کرنے کیوں نہیں جاتی۔ پوچھو، گھر دیکھنے والا بھی کوئی چاہیے کہ نہیں۔

لینا دینا، رکھنا اٹھانا، یہ کون کرے؟ پھر وہ گھر میں بیٹھی تو نہیں رہتی تھی۔ جھاڑو، رسوئی، چوکا برتن، لڑکوں کی دیکھ بھال۔ یہ کوئی تھوڑا کام ہے۔۔۔ سو ما کی عورت گھر سنبھال لیتی نہ ہیرا کی عورت میں یہ سلیقہ تھا۔ جب سے علیحدگی ہوئی ہے دونوں گھروں میں ایک جون کی روٹی پکتی ہے۔ نہیں سب کو دن میں چار بار بھوک لگتی تھی۔ اب کھائیں چار دفعہ تو دیکھوں۔ اس مالک پن میں گوبر کی ماں کی جو درگت ہوئی ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ بیچاری اپنی دیورانیوں کے پھٹے پرانے کپڑے پہن کر دن کاٹتی تھی۔ خود بھوکی سو رہی ہوگی لیکن بہوؤں کے لیے جل پان کا دھیان رکھتی تھی۔ اپنے جسم پر گہنے کے نام پر کچا دھاگا بھی نہ تھا۔ دیورانیوں کے لیے دو دو چار چار گہنے بنوا دیئے۔ سونے کے نہ سہی، چاندی کے تو ہیں۔ جلن یہی تھی کہ مالک کیوں ہے۔ بہت اچھا ہوا کہ الگ ہو گئے۔ میرے سر سے بلا ٹلی۔''

بھولا نے ایک لوٹا پانی چڑھا کر کہا۔ ''یہی حال گھر گھر ہے بھیا! بھائیوں کی بات ہی کیا۔ یہاں تو لڑکوں سے بھی پٹتی اور پٹتی اس لیے نہیں کہ میں کسی کی کچال دیکھ کر منہ بند نہیں کر سکتا۔ تم جوا کھیلو گے، چرس پیو گے، گانجے کے دم لگاؤ گے مگر آئے کس کے گھر سے؟ خرچہ کرنا چاہتے ہو تو کماؤ، مگر کمائی تو کسی سے نہ ہوگی، خرچ دل کھول کر کریں گے۔ بڑا کا متا سودا لے کر بازار جائے گا تو آدھے پیسے غائب۔ پوچھو تو کوئی جواب نہیں۔ چھوٹا جنگلی ہے۔ وہ سنگت کے پیچھے متوالا رہتا ہے۔ شام ہوئی اور ڈھول مجیرہ لے کر بیٹھ گئے۔ سنگت کو میں برا نہیں کہتا۔ گانا بجانا عیب نہیں۔ لیکن یہ سب کام فرصت کے ہیں۔ یہ نہیں کہ گھر کا کوئی کام نہ کرو۔ آٹھوں پہر اسی دھن میں پڑے رہو۔ جاتی ہے میرے سر، سانی پانی میں کروں،

گائے بھینس میں دھوں، دودھ لے کر بازار جاؤں۔ یہ گرہستی جی کا جنجال ہے۔ سونے کی ہنسیا، جسے نہ اگلتے بنتا ہے نہ نگلتے۔ لڑکی ہے جھنیا، وہ بھی نصیب کی کھوٹی۔ تم تو اس کی سگائی میں آئے تھے۔ کتنا اچھا گھر بار تھا۔ اس کا آدمی بمبئی میں دودھ کی دکان کرتا تھا۔ ان دنوں وہاں ہندو مسلمان فساد ہوا تو کسی نے اس کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا۔ گھر ہی چوپٹ ہو گیا۔ وہاں اب اس کا نباہ نہیں۔ جا کر لے آیا کہ دوسری سگائی کر دوں گا مگر وہ راضی نہیں ہوتی اور دونوں بھاوجیں ہیں کہ رات دن اسے جلاتی رہتی ہیں۔ گھر میں مہا بھارت مچا رہتا ہے۔ مصیبت کی ماری یہاں آئی۔ یہاں بھی چین نہیں۔''

انہی دکھڑوں میں راستہ کٹ گیا۔ بھولا کا پرواتھا تو چھوٹا مگر بہت گلزار۔ زیادہ تر ہیر ہی بستے تھے اور کسانوں کو دیکھتے ان کی حالت بہت بری نہ تھی۔ بھولا سی گاؤں کا مکھیا تھا۔ دروازہ پر بڑی چرنی تھی جس پر دس بارہ گائیں بھینسیں کھڑی سانی کھا رہی تھیں۔ اندر ایک بڑا سا تخت پڑا تھا جو شاید سدا آدمیوں سے بھی نہ اٹھتا۔ کسی کھونٹی پر ڈھولک لٹک رہی تھی۔ کسی پر مجیرہ۔ ایک طاق پر کوئی کتاب بستے میں لپٹی رکھی تھی، جو شاید رامائن ہو۔ دونوں بہوئیں سامنے بیٹھی گوبر تھاپ رہی تھیں اور جھنیا چوکھٹ پر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں لال تھیں اور ناک کے سرے پر بھی سرخی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی رو کر اٹھی ہے۔ اس کے جسم سے بھرپور جوانی جھلک کر لہریں مار رہی تھی۔ منہ بڑا اور گول تھا۔ رخسار پھولے ہوئے، آنکھیں چھوٹی اور اندر دھنسی ہوئی، ماتھا پتلا، پر سینے کا ابھار اور جسم کا وہی گدگدا پن آنکھوں کو کھینچتا تھا۔ اس پر چھپی ہوئی گلابی ساڑھی اسے اور بھی خوبصورت بنا رہی تھی۔

بھولا کو دیکھتے ہی اس نے لپک کر ان کے سر سے کھانچہ اتروایا۔ بھولا نے گوبر اور ہوری کے کھانچے اتروائے اور جھنیا سے بولے۔ ''پہلے ایک چلم بھر لا، پھر تھوڑا سا رس بنا لے۔ پانی نہ ہو تو گگرالا، میں کھینچ دوں گا۔ ہوری مہتو کو پہنچانتی ہے نا؟''

پھر ہوری سے بولا۔ ''گھر والی کے بنا گھر نہیں رہتا بھیا۔ پرانی کہاوت ہے ''ناٹن کھیتی بہورین گھر۔'' ناٹے بیل کیا کھیتی کریں گے اور بہوئیں کیا گھر سنبھالیں گی۔ جب سے اس کی ماں مری ہے، جیسے گھر کی برکت ہی اٹھ گئی۔ بہوئیں آٹا پا تھ لیتی ہیں پر گرہستی چلانا کیا جانیں۔ ہاں منہ چلانا خوب جانتی ہیں۔ لونڈے کہیں پھڑ پر جمے ہوں گے۔ سب کے سب کاہل ہیں کام چور۔ جب تک جیتا ہوں ان کے پیچھے مرتا ہوں۔ مر جاؤں گا تو آپ سر پر ہاتھ رکھ کر روئیں گے۔ لڑکی بھی ویسی ہی ہے۔ چھوٹا سا اڑھنا بھی کرے گی تو بھن بھنا کر۔ میں تو سہہ لیتا ہوں، خصم تھوڑے ہی سہے گا۔''

جھنیا ایک ہاتھ میں بھری چلم، دوسرے میں لوٹا بھر ارس لیے بڑی پھرتی سے آ پہنچی۔ پھر رسی اور کلسا لے کر پانی بھرنے چلی، گوبر نے اس کے ہاتھ سے کلسا لینے کے لیے ہاتھ بڑھا کر جھینپتے ہوئے کہا۔ ''تم رہنے دو، میں بھی کسی نے نہ دیا۔''

''مہمان کاہے سے ہو گیا، تمہارا پڑوسی ہی تو ہوں۔''

''پڑوسی سال بھر میں ایک بار بھی صورت نہ دکھاوے تو مہمان ہی ہے۔''

''روج روج (روز روز) آنے تو مرجاد بھی نہیں رہتی۔''

جھنیا ہنس کر ترچھی نگاہوں سے تاکتی ہوئی بولی۔ ''وہی مرجاد تو دے رہی ہوں مہینے میں ایک بار آؤ گے تو ٹھنڈا پانی دوں گی، پندرھویں دن آؤ گے تو چلم پاؤ گے،

ساتویں دن آؤ گے تو بیٹھنے کو ماچی دوں گی، روج روج آؤ گے تو کچھ نہ پاؤ گے۔''

''درسن تو دوں گی؟''

''درسن کے لیے پوجا کرنی پڑے گی۔''

یہ کہتے کہتے جیسے اسے کوئی بھولی بات یاد آ گئی، اس کا چہرا اداس ہو گیا، وہ بدھوا ہے۔ اس کے استری پن (نسائیت) کی دہلیز پر پہلے اس کا شوہر محافظ بنا بیٹھا رہتا تھا اور وہ بےفکر تھی۔ اب اس کا کوئی نگہبان نہ تھا اس لیے وہ دروازے کو سدا بند تکھتی ہے۔ کبھی کبھی گھر کے سونے پن سے اکتا کر وہ دروازہ کھولتی ہے مگر کسی کو آتا دیکھ کر خوف سے دونوں کواڑ پھر بند کر دیتی ہے۔

گوبر نے کلسا بھر کر نکالا، سب نے شربت پیا اور ایک چلم تمباکو پی کر لوٹ پڑے۔ بھولا نے کہا۔ ''کل تم آ کر گائے لے جانا گوبر، اس سے تو سانی کھا رہی ہے۔''

گوبر کی آنکھیں اسی گائے پر لگی ہوئی تھیں اور وہ دل ہی دل میں مست ہوا جاتا تھا۔ گائے اتنی اچھی اور رسڈول ہے، اس کا اسے سان وگمان بھی نہ تھا۔

ہوری نے لالچ روک کر کہا۔ ''منگوالوں گا، جلدی کیا ہے؟''

''تمہیں جلدی نہ ہو، ہمیں تو جلدی ہے۔ اسے دوارے پر دیکھ کر تمہیں وہ بات یاد رہے گی۔''

''اس کی مجھے بڑی پھکر ہے دادا۔''

''تو کل گوبر کو بھیج دینا۔''

دونوں نے اپنے کھانچے سر پر رکھے اور روانہ ہوئے۔ دونوں اتنے خوش تھے

گویا بیاہ کر کے لوٹے ہوں۔ ہوری کو تو اپنی دیرینہ خواہش کے پوری ہونے کی خوشی تھی اور وہ بھی بلا پیسے کے! گوبر کو اس سے بھی زیادہ قیمتی چیز مل گئی تھی۔ اس کے دل میں بھی سوئی تمنا جاگ اٹھی تھی۔

موقع پا کر اس نے پیچھے کی طرف دیکھا۔ جھنیا دروازے پر کھڑی تھی۔ امید کی مستی میں بے صبر اور بے قرار!

(4)

ہوری کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ نیم کے پیڑ تلے اپنی بانس کی چارپائی پر بڑا بار بار تاروں کی طرف دیکھتا تھا۔ گائے کے لیے ایک نا ند گاڑنی ہے۔ اس کی نا ند بیلوں سے الگ رہے تو اچھا ہو۔ ابھی تو رات باہر ہی رہے گی، لیکن چوما میں اس کے لیے کوئی دوسری جگہ ٹھیک کرنا ہوگی۔ باہر لوگ نظر لگا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ٹونا ٹوٹکا کر دیتے ہیں کہ گائے کا دودھ ہی سوکھ جاتا ہے۔ تھن میں ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی، لات مارتی ہے۔ نہیں، باہر باندھنا ٹھیک نہیں اور باہر نا ند ہی کون گاڑنے دے گا؟ کارندہ صاحب نجر (نذر) کے لیے منہ پھلائیں گے، چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے رائے صاحب کے پاس پھر یاد (فریاد) لے کر جانا تو ٹھیک نہیں اور کارندے کے آگے میری سنتا ہی کون ہے؟ ان سے کچھ کہوں تو کارندہ بیری بن جاتا ہے، پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کرنا نادانی ہے۔ اندر ہی باندھوں گا۔ آنگن ہے تو چھوٹا پر ایک جھونپڑی ڈال لینے سے کام چل جائے گا۔ ابھی پہلا ہی بیانا

ہے۔ پانچ سیر سے کم دودھ نہ دے گی۔ سیر بھر تو گوبر ہی کو چاہیے۔ روپیا دودھ دیکھ کر کیسی للچاتی رہتی ہے، اب پئے جتنا چاہے! کبھی کبھی دو چار سیر مالکوں کو بھی دے آیا کروں گا۔ کارندہ صاحب کی پوجا بھی کرنی ہی ہوگی اور بھولا کے روپے بھی دے دینا چاہئیں۔ گائی کے ڈھکوسلے میں اسے کیوں ڈالوں؟ جو آدمی اپنے اوپر بسواس کرے اسے دھوکا دینا نیچوں کا کام ہے۔ اسی روپے کا گائے میرے بسواس پر دے دی ہے، نہیں یہاں تو کوئی ایک پیسے کو نہیں پیتا تا۔ سن میں کیا کچھ نہ ملے گا؟ اگر پچیس روپے بھی دے دوں تو بھولا کو ڈھارس ہو جائے۔ دھنیا سے ناحق (ناحق) بتلا دیا' چپکے سے گائے لا کر باندھ دیتا تو چکرا جاتی۔ لگتی پوچھنے کے کس کی گائے ہے، کہاں سے لائے ہو؟ کھوب (خوب) دک (دق) کر کے بتاتا، پر جب پیٹ میں بات پچے بھی۔ کبھی دو چار پیسے اوپر سے آجاتے ہیں۔ انہیں بھی نہیں چھپا سکتا اور یہ اچھا بھی ہے۔ اسے گھر کی چنتا رہتی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ان کے پاس بھی پیسے رہتے ہیں تو پھر نکھرے (نخرے) بگھارنے لگے۔ گوبر کچھ آلسی ہے، نہیں تو گئو کی ایسی سیوا کرتا جیسی چاہیے۔ آلسی والسی کچھ نہیں ہے، اس عمر میں کون آلسی نہیں ہوتا؟ میں بھی دادا کے سامنے مٹر گشتی کیا کرتا تھا، بیچارے پہر رات سے کربی لگتے، کبھی دوارے پر جھاڑو لگاتے، کبھی کھیت میں کھاد ڈالتے، میں پڑا سوتا رہتا، کبھی جگا دیتے تو میں بگڑ جاتا اور گھر چھوڑ کر بھاگ جانے کی دھمکی دیتا۔ لڑکے جب اپنے ماں باپ کے سامنے بھی جندگی (زندگی) کا تھوڑا سا سکھ نہ پائیں گے تو پھر جب اپنے سر پر پڑ گئی تو کیا پائیں گے؟ دادا کے مرتے ہی کیا میں نے گھر نہیں سنبھال لیا؟ سارا گاؤں یہی کہتا تھا کہ ہوری گھر بگاڑ

دے گا۔لیکن سر پر بوجھ پڑتے ہی میں نے گھر نہیں سنبھال لیا؟ سارا گاؤں یہی کہتا تھا کہ ہوری گھر بگاڑ دے گا۔لیکن سر پر بوجھ پڑتے ہی میں نے ایسا چولا بدلا کہ لوگ دیکھتے رہ گئے۔سوبھا اور ہیرا الگ ہی ہو گئے،نہیں آج اس گھر کی اور بات ہوتی۔تین ہل ایک ساتھ چلتے تھے،اب تینوں الگ الگ چلتے ہیں۔سب سے کا پھیر ہے۔دھنیا کو کیا دوکھ تھا؟ بیچاری جب سے گھر میں آئی کبھی تو چین سے نہ بیٹھی،ڈولی سے اترتے ہی سارا کام سر پر اٹھالیا۔اماں کو پان کی طرح پھیرتی رہتی تھی،جس نے گھر کے پیچھے اپنے کو مٹا دیا وہ اگر دیورانیوں سے کام کرنے کو کہتی تھی تو کیا برا کرتی تھی؟ آخر اسے بھی تو کچھ آرام ملنا چاہیے۔پر بھاگ میں آرام لکھا ہوتا تب تو ملتا۔تب دیورانیوں کے لیے مرتی تھی،اب اپنے بچوں کے لیے مرتی ہے۔وہ اتنی سیدھی،گمکھور (غمخوار) بے چھل کپٹ کی نہ ہوتی تو آج سوبھا اور ہیرا جو مونچھوں پر تاؤ دیتے پھرتے ہیں،کہیں بھیک مانگتے ہوتے۔آدمی کتنا مطلبی ہوتا ہے!جس کے لیے مرو،وہی بیری بن جاتا ہے۔ہوری نے پھر پورب کی طرف دیکھا۔سایت (شاید) سیرا (سویرا) ہو رہا ہے۔گوبر کا ہے کو جا گنے لگا؟نہیں،کہہ کے تو یہی سویا تھا کہ منہ اندھیرے ہی چلا جاؤں گا۔جا کر ناند تو گاڑ ہی دوں،پر نہیں۔جب تک گائے نہ آجائے،ناند گاڑنا ٹھیک نہیں۔کہیں بھولا بدل گیا یا اور کسی کارن سے گائے نہ دی تو سارا گاؤں ہنسے گا کہ چلے تھے گائے لینے!چٹھے نے اتنی پھرتی سے ناند گاڑ دی جیسے اسی کی کسر تھی!بھولا ہے تو اپنے گھر کا مالک،پر جب لڑکے سیانے ہو گئے تو باپ کی کہاں چلتی ہے؟ کامتا اور جنگی اکڑ جائیں تو کیا بھولا اپنے من سے گائے دے دیں گے؟ کبھی نہیں۔

یکا یک گوبر چونک کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا بولا۔ ''ارے یہ تو بھور ہو گیا، تم نے ناند گاڑ دی دادا؟''

ہوری گوبر کے گٹھے ہوئے بدن اور چوڑے سینے کی طرف غرور سے دیکھ کر اور دل میں یہ سوچتے ہوئے کہ اگر اسے کہیں دودھ گھی ملتا تو کیسا پٹھا ہو جاتا، بولا۔

''نہیں ابھی نہیں گاڑی، سوچا کہ کہیں نہ ملے تو ناحک (ناحق) بھدہو۔''

گوبر نے تیوری چڑھا کر ''ملے گی کیوں نہیں؟''

''ان کے من میں کوئی چور بیٹھ جائے تو؟''

''چور بیٹھے یا ڈاکو، گائے تو انہیں دینی ہی پڑے گی۔''

گوبر نے اور کچھ نہ کہا، لاٹھی کندھے پر رکھی اور چل دیا۔

ہوری اسے جاتا ہوا دیکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا رہا۔ اب لڑکے کی سگائی میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ سترھواں سال لگ گیا، پر کریں کیسے؟ کہیں پیسے کے بھی درسن ہوں۔ جب سے تینوں بھائیوں میں الگاوا ہو گیا، گھر کی ساکھ جاتی رہی، مہتو لڑکا دیکھنے آتے ہیں پر گھر کی دسا دیکھ کر منہ پھیکا کر کے چلے جاتے ہیں۔ دو ایک راجی (راضی) بھی ہوئے تو روپے مانگتے ہیں۔ دو تین سو لڑکی کا دام چکائے اور اتنا ہی اوپر سے کھرچ (خرچ) کرے، تب جا کر بیاہ ہو۔ کہاں سے آویں اتنے روپے؟ فصل کھلیان میں تل جاتی ہے، کھانے بھر کو بھی نہیں بچتا، بیاہ کہاں سے ہو؟ اور اب تو سونا بیاہنے لایک (لایق) ہو گئی ہے۔ لڑکے کا بیاہ نہ ہوا نہ سہی، لڑکی کا بیاہ نہ ہوا تو ساری برداری میں ہنسی ہو گی۔ پہلے تو اسی کی سگائی کرنی ہے، پیچھے دیکھا جائے گا۔

ایک آدمی نے رام رام کیا اور پوچھا۔ ''تمہاری کوٹھی میں کچھ بانس ہوں گے مہتو؟''

ہوری نے دیکھا، دھڑی بانس والا سامنے کھڑا ہے۔ ناتا، کالا، خوب موٹا، چوڑا منہ، بڑی بڑی مونچھیں، سرخ سرخ آنکھیں، کمر میں بانس کاٹنے کی کٹار کھونسے ہوئے۔ سال میں ایک دو بار آ کر چقیں، کرسیاں، مونڈھے، ٹوکریاں وغیرہ بنانے کے لیے کچھ بانس کاٹ کر لے جاتا تھا۔

ہوری خوش ہو گیا۔ مٹھی گرم ہونے کی کچھ آس بندھی۔ چودھری کو لے جا کر تین کوٹھیاں دکھائیں، مول بھاؤ کیا اور پچیس روپے سینکڑے میں میں پانچ بانسوں کا بیعانہ لے کر، پھر دونوں لوٹے۔ ہوری نے اسے چلم پلائی، ناشتہ کرایا اور تب رمز کے لہجے میں بولا۔ ''میرے بانس کبھی تیس روپے سے کم میں نہیں جاتے مگر تم گھر کے آدمی ہو، تم سے کیا بھاؤ تاؤ کرنا؟ تمہارا وہ لڑکا جس کی سگائی ہوئی تھی.... ابھی پردیس سے لوٹا کہ نہیں.....؟''

چودھری نے چلم کا دم لگا کر کھانستے ہوئے کہا۔ ''اس لونڈے کے پیچھے تو مرمٹا تھا ہو۔ جوان عورت گھر میں بیٹھی تھی اور وہ برادری کی ایک دوسری عورت کے ساتھ پردیس میں موج کرنے چل دیا۔ بہو بھی دوسرے کے ساتھ نکل گئی۔ بڑی بری جات (ذات) ہے مہتو، کسی کی نہیں ہوتی۔ سمجھایا کہ تو جو چاہے کھا۔ میری ناک نہ کٹا۔ پر کون سنتا ہے؟ عورت کو بھگوان سب کچھ دے، روپ نہ دے، نہیں وہ کابو (قابو) میں نہیں رہتی..... کوٹھیاں تو بنٹ گئی ہوں گی؟''

ہوری نے آسمان کی طرف دیکھا اور گویا اس کی وسیع فضا میں اڑتا ہوا بولا۔

''سب کچھ بنٹ گیا، چودھری! جن کو لڑکوں کی طرح پالا پوسا، وہ اب برابر کے حصے دار ہیں۔ مگر بھائی کا حصہ کھانے کی نیت نہیں ہے۔ ادھر تم سے روپے ملیں گے، ادھر دونوں بھائیوں کو بانٹ دوں گا۔ چاروں کی جندگانی (اندگانی) میں کیوں کسی سے چھل کپٹ کروں؟ نہیں کہہ دوں کہ بیس روپے سینکڑے میں بیچے ہیں تو انہیں کیا پتہ چلے گا؟ تم ان سے کہنے تھوڑے ہی جاؤ گے۔ تمہیں تو میں نے برابر اپنا بھائی سمجھا ہے۔''

برتاؤ میں ہم بھائی کے معنی کا کتنا ہی بیجا استعمال کریں لیکن اس کے تصور میں جو پاکیزگی ہے، وہ ہماری سیاہ دلی سے کبھی آلودہ نہیں ہو سکتی۔

ہوری نے در پردہ یہ تجویز پیش کر کے چودھری کے منہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کچھ عاجزانہ انداز تھا، جو بھیک مانگتے وقت موئے بھکاریوں کے چہرے پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ چودھری نے ہوری کا آسن پا کر چابک جمایا۔ ''ہمارا تمہارا پرانا بھائی چارہ ہے مہتو، ایسی بات ہے بھلا۔ پر بات یہ ہے کہ آدمی ایمان بیچتا ہے تو کسی لالچ سے۔ بیس روپے، میں پندرہ کہہ دوں گا مگر جو بیس روپے دام لو تو۔''

ہوری نے کھسیا کر کہا۔ ''تم چودھری اندھیر کرتے ہو۔ بیس روپے میں کہیں ایسے بانس ملتے ہیں؟''

''ایسے کیا، اس سے اچھے بانس آتے ہیں دس روپے میں۔ ہاں دس کوس اور پچھم چلے جاؤ دام بانس کا نہیں ہے، سہر (شہر) کے پاس ہونے کا ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ جتنی دیر وہاں جانے میں لگے گی، اتنی دیر میں تو چار روپے کا کام ہو جائے

گا۔''

سودا پٹ گیا۔ چودھری نے مرضائی اتار کر چھپر پر رکھ دی اور بانس کاٹنے لگا۔ الکھ کی سینچائی ہو رہی تھی۔ ہیرا کی عورت کلیوا لے کر کنویں پر جا رہی تھی۔ چودھری کو بانس کاٹتے دیکھ کر گھونگھٹ کے اندر سے بولی ''کون بانس کاٹتا ہے۔ یہاں بانس نہ کٹیں گے۔''

چودھرنی نے ہاتھ روک کر کہا۔ ''بانس مول لیے ہیں، بندہ روپے سینکڑے کا بیعانہ ہوا ہے، سنیت میں نہیں کاٹ رہے ہیں۔''

یہ عورت اپنے گھر کی مالکہ تھی۔ اسی کی مخالفت سے بھائیوں میں علیحدگی ہوئی تھی۔ دھنیا کو شکست دے کر شیر ہو گئی تھی۔ ہیرا کبھی کبھی اس کی مرمت کر دیتا تھا۔ ابھی حال ہی میں اتنا مارا تھا کہ وہ کئی دن تک کھاٹ پر سے نہ اٹھ سکی، لیکن وہ اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ ہیرا غصے میں اسے مارتا تھا۔ مگر چلتا تھا اسی کے اشاروں، اس گھوڑے کی طرح جو کبھی کبھی مالک کو لات مار کر بھی اسی کی سواری میں چلتا ہے۔

کلیوا ٹوکری سر سے اتار کر بولی۔ ''پندرہ روپے میں ہمارے بانس نہ جائیں گے۔''

چودھری عورت ذات سے اس بارے میں چیت کرنا خلاف مصلحت سمجھتے تھے۔ بولے۔ ''جا کر اپنے آدمی کو بھیج دے، جو کچھ کہنا ہو آ کر کہیں۔''

عورت کا نام پنی تھا۔ بچے دو ہی ہوئے تھے، لیکن بدن ڈھل گیا تھا۔ بناؤ سنگار کے ذریعہ وقت کے ہاتھوں ہونے والی بربادی، مگر گرہستی میں کھانے ہی کا

ٹھکانا نہ تھا۔ سنگار کے لیے پیسے کہاں سے آتے؟ اسی مفلسی اور مجبور کر اچٹ جاتا۔

وہ قریب جا کر چودھری کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی۔ ایک منٹ تک یہی ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ آخر چودھری نے اسے زور سے دھکیل دیا۔ پنی دھکا کھا کر گر پڑی۔ مگر پھر سنبھلی اور پاؤں سے تلی نکال کر چودھری کے سر، منہ، پیٹھ پر اندھا دھند جمانے لگی۔ بانس والا ہو کر اسے دھکیل دے۔ اس کی بے عزتی تھی۔ مارتی جاتی تھی اور روتی بھی جاتی تھی۔ چودھری اسے دھکا دے کر عورت سے طاقت آزمائی کر کے ٹھیس کھا چکا تھا۔ بس کھڑے کھڑے مار کھانے کے سوا اس مصیبت سے بچنے کا اس کے پاس اور کوئی علاج نہ تھا۔ پنی کا رونا سن کر ہوری بھی دوڑا ہوا آیا۔ پنی نے اسے دیکھ کر زور زور سے چلانا شروع کیا۔ ہوری نے سمجھا کہ چودھری نے پنیا کو مارا ہے۔ خون نے جوش مارا اور وہ الگاوے اونچے بند کو توڑتا ہوا سب کچھ اپنے اندر سمیٹ لینے کے لیے باہر ابل پڑا۔ چودھری کو زور سے ایک لات جما کر بولا۔

''اب اپنا چاہتے ہو تو چودھری یہاں سے چلے جاؤ۔ نہیں تمہاری لہاس (لاش) اٹھے گی۔ تم نے اپنے کو سمجھا کیا ہے؟ تمہاری اتنی مجال کے میری بہو پر ہاتھ اٹھاؤ۔''

چودھری قسمیں کھا کھا کر اپنی صفائی دینے لگا۔ تلیوں کی چوٹ میں اس کا گنہگار دل خاموش تھا۔ یہ لات اسے بلا قصور ملی اور اس کے پھولے ہوئے گال آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ اس نے تو بہو کو چھوا بھی نہیں۔ کیا وہ اتنا گنوار ہے کہ وہ مہتوں کی عورت پر ہاتھ اٹھائے گا۔

ہوری نے کہا۔ ''جھوٹ مت کہو۔ آنکھوں میں دھول مت جھونکو! تم نے کچھ

کہا نہیں تو بہو جھوٹ موٹ روتی ہے؟ روپے کی گرمی ہے۔ وہ نکال دی جائے گی۔ الگ ہیں تو کیا ہوا ہے تو ایک کھون (خون)، کوئی ترچھی آنکھ سے دیکھے تو آنکھ نکال لیں۔''

پنی چنڈی بنی ہوئی تھی۔ گلا پھاڑ کر بولی۔ ''تو نے مجھے دھکا دے کر گرا نہیں دیا؟ کھا جا اپنے بیٹے کی سوگندھ!''

ہیرا کو بھی خبر ملی کے چودھری اور پنیا میں جنگ ہو رہی ہے۔ چودھر نے پنیا کو دھکا دیا، پنیا نے اسے تلیوں سے پیٹا۔ اس نے پروہیں چھوڑا اور اوگی (بیلوں کا چابک) لیے واردات کے موقع کی طرف چلا۔ وہ گاؤں میں اپنے غصے کے لیے مشہور تھا۔ چھوٹا قد، گٹھا ہوا بدن، آنکھیں کوڑی کی طرح نکل آئی تھیں اور گلے کی رگیں تن گئی تھیں، مگر اسے چودھری پر غصہ نہ تھا بلکہ غصہ تھا پنیا پر۔ وہ کیوں ودھری سے لڑی؟ کیوں اس کی عزت مٹی میں ملادی؟ بانس والے سے جھگڑنے سے اسے کیا مطلب؟ اسے جا کر ہیرا سے کل ماجرا بیان کر دینا چاہیے تھا۔ وہ جیسا مناسب سمجھتا کرتا۔ وہ اس سے لڑنے کیوں گئی؟ اس کی چلتی تو پنیا کو پردے میں رکھتا۔ پنیا کسی بڑے سے منہ کھول کر باتیں کرے، یہ اسے ناگوار تھا۔ وہ خود جتنا گرم مزاج تھا پنیا کو اتنا ہی ٹھنڈا رکھنا چاہتا تھا۔ جب بھیا نے پندرہ روپے میں سودا کرلیا تو وہ بیچ میں کودنے والی کون تھی؟

اس نے آتے ہی پنیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور گسیٹتا ہوا الگ لے جا کر لگا لاتیں مارنے۔ ''حرامزادی تو ہماری ناک کٹانے پر لگی ہوئی ہے۔ تو چھوٹے چھوٹے آدمیوں سے لڑتی پھرتی ہے۔ کس کی پگڑی نیچی ہوتی ہے بتا! (ایک لات اور جما

کر) ہم تو وہاں کلیوا کی باٹ جوہ رہے ہیں تو یہاں لڑائی ٹھانے بیٹھی ہے۔ اتنی بے حیائی! آنکھ کا پانی ایسا گر گیا! کھود کر گاڑ دوں گا۔''

پنی ہائے ہائے کرتی جاتی تھی۔ ''تیری مٹی اٹھے، تجھے مرگی آوے، دیبی ماں تجھے لیل جائیں، بھگوان کرے تو کوڑھی ہو جائے ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر گریں۔''

اور گالیاں تو ہیرا کھڑا کھڑا سنتا رہا لیکن یہ پچھلی گالی اسے لگ گئی۔ ہیضہ وغیرہ میں کوئی خاص تکلیف نہ تھی۔ ادھر بیمار پڑے' ادھر چل دیئے۔ مگر کوڑھ! یہ گھن کی موت اور اس سے بھی گھن کی زندگی! وہ تلملا اٹھا۔ دانت پیستا ہوا پھر پنیا پر جھپٹا اور بال پکڑ کر اس کا سر زمین پر رگڑتا ہوا بولا۔ ''ہاتھ پاؤں کٹ کر گر جائیں گے تو میں تجھے لے کر چاٹوں گا؟ تو ہی میرے بال بچوں کو پالے گی؟ ایں، تو ہی اتنی بڑی گر ہستی چلائے گی۔ تو تو دوسرا بھتار (خاوند) کر کے کنارے کھڑے ہو جائے گی۔''

چودھری کو پنیا کی اس درگت پر رحم آ گیا۔ ہیرا کو سمجھانے لگا۔ ''ہیرا مہتو اب جانے دو بہت ہوا، کیا ہوا اس نے مجھے مارا، میں تو چھوٹا نہیں ہو گیا۔ دھنیہ بھاگ! کہ بھگوان نے یہ دن دکھایا۔''

ہیرا نے چودھری کو ڈانٹا۔ ''تم چپ رہو چودھری! میرے گسے (غصے) میں پڑ جاؤ گے تو برا ہو گا۔'' عورت ذات اسی طرح بہکتی ہے۔ آج کو تم سے لڑ گئی، کل کو دوسروں سے لڑ جائے گی۔ تم بھلے مانس ہو ہنس کر ٹال گئے، دوسرا تو برداس (برداشت) نہ کرے گا۔ کہیں اس نے بھی ہاتھ چلا دیئے تو کتنی آبرو ہ جائے گی، بتاؤ!

اس خیال نے اس کے غصے کو پھر بھڑکا دیا۔ لپکا ہی تھا کہ ہوری نے دوڑ کر پکڑ

لیا اور اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''ارے تو ہو گیا دیکھ تو لیا دنیا نے کہ تم بڑے بہادر ہو۔ اب کیا اسے پیس کر پی جاؤ گے؟''

ہیرا اب بھی بڑے بھائی کا ادب کرتا تھا۔ براہ راست نہ لڑتا تھا۔ چاہتا تو ایک جھٹکے میں اپنا ہاتھ چھڑا لیتا مگر اتنی بے ادبی نہ کر سکا۔ چودھری کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اب کیا کھڑے تاکتے ہو؟ جا کر اپنے بانس کاٹو! میں نے سہی کر دی۔ پندرہ روپے سینکڑے میں طے ہے۔''

کہاں تو پنی بیٹھی رو رہی تھی اور کہاں جھمک کر اٹھی اور اپنا سر پیٹ کر بولی۔ ''لگا دے گھر میں آگ نگوڑے! مجھے کیا کرنا ہے؟ بھاگ پھوٹ گیا کہ تجھ جیسے کسائی (قصائی) کے پالے پڑی۔ لگا دے گھر میں آگ!''

اس نے کلیوا کی ٹوکری وہیں چھوڑ دی اور گھر کی طرف چلی۔ ہیرا گرجا۔ ''وہاں کہاں جاتی ہے چڑیل؟ چل کنویں پر، نہیں تو کھون (خون) پی لوں گا۔''

پنیا کے پیر تھم گئے۔ وہ اس ناٹک کا دوسرا کھیل نہ کھیلنا چاہتی تھی۔ چپکے سے ٹوکری اٹھائی اور روتے ہوئے کنویں کی طرف چلی۔ ہیرا پیچھے پیچھے چلا۔

ہوری نے کہا۔ ''اب پھر مار پیٹ نہ کرنا، اس سے عورت بے سرم (بے شرم) ہو جاتی ہے۔''

دھنیا نے دروازہ پر آ کر ہانک لگائی۔ ''تم وہاں کھڑے کھڑے کیا تماسا (تماشا) دیکھ رہے ہو؟ کوئی تمہاری سنتا بھی ہے کہ یوں ہی سکچھا (سبق) دے رہے ہو؟ اس دن اسی بہو نے تمہیں گھونگھٹ کی آڑ میں داڑھی جار کھی تھی۔ بھول گئے۔ بہریا ہو کر پرائے مردوں سے لڑے گی تو ڈانٹی نہ جائے گی؟''

ہوری دروازے پر آ کرنٹ کھٹ پن کے ساتھ بولا۔ ''اور جو میں اسی طرح تجھے ماروں تو؟''

''کیا کبھی مارا نہیں جو مارنے کی سادھ بنی ہوئی ہے؟''

''اتنی بے دردی سے مارتا تو گھر چھوڑ کر بھاگ جاتی۔ پنیا بڑی گمگو (غمخوار) ہے۔''

''اوہو، ایسے بڑے دردوالے ہو تم! ابھی تک مار کا داگ (داغ بنا ہوا ہے، دلار کرنا سیکھا ہی نہیں۔ میں ہی ایسی ہوں کہ تمہارے ساتھ نباہ ہوا۔''

''اچھا رہنے دے، بہت اپنا بکھان نہ کر! تو ہی روٹھ روٹھ کر میکے بھاگتی تھی جب مہینوں منوتی کرتا تھا تب کہیں جا کر آتی تھی۔''

''جب اپنی گرج (غرض) ستاتی تھی تب منانے جاتے تھے، لالا میرے دلار نے نہیں جاتے تھے۔''

''اسی سے تو میں سب سے تیرا بکھان کرتا ہوں۔''

ازدواجی زندگی کی صبح میں تمنا اپنے گلابی نشے کے ساتھ طلوع ہوتی ہے اور دل کے آسمان کو پورے طور پر اپنی سنہری کرنوں سے رنگ دیتی ہے۔ پھر دوپہر کی تپش کا وقت آتا ہے۔ دم بدم بگولے اٹھتے ہیں اور زمین کانپنے لگتی ہے۔ تمنا کا سنہرا پر داہٹ جاتا ہے اور اصلیت اپنی عریانی میں آگے کھڑی رہتی ہے۔ اس کے بعد آرام دہ شام آتی ہے، سرد اور سکون افزا، جب ہم تھکے ہوئے مسافروں کی طرح دن بھر کی مسافت کا حال کہتے اور سنتے ہیں۔ بے غرضانہ انداز سے، گویا ہم کسی اونچی چوٹی پر جا بیٹھے ہیں جہاں نیچے کا شور و غل ہم تک نہیں پہنچتا۔

دھنیا نے تنک کر کہا۔ ''چلو چلو! بڑے بکھان کرنے والے! جرا (ذرا) سا کوئی کام بگڑ جائے تو گردن پر سوار ہو جاتے ہو۔''

''ہوری نے میٹھے اور لہنے کے ساتھ کہا۔ ''دیکھو گوبر گائے لے کر آتا ہے کہ کالی (خالی) ہاتھ۔''

''اچھا آدمی ہے، پر لڑکے بڑے کپوت ہیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں سبوں نے گول مال نہ کر دیا ہو۔''

چودھری پسینے میں ڈوبا ہوا آ کر بولا۔ ''مہتو، چل کر بانس گن لے۔ کل ٹھیلا لا کر اٹھا لے جاؤں گا۔''

ہوری نے بانس گننے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ''چودھری ایسا آدمی نہیں ہے۔ پھر ایک آدھ بانس اور رکاٹ ہی لے گا تو کیا؟ روج (روز) تو منگنی میں بانس کٹتے رہتے ہیں۔ بیاہوں میں تو مانڈو بنانے کے لیے لوگ بیس بانس کاٹ لے جاتے ہیں۔''

چودھری نے ساڑھے سات روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ہوری نے گن کر کہا۔ ''اور نکالو، حساب سے ڈھائی اور ہوتے ہیں۔''

چودھری نے رکھائی سے کہا۔ ''پندرہ روپے میں طے ہوئے ہیں کہ نہیں؟''

''پندرہ روپے میں نہیں، بیس روپے میں۔''

''ہیرا مہتو نے تو تمہارے سامنے پندرہ روپے کہے تھے، کہو تو بلا لاؤں۔''

''طے تو بیس ہی روپے ہوئے تھے۔ چودھری اب تمہاری جیت ہے، جو چاہو کہو۔ ڈھائی روپے ہیں۔ تم دو ہی دے دو۔''

مگر چودھری کچی گولیاں نہ کھیلا تھا۔ اب اسے کس کا ڈر؟ ہوری کے منہ میں تالا پڑا ہوا تھا۔ کیا کہے، ماتھا ٹھونک کر رہ گیا۔ بس اتنا بولا۔ ''یہ اچھی بات نہیں ہے ۔چودھری دو روپے دبا کر راجا نہ ہو جاؤ گے۔''

چودھری تند لہجے میں بولا ''اور تم کیا بھائیوں کے تھوڑے پیسے دبا کر راجا ہو جاؤ گے۔ ڈھائی روپے پر اپنا ایمان بگاڑ رہے ہو۔ اس پر مجھے اپدیش دینے چلے ہو۔ ابھی پردہ کھول دوں تو سر نیچا ہو جائے گا۔''

ہوری پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ چودھری تو روپے سامنے زمین پر رکھ کر چلتا بنا مگر وہ نیم کے نیچے بیٹھا بڑی دیر تک پچھتاتا رہا۔ وہ کتنا لالچی اور مطلبی ہے۔ اس کا اسے آج پتہ چلا۔ چودھری نے ڈھائی روپے دے دیئے ہوتے تو اسے اتنی خوشی ہوتی۔ اپنی چالاکی کی سراہنا کہ بیٹھے بٹھائے ڈھائی روپے مل گئے۔ ٹھوکر کھا کر ہی تو ہم ہوشیاری کے ساتھ قدم اٹھانا سیکھتے ہیں۔

دھنیا اندر چلی گئی۔ باہر آئی تو روپے زمین پر پڑے دیکھے۔ گن کر بولی۔ ''اور روپے کیا ہوئے؟ دس نہ چاہیے؟''

ہوری نے لمبا منہ بنا کر کہا۔ ''ہیرا نے پندرہ روپے میں دے دیئے تو میں کیا کروں؟''

''ہیرا پانچ روپے میں دے دے ہم نہیں دیتے ان داموں۔''

''وہاں مار پیٹ ہو رہی تھی، بیچ میں کیا بولتا؟''

ہوری نے اپنی ہار اپنے دل ہی میں رکھ لی جیسے کوئی چوری سے آم توڑنے کے لیے چڑھے تو گر پڑنے پر دھول جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہو کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔

جیت کر آپ اپنی ڈغابازیوں کی ڈینگ مار سکتے ہیں۔ جیت میں سب کچھ معاف ہے مگر ہار کی شرم تو پی جانے ہی کی چیز ہے۔ دھنیا شوہر کو طعنے دینے لگی۔ ایسے مبارک موقع اسے بہت کم ملتے تھے۔ ہوری اس سے چالاک تھا۔ مگر آج بازی دھنیا کے ہاتھ تھی۔ ہاتھ مٹکا کر بولی۔ ''کیوں نہ ہو، بھائی نے پندرہ روپے کہہ دیئے تو تم کیسے ٹوکتے؟ ارے رام رام! لاڈلے بھائی کا دل چھوٹا ہو جاتا کہ نہیں۔ پھر جب اپنا پڑا انرتھ ہو رہا تھا کہ لاڈلی بہو کے گلے پر چھری چل رہی تھی، تو تم بھلا کیسے بولتے؟ اسی بکھت (وقت) کوئی تمہارا سربس (سب کچھ) لوٹ لیتا تو بھی تمہیں سدھ نہ ہوتی۔''

''ہوری چپ چاپ سنتا رہا۔ جھنجھلاہٹ ہوئی، غصہ آیا، خون کھولا، آنکھیں جلیں، دانت پیسے مگر کچھ بولا نہیں۔ چپکے سے کدال لی اور کھیت گوڑنے چلا۔

دھنیا نے کدال چھین کر کہا۔ ''کیا ابھی سیر ا ہے کیا، جو اوکھ گوڑنے چلے؟ سو۳رج دیوتا سر پر آ گئے۔ نہانے دھونے جاؤ،م روٹی تیار ہے۔''''ہوری نے بھنبھنا کر کہا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

دھنیا نے جلے پر نمک چھڑکا۔ ''ہاں کاہے کو بھوک لگے گی، بھائی نے بڑے بڑے لڈو کھلا دیئے ہیں نا! بھگوان ایسے سپوت بھائی سب کو دیں۔''

ہوری بگڑا۔ ''تو آج مار کھانے پر لگی ہوئی ہے۔''

دھنیا نے نقلی عاجزی دکھا کر کہا۔ ''کیا کروں، تم دلا رہی اتنا کرتے ہو کہ میرا سر پھر گیا ہے۔''

''تو گھر میں رہنے دے گی کہ نہیں۔''

''تو گھر تمہارا، مالک تم، میں بھلا کون ہوتی ہوں تمہیں گھر سے نکالنے والی؟''

ہوری آج دھنیا سے کسی طرح پیش نہیں پا سکتا، اس کی عقل جیسے کند ہو گئی ہے۔ ان طنز کے تیروں کو روکنے کے لیے اس کے پاس کوئی ڈھال نہیں ہے۔ آہستہ سے کدال رکھ دی اور انگوچھا لے کر نہانے چلا گیا۔ لوٹا کوئی آدھ گھنٹے میں، مگر گوبر ابھی تک نہ آیا، اکیلے کیسے کھانا کھالے؟ لونڈا وہاں جا کر سو رہا۔ بھولا کی وہ چنچل چھوکری نہیں ہے جھنیا، اسی کے ساتھ ہنسی دل لگی کر رہا ہو گا۔ کل بھی تو اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ نہیں گائے دی تو لوٹ کیوں نہیں آیا؟ کیا وہاں دھرنا دے گا۔؟

دھنیا نے کہا۔ ''اب کھڑے کیا ہو؟ گوبر سانجھ کو آوے گا۔''

ہوری نے اور کچھ نہ کہا کہ کہیں دھنیا پھر نہ کچھ کہہ بیٹھے، کھانا کھا کر نیم کے سائے میں سو رہا۔

روپا روتی ہوئی آئی۔ ننگے بدن، ایک لنگوٹی لگائے، جھبرے بال ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہوری کے سینے پر لوٹ گئی۔ اس کی بڑی سونا کہتی ہے۔ ''گائے آئے گی تو اس کا گوبر میں ہاتھوں گی۔ روپا یہ نہیں برداشت کر سکتی، سونا ایسی کہاں کی بڑی رانی ہے کہ سارا گوبر آپ ہاتھ ڈالے؟ روپا اس سے کس بات میں کم ہے۔؟ سونا روٹی پکاتی ہے تو کیا ہوا' روپا برتن نہیں مانجھتی؟ سونا پانی لاتی ہے تو کیا ہوا' روپا کنویں پر رسی نہیں لے جاتی؟ سونا تو کلسا بھر کر اٹھلاتی چلی آتی ہے، رسی سمیٹ کر روپا ہی لاتی ہے۔ گوبر دونوں ساتھ پاتھتی ہیں۔ سونا کھیت گوڑنے جاتی ہے تو کیا روپا بکری چرانے نہیں جاتی؟ پھر سونا اکیلے کیوں پاتھے گی۔ یہ انیائے روپا کیسے سہے؟

ہوری نے اس کے بھولے پن پر ریجھ کر کہا۔ ''نہیں گائے کا گوبر تو پاتھنا، سونا گائے کے پاس جائے تو بھگا دینا۔''

روپا نے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ ''دودھ بھی میں ہی دوہوں گی۔''

''ہاں ہاں تو نہ دوہے گی تو کون دوہے گا؟''

''وہ میری گائے ہوگی۔''

''ہاں سولہوں آنے تیری!''

روپا خوش ہو کر اپنی جیت کا مبارک ماجرا ہاری ہوئی سونا کو سنانے چلی گئی۔

''گائے میری ہوگی، اس کا دودھ میں دوہوں گی، اس کا گوبر میں پاتھوں گی، تجھے کچھ نہ ملے گا۔''

سونا سن میں نوعمر، جسم میں جوان اور عقل میں بچی تھی۔ گویا اس کا شباب اسے آگے کھینچتا تھا اور طفلی پیچھے لے جاتی تھی۔ کچھ باتوں میں ہوشیار کہ نوجوان گریجویٹ عورتوں کو پڑھائے اور کچھ باتوں میں اتنی الھڑ کہ بچوں سے بھی پیچھے۔ لمبا، روکھا مگر خوش چہرہ، ٹھڈی نیچے کو کھنچتی ہوئی، آنکھوں میں ایک قسم کی آسودگی، نہ آنکھوں میں کاجل، نہ بدن پر کوئی گہنا، جیسے گرہستی کے بوجھ نے شباب کو دبا کر باؤنا بنا دیا ہو۔ سر کو ایک جھٹکا دے کر بولی۔ ''جا تو گوبر پاتھ، جب تو دودھ دوہ کر رکھے گی تو میں پی جاؤں گی۔''

''میں دودھ کی ہانڈی تالے میں بند کر کے رکھوں گی۔''

''میں تالا توڑ کر دودھ نکال لوں گی۔''

یہ کہتی ہوئی وہ باغ کی طرف چل دی۔ آم گدرا گئے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے

ایک آدھ زمین پر گر پڑے تھے۔ لو کے مارے ہوئے بچھڑے اور پلے، لیکن بچے ٹپکا سمجھ کر باغ میں منڈلایا کرتے تھے۔ روپا بھی بہنھ کے پیچھے ہولی۔ جو کام سونا کرے وہ روپا ضرور کرے گی۔ سونا کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی تھی۔ روپا کے بیاہ کا کوئی چرچا نہیں کرتا۔ اس لیے وہ خود اپنے بیان کے لیے ضد کرتی ہے۔ اس کا دولہا کیسا ہو گا، وہ کیا کیا لائے گا۔ اسے کیسے رکھے گا۔ اسے کیا کھلائے گا، کیا پہنائے گا۔ اس کا وہ بڑا مفصل بیان کرتی جسے سن کر شاید کوئی لڑکا اس سے بیاہ کرنے پر راضی نہ ہوتا۔

شام ہو رہی تھی۔ ہوری ایسا سیا السایا کہ گوڑنے نہ جا سکا۔ بیلوں کو ناند میں لگا یا۔ بھوسہ کھلی دی اور ایک چلم بھر کر پینے لگا۔ اس فصل میں سب کچھ کھلیان میں تول دینے پر بھی ابھی اس کا کوئی تین سو کا قرض تھا، جس پر کوئی سو روپے سود کے بڑھتے جاتے تھے۔ منگرو شاہ سے آج پانچ برس ہوئے کہ بیل کے لیے ساٹھ روپے لیے تھے، پورے ساٹھ دے چکا تھا مگر ساٹھ کے ساتھ بنے ہوئے تھے۔ داتا دین پنڈت سے تیس روپے لے کر آلو بوئے تھے، آلو تو چور کھود لے گئے اور اس تیس کے ان تین برسوں میں سو ہو گئے تھے۔ دو لاری بیوہ سیٹھانی تھی جو گاؤں میں نمک، تیل، تمباکو کی دکان رکھے ہوئے تھی، بٹوارے کے وقت اس سے چالیس روپے لے کر بھائیوں کو دینا پڑے تھے، اس کے بھی تقریباً سو روپے ہو گئے تھے کیونکہ ایک آنہ فی روپیہ سود تھا۔ لگان ہی کے ابھی پچیس باقی پڑے ہیں اور دسہرہ کے دن شگون کے روپے کا بھی کوئی بندوبست کرنا تھا۔ بانسوں کے روپے بڑے موقع سے مل ہیں گئے۔ شگون کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن کون جانے؟ یہاں تو

ایک دھیلا بھی ہاتھ میں آ جائے تو گاؤں میں شور مچ جائے اور لینے والے چاروں طرف سے نوچنے لگتے ہیں۔ یہ پانچ روپے تو وہ شگون میں دے گا۔ چاہے کچھ ہو جائے مگر ابھی زندگی کے بڑے بڑے کام تو سر پر سوار ہیں۔ گوبر اور سونا کا بیاہ، بہت ہاتھ روکنے پر بھی تین سو سے کم نہ انھیں گے۔ یہ تین سو کس کے گھر سے آئیں گے؟ کتنا چاہتا ہے کہ کسی سے ایک پیسہ ادھار نہ لے اور جس کا آتا ہے اس کی پائی پائی چکا دے مگر ہر طرح کی تکلیف اٹھانے پر بھی گلا نہیں چھوٹتا۔ اسی طرح سود بڑھتا جائے گا اور ایک دن اس کا سب گھر بار نیلام ہو جائے گا۔ تو اس کے بال بچے بے سہارا ہو کر بھیک مانگتے پھریں گے۔ ہوری جب کام دھندے سے چھٹی پا کر چلم پینے لگتا تھا تو یہ فکر ایک سیاہ دیوار کی طرح اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی تھی، جس میں سے نکل جانے کی اسے کوئی راہ نہ سوجھتی تھی۔ اگر دھیرج تھا تو یہی کہ یہ بپتا تنہا اس کے سر نہ تھی بلکہ عموماً سبھی کسانوں کا یہی حال تھا۔ بہتوں کی حالت تو اس سے بھی بدتر تھی۔ سوبھا اور ہیرا کو جدا ہوئے ابھی کل تین سال ہوئے تھے مگر دونوں پر چار چار سو کا بار ہو گیا تھا۔ جھینگر دوہل کی کھیتی کرتا ہے۔ اس پر ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ جیاون مہتو کے گھر بھکاری بھیک نہیں پاتا مگر قرضے کا کوئی ٹھکانا نہیں، یہاں بچا کون ہے؟

یکا یک سونا اور روپا دونوں دوڑی ہوئی آئیں اور ایک ساتھ بولیں۔ ''بھیا گائے لا رہے ہیں۔ آگے آگے گائے ہے پیچھے بھیا ہیں۔''

پہلے روپا نے گوبر کو آتے دیکھا تھا۔ یہ خبر سنانے کی سرخروئی اسے ملنی چاہیے تھی۔ سونا برابری کی ساجھے دار ہو جاتی ہے۔ یہ اس سے کیسے سہا جاتا۔

اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''پہلے میں نے گائے دیکھی، تبھی دوڑی۔ بہن نے تو پیچھے سے دیکھا۔''

سونا اس دعویٰ کو تسلیم نہ کر سکی۔ بولی۔ ''تو نے بھیا کو کہاں پہچانا؟ تو تو کہتی تھی کہ کوئی گائے بھاگی آ رہی ہے۔ میں نے ہی کہا تھا کہ بھیا ہیں۔''

دونوں پھر باغ کی طرف دوڑیں، گائے کا خیر مقدم کرنے کے لیے۔

دھنیا اور ہوری دونوں گائے باندھنے کی تدبیر کرنے لگے۔ ہوری بولا۔ ''چلو جلدی سے نادگاڑ دیں۔''

دھنیا کے چہرے پر شباب چمک اٹھا تھا۔ بولی۔ ''نہیں، پہلے تھالی میں تھوڑا آٹا اور گڑ گھول کر رکھ دیں۔ بیچاری دھوپ میں چلی ہوگی، پیاسی ہوگی۔ تم جا کر نادگاڑو، میں گھولتی ہوں۔''

''کہیں ایک گھنٹی پڑی تھی۔ اسے ڈھونڈ لے۔ گائے کے گلے میں باندھیں گے۔''

''سونا کہاں گئی؟ سیٹھانی کی دکان سے تھوڑا کالا ڈورا منگوا لو، گائے کو ٹیٹھ (نظر) بہت لگتی ہے۔''

''آج میرے من کی بڑی بھاری سادھ پوری ہوگئی۔''

دھنیا اپنی دلی مسرت کو دل ہی میں رکھنا چاہتی تھی۔ اتنی بڑی نعمت اپنے ساتھ کوئی زحمت نہ لائے، اس اندیشہ سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ آسمان کی طرف تاک کر بولی۔ ''گائے کے آنے کا آنند تو جب ہے کہ اس کا پورا قدم بھی اچھا ہو۔ بھگوان کے من کی بات ہے۔''

گویا وہ بھگوان کو بھی دھوکا دینا چاہتی تھی۔ بھگوان کو بھی دکھانا چاہتی تھی کہ اس گائے کے آنے سے اسے اتنی خوشی نہیں ہوئی کہ حسدی بھگوان سکھ کا پلڑا اونچا کرنے کے لیے کوئی نئی بپتا بھیج دیں۔

وہ ابھی آٹا گھول رہی تھی کہ گوبر گائے کو لیے بچوں کے ایک جلوس کے ساتھ دروازے پر آ پہنچا۔ ہوری دوڑ کر گائے کے گلے سے لپٹ گیا۔ دھنیا نے آٹا چھوڑ دیا اور جلدی سے ایک پرانی ساڑھی کا کالا کنارہ پھاڑ کر گائے کے گلے میں باندھ دیا۔

ہوری بھگتی بھری نگاہوں سے گائے کو دیکھ رہا تھا جیسے ساچھات (مجسم) دیوی جی نے گھر میں قدم رکھا ہو، آج بھگوان نے یہ دن دکھایا کہ اس کا گھر گئو ماتا کے چرنوں سے پوتر ہو گیا۔ اے اچھے بھاگ! نجانے کس کے پن کے پھل ہیں؟

دھنیا نے گھبرا کر کہا۔ ''کھڑے کیا ہو آنگن میں ناند گاڑ دو۔''

''آنگن میں جگہ کہاں ہے؟''

''بہت جگہ ہے۔''

''میں تو باہر ہی گاڑتا ہوں۔''

''پاگل نہ بنو۔ گاؤں کا حال جان کر بھی انجان بنتے ہو۔ جو بات نہیں جانتے اس میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ دنیا بھر کی بد یا تم ہی نہیں پڑھے ہو۔''

ہوری سچ مچ آپے میں نہ تھا۔ گائے اس کے لیے صرف بھگتی کی چیز نہ تھی بلکہ زندہ دولت تھی۔ وہ اس سے اپنے دروازے کی رونق اور گھر کی عظمت بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ گائے کو دروازے پر بندھی کو دیکھ کر پوچھیں کہ یہ کس کا گھر

ہے؟ لوگ کہیں، ہوری مہتو کا جبھی لڑکی والوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ آنگن میں بندھی تو کون دیکھے گا؟ دھنیا اس کے خُ اف خوف کھا رہی تھی۔ وہ گائے کو سات پردوں کے اندر چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اگر گائے آٹھوں پہر کوٹھری میں رہ سکتی تو وہ شاید اسے باہر نہ نکلنے دیتی۔ یوں تو ہر بات میں ہوری کی جیت ہوتی تھی۔ وہ اپنی بات پر اڑ جاتا تھا اور دھنیا کو دب جانا پڑتا تھا۔ مگر آج دھنیا کے سامنے ہوری کی ایک نہ چلی۔ دھنیا لڑنے پر تل گئی۔ گوبر، سونا اور روپا غرض کہ سارا گھر ہوری کی طرف تھا۔ مگر دھنیا نے تنہا سب کو شکست دی۔ آج اس میں ایک عجیب خود اعتمادی اور وہری میں ایک عجب انکساری کا ظہور ہو گیا تھا۔

مگر تماشا کیسے رک سکتا تھا؟ گائے ڈولی میں بیٹھ کر تو آئی نہ تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ گاؤں میں اتنی بڑی بات ہو جائے اور میلہ نہ لگے۔ جس نے سنا' سب کام کاج چھوڑ کر دیکھنے دوڑا۔ وہ معمولی ۹ دیسی گائے نہیں ہے، بھولا کے گھر سے اسی روپے میں آئی ہے۔ ہوری اسی روپے تو کیا دیں گے؟ پچاس ساٹھ روپے میں لائے ہوں گے۔ گاؤں کی تاریخ میں پچاس ساٹھ روپیوں کی گائے کا آنا بھی انہونی بات تھی۔ بیل تو پچاس کے بھی آئے، سو کے بھی آئے مگر گائے کے لیے اتنی بڑی رقم کسان کیا کھا کر خرچ کرے گا؟ یہ تو گوالوں ہی کا کلیجہ ہے کہ انجلیوں روپے گن آتے ہیں۔ گائے کیا ہے مجسم دیوی کا روپ ہے۔ تماشائیوں اور نقادوں کا تانتا لگا ہوا تھا اور ہوری دوڑ دوڑ کر سب کی آؤ بھگت کر رہا تھا۔ اتنا منکسر مزاج، اتنا خوش وہ کبھی نہ تھا۔

ستر سال کے بوڑھے پنڈت داتا دین لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئے اور پوپلے منہ

سے بولے۔ ''کہاں ہو ہوری؟ تنک ہم بھی تمہاری گائے دیکھ لیں، سنا ہے بڑی سندر ہے۔''

ہوری نے دوڑ کر پالا گن کیا اور دل میں متکبرانہ مسرت کے مزے لیتا ہوا بڑی خاطر سے پنڈت جی کو صحن میں لے گیا۔ پنڈت نے گائے کو اپنی پرانی اور تجربہ کار نگاہوں سے دیکھا، سینگیں دیکھیں، تھن دیکھے، پٹھے دیکھے اور گھنی اجلی بھوؤں کے نیچے چھپی ہوئی آنکھوں میں جوانی کی امنگ بھر کر بولے۔ ''کوئی ورودھ (عیب) نہیں ہے بیٹا، بال بھونری سب ٹھیک! بھگوان چاہیں گے تو تمہارے بھاگ کھل جائیں گے۔ ایسے اچھے لچھن ہیں کہ واہ! بس راتب نہ کم ہونے پاوے۔ ایک ایک بچوا سو سو کا ہوگا۔''

ہوری نے خوشی کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے کہا۔ ''سب کا آسیر باد ہے دادا۔''

داتا دین نے سرتی کی پیک تھوکتے ہوئے کہا۔ ''مرا آشیر باد نہیں ہے بیٹا، بھگوان کی دیا ہے۔ یہ سب بھگوان کی دیا ہے۔ روپے نگد (نقد) دیئے؟''

ہوری نے بے پر کی اڑائی۔ اپنے مہاجن کے روبرو بھی اپنی امیری دکھانے کا ایسا اچھا موقع وہ کیوں ہاتھ سے جانے دے۔ ٹکے کی نئی ٹوپی سر پر رکھ کر جب ہم اکڑنے لگتے ہیں تو اتنی بڑی نعمت پا کر اس کا دماغ کیوں نہ آسمان پر چڑھ جائے؟ بولا۔ ''بھولا ایسا بھلا مانس نہیں ہے مہاراج، کہ نگد گنائے پورے، چوکس!''

اپنے مہاجن کے سامنے یہ ڈینگ مار کر ہوری نے نادانی تو کی تھی مگر داتا دین

کے چہرے پر بے صبری کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ اس کہنے میں کتنی سچائی ہے، یہ ان کی ان بجھی ہوئی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا جن میں روشنی کی جگہ تجربہ چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ خوش ہو کر بولے۔ ''کوئی ہرج نہیں بیٹا، کوئی ہرج نہیں! بھگوان سب اچھا کریں گے۔ پانچ سیر دودھ ہے اس میں، بچے کے لیے چھوڑ کر؟''

دھنیا نے فوراً ٹوکا۔ ''ارے نہیں مہراج، اتنا دودھ کہاں؟ بڑھیا تو ہوگئی ہے، پھر یہاں راتب کہاں دھرا ہے؟''

داتا دین نے بھید بھری نگاہوں سے دیکھ کر اس کی چوکسی کی داد دی، جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''گرہستن کا یہی دھرم ہے۔ دون کی لینا مردوں کا کام ہے، انہیں کرنے دو۔'' پھر ویسے ہی لہجے میں بولے۔ ''باہر نہ باندھنا اور اتنا کہے دیتے ہیں۔''

دھنیا نے شوہر کی طرف فتح مندانہ نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہو۔ ''لو اب تو مانو گے۔'' پھر دھنیا داتا دین سے بولی۔ ''نہیں مہراج باہر کیوں باندھیں گے؟ بھگوان دیں تو اسی آنگن میں تین گائیں اور بندھ سکتی ہیں۔''

سارا گاؤں گائے دیکھنے آیا، نہیں آئے تو سوبھا اور ہیرا جو سگے بھائی تھے۔ ہوری کے دل میں بھائیوں کے لیے اب بھی جگہ تھی۔ وہ دونوں اگر دیکھ لیتے اور خوش ہو جاتے تو اس کی دلی خواہش پوری ہو جاتی۔ شام ہوگئی۔

ہوری نے ڈرتے ڈرتے دھنیا سے کہا۔ ''نہ سوبھا آیا، نہ ہیرا، سنا نہ ہوگا۔''

دھنیا بولی۔ ''تو یہاں کون انہیں بلانے جاتا ہے؟''

''تو بات سمجھتی نہیں، لڑنے کو تیار رہتی ہے۔ بھگوان نے جب یہ دن دکھایا ہے

تو ہمیں سر جھکا کر چلنا چاہیے۔ آدمی کو اپنے سگوں کے منہ سے اپنی بھلائی برائی سننے کی جتنی اچھا ہوتی ہے'' اتنی باہر والوں کے منہ سے نہیں۔ پھر اپنے بھائی لاکھ برے ہوں تو اپنے بھائی ہی ہیں۔ اپنے حصے بکھرے (بخرے) کے لیے سبھی لڑتے ہیں۔ مگر اس سے کھون (خون) تھوڑے ہی بدل جاتا ہے۔ دونوں کو بلا کر دکھا دینا چاہیے، نہیں تو کہیں گے کہ گائے لائے اور ہمیں بتایا تک نہیں۔''

دھنیا نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ''میں نے تم سے سو بار، لاکھ بار کہہ دیا کہ میرے منہ پر اپنے بھائیوں کا بکھان نہ کیا کرو، ان کا نام سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ سارے گاؤں نے سنا، کیا انہوں نے نہ سنا ہوگا؟ کچھ اتنی دور بھی تو نہیں رہتے۔ سارا گاؤں دیکھنے آیا، ان ہی کے پاؤں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ مگر آویں کیسے؟ جلن ہو رہی ہوگی کہ اس کے گھر گائے آ گئی۔ چھاتی پھٹی جاتی ہو گئی۔''

چراغ جلانے کا وقت آ گیا تھا، دھنیا نے جا کر دیکھا تو بوتل میں مٹی کا تیل نہ تھا۔ بوتل لے کر تیل لینے چلی گئی۔ پیسے ہوتے تو روپا کو بھیجتی۔ ادھار لانا ہے، کچھ للو چپو کرے گی جبھی تیل ادھار ملے گا۔

ہوری نے روپا کو بلا کر پیار سے گود میں بٹھایا اور کہا۔ ''تنک جا کر دیکھ ہیرا کا کا آ گئے ہیں کہ نہیں۔ سوبھا کا کو بھی دیکھتی آنا۔ کہنا کہ دادا نے تمہیں بلایا ہے۔ نہ آویں تو ہاتھ پکڑ کر کھینچ لانا۔''

روپا ٹھنک کر بولی۔ ''چھوٹ کا کی مجھے ڈانٹتی ہے۔''

''کا کی کے پاس کیا کرنے جائے گی؟ پھر سوبھا کی گھر والی تو تجھے پیار کرتی

ہے۔''

''سو بھا کا کام مجھے چڑاتے ہیں، کہتے ہیں.....میں نہ کہوں گی۔''

''کیا کہتے ہیں، بتا!''

''چڑاتے ہیں۔''

''کیا کہہ کر چڑاتے ہیں۔''

''کہتے ہیں کہ تیرے لیے موس پکڑ رکھا ہے، لے جا بھون کر کھالے۔''

ہوری کے دل میں گدگدی پیدا ہوئی۔

''تو کہتی نہیں کہ پہلے تم کھالو تب میں کھاؤں گی؟''

''اماں منع کرتی ہیں، کہتی ہیں کہ ان لوگوں کے گھر نہ جایا کر۔''

''تو اماں کی بیٹی ہے کہ دادا کی؟''

روپا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔''اماں کی!''اور ہنسنے لگی۔

''تو پھر میری گودی سے اتر جا۔آج میں تجھے اپنی تھالی میں نہ کھلاؤں گا۔''

گھر میں ایک ہی پھول کی تھالی تھی۔ ہوری اسی میں کھاتا تھا۔ تھالی میں کھانے کی عزت پانے کے لیے روپا ہوری کے ساتھ کھاتی تھی۔اس عزت کو وہ کیسے چھوڑے؟ ہمک کر بولی۔''اچھا تمہاری!''

''تو پھر میرا کہنا مانے گی، یا اماں کا؟''

''تمہارا۔''

''تو جا کر ہیرا اور سو بھا کو پکڑ لا۔''

''اور اماں بگڑیں؟''

''اماں سے کہنے کون جائے گا؟''

روپا کودتی ہوئی ہیرا کے گھر چلی۔ عداوت کا جال بڑی بڑی مچھلیوں کو پھنساتا ہے، چھوٹی مچھلیاں یا تو اس میں پھنستی ہی نہیں یا فوراً نکل بھاگتی ہیں۔ ان کے لیے وہ مارنے والا جال کھیل کی چیز ہے۔ ڈر کی نہیں بھائیوں سے ہوری کی بول چال بند تھی مگر روپا دونوں گھروں میں آتی جاتی تھی۔ بچوں سے کیا بیر؟

مگر روپا گھر سے نکلی ہی تھی کہ دھنیا تیل لیے ہوئے مل گئی۔ پوچھا۔ ''سانجھ کی بریا (وقت) کہاں جاتی ہے؟ چل گھر!'' روپا ماں کو خوش کرنے کے لالچ کو نہ روک سکی۔

دھنیا نے ڈانٹا۔ ''چل گھر کسی کو بلانے نہیں جانا ہے۔''

روپا کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ گھر لائی اور ہوری سے بولی۔ ''میں نے تم سے لاکھ بار کہہ دیا کہ میری لڑکی کو کسی کے گھر نہ بھیجا کرو۔ کسی نے کھٹکھر کرا دیا تو میں تمہیں لے کر چاٹوں گی۔ ایسا ہی بڑا پریم ہے تو آپ کیوں نہیں جاتے؟ جان پڑتا ہے کہ ابھی پیٹ نہیں بھرا۔''

ہوری ناند جما رہا تھا۔ ہاتھوں میں مٹی لپیٹے ہوئے سنی ان سنی کر کے بولا۔ ''کس بات پر بگڑتی ہے بھائی؟'' یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ اندھے کتے کی طرح ہوا پر بھونکا کرے۔

دھنیا کو کپی میں تیل بھرنا تھا۔ اس وقت جھگڑا نہ بڑھانا چاہتی تھی۔ روپا بھی لڑکوں میں جا ملی۔

پہر رات سے زیادہ جا چکی تھی۔ ناند گڑ چکی تھی۔ بھوسہ کھلی ڈال دی گئی۔ گائے

من مارے اداس بیٹھی تھی۔ جیسے کوئی بہو سسرال آئی ہو۔ ناند میں منہ تک نہ ڈالتی تھی۔ ہوری اور گوبر کھانا کھا کر آدھی آدھی روٹی اس کے لیے لائے مگر اس نے سونگھا تک نہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی، جانوروں کو بھی اکثر تھان چھوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ہوری باہر کھاٹ پر بیٹھ کر چلم پینے لگا تو پھر بھائیوں کی یاد آئی۔ نہیں آج اس سبھ سمے (مبارک وقت) پر بھائیوں سے بے پروا نہیں رہ سکتا۔ اس کا دل پونجی پا کر بڑا ہو گیا تھا۔ بھائیوں سے جدا ہو گیا ہے تو کیا ہوا۔ ان کا بیری تو نہیں ہے! یہی گائے تین سال پہلے آئی ہوتی تو سبھی کو اس پر برابر کا حک (حق) ہوتا اور کل کو یہی گائے دودھ دینے لگے گی تو کیا وہ بھائیوں کے گھر دودھ نہ بھیجے گا۔ کیا دہی نہ بھیجے گا؟ ایسا تو اس کا دھرم نہیں ہے۔ بھائی اس کا برا چیتیں، پر وہ کیوں ان کا برا چیتے؟ اپنی اپنی کرنی تو اپنے اپنے ساتھ ہے۔

اس نے نریل کھاٹ کے پائے سے لگا کر رکھ دیا اور ہیرا کے گھر کی طرف چلا۔ سوبھا کا گھر بھی ادھر ہی تھا۔ دونوں اپنے اپنے دروازے پر پڑے ہوئے تھے۔ کافی اندھیرا تھا۔ ہوری پر ان میں سے کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ دونوں میں کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ ہوری رک گیا اور باتیں سننے لگا۔ ایسا آدمی کہاں ہے جو اپنا چرچا سن کر ہٹ جائے۔

ہیرا نے کہا۔ ''جب تک ایک تھے، ایک بکری بھی نہیں لی، اب پچھائیں گائے لی جاتی ہے۔ بھائی کا حک (حق) مار کر کسی کو پھلتے پھولتے نہیں دیکھا۔''

سوبھا بولا۔ ''یہ تم انیائے کر رہے ہو ہیرا! بھیا نے ایک ایک پیسے کا حساب

دیا۔ یہ میں کبھی نہ مانوں گا کہ انہوں نے پہلے کی کمائی چھپا رکھی تھی۔''

''تم مانو چاہے نہ مانو، پر ہے یہ پہلے ہی کی کمائی۔''

''کسی پر جھوٹ تہمت نہ لگانا چاہیے۔''

''اچھا تو یہ روپے کہاں سے آ گئے۔ کہاں سے ہن برس پڑا؟ اتنے ہی کھیت تو ہمارے پاس بھی ہیں۔ اتنی ہی اپج ہماری بھی ہے پھر کیوں ہمارے پاس کپھن (کفن) کوڑی نہیں ہے اور ان کے گھر نئی گائے آئی ہے؟''

''ادھار لائے ہوں گے۔''

''بھولا ادھار دینے والا آدمی نہیں۔''

''کچھ بھی ہو گائے ہے بڑی سندر۔ گوبر لیے آتا تھا تو میں نے رستے میں دیکھا۔''

''بے ایمانی کا دھن جیسے آتا ہے ویسے چلا جاتا ہے۔ بھگوان چاہیں گے تو گائے گھر میں بہت دن نہ رہے گی۔''

ہوری سے اور نہ سنا گیا۔ وہ گئی گزری باتوں کو بھلا کر اپنے دل میں پریم اور اپنا وا بھرے ہوئے بھائیوں کے پاس آیا تھا۔ اس صدمے نے جیسے اس کے دل میں سوراخ کر دیا اور وہ برادرانہ جذبہ اس میں کسی طرح نہ ٹھہر سکا۔ جی میں آیا کہ اسی وقت حملے کا جواب دے۔ مگر بات بڑھ جانے کے ڈر سے چپ رہ گیا۔ مگر اس کی نیت صاف ہے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ بھگوان کے آگے وہ نر دوکھ (بیگناہ) ہے۔ دوسروں کی اسے پروا نہیں ہے۔ الٹے پاؤں لوٹ آیا اور وہی جلی ہوئی چلم پینے لگا مگر جیسے وہ زہر ہر لحظہ اس کی رگوں میں پھیلتا جاتا تھا۔ اس نے سو جانے کی کوشش

کی مگر نیند نہ آئی۔ بیلوں کے پاس جا کر انہیں سہلانے لگا تو زہر مدھم پڑا۔ پھر چلم بھری مگر اس میں بھی کچھ مزا نہ تھا۔ زہر نے جیسے احساس کو دبا دیا ہو۔ جیسے نشے میں احساس یک طرفہ ہو جاتا ہے، جیسے پھیلا ہوا پانی ایک سمت میں ہو کر تیزی سے بہنے لگتا ہے، وہی حالت اس کی ہو رہی تھی۔ اسی مجنونانہ حالت میں وہ اندر گیا۔ ابھی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صحن میں ایک طرف چٹائی پر پڑی ہوئی دھنیا سونا سے دیہہ (بدن) دبوا رہی تھی اور وہ پا جو روز شام ہوتے ہی سو جاتی تھی، آج کھڑی ہوئی گائے کا منہ جھلا رہی تھی۔ ہوری نے جا کر گائے کو کھونٹے سے کھول لیا اور دروازے کی طرف لے چلا۔ وہ اسی دم گائے کو بھولا کے گھر پہنچانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ اتنا بڑا کلنک سر پر لے کر وہ اب گائے کو گھر میں نہیں رکھ سکتا، کسی طرح نہیں!

دھنیا نے پوچھا۔ ''کہاں لے جاتے ہو رات کو؟''

ہوری نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ''لیے جاتا ہوں بھولا کے گھر، لوٹا دوں گا۔'' دھنیا کو تعجب ہوا، اٹھ کر سامنے آ گئی اور بولی۔ ''لوٹا کیوں دو گے، لوٹا نے ہی کے لیے لائے تھے؟''

''ہاں اس کے لوٹا ہی دینے میں کسل ہے۔''

''کیوں، بات کیا ہے؟ اتنے ارمان سے لائے اور اب لوٹا نے جا رہے ہو۔ کیا بھولا روپیہ مانگتے ہیں؟''

''نہیں، بھولا یہاں کب آئے۔''

''تو پھر کیا بات ہوئی؟''

''کیا کرے گی پوچھ کر؟''

دھنیا نے اچک کر گائے کی رسی ہاتھ سے چھین لی۔ اس کی تیز عقل نے گویا اڑتی ہوئی چڑیا پکڑ لی۔ بولی۔ ''تمہیں بھائیوں کا رڈ ہو تو جا کر ان کے پیروں پڑو، میں کسی سے نہیں ڈرتی، اگر ہماری بڑھتی دیکھ کر کسی کی چھاتی پھٹتی ہے تو پھٹ جائے، مجھے پروا نہیں ہے۔''

ہوری نے منکسرانہ لہجے میں کہا۔ ''دھیرے دھیرے بولو مہارانہ! کوئی سنے تو کہے کہ یہ سب اتنی رات گئے لڑ رہے تھے۔ میں اپنے کانوں سے کیا کیا سن آیا ہوں، تو کیا جانے؟ یہاں چرچا ہو رہا ہے کہ میں نے الگ ہوتے سمے روپے دبا لیے تھے اور بھائیوں سے کپٹ کیا تھا، وہی روپے اب نکل رہے ہیں۔''

''ہیرا کہتا ہوگا؟''

''سارا گاؤں کہہ رہا ہے، اکیلے ہیرا کو کیوں بدنام کروں؟''

''سارا گاؤں نہیں کہہ رہا ہے، اکیلے ہیرا کہہ رہا ہے۔ میں ابھی جا کر پوچھتی ہوں نا کہ تمہارے باپ کتنے روپے چھوڑ کر مرے تھے؟ داڑھی جاروں کے پیچھے تم بگڑ گئے۔ ساری جندگی (زندگی) مٹی میں ملا دی۔ پال پوس کر سانڈ کیا اور اب ہم بے ایمان ہیں۔ میں کہے دیتی ہوں کہ اگر گائے گھر سے باہر نکلی تو انرتھ ہو جائے گا۔ رکھ لیے ہم نے روپے اور بیچ کھیت دبا لیے۔ ڈنکے کی چوٹ پر کہتی ہوں کہ میں نے ہنڈا بھر مہریں چھپا لیں۔ ہیرا اور سوبھا اور سنسار کو جو کرنا ہو کر لے۔ کیوں نہ روپے رکھ لیں؟ دو دو سنڈوں کو بیاہ نہیں کیا، گونا نہیں کیا۔''

ہوری نے سٹپٹا گیا۔ دھنیا نے اس کے ہاتھ سے رسی چھین لی اور گائے کو

کھونٹے سے باندھ کر دروازے کی طرف چلی۔ ہوری سٹپٹا گیا۔ پکڑنا چاہا مگر وہ باہر جا چکی تھی۔ وہیں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ باہر اسے پکڑنے کی کوشش کر کے وہ کوئی ناٹک نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ دھنیا کے غصے سے وہ خوب واقف تھا۔ بگڑتی ہے تو چنڈی ہی بن جاتی ہے۔ مارو، کاٹو سنے گی نہیں۔ لیکن ہیرا بھی تو ایک ہی بگڑیل ہے، کہیں ہاتھ چلا بیٹھے تو پرنے (قیامت) ہی ہو جائے۔ نہیں، ہیرا اتنا مورکھ نہیں ہے۔ میں نے کہاں سے کہاں یہ آگ لگائی۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ بات دل میں ڈال لیتا تو کیوں یہ بکھیڑا ہوتا؟ دفعتاً دھنیا کی کرخت آواز کان میں پڑی۔ ہیرا کی گرج بھی سن پڑی، پھر پنی کا تیز لہجہ بھی دل میں چبھا۔ یکایک اسے گوبر کی یاد آئی۔ باہر لپک کر اس کی کھاٹ دیکھی تو وہ وہاں نہ تھا۔ غضب ہو گیا۔ گوبر بھی وہیں پہنچ گیا۔ اب کسل نہیں۔ اس کا نیا کھون (خون) ہے۔ نجانے کیا کر بیٹھے۔ لیکن ہوری وہاں کیسے جائے؟ ہیرا کہے گا کہ آپ تو بولتے نہیں اور اس ڈائن کو لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ شور دم بدم بڑھتا جاتا تھا۔ سارا گاؤں جاگ پڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کہیں آگ لگ گئی ہے اور لوگ چارپائیوں سے اٹھ اٹھ کر بجھانے کے لیے دوڑے جا رہے ہیں۔ اتنی دیر تک تو وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔ پھر نہ رہا گیا۔ دھنیا پر غصہ آیا۔ وہ کیوں چڑ کر لڑنے گئی؟ اپنے گھر میں آدمی نجانے کس کو کیا کہتا ہے۔ جب تک کوئی منہ پر بات نہ کہے یہی سمجھنا چاہیے کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ ہوری کی کسانی فطرت جھگڑے سے بھاگتی تھی۔ چار باتیں سن کر غم کھا جانا اس سے کہیں اچھا ہے کہ آپس میں جھگڑا ہو، کہیں مار پیٹ ہو جائے تو تھانہ پولیس ہو، بندھے بندھے پھرو، سب کی چوری بنتی سنو، عدالت کی دھول پھانکو، کھیتی باڑی

جہنم میں جائے۔اس کا ہیرا پر تو کوئی بس نہ تھا مگر دھنیا کو تو بل سے کھینچ لا سکتا ہے۔ بہت ہو گا گالیاں دے لے گی۔ ایک دو دن روٹھی رہے گی۔ تھانہ پولیس کی تو نوبت نہ آوے گی۔وہ جا کر ہیرا کے دروازے پر سب سے دور دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ایک فوجی افسر کی طرح میدان میں آنے سے پہلے حالات کو بخوبی سمجھ لینا چاہتا تھا۔ اگر اپنی جیت ہو رہی ہے تو کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ ہار ہوری ہے تو فوراً کود پڑے گا۔ دیکھا تو وہاں پچاسوں آدمی جمع ہو گئے تھے۔ پنڈت داتا دین، لالہ پٹیشری، دونوں ٹھاکر جو گاؤں کے کرتا دھرتا تھے، سبھی پہنچ گئے تھے۔ دھنیا کا پلہ ہلکا ہو رہا تھا۔اس کی تندی رائے عامہ کو اس کے خلاف کئے دیتی تھی۔ وہ لڑائی کے فن میں طاق نہ تھی، غصے میں ایسی جلی کٹی سنا رہی تھی کہ لوگوں کی ہمدردی اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

وہ گرج رہی تھی۔''تو ہمیں دیکھ کر کیوں جلتا ہے۔ہمیں دیکھ کر کیوں تیری چھاتی پھٹتی ہے؟ پال پوس کر جوان کر دیا، یہ اس کا انام (انعام) ہے؟ ہم نے پالا ہوتا تو آج کہیں بھیک مانگتے ہوتے، روکھ کی چھانہہ بھی نہ ملتی۔''

ہوری کو یہ لفظ ضرورت سے زیادہ کڑے معلوم ہوئے۔ بھائیوں کو پالنا تو اس کا دھرم تھا، ان کے حصے کی جائیداد بھی تو اس کے ہاتھ میں تھی۔ کیسے نہ پالتا پوستا؟ دنیا میں کہیں منہ دکھانے والا رہتا۔ہیرا نے جواب دیا۔''ہم کسی کو کچھ نہیں جانتے۔تیرے گھر میں کتوں کی طرح ٹکڑا کھاتے تھے اور دن بھر کام کرتے تھے۔ یہ جانا ہی نہیں کہ لڑکپن اور جوانی کیسی ہوتی ہے۔ دن دن بھر سوکھا گوبر اکٹھا کرتے تھے۔ اس پر بھی تو بناوس گالی دیئے روٹی نہ دیتی تھی۔تجھ جیسی پاپا چن کے پالے پڑ کر جند

گی (زندگی) کڑوی ہوگئی۔''

دھنیا اور تیز پڑی۔ ''جبان (زبان) سنبھال نہیں تو منہ سے باہر کھینچ لوں گی۔ لپساچن تیری عورت ہوگی۔ تو ہے کس پھیر میں مونڈی کاٹے، ٹکڑا خور نمک حرام!''

داتا دین نے ٹوکا۔ ''اتنا کڑوا بچن کیوں کہتی ہے دھنیا؟ استری کا دھرم ہے کہ گم (غم) کھائے۔ وہ تو اجڈ ہے، کیوں اس کے منہ لگتی ہے۔''

لالہ پٹیشری پٹواری نے تائید کی۔ ''بات کا جواب بات ہے، گالی نہیں، تو نے لڑکپن میں اسے پالا پوسا، پر یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ اس کی جائیداد تیرے ہاتھ میں تھی؟''

دھنیا نے سمجھا کہ سب کے سب مل کر مجھے نیچا کھانا چاہتے ہیں۔ پس چومکھی لڑائی لڑنے کے لیے تیار ہوگئی۔ ''اچھا تم رہنے دو لالا! میں سب کو پہچانتی ہوں۔ اس گاؤں میں رہتے بیس برس ہو گئے، ایک ایک کی نس پہچانتی ہوں۔ میں گالی دے رہی ہوں اور وہ پھول برسا رہا کیوں؟''

ڈلاری سیٹھانی نے آگ پر گھی ڈالا۔ ''سچ ہے بڑی گال وراج (زبان دراز) عورت ہے بھائی، مردوں کے منہ لگتی ہے۔ ہوری ہی جیسا مرد ہے کہ اس کا نباہ ہوتا ہے۔ دوسرا ہوتا تو ایک نہ پٹتی۔''

اگر ہیرا اس وقت ذرا نرم پڑ جاتا تو اس کی فتح ہو جاتی، لیکن وہ گالیاں سن سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اوروں کو اپنیطرف دیکھ کر وہ کچھ شیر ہو رہا تھا۔ گلا پھاڑ کر بولا۔ ''چلی جا میرے دروارے سے، نہیں تو جوتوں سے بات کروں گا۔ جھونڈا پکڑ کر اکھاڑ لوں گا۔ گالی دیتی ہے ڈائن؟ بیٹے کا گھمنڈ ہو گیا۔ کھون (خون).....''

پانسہ پلٹ گیا۔ ہوری کا خون جوش میں آ گیا' جیسے بارود میں چنگاری پڑ گئی ہو۔ آگے بڑھ کر بولا۔ ''اچھا، بس اب چپ ہو جاؤ ہیرا! اب نہیں سنا جاتا۔ میں اس عورت کو کیا کہوں؟ جب میری پیٹھ میں دھول لگتی ہے تو اسی کے کارن۔ نجانے کیوں اس سے چپ نہیں رہا جاتا۔''

چاروں طرف سے ہیرا پر بوچھاڑ پڑنے لگی۔ داتا دین نے بے غیرت کہا، پٹیشری نے غنڈا بنایا، جھنگری سنگھ نے شیطان کا لقب دیا، دلاری نے کپوت کہا۔ ایک کڑے لفظ نے دھنیا کا پلہ ہلکا کر دیا تھا۔ دوسرے کڑوے لفظ نے ہیرا کو پستی میں ڈال دیا۔ پر ہوری کے سنجیدہ الفاظ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

ہیرا سنبھل گیا۔ کل گاؤں اس کے خلاف ہو گیا ہے۔ اب چپ رہنے میں ہی خیریت ہے، غصے کے تیز نشے میں بھی اس میں اتنا ہوش باقی تھا۔

دھنیا کا کلیجہ دونا ہو گیا۔ ہوری سے بولی۔ ''سن لو کان کھول کے، بھائیوں کے لیے مرتے رہتے ہو، یہ بھائی ہیں؟ ایسے بھائی کا تو نہ دیکھے۔ یہ مجھے جوتوں سے مارے گا۔ کھلا پلا کر.....''

ہوری نے ڈانٹا۔ ''پھر کیوں نہیں جاتی؟''

دھنیا زمین پر بیٹھ گئی اور فریاد کے لہجے میں بولی۔ ''اب تو تیرے جوتے کھا کر گھر جاؤں گی اور جرا (ذرا) اس کی مردمی دیکھ لوں۔ کہاں ہے گوبر؟ اب کس دن کام آوے گا؟ تو دیکھ رہا ہے بیٹا کہ اب تیری ماں کو جوتے مارے جا رہے ہیں!''

اس طرح فریاد کر کے اس نے اپنے غصے کے ساتھ ہوری کے غصے کو بھی عملی صورت دے دی۔ آگ کو پھونک کر اس میں لپٹ پیدا کر دی۔ ہیرا ہارا ہوا سا پیچھے

ہٹ گیا تھا۔ پنی اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف کھینچ رہی تھی۔ یکا یک دھنیا نے شیر نی کی طرح جھپٹ کر ہیرا کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ دھم سے زمین پر گر پڑا اور بولی۔ ''کہاں جاتا ہے؟ جوتے مار! مار جوتے! دیکھوں تیری مردمی!''

ہوری نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا گھر کی طرف چلا۔

(5)

ادھر گوبر کھانا کھا کر ہیرا ٹولہ جا پہنچا۔ آج جھنیا سے اس کی بہت باتیں ہوئی تھیں۔ جب وہ گائے لے کر چلا تھا تو جھنیا آدھے راستہ تک اس کے ساتھ آئی تھی۔ گوبر تنہا گائے کو کیسے لے جاتا، اجنبی کے ساتھ جانے میں اس کا بھڑکنا قدرتی تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد جھنیا نے گوبر کو بھید بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''اب تم کاہے کو یہاں آؤ گے؟''

ایک روز پہلے تک گوبر کنوارا تھا۔ گاؤں میں جتنی جوان عورتیں تھیں، وہ یا تو اس کی بہنیں تھیں یا بھاوجیں۔ بہنوں سے تو کوئی چھیڑ چھاڑ ہو ہی کیا سکتی تھی۔ بھاوجیں البتہ کبھی کبھی اس سے ٹھٹھولی کیا کرتی تھیں مگر یہ محض تفریحا ہوتا تھا۔ ان کی نگاہوں میں ابھی اس کے شباب میں صرف پھول لگتے تھے۔ جب تک پھل نہ لگ جائیں اس پر ڈھیلے پھینکنا اور کسی طرف سے حوصلہ افزائی نہ پا کر اس کے گلے سے لپٹا ہوا تھا۔ جنیا کا محروم دل جیسے بھاوجوں کے طنز و مذاق نے اور بھی خواہشمند بنا دیا تھا۔ اس کے کنوارے پن ہی پر للچا اٹھا۔ اس کنوارے پن میں بھی

پتے کے کھڑکتے ہی کسی سوئے ہوئے شکاری جانور کی طرح شباب جاگ اٹھا۔

گوبر نے کھلے منچلے پن کے ساتھ کہا۔ ''اگر بھکاری کو ملنے کا آسرا ہو تو وہ دن بھر اور رات بھر داتا کے دوارے پر کھڑا رہے۔''

جھنیا معروضانہ لہجہ میں بولی۔ ''تو یہ کہو کہ تم بھی مطلب کے یار ہو۔''

گوبر کی رگوں کا خون متحرک ہوا تھا، بولا۔ ''بھوکا آدمی اگر ہاتھ پھیلائے تو اسے چھما کر دینا چاہیے۔''

جھنیا اور گہری اتری۔ ''بھکاری جب تک دس دروازے نہ جائے اس کا پیٹ کیسے بھرے گا؟ ایسے بھکاریوں کو منہ نہیں لگاتی۔ ایسے تو گلی گلی ملتے ہیں۔ پھر بھکاری دیتا کیا ہے؟ ایسیں، ایسیوں سے تو کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔''

کم فہم گوبر جھنیا کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ جھنیا چھوٹی ہی سی تھی، جبھی سے گاہکوں کے گھر دودھ لے کر جایا کرتی تھی۔ سسرال میں بھی اسے گاہکوں کے گھر دودھ پہنچانا پڑتا تھا۔ آج کل دہی بیچنے کا بار اسی پر ہے۔ اسے طرح طرح کے انسانوں سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ دو چار روپے اس کے ہاتھ لگ جاتے تھے۔ گھڑی بھر کے لیے دل بہلاوا بھی ہو جاتا تھا۔ مگر یہ خوشی جیسے منگنی کی چیز ہو۔ اس میں امید نہ تھی، ایثار نہ تھا، اختیار نہ تھا۔ وہ ایسی محبت چاہتی تھی جس کے لیے وہ جئے اور مرے، جس پر وہ خود کو قربان کر دے! وہ صرف جگنو کی چمک نہیں بلکہ چراغ کی مستقل روشنی چاہتی تھی۔ وہ ایک گرہست کی لڑکی تھی اور اس کے گرہست پن کو رنگیں مزاجوں کی لگاوٹیں کچل نہ سکی تھیں۔

گوبر نے پرشوق بشرے سے کہا۔ ''بھکاری کو ایک ہی دوارے پر بھر پیٹ

بھیک مل جائے تو کیوں دردر گھومے؟''

جھنیا نے رحم سے اس کی طرف دیکھا۔ کتنا بھولا ہے، جیسے کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ بولی۔ ''بھکاری کو ایک جگہ بھر پیٹ کہاں ملتا ہے؟ اسے تو مٹھی ہی بھر ملے گا۔ سب کچھ تو جبھی پاؤ گے، جب اپنا بھی سب کچھ دو گے؟''

''میرے پاس کیا ہے، جھنیا؟''

''تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ میرے لیے تمہارے پاس جو کچھ ہے، وہ بڑے بڑے لکھ پتی لوگوں کے پاس بھی نہیں۔ مجھ سے بھیک نہ مانگ کر مجھے مول لے سکتے ہو۔''

گوبر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

جھنیا نے پھر کہا۔ ''اور جانتے ہو دام کیا دینا ہوگا۔ میرا ہو کر رہنا پڑے گا، پھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے دیکھوں گی تو گھر سے نکال دوں گی۔''

گوبر کو جیسے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے چاہی ہوئی چیز مل گئی۔ ایک عجیب خوف بھری خوشی سے اس کا عضو عضو بھڑک اٹھا۔ مگر یہ کیسے ہوگا؟ جھنیا کو رکھ لے تو رکھنی (خولہ) کو لے کر گھر میں رہے گا کیسے؟ برادری کا جھنجھٹ تو ہے۔ سارا گاؤں کائیں کائیں کرنے لگے گا۔ سبھی دشمن ہو جائیں گے۔ اماں تو اسے گھر میں گھسنے ہی نہ دیں گی، مگر جب عورت ہو کر یہ نہیں ڈرتی تو مرد ہو کر وہ کیوں ڈرے؟ بہت ہوگا، لوگ اسے الگ کر دیں گے۔ وہ الگ ہی رہے گا۔ جھنیا جیسی عورت گاؤں میں دوسری کون ہے؟ کتنی سمجھداری کی باتیں کرتی ہے۔ کیا جانتی نہیں کہ میں اس کے لائک (لائق) نہیں ہوں؟ پھر بھی مجھ سے محبت کرتی ہے، میری

ہونے کو راجی (راضی) ہے۔ گاؤں والے نکال دیں گے' تو کیا دنیا میں دوسرا گاؤں ہی نہیں ہے؟ اور گاؤں کیوں چھوڑے؟ ماتا دین نے چمارن رکھ لی تو کسی نے کیا کرلیا؟ داتا دین دانت پیس کر رہ گئے۔ ماتا دین نے اتنا ضرور کیا کہ اپنا دھرم بچالیا۔ اب بھی بنا اسنان (اشنان) پوجا کیے بنا منہ میں پانی نہیں ڈالتے۔ دونوں جون اپنا کھانا آپ پکاتے ہیں اتو راب تو الگ کھانا بھی نہیں پکاتے۔ داتا دین اور وہ ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ جھنگری سنگھ نے باٹھی (برہمنی) رکھ لی، ان کا کسی نے کیا کرلیا؟ ان کا جتنا آدر تب تھا' اتنا اب بھی ہے بلکہ اور ادھ۔ پہلے نوکری کھوجتے پھرتے تھے، اب اس کے روپے سے مہاجن بن بیٹھے۔ ٹھکرائی کا رعب تو تھا ہی، مہاجنی کا عرب بھی جم گیا۔ مگر پھر خیال آیا کہ کہیں جھنیا ہنسی نہ کر رہی ہو۔ پہلے اس کا اطمینان ہو جانا ضروری تھا۔

اس نے پوچھا۔ ''من سے کہتی ہو جھونا کہ کھالی (خالی) لالچ دے رہی ہو؟ میں تو تمہارا ہو چکا، اب تم بھی میری ہو جاؤ گی؟''

''تم میرے ہو چکے؟ کیسے جانوں؟''

''تم جان بھی مانگو تو دے دوں۔''

''جان دینے کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟''

''تم سمجھا دو نا۔''

''جان دینے کا مطلب ہے ساتھ رہ کر نباہ کرنا، ایک بار ہاتھ پکڑ کر عمر بھر نباہ کرتے رہنا، چاہے دنیا کچھ کہے، چاہے ماں باپ، بھائی بند، گھر دوار سب کچھ چھوڑنا پڑے، منہ سے جان دینے والے بہتوں کو دیکھ چکی ابھوزوں کی طرح

پھول کا رس لے کر اڑ جاتے ہیں۔تم بھی تو اسی طرح نہ اڑ جاؤ گے؟''

گوبر کے ایک ہاتھ میں گ ائے کی رسی تھی۔دوسرے ہاتھ میں اس نے جھنیا کا ہاتھ پکڑ لیا۔جیسے بجلی کے تار پر ہاتھ پڑ گیا ہو، سارا بدن شباب کے اولیں مس سے کانپ اٹھا۔کتنی نرم و نازک اور بھری ہوئی کلائی !جھنیا نے اس کا ہاتھ ہٹایا نہیں، جیسے اس چھونے کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔پھر لمحہ بھر بعد سنجید گی سے بولی'' آج تم نے میرا ہاتھ پڑا ہے، یاد رکھنا۔''

''خوب یاد رکھوں گا۔جھونا اور مرتے دم تک نباہوں گا۔''

جھنیا بے اعتباری کی مسکراہٹ سے بولی۔''اسی طرح تو سب کہتے ہیں گوبر، بلکہ اس سے بھی میٹھے چکنے شبدوں (لفظوں) میں۔اگر من میں کپٹ ہو تو مجھے بتا دو،۔ہشیار ہو جاؤں۔ایسوں کو دل نہیں دیتی، ان سیت وہنس بول لینے کا ناتا رکھتی ہوں۔برسوں سے دودھ لے کر ہاٹ جاتی ہوں۔ایک سے ایک بابو، مہاجن، ٹھاکر، وکیل، اعلیٰافسر اپنی چاہ دکھا کر مجھے پھنسالینا چاہتے ہیں،۔کوئی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے۔''جھنیا تر سامت۔'' کوئی مجھے سیلی چتون سے گھورتا ہے جیسے پریم کے مارے بے سدھ ہو گیا ہو۔کوئی گہنے۔سب میری گلامی (غلامی) کرنے کو تیار رہتے ہیں، عمر بھر، بلکہ دوسرے جنم میں بھی! پر میں بھی! پر میں ان سبھوں کی نس پہچانتی ہوں۔سب کے سب بھونرے ہیں۔رس لے کر اڑ جانے والے میں بھی انہیں لبھاتی ہوں، ترچھی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی مسکاتی ہوں، وہ مجھے گدھی بناتے ہیں۔میں انہیں الو بناتی ہوں۔میں مر جاؤں تو ان کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے گا۔وے مر جائیں تو میں کہوں گی کہ اچھا ہوا مر گیا۔میں تو جس کی ہو جاؤں

گی‘ اس کی جنم بھر کے لیے ہو جاؤں گی۔ سکھ میں، دکھ میں، سمپت میں، بپت میں، اسی کے ساتھ رہوں گی۔ ہرجائی نہیں ہوں کہ سب سے ہنستی بولتی پھروں۔ نہ روپے کی بھوکی ہوں، نہ گہنے کپڑے کی۔ بس بھلے آدمی کا ساتھ چاہتی ہوں جو مجھے اپنا سمجھتے اور جسے میں بھی اپنا سمجھوں۔ ایک پنڈت جی بہت تلک چھاپا لگاتے ہیں آڈھ سیر دودھ لیتے ہیں۔ ایک دن ان کی گھر والی کہیں نیوتے میں گئی تھی۔ مجھے کیا معلوم؟ اور دنوں کی طرح دودھ لیے بھیتر چلی گئی۔ وہاں پکارتی ہوں، بہو جی! بہو جی! کوئی بولتا ہی نہیں۔ اتنے میں دیکھتی ہوں تو پنڈت جی باہر کواڑ بند کیے چلے آرہے ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ اس کی نیت بری ہے۔ میں نے ڈانٹ کر چوچھا۔ ’’تم نے کواڑ کیوں بند کر لیے؟ بہو جی کہیں گئی ہیں کیا؟ گھر میں سناٹا کیوں ہے؟‘‘

اس نے کہا۔ ’’وہ ایک نیوتے میں گئی ہیں‘‘ اور میری طرف دو ڈگ (قدم) اور بڑھ آیا۔

میں نے کہا۔ ’’تمہیں دودھ لینا ہو تو لو نہیں تو میں جاتی ہوں۔‘‘

بولا۔ ’’آج تو یہاں سے نہ جانے پاؤ گی جھونا رانی! روج روج (روز روز) کلیجے پر چھری چلا کر بھاگ جاتی ہو۔ آج میرے ہاتھ سے نہ بچو گی۔‘‘

تم سے سچ کہتی ہوں گوبر، میرے روئیں کھڑے ہو گئے۔

گوبر جوش میں بولا۔ ’’میں بچہ کو دیکھ پاؤں تو کھود کر گاڑ دوں، کھون (خون) پی لوں۔ تم مجھے دکھا دینا۔‘‘

’’سنو تو، ایسوں کا منہ توڑنے کے لیے میں ہی بہت ہوں۔ میری چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔ یہ کچھ کر بیٹھے و کیا کروں گی؟ کوئی چلانا بھی نہ سنے گا۔ پر

من میں پکا کرلیا تھا کہ مریل دیہہ (بدن) چھوئی تو دودھ بھری ہانڈی اس کے منہ پر پٹک دوں گی۔ چار پانچ سیر دودھ جائے گا تو جائے، بچہ کویا دتو ہو جائے گا۔ کلیجہ کڑا کر کے بولی۔ ''اس پھیر میں نہ رہنا پنڈت جی! میں اہیر کی لڑکی ہوں، مونچ کا ایک ایک بال چنوالوں گی۔ یہی لکھا ہے تمہارے پوتھی پترے میں کہ دوسروں کی بہو بیٹی کو اپنے گھر میں بند کر کے اس کی آبرو لو؟ اسی لیے تلک چھاپے کا جال بچھائے بیٹھے ہو؟ لگا ہاتھ جوڑنے، پاؤں پڑنے۔ بولا۔ ''ایک چاہنے والے کا من رکھ لوگی تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔ جھونا رانی؟ کبھی کبھی گریبوں (غریبوں) پر دیا کیا کرو۔ نہیں بھگوان پوچھیں گے کہ میں نے تمہیں اتنا روپ کا دھن دیا تھا۔ تم نے اس سے ایک برہمن کا اپکار بھی نہیں کیا، تو کیا جواب دو گی؟ بولو! روپے پیسے کا دان تو سدا ہی پاتا ہوں، آج روپ کا دان دو۔''

میں نے یوں ہی من پر کھنے کو کہہ دیا کہ میں پچاس روپے لوں گی۔ سچ کہتی ہوں گوبر کہ وہ اسی دم کوٹھڑی میں گیا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر میرے ہاتھوں میں دینے لگا۔ اور جب میں نے نوٹ وہیں گرا دیئے اور دوارے کی طرف چلی تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں تو پہلے ہی تیار تھی۔ ہانڈی اس کے منہ پر دے ماری، سر سے پاؤں تک سرابور ہو گیا۔ چوٹ بھی بہت لگی۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور لگا ہائے ہائے کرنے۔ میں نے دیکھا کہ اب یہ کچھ نہیں کر سکتا تو پیٹھ میں دو لاتیں جما دیں اور کواڑ کھول کر بھاگی۔''

گوبر قہقہہ لگا کر بولا۔ ''بہت اچھا کیا تم نے۔ دودھ سے نہا گیا ہو گا۔ تلک چھاپا بھی دھل گیا ہو گا۔ مونچھیں بھی کیوں نہ اکھاڑ لیں؟''

''دوسرے دن پھر میں اس کے گھر گئی۔ گھر والی آ گئی۔ وہ اپنے بیٹھک میں سر پر پٹی باندھے پڑا تھا۔ میں نے کہا کہو تو کل کی تمہارے کرتوت کھول دوں پنڈت! لگا ہاتھ جوڑنے۔ میں نے کہا۔ اچھا تھوک کر چاٹو تو چھوڑ دوں۔ دھرتی پر ماتھا ٹیک کر کہنے لگا۔ اب میری آبرو تمہارے ہاتھ ہے۔ جھونا یہ سمجھ لو کہ پنڈتانی مجھے جیتا نہ چھوڑیں گی، مجھے بھی اس پر دیا آ گئی۔''

گوبر کو یہ دیا بری لگی، بولا۔ ''یہ تم نے کیا کہا۔ اس کی عورت سے جا کر کہہ کیوں نہ دیا کہ جوتوں سے پیٹتی۔ ایسے پاکھنڈیوں پر دیا نہ کرنی چاہیے۔ تم مجھے کل اس کی صورت دکھا دو۔ پھر دیکھنا کہ کیسی مرمت کرتا ہوں۔''

جھنیا نے اس کے ادھ کھلے شباب کو دیکھ کر کہا۔ ''تم اسے نہ پاؤ گے۔ پورا دیو ہے، سنیت میت کا مال اڑاتا ہے کہ نہیں۔''

گوبر اپنے شباب کی یہ تحقیر کیسے برداشت کرتا؟ ڈینگ مار کر بولا۔ ''موٹے ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ یہاں پولاد (فولاد) کی ہڈیاں ہیں۔ تین سو ڈنڈ روج (روز) مارتا ہوں۔ دودھ گھی نہیں ملتا، نہیں تو اب تک سینہ یوں نکل آیا ہوتا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا سینہ تان کر دکھایا۔

جھنیا نے تقویت بھری آنکھوں سے دیکھا۔ بولی۔ ''اچھا کبھی دکھا دوں گی۔ پر یہاں تو سبھی ایک سے ہیں۔ تم کس کس کی مرمت کرو گے؟ نہ جانے مردوں کی کیا عادت ہے کہ جہاں کوئی جوان سندر عورت دیکھی اور بس لگے گھورنے، چھاتی پیٹنے۔ اور یہ جو بڑے آدمی کہلاتے ہیں یہ تو نرے کچالی ہوتے ہیں۔ پھر میں تو کوئی سندری بھی نہیں ہوں.....''

گوبر نے احتجاج کیا۔ ''تم! تمہیں دیکھ کر تو جی یہی چاہتا ہے کہ کلیجے میں بٹھا لیں۔''

جھنیا نے اس کی پیٹھ پر ایک ہلکا سا گھونسہ جمایا۔ ''لگے اوروں کی طرح تم بھی چاپلوسی کرنے۔ میں جیسی کچھ ہوں، میں جانتی ہوں۔ پر ان لوگوں کو تو کوئی بھی جوان عورت مل جائے، گھڑی بھر من بہلانے کو اور کیا چاہیے؟ گن تو آدمی اس میں دیکھتا ہے جس کے ساتھ جنم بھر نباہ کرنا ہو۔ سنتی بھی ہوں اور دیکھتی بھی ہوں آج کل بڑے گھروں کا عجب حال، جس محلے میں میری سسرال ہے اسی میں گپڈو گپڈو نام کے کاشمیری (کشمیری) رہتے تھے۔ بڑے بھاری آدمی تھے۔ ان کے یہاں پانچ سیر دودھ لگتا تھا۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں۔ کوئی بیس بیس پچیس پچیس برس کی، ایک سے ایک سندر، تینوں بڑے کالج میں پڑھنے جاتی تھیں۔ ایک سایت (شاید) کالج میں پڑھاتی تھی اور تین سو کا مہینہ پاتی تھی۔ ستاروے سب بجاویں، ہارمونیاوے سب بجاویں، ناچیں وے، گاویں وے، پر بیاہ کوئی نہ کرتی تھی۔ رام جانے وہ کسی مرد کو پسند نہ کرتی تھیں کہ مرد انہیں پسند نہ کرتے تھے۔ ایک بار میں نے بڑی بی سے پوچھا تو ہنس کر بولیں کہ ہم لوگ یہ روگ نہیں پالتے۔ پر بھیتر ہی بھیتر گل چھرے اڑاتی تھیں۔ جب دیکھو دو چار لونڈے ان کو گھیرے ہوتے۔ جو سب سے بڑی تھی وہ تو کوٹ پتلون پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر مردوں کے ساتھ گھومنے جاتی۔ سارے شہر میں ان کی لیلا کا چرچا تھا۔ گپڈو بابو سر نیچا کیے، جیسے منہ پر کالکھ سی لگائے رہتے تھے۔ لڑکیوں کو ڈانٹتے تھے، سمجھاتے تھے، وے سب کی سب کھل کھلا کہتی تھیں کہ تمہیں ہمارے بیچ میں بولنے کا کچھ مجال نہیں، ہم

اپنے من کی رانی ہیں۔ جو ہمارا جی چاہے کریں گے۔ بیچارہ باہ جوان جوان لڑکیوں سے کیا بولے؟ مارنے باندھنے سے رہا، ڈانٹنے ڈپٹنے سے رہا۔ پر بھائی بڑے آدمیوں کی باتیں کون چلاوے؟ وہ جو کچھ کریں سب ٹھیک ہے۔ انہیں تو برادری اور پنچایت کا بھی ڈر نہیں ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا کہ کسی کا روج روج (روز روز) من کیسے بدل جاتا ہے۔ کیا آدمی گائے بکری سے بھی گیا بیتا ہو گیا؟ پر کسی کو برا نہیں کہتی، بھائی من کو جیسا بناؤ ویسا بنتا ہے۔ ایسوں کو بھی دیکھتی ہوں جنہیں سدا کی دال روٹی کے بعد کبھی کبھی منہ کا سواد (ذائقہ) بدلنے کے لیے حلوا پوری بھی چاہیے اور ایسوں کو بھی دیکھتی ہوں جنہیں گھر کی روٹی دال دیکھ کر جوڑی آتی ہے۔ کچھ بچاریاں ایسی بھی ہیں جو اپنی دال روٹی ہی میں مگن رہتی ہیں۔ حلوا پوری سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ میری دونوں بھاوجوں ہی کو دیکھو۔ ہمارے بھائی کبڑے نہیں ہیں۔ دس جوانوں میں ایک جوان ہیں۔ پر بھاوجوں ہی کو دیکھو۔ ہمارے بھائی کان کی سونے کی بالیاں بنوائے، مہین ساڑھیاں لاوے اور روج چاٹ کھلاوے۔ بالیا اور ساڑھیاں اور مٹھائیاں مجھے بھی کم اچھی نہیں لگتیں مگر جو کہو کہ اس کے لیے اپنی لاج بیچتی پھروں تو بھفوان اس سے بچاویں۔ ایک کے ساتھ روکھا سوکھا کھا کر عمر کاٹ دینا، بس اپنا تو یہی راگ ہے۔ بہت کر کے تو مرد ہی عورتوں کو گگاڑتے ہیں۔ جب مرد ادھر ادھر تاک جھانک کرے گا تو عورت بھی آنکھیں لڑائے گی۔ مرد دوسری عورت کے پیچھے دوڑے گا تو عورت بھی دوسرے مرد کے پیچھے دوڑے گی۔ مرد کا ہرجائی ہونا عورت کو بھی دوسرے لگتا ہے جتنا عورت کا مرد کو۔ یہی سمجھ لو میں نے تو اپنے آدمی سے ساپھ ساپھ (صاف)

(صاف) کہہ دیا تھا کہ اگر تم ادھر ادھر لپکے تو میرے بھی جو جی میں آوے گا کروں گی۔ جو یہ چاہو کہ تم تو اپنے من کی کرو اور عورت کو مار کے ڈر سے اپنے بس میں رکھو تو یہ نہ ہوگا، تم کھلے کھجانے (خزانے) کرتے ہو، وہ چھپ کر کرے گی۔ تم اسے جلا کر سکھی نہیں رکھ سکتے۔"

گوبر کے لیے یہ ایک نئی دنیا کی باتیں تھیں۔ محو ہو کر سن رہا تھا۔ کبھی کبھی تو آپ ہی آپ اس کے پاؤں رک جاتے، پھر چیت کر چلنے لگتا۔ جھنیا نے پہلے اسے اپنے روپ پر موہ لیا تھا۔ آج اس نے تجربے سے بھری باتوں اور اپنی عصمت پروری کے ذکر سے اسے اپنا گرویدہ بنالیا۔ ایسے روپ، گن اور گیان والی عورت اسے مل جائے تو دھنیہ بھاگ! پھر وہ کیوں پنچایت اور برادری سے ڈرے؟

جھنیا نے جب دیکھ لیا کہ اس کا رنگ گہرا جم گیا تو سینے پر ہاتھ رکھ کر زبان کو دانت سے کاٹتی ہوئی بولی۔

"ارے یہ تو تمہارا گاؤں آ گیا! تم بھی بڑے چالاک ہو، مجھے کہا بھی نہیں کہ لوٹ جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ لوٹ پڑی۔

گوبر نے اصرار سے کہا۔ "چھن (لمحہ) بھر کے لیے میرے گھر کیوں نہیں چلتی؟ اماں بھی تو دیکھ لیں۔"

جھنیا نے شرم سے آنکھیں چرا کر کہا۔ "تمہارے گھر یوں نہ جاؤں گی۔ مجھے تو یہی اچرج ہوتا ہے کہ میں اتنی دور کیسے آ گئی۔ اچھا بتاؤ، اب کب آؤ گے؟ رات کو

میرے دروا جے (دروازے) پر اچھی سنگت ہو گی چلے آنا۔ میں اپنے پچھواڑے ملوں گی۔"

"اور جو نہ ملیں؟"

"تو لوٹ آنا۔"

"تو پھر میں آؤں گا۔"

"آنا پڑے گا۔ نہیں تو کہے دیتی ہوں! ہاں!"

"تم بھی بچن دو گی کہ ملو گی۔"

"میں بچن نہیں دیتی۔"

"تو میں بھی نہیں آتا۔"

"میری بلا سے۔"

جھنیا انگوٹھا دکھا کر چل دی۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے پر اپنا اپنا اقتدار قائم کر چکے تھے۔ جھنیا جانتی تھی کہ وہ آئے گا؟ گوبر جانتا تھا کہ وہ ملے گی۔ کیسے نہ ملے گی؟

جب وہ تنہا گائے کو ہانکتا ہوا چلا تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ بہشت سے گر پڑا ہو۔

(6)

جیٹھ کی گرم شام سمری کی سڑکوں اور گلیوں میں پانی کے چھڑکاؤ سے سرد و

شاداب ہو رہی تھی۔ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں اور پودوں کے گملے سجا دیئے گئے تھے اور بجلی کے پنکھے چل رہتے تھے۔ رائے صاحب اپنے کارخانے میں بجلی بنوا لیتے تھے۔ ان کے سپاہی پیلی وردیاں پہنے اور نیلے صافے باندھے عوام پر رعب جماتے پھرتے تھے۔ نوکر سفید کرتے پہنے اور زعفرانی رنگ کی پگڑیاں باندھے مہمانوں اور مکھیوں کی خاطر و مدارات کر رہے تھے۔ اس وقت ایک موٹر صدر دروازے کے سامنے آ کر رکا اور اس میں سے تین اصحاب اترے۔ وہ جو کھدر کا کرتا اور چپل پہنے ہوئے ہیں، ان کا نام پنڈت اونکار ناتھ ہے۔ آپ بجلی نامے روزنامے کے مشہور معروف ایڈیٹر ہیں جنہیں دیش کی چنتا نے گھلا ڈالا ہے۔ دوسرے صاحب جو کوٹ پتلون میں ہیں، وہ ہیں تو وکیل مگر وکالت نہ چلنے کے سبب ایک بیمہ کمپنی کی دلالی کرتے ہیں اور تعلقداروں کو مہاجنوں اور بینکوں سے قرض دلانے میں وکالت سے کہیں زیادہ کمائی کر لیتے ہیں۔ ان کا نام ہے شیم بہاری ٹھکھا اور تیسرے صاحب جو ریشمی اچکن اور چست پاجامہ پہنے ہوئے ہیں مسٹر بی مہتا یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ یہ تینوں صاحب رائے صاحب کے ہم سبقوں میں ہیں اور شگون کے جلسے میں مدعو ہوئے ہیں۔ آج سارے علاقے کے اسامی آئیں گے اور شگون کے روپے نذر کریں گے رات کو دھنش یگیہ ہوگا اور مہمانوں کی دعوت ہوگی۔ ہوری نے پانچ روپے شگون کے دیئے ہیں اور ایک گلابی مرضائی پہنے، گلابی پگڑی باندھے، گھٹنے تک چھنی کا چھے، ہاتھ میں ایک کھرپی لیے اور چہرے پر پاؤڈر ملے راجہ جنک کا مالی بن گیا ہے اور گھمنڈ سے اتنا پھول اٹھا ہے' گویا کل جلسہ اسی کی بدولت ہو رہا ہے۔

رائے صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ دوہرے بدن کے اونچے آدمی تھے۔ گٹھا ہوا جسم، بارونق چہرہ، بلند پیشانی، گورا رنگ، اس پر شربتی ریشمی چادر خوب پھب رہی تھی۔

پنڈت اونکار ناتھ نے پوچھا۔ ''اب کے کون سا ناٹک کھیلے کا ارادہ ہے؟ میری دلچسپی کی تو یہاں وہی ایک چیز ہے۔''

رائے صاحب نے تینوں اصحاب کو خیمے کے سامنے کرسیوں پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو دھنش یگیہ ہوگا اور پھر اس کے بعد ایک مزاحیہ ڈرامہ۔ ناٹک تو کوئی اچھا نہ ملا۔ کوئی اتنا لمبا کہ شاید پانچ گھنٹوں میں نہ ختم ہو اور کوئی اتنا مشکل کے شاید یہاں ایک آدمی بھی اس کا مطلب نہ سمجھے۔ آخر میں نے خود ایک مزاحیہ ناٹک لکھ ڈالا جو دو گھنٹوں میں پورا ہو جائے گا۔''

اونکار ناتھ کو رائے صاحب کی ڈرامہ نگاری میں بہت شک تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ذہانت تو غریبی ہی میں چمکتی ہے، چراغ کی طرح جو اندھیرے ہی میں اپنی روشنی ظاہر کرتا ہے۔ بے پروائی سے منہ پھیر لیا، جسے چھپانے کی بھی انہوں نے کوشش نہیں کی۔

مسٹر ٹنکا ان بیکار باتوں میں نہ پڑنا چاہتے تھے۔ مگر پھر بھی رائے صاحب کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ اس کے متعلق انہیں کچھ کہنے کا حق ہے۔ بولے۔ ''ناٹک کوئی بھی اچھا ہو سکتا ہے، اگر اس کے ایکٹر اچھے ہوں۔ عمدہ سے عمدہ ناٹک برے ایکٹروں کے ہاتھ میں پڑ کر برا ہو سکتا ہے۔ اگر اس کے ایکٹر اچھے ہوں، تعلیمافتہ ایکٹریسیں نہیں آئیں ہمارے ناٹکی فن کا ادھار نہیں ہو سکتا۔ اب کے تو آپ نے

کونسل میں سوالوں کی دھوم مچادی میں تو دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی ممبر کا ریکاڈ اتنا شاندار نہیں ہے۔''

فلسفہ کے پروفیسر مسٹر مہتا اس تعریف کو سہہ نہ سکتے تھے۔ مخالفت تو کرنا چاہتے تھے مگر اصول کی آڑ لے کر۔ انہوں نے حال ہی میں ایک کتاب کئی سال کی محنت سے لکھی تھی۔ اس کی جتنی شہرت ہونی چاہیے تھی، اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوئی تھی جس سے وہ بہت مغموم تھے۔ بولے۔ ''بھئی میں سوالوں کا قائل نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری زندگی ہمارے اصولوں کے مطابق ہو۔ آپ کسانوں کے بہی خواہ ہیں، انہیں انواع واقسام کی مراعات دینا چاہتے ہیں۔ زمینداروں کے اختیارات چھین لینا چاہتے ہیں بلکہ انہیں تو آپ سماج کی نحوست کہتے ہیں۔ مگر پھر بھی آپ زمیندار ہیں۔ ویسے ہی زمیندار جیسے ہزاروں ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ کسانوں کے ساتھ رعایت ہونی چاہیے تو پہلے آپ خود شروع کریں۔ کسانوں کو نذرانہ لیے بغیر پٹے لکھ دیں۔ بیگار بند کر دیں، اضافہ لگان سے درگزر کریں، چراگاہیں چھوڑ دیں۔ مجھے ان لوگوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے جو باتیں کرتے ہیں کمیونسٹوں کی سی، مگر زندگی ہے رئیسوں کی سی، اتنی ہی عیش اور خودغرضی سے معمور!''

رائے صاحب کو صدمہ ہوا۔ وکیل صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ایڈیٹر صاحب کے منھ پر کالک سی لگ گئی۔ وہ خود اشتراکیت کے پجاری تھے مگر ہر گھر میں آگ نہ لگانا چاہتے تھے۔

ٹنکا نے رائے صاحب کی وکالت کی۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ رائے صاحب کا

اپنے آسامیوں کے ساتھ جتنا اچھا سلوک ہے، ویسا ہی اگر سبھی زمیندار برتیں تو یہ سوال ہی باقی نہ رہے۔''

مہتا نے ہتھوڑے کی دوسری چوٹ جمائی۔ ''مانتا ہوں، آپ کا اپنے آسامیوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ اس میں خودغرضی ہے یا نہیں؟ اس کا ایک سبب کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ دھیمی آنچ میں کھانا ذائقہ دار پکتا ہے؟ گڑ سے مارنے والا زہر سے مارنے والے کی بہ نسبت کہیں زیادہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ہم یا تو سوشلسٹ ہیں یا نہیں ہیں۔ ہیں تو ویسا ہی برتیں بھی ورنہ بکنا چھوڑ دیں۔ میں نقلی زندگی کے خلاف ہوں۔ اگر گوشت کھانا اچھا سمجھتے ہو تو کھاؤ اعلانیہ۔ برا سمجھتے ہو تو نہ کھاؤ۔ یہ تو میری سمجھ میں آتا ہے مگر اچھا سمجھنا اور چھپ کر کھانا یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اسے بزدلی بھی کہتا ہوں اور مکاری بھی جو دراصل ایک ہی ہیں۔''

رائے صاحب ایک صحبت یافتہ آدمی تھے۔ توہین اور صدمے کو صبر اور فراخدلی سے سہنے کی انہیں مہارت تھی۔ کچھ پس و پیش میں پڑ کر بولے۔ ''آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ مہتا جی! آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی صاف گوئی کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ مگر آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسری مسافتوں کی طرح خیالوں کی مسافت میں بھی منزلیں ہیں اور آپ ایک منزل کو چھوڑ کر دوسری منزل میں نہیں جا سکتے۔ انسانی زندگی کی تاریخ اس کا ایک بین ثبوت ہے۔ میری پرورش اس ماحول میں ہوئی ہے جہاں بادشاہ خدا ہے اور زمیندار خدا کا مشیر ہے۔ میرے والد مرحوم اسامیوں پر بہت دیا کرتے تھے کہ پالے سوکھے میں کبھی نصف اور کبھی پورا لگان

معاف کر دیتے تھے۔ اپنے ذخیرے سے اناج نکال کر اسامیوں کو کھلا دیتے تھے۔ گھر کے زیور بیچ کر لڑکیوں کے بیاہ میں مدد دیتے تھے۔ مگر یہ سب اسی وقت تک' جب تک انہیں سرکار اور دھرماوتار کہتی رہے۔ انہیں اپنا دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرتی رہے۔ رعایا کو پالنا ان کا سناتن دھرم تھا مگر اختیار کے نام پر وہ کوڑی کا دندانہ بھی چھوڑ دینا نہ جانتے تھے۔ میں اسی ماحول میں پلا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں عملاً خواہ کچھ کروں مگر ارادوں میں ان سے آگے بڑھ گیا ہوں اور یہ ماننے لگا ہوں کے جب تک کسانوں کو یہ رعایتیں اختیاری شکل میں نہ ملیں گی' اس وقت تک صرف نیک خیالی کی بنیاد پر ان کی حالت میں سدھار نہیں ہوسکتا۔ اپنی خوشی سے بے غرض بن جانا تو مستثنیات میں سے ہے۔ میں خود اچھا خیال رکھتے ہوئے بھی اپنا سوارتھ نہیں چھوڑ سکتا اور چاہتا ہوں کہ ہمارے طبقے کو حکومت کی طاقت اور طرز عمل کے ذریعہ سے اپنا سوارتھ چھوڑ دینے کے لیے مجبور کر دیا جائے۔ اسے آہ بزدلی کہیں گے۔ میں مجبوری کہتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ کسی کو بھی دوسرے کی محنت پر موٹے ہونے کا حق نہیں ہے۔ دوسروں کے بل پر جینا انتہائی بے غیرتی ہے۔ کام کرنا جملہ جانداروں کا دھرم ہے۔ سماج کی وہ تقسیم تدوین جس میں کچھ لوگ مفت مزے اڑائیں اور بیشتر لوگ مرا کھپا کریں، کبھی راحت بخش نہیں ہوسکتی۔ پونجی اور تعلیم جسے میں پونجی ہی کا ایک پہلو سمجھتا ہوں، ان کا گڑھ جتنی جلد ٹوٹ جائے اتنا ہی اچھا۔ جنہیں پیٹ کی روٹی میسر نہیں' ان کے افسر دس دس پانچ پانچ ہزار پاتے ہیں، یہ ہنسنے کے قابل ہے اور شرم کے بھی۔ اس نظام نے ہم زمینداروں میں کتنی عیش پسندی، کتنی بدچلنی، کتنی غلامی اور کتنی بے شرمی بھر دی

ہے۔ یہ میں خوب جانتا ہوں۔ مگر میں ان ہی وجوہ سے اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ اپنے سوارتھ کے خیال سے بھی اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ اس شان کو نبھانے کے لیے ہمیں اپنے ضمیر کا اتنا خون کرنا پڑتا ہے کہ ہم میں خود داری کا انم بھی نہیں رہ گیا ہے۔ ہم اپنی آسامیوں کو لوٹنے کے لیے مجبور ہیں۔ اگر افسروں کو قیمتی قیمتی ڈالیاں نہ دیں تو باغی سمجھے جائیں گے۔ اور شان و شوکت سے نہ رہیں تو کنجوس کہلائیں۔ انقلابی تحریک کی ذرا سی آہٹ پر ہم کانپ اٹھتے ہیں اور افسروں کے پاس فریاد لے کر دوڑتے ہیں کہ ہمیں اپنے پر اعتبار نہیں رہا اور نہ ہم میں مردانگی ہی رہ گئی ہے۔ بس ہماری حالت ان بچوں کیسی ہے جنہیں چمچ سے دودھ پلا کر پالا جاتا ہے۔ دیکھنے میں مگر واقعی کمزور، بے بس اور محتاج!''

مہتا نے تالی بجا کر کہا۔ ''ہیئر ہیئر (سنو سنو) آپ کی زبان میں جتنی عقل ہے، کاش اس کی نصف بھی زبان میں ہوتی! افسوس یہی ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ اپنے خیالات پر عمل نہیں کر سکتے۔''

اونکار ناتھ بولے۔ ''اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ مسٹر مہتا! ہمیں وقت کے ساتھ چلنا بھی ہے اور اسے اپنے ساتھ چلانا بھی ہے۔ برے ہی کاموں میں مدد کی ضرورت نہیں ہوتی، اچھے کاموں کے لیے بھی مدد کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ آپ ہی کیوں آٹھ سو روپے مہینے ہڑپ کرتے ہیں جبکہ آپ کے کروڑوں بھائی صرف آٹھ روپے میں اپنا نباہ کر رہے ہیں؟''

رائے صاحب نے ظاہراً افسوس لیکن باطنی اطمینان سے ایڈیٹر صاحب کو دیکھا اور بولے۔ ''شخصی باتوں کی تنقید نہ کیجے، ایڈیٹر صاحب! ہم یہاں سماج کے

نظام پر غور کر رہے ہیں۔''

مسٹر مہتا ویسے ہی ٹھنڈے دل سے بولے۔ ''نہیں میں اسے برا نہیں سمجھتا۔ سماج شخصوں سے بنتا ہے اور شخص کو بھول کر ہم کسی نظام پر غور نہیں کر سکتے۔ اسی لیے اتنی تنخواہ لیتا ہوں کہ میرا اس نظام پر اعتقاد نہیں ہے۔''

ایڈیٹر صاحب کو حیرت ہوئی۔ ''اچھا تو آپ موجودہ نظام کے حامی ہیں۔''

میں اس اصول کا حامی ہوں کے دنیا میں چھوٹے بڑے ہمیشہ رہیں گے اور انہیں ہمیشہ رہنا چاہیے۔ اسے مٹانے کی کوشش کرنا بنی نوح انسان کی تباہی کا موجب ہوگا۔''

کشتی جوڑ بدل گیا۔ رائے صاحب الگ کھڑے ہو گئے اور ایڈیٹر صاحب اکھاڑے میں اترے۔ ''آپ اس بیسویں صدی میں اعلیٰ ادنیٰ کا فرق مانتے ہیں؟''

''جی ہاں، مانتا ہوں اور بڑے زوروں سے مانتا ہوں۔ جس مت کو آپ مانتے ہیں وہ بھی تو کوئی نیا مت نہیں ہے۔ جب سے انسان میں خودی کا ارتقاء ہوا' جبھی سے اس مت کا جنم ہوا۔ بدھ اور افلاطون اور عیسیٰ سبھی سماج میں مساوات کے مبلغ تھے۔ یونان اور روم اور شام سبھی نے اس کی آزمائش کی مگر غیر قدرتی ہونے کے سبب کبھی وہ دیر پا نہ رہ سکی۔''

''آپ کی باتیں سن کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔''

''تعجب نادانی کا دوسرا نام ہے۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس پر مضامین کا کوئی سلسلہ شروع کر

دیں۔''

''جی میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ اچھی رقم دلایئے تو البتہ۔''

''آپ نے اصول ہی ایسا کیا ہے کہ اعلانیہ عوام کو لوٹ سکتے ہیں۔''

''مجھ میں اور آپ میں فرق صرف اتنا ہے کہ میں جو کچھ مانتا ہوں، اس پر عمل کرتا ہوں اور آپ لوگ مانتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ دولت کو آپ کسی بے انصافی کے ذریعہ برابر پھیلا سکتے ہیں، مگر عقل، کردار خوبصوتی، ذہانت اور طاقت کو برابر پھیلا دینا تو آپ کی سکت سے باہر ہے۔ چھوٹے بڑے کا فرق صرف دولت ہی سے نہیں ہوتا۔ میں نے بڑے بڑے دولتمندوں کو فقیر کے سامنے گھٹنے ٹیکتے دیکھا ہے اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ حسن کی چوکھٹ پر بڑے بڑے راجے ناک رگڑتے ہیں۔ کیا یہ تمدنی افتراق نہیں ہے؟ عقل پہلے بھی حکومت کرتی تھی اور آگے بھی ہمیشہ کرے گی۔''

طشتری میں پان آ گئے تھے۔ رائے صاحب نے مہمانوں کو پان، الائچی دیتے ہوئے کہا۔ ''عقل اگر خودغرضی سے بری ہو تو ہمیں اس اقتدار ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ سوشلز کا یہی معیار ہے۔ ہم سادھو مہاتماؤں کے سامنے اس لیے سر جھکاتے ہیں کہ ان میں تیاگ (ترک) کامل ہے۔ اسی طرح ہم عقل کے ہاتھ میں اختیار اور وقار شخص کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے لیکن اس کی دولت بس بونے کے لیے اس کے بعد اور بھی طاقتور ہو جاتی ہے۔ عقل کے بغیر کوئی سماج نہیں چل سکتا، ہم تو صرف اس بچھو کا ڈنک توڑ دینا چاہتے ہیں۔''

دوسرا موٹر آ پہنچا اور مسٹر کھنا اترے جو ایک بینک کے منیجر اور شکر مل کے مینجنگ

ڈائریکٹر ہیں۔ دو عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ رائے صاحب نے ان دونوں کو اتارا۔ وہ جو کھدر کی ساڑھی پہنے ہوئی بہت متین دروا ندیش سی ہیں، مسٹر کھنا کی بیوی کامنی کھنا ہیں۔ دوسری جو اونچی ایڑی کا بوٹ پہنے ہوئے ہیں اور جس کے حسین چہرے سے ہنسی پھوٹی پڑتی ہے، مس مالتی ہیں، جو انگلستان سے ڈاکٹر پڑھ کر آئی ہیں اور اب پریکٹس کرتی ہیں۔ تعلقداروں کے محلوں میں ان کی بڑی آمدورفت ہے۔ آپ نئے جگ کی مجسم مورت ہیں۔ نازک اندام مگر شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی، جھجک کا کہیں نام بھی نہیں۔ وضع میں مکمل، بلا کی حاضر جواب، مردانہ جذبات کی ماہر، کھیل کود زندگی کا ماحصل سمجھنے والی، لبھانے اور جھانے کے فن میں طاق، جہاں روح کا مقام ہے وہاں ظاہرداری، جہاں دل کی جگہ ہے وہاں نازوانداز، دلی جذبات پر اچھا قابو جس میں رغبت یا خواہش کا فقدان سا ہو گیا ہے۔

آپ نے مسٹر مہتا سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''سچ کہتی ہوں، آپ صورت سے فلسفی معلوم ہوتے ہیں۔ اس نئی کتاب میں آتما کے ماننے والے کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ پڑھتے پڑھتے کئی بار دل میں آیا کہ آپ سے لڑ جاؤں۔ فلاسفروں میں ہمدردی کیوں نہیں ہوتی؟''

مہتا صاحب جھینپ گئے۔ کنوارے تھے اور نئے جگ کی عورتوں سے پناہ مانگتے تھے۔ مردوں کی جماعت میں خوب چہکتے تھے مگر جیوں ہی کوئی عورت آئی اور آپ کی زبان بند ہوئی، جیسے عقل پر قفل لگ جاتا تھا۔ عورتوں سے مہذبانہ سلوک تک کرنے کا ہوش نہ رہتا تھا۔

مسٹر کھنا نے پوچھا۔ ''فلاسفروں کی صورت میں کیا خاص بات ہوتی ہے، دیوی جی؟''

مالتی نے مہتا کی طرف رحم سے دیکھ کر کہا۔ ''مہتا جی! برا نہ مانیں تو بتادوں۔''

کھنا صاحب مس مالتی کے پرستاروں میں سے تھے۔ جہاں مس مالتی جائیں، وہاں کھنا کا پہنچنا لازمی تھا۔ ان کے آس پاس بھونرے کی طرح منڈلاتے رہتے تھے۔ ہر وقت ان کی یہی خواہش رہتی تھی کہ مالتی سے زیادہ سے زیادہ وہی بولیں اور اس کی نگاہ زیادہ سے زیادہ ان ہی پر رہے۔

کھنا نے آنکھ جھپکا کر کہا۔ ''فلسفی کسی بات کا برا نہیں مانتے۔ ان میں یہی تو وصف ہے۔''

''تو سنئے۔ فلسفی ہمیشہ مردہ دل ہوتے ہیں۔ جب دیکھئے اپنے خیالوں میں غرق بیٹھے ہیں! آپ کی طرف تاکیں گے مگر آپ کو دیکھیں گے نہیں، آپ ان سے باتیں کیے جائیں لیکن وہ کچھ سنیں گے نہیں، جیسے خلا میں اڑ رہے ہوں۔''

سب لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ مہتا صاحب گویا زمین پر گڑ گ!

''آکسفورڈ میں میرے فلسفہ کے پروفیسر مسٹر ہسپینڈ تھے.....!''

کھنا نے ٹوکا۔ ''نام تو نرالا ہے۔''

''جی ہاں اور تھے کنوارے.....''

''مسٹر مہتا بھی تو کنوارے.....''

''یہ روگ سبھی فلاسفروں کو ہوتا ہے۔''

اب مہتا کو موقع ملا۔ بولے۔ ''آپ بھی تو اسی مرض میں مبتلا ہیں؟''

''میں نے عہد کیا ہے کہ کسی فلاسفر ہی سے شادی کروں گی اور یہ طبقہ شادی کے بعد گھبراتا ہے۔ ہسبینڈ صاحب عورت کو دیکھ کر گھر میں چھپ جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں کئی لڑکیاں تھیں۔ اگر ان میں سے کوئی کبھی کچھ پوچھنے کے لیے ان کے دفتر میں چلی جاتی تو آپ ایسے گھبرا اٹھتے جیسے کوئی شیر آ گیا ہو۔ ہم لوگ انہیں خوب چھیڑتے تھے مگر تھے بیچارے بڑے ہی سادہ مزاج کئی ہزار کی آمدنی تھی مگر میں نے انہیں سدا ایک ہی سوٹ پہنے دیکھا۔ ان کی ایک بیوہ بہن تھی۔ وہی ان کے گھر کا سارا انتظام کرتی تھی۔ مسٹر ہسبینڈ کو تو کھانے پینے کی فکر ہی نہ رہتی تھی۔ لنے والوں کے ڈر سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے لکھا پڑھا کرتے تھے۔ کھانے کا وقت آ جاتا تو ان کی بہن آہستہ سے اندر کے دروازے سے ان کے پاس جا کر ان کی کتاب بند کر دیتی تھی۔ جبھی انہیں معلوم ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت آ گیا۔ رات کو بھی کھانے کا وقت مقرر تھا۔ ان کی بہن کمرے کی بتی بجھا دیا کرتی۔ ایک دن بہن نے کتاب بند کرنا چاہی تو آپ نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبا لیا اور بہن بھائی زور آزمائی ہونے لگی۔ آخر بہن ان کی پھیہ دار کرسی کو کھینچ کر کھانے کے کمرے میں لے گئی۔''

رائے صاحب بولے۔ ''مگر مہتا صاحب تو بڑے خلیق اور خوش مزاج ہیں' ورنہ اس ہنگامے میں کیوں آتے؟''

''تو آپ فلاسفر نہ ہوں گے۔ جب اپنے تفکرات سے ہمارے سر میں درد ہونے لگتا ہے تو پھر دنیا بھر کی فکر سر پر سوار کر کے کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے؟''

ادھر ایڈیٹر صاحب مسز کھنا صاحبہ سے اپنی مالی پریشانیوں کی داستان کہہ رہے

تھے۔ ''بس یوں سمجھئے شریمتی جی کہ ایڈیٹر کی زندگی ایک طویل فریاد ہے جسے سن کر لوگ رحم کے عوض کانوں پر ہاتھ دھر لیتے ہیں۔ بیچارہ نہ اپنا بھلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کا۔ پبلک اس سے امید تو یہی رکھتی ہے کہ ہر تحریک میں وہ سب سے آگے رہے۔ جیل جائے، مار کھائے، گھر کا مال اسباب قرق کرائے، یہ اس کا فرض سمجھا جاتا ہے، مگر اس کی مشکلات کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ ہو تو وہ سب کچھ، اسے ہر علم وفن کا ماہر بھی ہونا چاہیے مگر اسے زندہ رہنے کا حق نہیں۔ آپ تو آج کل کچھ لکھتی ہی نہیں۔ خوش نصیبی سے آپ کی خدمت کرنے کا جو تھوڑا بہت موقع مجھے مل سکتا ہے، اس سے آپ مجھے کیوں محروم رکھتی ہیں؟''

شریمتی کھنا کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ اس ناطے سے ایڈیٹر صاحب کبھی کبھی ان سے مل لیا کرتے تھے، لیکن گھر کام دھندوں میں مصروف رہنے کے سبب ادھر بہت دنوں سے وہ کچھ لکھ نہ سکی تھیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب ہی نے انہیں حوصلہ دلا کر شاعر بنایا تھا۔ فطری ذکاوت ان میں بہت کم تھی۔

''کیا لکھوں؟ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ آپ نے کبھی مس مالتی سے کچھ لکھنے کو نہیں کہا؟''

ایڈیٹر صاحب نے بے رخی سے کہا۔ ''ان کا وقت قیمتی ہے، کامنی دیوی! لکھتے تو وہ لوگ ہیں جن کے دل میں کچھ درد ہے، پریم ہے، لگن ہے اور گیان ہے۔ جنہوں نے دولت اور عیش وعشرت کو زندگی کا مقصد بنا لیا، وہ کیا لکھیں گے؟''

کامنی نے حسد آمیز تمسخرانہ سے کہا۔ ''اگر آپ ان سے لکھا سکیں تو آپ کے اخبار کی اشاعت دونی ہو جائے۔ لکھنو میں تو ایسا کوئی طبیعت دار نہیں ہے جو آپ کا

گاہک نہ بن جائے۔''

''اگر دولت میری زندگی کا مقصد ہوتی تو آج میں اس حالت میں نہ ہوتا۔ مجھے بھی دھن کمانے کا ڈھنگ معلوم ہے۔ آج چاہوں تو لاکھوں کما سکتا ہوں۔ مگر یہاں تو دولت کو کبھی کچھ سمجھا ہی نہیں۔ ادبی خدمت میری زندگی کا مقصد ہے اور رہے گا۔''

''کم سے کم میرا نام تو گاہکوں میں لکھا دیجئے۔''

''آپ کا نام گاہکوں میں نہیں، مربیوں میں لکھوں گا۔''

''مربیوں میں رانیوں، مہارانیوں کو رکھئے جن کی ذرا سی خوشامد کر کے آپ اپنے اخبار کو نفع کی چیز بنا سکتے ہیں۔''

''میری رانی مہارانی آپ ہیں۔ میں تو آپ کے سامنے کسی رانی مہارانی کی حقیقت نہیں سمجھتا جس میں دیا اور گیان ہے۔ وہ میری رانی مہارانی ہے۔ خوشامد سے مجھے نفرت ہے۔''

کامنی نے چٹکی لی۔ ''لیکن میری خوشامد تو آپ کر رہے ہیں ایڈیٹر صاحب۔''

ایڈیٹر نے متانت سے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ خوشامد نہیں ہے شریمتی جی! دل کے سچے جذبات ہیں۔''

رائے صاحب نے پکارا۔ ''ایڈیٹر صاحب ذرا ادھر آئیے گا، مس مالتی آپ سے کچھ کہتی ہیں۔''

ایڈیٹر کی وہ سب اکڑ غائب ہوگئی۔ عجز و انکساری کی مورت بنے ہوئے جا کر کھڑے ہو گئے۔ مالتی نے انہیں ترحمانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''میں ابھی کہہ

رہی تھی کہ دنیا میں مجھے سب سے زیادہ ڈرائیڈیٹر صاحب سے لگتا ہے۔ آپ لوگ جسے چاہیں، ایک منٹ میں بگاڑ دیں۔ مجھی سے چیف سیکرٹری نے ایک دفعہ کہا۔ ''اگر میں اس بلا ڈی اور انکارنا تھ کو جیل میں بند کر سکوں تو خود کو خوش نصیب سمجھو ں۔''

اونکا ناتھ کی بڑی بڑی مونچھیں تن گئیں اور آنکھوں میں غرور کی چمک آ گئی۔ یوں وہ بڑے متحمل مزاج آدمی تھے، مگر چیلنج سن کر ان کی مردانگی متحرک ہو جاتی تھی۔ استقلال کے لہجے میں بولے۔ ''اس مہربانی کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس بزم میں اپنا ذکر تو ہوتا ہے۔ خواہ کسی طرح ہو۔ آپ سیکرٹری صاحب سے کہہ دیجئے گا کہ اونکارناتھ ان آدمیوں میں نہیں ہیں جو ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جائے گا۔ اس کا قلم اسی وقت رکے گا، جب اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گا۔ اس نے بے انصافی اور ظلم کو جڑ سے کھود کر پھینک دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔''

مس مالتی نے اور اکسایا۔ ''مگر آپ کا یہ وطیرہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب آپ معمولی خوش اطواری سے حکام کی مدد حاصل کر سکتے ہیں تو کیوں ان سے کنی کاٹتے ہیں۔ اگر آپ اپنی تنقیدوں میں آگ اور زہر ذرا کم کر دیں تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کو سرکار سے کافی مدد دلا سکتی ہوں۔ پبلک کو تو آپ نے دیکھ لیا۔ اس سے اپیل کی، اس کی خوشامد کی، اپنی مشکلیں کہیں، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب ذرا حکام کو بھی آزما دیکھئے۔ تیسرے مہینے آپ موٹر پر نہ چلنے لگیں اور سرکاری دعوتوں میں مدعو نہ ہونے لگیں تو مجھے آپ جتنا چاہے کوسئے گا۔ تب یہی رئیس اور نیشنلسٹ جو آپ کی پروا نہیں کرتے، آپ کے مکان کا طواف کریں گے۔''

اونکار ناتھ نے گھمنڈ سے کہا۔ ''یہی تو میں نہیں کر سکتا دیوی جی! میں نے اپنے اصولوں کو ہمیشہ بلند اور پاک رکھا ہے اور جیتے جی ان کی حفاظت کروں گا۔ دولت کے پجاری تو گلی گلی میں ملیں گے۔ میں اصول کے پجاریوں میں ہوں۔''

''میں اسے مکر کہتی ہوں۔''

''آپ کی خوشی۔''

''دھن کی آپ کو پروا نہیں؟''

''اصولوں کا خون کرتے نہیں۔''

''تو آپ کے اخبار میں بدیسی چیزوں کے اشتہار کیوں ہوتے ہیں؟ میں نے کسی کے اور اخبار میں اتنے بدیسی اشتہار نہیں دیکھے۔ آپ بنتے تو ہیں بڑے اصول پرستم، مگر اپنے نفع کے لیے دیس کا دھن بدیس بھیجتے ہوئے آپ کو ذرا بھی رنج نہیں ہوتا۔ آپ کسی دلیل سے اپنے اس طرز کو حق بجانب قرار نہیں دے سکتے۔''

اونکار ناتھ کے پاس سچ مچ کوئی جواب نہ تھا۔ انہیں بغلیں جھانکتے دیکھ کر رائے صاحب نے ان کی مدد کی۔

''تو آخر آپ کیا چاہتی ہیں؟ ادھر بھی مارے جائیں اور ادھر بھی مارے جائیں تو اخبار کیسے چلے؟''

مس مالتی نے رحم کرنا سیکھا تھا۔ بولی۔ ''اخبار نہیں چلتا تو بند کر دیجیے۔ اپنا اخبار چلانے کے لیے آپ کو بدیسی چیزوں کے پرچار کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر آپ مجبور ہیں تو اصول پرست اخباروں کو دیکھ کر جل اٹھتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ

دیا سلائی دکھادوں۔ جو شخص قول فعل میں یکسانیت نہیں رکھتا' وہ اور چاہے جو کچھ ہو' اصول پرست نہیں ہے۔''

مہتا کھل اٹھے۔ ذرا دیر قبل انہوں نے خود اس خیال کو پیش کیا تھا۔ انہیں معلوم ہوا کہ اس عورت میں سوچنے کی سکت بھی ہے۔ یہ صرف تتلی نہیں ہے۔ تامل دور ہو گیا۔ بولے۔ ''یہی بات میں ابھی کہہ رہا تھا۔ قول فعل میں یکسانیت نہ ہونا ہی دغا ہے، مکاری ہے۔''

مالتی خوش ہو کر بولی۔ ''تو اس بارے میں آپ اور ہم ایک ہیں، تو میں بھی فلاسفر ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہوں؟''

کھنا کی زبان کھجلا رہی تھی۔ بولے۔ ''آپ کا ایک ایک عضو فلسفے میں ڈوبا ہوا ہے۔''

مالتی نے ان کی راس کھینچی۔ ''اچھا آپ بھی فلسفے کو گنگا جی کے حوالے کر بیٹھے' ورنہ آپ اتنے بینکوں اور کمپنیوں کے ڈائریکٹر نہ ہوتے۔''

رائے صاحب نے کھنا کو سہارا دیا۔ ''تو آپ سمجھتی ہیں کہ فلاسفروں کو ہمیشہ فاقہ مست رہنا چاہیے۔''

''جی ہاں! فلاسفر اگر رغبت پر فتح نہ پا سکتے تو فلاسفر کیسا؟''

''اس لحاظ سے تو شاید مہتا صاحب بھی فلاسفر نہ ٹھہریں۔''

مہتا نے آستین چڑھا کر کہا۔ ''میں نے تو کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا رائے صاحب! میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ جن اوزاروں سے لوہار کام کرتا ہے' ان اوزاروں سے سنار نہیں کرتا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آم بھی اسی حالت میں

پھولے پھلے جیسے ببول یا تاڑ؟ میرے لیے دولت صرف ان آسانیوں کا نام ہے جن میں اپنی زندگی کو بامعنی بنا سکوں۔ دولت میرے لیے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی چیز نہیں بلکہ صرف ذریعہ ہے۔ مجھے دولت کی بالکل خواہش نہیں۔ آپ صرف ایسے ذرائع مہیا کریں جن سے میں اپنی زندگی کو کام کی چیز بنا سکوں۔''

اونکار ناتھ سوشلسٹ تھے۔ شخصی فضیلت کو کیسے مان سکتے تھے؟ ''اسی طرح ہر مزدور کہہ سکتا ہے کہ اسے کام کرنے کی آسانیوں کی غرض سے ایک ہزار ماہوار کی ضرورت ہے۔''

''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس مزدور کے بغیر آپ کا کام نہیں چل سکتا تو آپ کو وہ آسانیاں دینی پڑیں گی۔ اگر وہی کام دوسرا مزدور کم مزدوری میں کر دے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ پہلے مزدور کی خوشامد کریں۔''

''اگر مزدوروں کے ہاتھ میں اختیار رہوتا تو مزدوروں کے لیے عورت اور شراب بھی اتنی ہی ضروری ہو جاتیں جتنی فلاسفروں کے لیے؟''

''تو آپ یقین کیجئے میں اس سے حسد نہ کرتا۔''

''جب آپ کی زندگی باطنی ہونے کے لیے عورت اس قدر ضروری ہے تو آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

مہتا نے بے تامل کہا۔ ''اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ آزادانہ عیش کوشی روح کے ارتقاء میں رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ شادی تو روح اور زندگی کو پنجرے میں بند کر دیتی ہے۔''

کھنا نے تائید کی۔ ''پابندی اور نفس کشی پرانی تھیوریاں ہیں۔ نئی تھیوری ہے

آزادانہ عیش کوشی۔''

مالتی نے چوٹی پکڑی۔''تو آپ ہی کریں گے؟''

کامنی نے مالتی کی طرف زہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور منہ سکیڑ لیا گویا کہہ رہی ہوں۔''کھنا تمہیں مبارک رہیں، مجھے پروا نہیں۔''

مالتی نے مہتا کی طرف دیکھ کر کہا۔''اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے مسٹر مہتا؟''

مہتا متین بن گئے۔وہ کسی مسئلے پر اپنی رائے دیتے تھے تو گویا اپنی کل جان اسی میں ڈال دیتے تھے۔بولے۔''بیاہ کو میں سماجی سمجھوتہ سمجھتا ہوں، جسے رد کرنے کا اختیار نہ مرد کو ہے، نہ عورت کو۔سمجھوتہ کرنے سے پہلے آپ آزاد ہیں مگر اس کے بعد آپ کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔''

''تو آپ طلاق کے خلاف ہیں اصول؟''

''بالکل۔''

''اور آزادانہ عیش پرستی والا اصول؟''

''وہ ان کے لیے ہے جو بیاہ نہیں کرنا چاہتے۔''

''اپنی روح کا کامل ارتقاء سبھی چاہتے ہیں، پھر بیاہ کون کرے اور کیوں کرے؟''

''اسی لیے آزادی سبھی چاہتے ہیں، مگر ایسے بہت کم ہیں جو لالچ کو روک سکیں۔''

''آپ بہت کسے سمجھتے ہیں، ازدواج کو یا تجرد کو؟''

''سماجی اعتبار سے ازدواج کو اور شخصی نقطہ خیال سے تجرد کو۔''

دھنش یگیہ کا وقت قریب تھا۔ دس سے ایک بجے تک دھنش یگیہ اور ایک سے تین بجے تک ناٹک، یہ پروگرام تھا۔ کھانے کی تیاری شروع ہوئی مہمانوں کے لیے بنگلے میں الگ الگ رہنے کا انتظام تھا۔

کھنا صاحب اور ان کی پارٹی کے لیے دو کمرے تھے۔ اور بھی کتنے ہی مہمان آ گئے تھے۔ سبھی اپنے اپنے کمرے میں گئے۔ دو کمرے تھے اور بھی تھے۔ کتنے ہی مہمان وہاں جا بیٹھے۔ یہاں چھوت چھات کا کوئی ذکر نہ تھا۔ سبھی ذات کے لوگ ایک ساتھ کھانا کھانے بیٹھے۔ صرف اونکار ایڈیٹر سب سے الگ کمرے میں پھلاہار کرنے چلے گئے اور کامنی کے سر میں درد تھا۔ پس اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ کھانے کے وقت مہمانوں کی تعداد پچیس سے کم نہ تھی۔ شراب بھی تھی۔ گوشت بھی تھا۔ اس جلسے کے لیے رائے صاحب عمدہ قسم کی شراب خاص طور پر تیار کراتے تھے۔ گوشت بھی کئی طرح کا پکتا تھا۔ کوفتہ، کباب اور پلاؤ۔ مرغ، بکرا، ہرن، تیتر، بٹیر، جسے جو پسند ہو، کھائے۔

کھانا شروع ہو گیا تو مالتی نے پوچھا۔ ''ایڈیٹر صاحب کہاں گئے؟ کسی کو بھیجئے رائے صاحب کہ انہیں پکڑ لائے۔'' رائے صاحب نے کہا۔ ''وہ ویشنو ہیں، انہیں یہاں بلا کر کیوں بیچارے کا دھرم بگاڑو گی۔ بڑا ہی دھرم کرم والا آدمی ہے۔''

''اجی اور کچھ نہ سہی، تماشا تو رہے گا۔''

یکا یک ایک صاحب کو اس نے دیکھ کر پکارا۔ ''آپ بھی تشریف رکھتے ہیں، مرزا خورشید، اچھا یہ کام آپ کے سپرد ہے۔ آپ کی لیاقت کا امتحان ہو جائے گا۔''

مرزا خورشید گورے چٹے آدمی تھے، بھوری مونچھیں، نیلی آنکھیں، دوہرا بدن، چاند پر کے بال صفا چٹ، چھ کلیا اچکن اور چوڑی دار پا جامہ پہنتے تھے۔ اوپر سے ہیٹ لگا لیتے تھے۔ کونسل کے ممبر تھے مگر وہاں بیشتر اوقات خراٹے ہی لیتے رہتے تھے۔ رائے دینے کے وقت چونک چونک پڑتے تھے۔ اور نیشنلسٹوں کی طرف سے بول دیتے تھے۔ صوفی تھے، دوبار حج کر آئے تھے مگر شراب خوب پیتے تھے۔ کہتے تھے کہ جب ہم خدا کا ایک حکم بھی کبھی نہیں مانتے تو دین کے لیے کیوں جان دیں؟ بڑے پر مذاق اور لا ابالی انسان تھے۔ پہلے بصرے میں ٹھیکے کا کام کرتے تھے۔ لاکھوں کمائے مگر شامت اعمال کے ایک میم سے آشنائی کر بیٹھے۔ مقدمہ بازی ہوئی۔ جیل جاتے جاتے بچے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ملک سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ جو کچھ جہاں تھا وہیں چھوڑا اور جو کچھ نکلے گا اسی میں زندگی کاٹ دیں گے' مگر ایجنٹوں نے جعل کر کے ان سے وہ پچاس ہزار بھی اینٹھ لیے۔ وہاں سے لکھنو چلے۔ گاڑی میں ایک مہاتما سے ملاقات ہوئی، انہوں نے سبز باغ دکھا کر ان کی گھڑی، انگوٹھیاں اور روپے سب اڑا دیئے۔

بیچارے لکھنو پہنچے تو جسم پر کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ رائے صاحب سے دیرینہ مراسم تھے۔ کچھ ان کی مدد سے کچھ اور دوستوں کی مدد سے ایک جوتے کی دکان کھول لی جو اب لکھنو کی سب سے زیادہ چلتی ہوئی دکان تھی۔ چار پانچ سو روزانہ کی بکری تھی۔ عوام کا تھوڑے ہی روز میں اتنا اعتقاد ہو گیا تھا کہ ایک بڑے بھاری مسلم تعلقدار کو نیچا دکھا کر کونسل میں پہنچ گئے تھے۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بولے۔ ''جی نہیں! میں کسی کا دین نہیں بگاڑتا۔ یہ کام آپ کو خود کرنا چاہیے۔ مزا تو

جب ہے کہ آپ انہیں شراب پلا کر چھوڑیں۔ یہ آپ کے معجزۂ حسن کی آزمائش ہے۔''

چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔ ''ہاں، ہاں، مس مالتی! آج اپنا کمال دکھایئے۔''

مالتی نے مرزا کو للکارا۔ ''کچھ انعام دو گے؟''

''سو روپے کی تھیلی۔''

''ہش سو روپے! لاکھ روپے کا دھرم بگاڑوں سو کے لیے؟''

''اچھا آپ خود اپنی فیس بتایئے؟''

''ایک ہزار، کوڑی کم نہیں۔''

''اچھا منظور۔''

''جی نہیں، لا کر مہتا صاحب کے ہاتھ میں رکھ دیجیے۔''

مرزا صاحب نے فوراً سو روپے کا نوٹ جیب سے نکالا اور اسے دکھاتے ہوئے کھڑے ہو کر بولے۔ ''بھائیو! یہ ہم سب مردوں کی عزت کا معاملہ ہے۔ اگر مس مالتی کی فرمائش نہ پوری ہوئی تو ہمارے لیے کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔ اگر میرے پاس روپے ہوتے تو میں مس مالتی کی ایک ایک ادا پر ایک ایک لاکھ روپے قربان کر دیتا۔ ایک قدیم شاعر نے اپنے معشوق کے ایک سیاہ خال پر سمرقند اور بخارا کے صوبے نچھاور کر دیئے تھے! آج آپ سبھی صاحبوں کی جوانمردی اور حسن پرستی کا امتحان ہے۔ جس کے پاس جو کچھ ہو، سچے سورما کی طرح نکال کر رکھ دے۔ آپ کو علم کی قسم اور معشوق کی اداؤں کی قسم اور اپنی عزت کی قسم، پیچھے

قدم نہ ہٹائیے۔ مردو! روپے خرچ ہو جائیں گے مگر نام ہمیشہ کے لیے رہ جائے گا۔ ایسا تماشا لاکھوں میں بھی سستا ہے، دیکھئے لکھنو کے حسینوی کی ملکہ ایک زاہد پرا پنے حسن کا جادو کیسے چلاتی ہے۔''

تقریر ختم کرتے ہی مرزا صاحب نے ہر ایک کی پاکٹ کی تلاشی شروع کر دی۔ پہلے مسٹر کھنا کی تلاشی ہوئی، ان کی جیب سے پانچ روپے نکلے۔

مرزا صاحب نے اداس ہو کر کہا۔ ''واہ کھنا صاحب واہ! نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ اتنی کمپنیوں کے ڈائریکٹر، لاکھوں کی آمدنی اور آپ کی جیب میں پانچ روپے، لاحول ولاقوۃ کہاں ہیں مہتا، آپ ذرا جا کر مسز کھنا سے کم سے کم سو روپے وصول کر لائیے۔''

کھنا کھسیا کر بولے۔ ''اجی ان کے پاس پیسہ بھی نہ ہوگا۔ کون جانتا تھا کہ آپ یہاں تلاشی لینا شروع کر دیں گے۔''

''خیر آپ خوش رہیے، ہم اپنی قسمت تو آزمالیں۔''

''اچھا تو میں جا کر ان سے پوچھتا ہوں۔''

''جی نہیں! آپ یہاں سے ہل نہیں سکتے۔ مسٹر مہتا! آپ فلاسفر ہیں ماہر علم النفس، دیکھئے اپنی بھد نہ کرائیے گا۔''

مہتا شراب پی کر مست ہو جاتے تھے تو اس مستی میں ان کا فلسفہ اڑ جاتا تھا اور زندہ دلی جاگ اٹھتی تھی۔ لپک کر مسز کھنا کے پاس گئے اور پانچ منٹ میں منہ لٹکائے آئے۔

مرزا نے پوچھا۔ ''ارے کیا خالی ہاتھ؟''

رائے صاحب ہنسے۔ ''قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے!''

مرزا نے کہا۔ ''ہو بڑے خوش نصیب کھنا، خدا کی قسم!''

مہتا نے قہقہہ لگایا اور جیب سے سو سو روپے کے پانچ نوٹ نکالے۔

مرزا نے دوڑ کر انہیں گلے لگا لیا۔

چاروں طرف سے آوازیں اٹھیں۔ ''کمال ہے! مانا ہوں استاد! کیوں نہ ہو' فلاسفر ہی تو ٹھہرے!''

مرزا نے نوٹوں کو آنکھوں سے لگا کر کہا۔ ''بھئی مہتا! آج سے میں تمہارا مرید ہو گیا۔ بتاؤ کیا جادو مارا؟'' مہتا اکڑ کر سرخ سرخ آنکھوں سے تاکتے ہوئے بولے۔ ''اجی کچھ نہیں، ایسا کونسا بڑا کام تھا؟ جا کر پوچھا، اندر آؤں؟ بولیں، آپ ہیں مہتا جی، آیئے۔ میں نے اندر جا کر کہا۔ وہاں لوگ برج کھیل رہے ہیں۔ مالتی پانچ سو روپیہ ہار گئی ہیں اور اپنی انگوٹھی بیچ رہی ہے' جو ہزار سے کم نہیں ہے۔ آپ نے تو دیکھی ہے بس وہی۔ آپ کے پاس روپے ہوں تو پانچ سو دے کر ایک ہزار کی چیز لے لیجیے۔ ایسا موقع پھر نہ ملے گا۔ مس مالتی نے اس وقت روپے نہ دیئے تو بے داغ نکل جائیں گے، بعد کو کون دیتا ہے؟ شاید اس لیے انہوں نے انگوٹھی نکالی ہو کہ پانچ سو روپے کس کے پاس دھرے ہوں گے۔ یہ سن کر وہ مسکرائیں اور جھٹ پٹ اپنی تھیلی سے پانچ نوٹ نکال کر دے دیئے اور بولیں' میں کچھ لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتی، نہ جانے کب کیا ضرورت پڑ جائے۔''

کھنا کھسیا کر بولے۔ ''جب ہمارے پروفیسروں کا یہ حال ہے تو یونیورسٹی کا ایشور ہی مالک ہے۔''

خورشید نے زخم پر نمک چھڑکا۔ ''ارے تو ایسی کون سی بڑی رقم ہے جس کے لیے آپ کا دل بیٹھا جاتا ہے؟ خدا جھوٹ نہ کہلائے تو یہ آپ کی ایک دن کی آمدنی ہے۔ بس سمجھ لیجئے گا کہ ایک دن بیمار پڑ گئے اور پھر روپیہ جائے گا بھی تو مس مالتی ہی کے ہاتھ میں اور آپ کے دردِ جگر کی دوا مس مالتی ہی کے پاس تو ہے۔'' مالتی نے ٹھوکر دی۔ ''دیکھئے مرزا جی! طویلے میں لتاہو ج اچھی نہیں۔''

مرزا نے دم ہلائی۔ ''کان پکڑتا ہوں مس صاحبہ!''

مسٹر ٹنخا کی تلاشی ہوئی۔ مشکل سے دس روپے نکلے۔ مہتا کی جیب سے صرف اٹھنی نکلی۔ کئی اصحاب نے ایک ایک دو دو روپیہ اپنے آپ دے دیئے۔ حساب جوڑا گیا تو تین سو کی کمی تھی۔ یہ کمی رائے صاحب نے فراخ دلی کے ساتھ پوری کر دی۔

ایڈیٹر صاحب نے میوے اور پھل کھائے تھے اور ذرا کمر سیدھی کر رہے تھے کہ رائے صاحب نے جا کر کہا۔ ''آپ کو مس مالتی یاد کر رہی ہیں۔''

وہ خوش ہو کر بولے ''زہے نصیب کہ مس مالتی مجھے یاد کر رہی ہیں۔''

رائے صاحب کے ساتھ ہی ہال میں پہنچ گئے۔

ادھر نوکروں نے میزیں صاف کر دی تھیں۔ مالتی نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔

ایڈیٹر نے انکسار دکھایا۔ بولے۔ ''بیٹھئے، تکلف نہ کیجیے۔ میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں؟''

مالتی نے عقیدت کے لہجے میں کہا۔ ''آپ تکلف سمجھتے ہوں گے، لیکن میں

سمجھتی ہوں کہ میں اپنی توقیر بڑھا رہی ہوں۔ یوں آپ اپنے کو کچھ نہ سمجھیں اور آپ کے لیے زیبا بھی یہی ہے۔ مگر یہاں جتنے لوگ جمع ہیں وہ سبھی آپ کی قومی اور ادبی خدمت سے خوب واقف ہیں۔ آپ نے اس دائرے میں جو اہم کام کیا ہے، خواہ ابھی لوگ اس کی قدر نہ کریں، لیکن وہ وقت بہت دور نہیں ہے بلکہ میرے خیال سے بہت قریب آ گیا ہے، جب ہر شہر میں آپ کے نام پر سڑکیں بنیں گی، کلب کھلیں گے اور ٹاؤن ہال میں آپ کی تصویر لٹکائی جائے گی۔ اس وقت جو کم و بیش بیداری ہے، وہ آپ ہی کی عظیم کوشش کا نتیجہ ہے۔ آپ کو یہ جان کو خوشی ہوگی کہ ملک میں اب آپ کے ایسے مقلد پیدا ہو گئے ہیں جو ''گرام سدھار'' کے کام میں آپ کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہیں اور ان سب کی بڑی خواہش ہے کہ یہ کام سنگھٹن کے ساتھ کیا جائے اور ان کے لیے گاؤں سدھار سبھا بنائی جائے جس کے آپ صدر رہوں۔''

اونکار ناتھ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں چوٹی کے آدمیوں میں اتنی عزت ملے۔ یوں وہ عام جلسوں میں کبھی کبھی بولتے اور کئی سبھاؤں کے سیکرٹری اور اسسٹنٹ سیکرٹری بھی تھے، مگر تعلیم یافتہ جماعت نے اب تک ان کی جانب اعتنائی برتی تھی۔ ان لوگوں میں کسی طرح وہ مل جل نہ پاتے تھے اور اسی لیے جلسوں میں ان کی کاہلی اور خودغرضی کی شکایت کیا کرتے تھے اور اپنے اخبار میں ایک ایک کو دھر گھسیٹتے تھے۔ قلم تیز تھا، کلمے سخت تھے، صاف گوئی کے بجائے ہرزہ گوئی کر بیٹھتے تھے۔ اس لیے لوگ انہیں خالی ڈھول سمجھتے تھے۔ اسی جماعت میں آج ان کی اتنی عزت! کہاں ہیں آج سوراج اور ہندوستان اور ہنٹر کے ایڈیٹر آ کر

دیکھیں اور اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں! آج یقیناً ان پر دیوتاؤں کی مہربانی ہے۔ نیک کوشش کبھی بیکار نہیں جاتی! یہ رشیوں کا قول ہے۔ وہ خود اپنی نظروں میں اٹھ گئے تھے۔ ممنونیت سے خوش ہو کر بولے۔ ''دیوی جی! آپ تو مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہیں۔ میں نے تو عوام کی جو کچھ خدمت کی، وہ اپنا فرض سمجھ کر کی ہے۔ اس عزت کو ذاتی نہیں بلکہ اس مقصد کی عزت کر رہا ہوں جس کے لیے میں نے اپنی زندگی قربان کر دی ہے، لیکن میری التجا ہے کہ صدرہ کا عہدہ کسی باعزت شخص کو دیا جائے۔ عہدہ پر میرا اعتقاد نہیں۔ میں تو خادم ہوں اور خدمت کرنا چاہتا ہوں۔''

مس مالتی اسے کسی طرح قبول نہیں کر سکتیں۔ صدر پنڈت جی کو بننا پڑے گا۔ شہر میں ایسا با اثر آدمی دوسرا دکھائی نہیں دیتا جس کے قلم میں جادو ہے اور جس کی شخصیت میں جادو ہے۔ وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ با اثر نہیں؟ وہ زمانہ گیا جب دولت اور اثر میں میل تھا۔ اب ذہانت اور اثر کے میل کا زمانہ ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو وہ صدارت ضرور قبول کرنی ہوگی۔ سیکرٹری مس مالتی ہوں گی۔ اس سبھا کے کے لیے ایک ہزار کا چندہ بھی ہو گیا ہے اور ابھی تو کل شہر اور صوبہ پڑا ہوا ہے۔ چار پانچ لاکھ مل جانا تو معمولی بات ہے!

اونکار ناتھ پر کچھ نہ سا چڑھنے لگا۔ ان کے دل میں جو ایک طرح کی ہنسی اٹھ رہی تھی، اس نے سنجیدہ ذمہ داری کی صورت اختیار کر لی۔ بولے۔ ''مگر آپ یہ سمجھ لیں مس مالتی کے یہ بڑ ذمہ داری کا کام ہے اور آپ کو اپنا بہت سا وقت دینا پڑے گا۔ میں اپنی جانب سے یقین دلاتا ہوں کہ آپ سبھا کے مقام پر مجھے سب سے پہلے موجود پائیں گی۔''

مرزا صاحب نے پچاڑا دیا۔ ''آپ کا بڑے سے بڑا دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتا آپ اپنا فرض ادا کرنے میں کبھی کسی سے پیچھے رہے۔''

مس مالتی نے دیکھا کہ شراب کا اثر کچھ کچھ ہو رہا تھا تو اور بھی سنجیدہ ہو کر بولیں۔ ''اگر ہم لوگ اس کام کی اہمیت نہ سمجھتے تو نہ یہ سبھا قائم ہوتی اور نہ آپ اس کے پریذیڈنٹ ہوتے۔ ہم کسی رئیس یا تعلقدار کو پریذیڈنٹ بنا کر روپیہ خوب بٹور سکتے اور خدمت کی آڑ میں اپنا مطلب پورا کر سکتے ہیں' مگر ہمارا یہ مقصد نہیں ہے۔ ہمارا واحد مقصد عوام کی خدمت کرنا ہے اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ آپ کا اخبار ہے۔ ہم نے طے کر لیا ہے کہ ہر شہر اور گاؤں میں اس کا پرچار کیا جائے اور جلد سے جلد اس کے گاہکوں کی تعداد بیس ہزار تک پہنچا دی جائے۔ صوبے کی کل میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے چیئرمین صاحبان ہمارے دوست ہیں۔ کئی چیئرمین یہیں موجود ہیں۔ اگر ہر ایک نے پانچ سو کاپیاں لے لیں تو پچیس ہزار کاپیاں تو آپ یقینی سمجھیں۔ پھر راجہ صاحب اور مرزا جی کی یہ صلاح ہے کہ اس کے متعلق کونسل میں یہ تجویز پیش کی جائے کہ ہر گاؤں کے لیے بجلی کی ایک کاپی سرکاری طور پر منگائی جائے یا کچھ سالانہ امداد منظور کی جائے، یقین کامل ہے کہ یہ تجویز پاس ہو جائے گی۔''

اونکار ناتھ نے جیسے نشہ میں جھومتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں گورنر کے پاس ڈیپوٹیشن لے جانا ہوگا۔ مسٹر خورشید بولے۔ ''ضرور ضرور!''

''ان سے کہنا ہوگا کہ کسی مہذب حکومت کے لیے یہ کتنی شرم اور بدنامی کی بات ہے کہ گرام سدھار کا واحد اخبار ہونے پر بھی 'بجلی' کی ہستی تک نہیں تسلیم کی

جاتی۔''

خورشید نے کہا۔''ضرور ضرور۔''

''میں گھمنڈ نہیں کرتا۔ ابھی گھمنڈ کرنے کا وقت نہیں آیا' پر مجھے اس کا دعویٰ ہے کہ دیہاتی سنگھٹن کے لیے 'بجلی' نے جتنا کام کیا ہے.....''

مسٹر مہتا نے اصلاح کی۔''نہیں جناب پتسیا کہیے!''

''مسٹر مہتا کا شکریہ ادا کرتا ہوں، ہاں اسے پتسیا ہی کہنا چاہیے۔ بڑی کھٹن پتسیا 'بجلی' نے جو پتسیا کی ہے وہ اس صوبے ہی کی نہیں بلکہ ملک کی تاریخ میں لاجواب ہے۔''

خورشید بولے۔''ضرور، ضرور!''

مس مالتی نے ایک پیگ اور دیا۔''ہماری سبھا نے یہ بھی طے کیا ہے کہ کونسل میں اب کے جو جگہ خالی ہو اس کے لیے آپ کو کھڑا کیا جائے۔ آپ کو صرف اپنی منظوری دینی ہوگی۔ باقی یہ کام ہم لوگ کرلیں گے۔ آپ کو نہ خرچ سے مطلب نہ پرچار سے، نہ دوڑ دھوپ سے۔''

اونکار ناتھ کی آنکھوں کی روشنی دونی ہوگئی، فخریہ انکسار سے بولے۔''میں لوگوں کا خادم ہوں، جو کام چاہے لے لیجیے۔''

''ہم لوگوں کو آپ سے ایسی ہی امید تھی۔ ہم اب تک فرضی دیوتاؤں کے سامنے ماتھا رگڑتے رگڑتے ہار گئے اور کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اب ہم نے آپ کی ذات میں اپنا سچا رہنما، سچا مرشد پایا ہے اور اس مبارک دن کی خوشی میں آج ہمیں یک دل اور یک زبان ہوکر اپنے غرور اور اپنی مکاری کو ترک کر دینا چاہیے۔ ہم میں

آج سے کوئی برہمن نہیں، کوئی شودر نہیں، کوئی ہندو نہیں، کوئی مسلمان نہیں، کوئی اونچا نہیں، کوئی نیچا نہیں۔ ہم سب لوگ ایک ہی ماں کے بچے، ایک ہی گود کے کھیلنے والے اور ایک ہی تھالی کے کھانے والے بھائی ہیں۔ جو لوگ تفریق پر اعتقاد رکھتے ہیں، جو لوگ علیحدگی اور کٹرپن کے قائل ہیں' ان کے لیے ہماری سبھا میں گنجائش نہیں۔ جس سبھا کے پریذیڈینٹ شری اونکارناتھ جی جیسے بڑے دل والے مہاشے ہوں' اس سبھا میں بڑے چھوٹے کا، کھانے پینے کا اور ذات پات کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اتحاد اور قومیت میں اعتقاد نہ رکھتے ہوں' وہ براہ کرم یہاں سے اٹھ جائیں۔''

رائے صاحب نے شبہ ظاہر کیا۔ ''میرے خیال میں اتحاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب لوگ کھانے پینے کا بچار چھوڑ دیں۔ میں شراب نہیں پیتا تو کیا مجھے اس سبھا سے الگ ہو جانا پڑے گا؟''

مالتی نے بے مروتی سے کہا۔ ''بے شک الگ ہو جانا پڑے گا! آپ اس سبھا میں رہ کر کسی طرح کا امتیاز نہیں رکھ سکتے۔''

مہتا نے گھڑے کو ٹھونکا۔ ''مجھے شک ہے کہ ہمارے پریذیڈنٹ خود ہی کھانے پینے کے اتحاد پر یقین نہیں رکھتے۔''

اونکارناتھ کا چہرہ زرد پڑ گیا، اس بدمعاش نے یہ کیا بے وقت کی شہنائی بجا دی؟ کمبخت کہیں گڑے مردے نہ اکھاڑنے لگے' ورنہ یہ ساری خوش نصیبی سپنے کی طرح خلا میں غائب ہو جائے گی۔

مس مالتی نے ان کے چہرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور استقلال

سے کہا۔ ''آپ کا یہ شک بے بنیاد ہے مہتا جی! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قومی اتحاد کا ایک بے نظیر حامی، ایسا فراخ دل شخص، ایسا طبیعت دار شاعران بیہودہ اور شرمناک تفریقوں کا قائل ہوگا؟ ایسا شک کرنا اس کی قومی پرستی کو ذلیل کرنا ہے۔''

اونکار ناتھ کا چہرہ چمک اٹھا، خوشی اور اطمینان کی جھلک دوڑ گئی۔

مالتی نے اسی لہجے میں کہا۔ ''اور اس سے بھی زیادہ ان کے مردانہ جذبات کی توہین کرنا ہے۔ ایک عورت کے ہاتھوں سے شراب کا پیالہ پا کر وہ کون مہذب شخص ہے جو انکار کر دے؟ یہ تو نسوانی طبقہ کی توہین ہوگی، اس طبقے کی جس کی نگاہ کے تیروں سے اپنے دل کو چھلنی بنانے کی خواہش بھی مردوں میں پائی جاتی ہے اور جس کی اداؤں پر مر مٹنے کی ہوس بڑے بڑے راجے مہاراجے تک رکھتے ہیں۔ لائیے بوتل اور گلاس اور دور چلنے دیجیے۔ اس مبارک موقع پر کسی طرح کا شبہ یا کسی طرح کا عذر، غداری سے کم نہیں ہے۔ پہلے ہم اپنے پریذیڈنٹ صاحب کی صحت کا جام پئیں گے۔''

شراب سوڈا اور برف پہلے ہی تیار تھا۔ مالتی نے اونکار ناتھ کو اپنے ہاتھوں سرخ زہر سے بھرا ہوا گلاس دیا اور انہیں کچھ ایسی جادو بھری چتون سے دیکھا کہ ان کا سارا اعتقاد اور نجی برتری کا سارا خیال کافور ہو گیا۔ دل نے کہا ''چال چلن ماحول کے تابع ہے۔ آج تم مفلس ہو، کسی موٹر کو گرد اڑاتے دیکھتے تو ایسا بگڑتے ہو کہ اسے پتھروں سے چور چور کر ڈالو گے لیکن کیا تمہارے دل میں موٹر کی تمنا نہیں ہے؟ ماحول ہی سب کچھ ہے، بقیہ کچھ نہیں! باپ دادوں نے نہیں پی تھی تو نہ پی ہو، انہیں ایسا موقع ہی کب ملا تھا؟ ان کا رزق تو پوتھی پتروں پر تھا۔ شراب لاتے کہاں

سے؟ اور پیتے بھی تو جاتے کہاں؟ پھر وہ تو ریل گاڑی پر نہ چڑھتے تھے۔ نل کا پانی نہ پیتے تھے۔ انگریزی پڑھنا گناہ سمجھتے تھے۔ زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ وقت کے ساتھ اگر نہیں چل سکتے تو وہ تمہیں پیچھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ایسی حسینہ کے نازک ہاتھوں سے اگر زہر بھی ملے تو اسے قبول کرنا چاہیے۔ جس خوش نصیبی کے لیے بڑے بڑے راجے مہاراجے ترستے ہیں، وہ آج ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ کیا وہ اسے ٹھکرا سکتے ہیں؟''

انہوں نے گلاس لیا اور سر جھکا کر اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے ایک ہی سانس میں پی گئے اور تب لوگوں کو متکبرانہ انداز سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں ''اب تو آپ کو مجھ پر یقین آیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں بالکل یونگا پنڈت ہوں؟ اب تو آپ مجھے مکار اور فریبی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے؟''

ہال میں ایسا شور و غل مچا کہ کچھ نہ پوچھو، جیسے پٹاری میں بند قہقہے نکل پڑے ہوں۔ ''واہ دیوی جی کیا کہنا! کمال ہے مس مالتی کمال ہے! توڑ دیا نمک قانون، توڑ دیا دھرم کا قلعہ، توڑ دیا پارسائی کا گھڑا۔''

اونکار ناتھ کے حلق کے نیچے شراب کا اترنا تھا کہ ان کے منچلے پن میں گویائی آ گئی۔ مسکرا کر بولے۔ ''میں نے اپنے دھرم کی امانت مس مالتی کے نازک ہاتھوں میں سونپ دی اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس کی واجبی حفاظت کریں گی۔ ان کے کنول سے قدموں پر میں ایسے ایک ہزار دھرموں کو نچھاور کر سکتا ہوں۔''

قہقہوں سے ہال گونج اٹھا۔

ایڈیٹر صاحب کا چہرہ پھولا ہوا تھا، آنکھیں جھکی پڑی تھیں۔ دوسرا گلاس بھر کے

بولے۔ ''یہ مس مالتی کا جام صحت ہے۔ آپ لوگ نوش کریں اور انہیں دعائیں دیں۔''

لوگوں نے پھر اپنے اپنے گلاس خالی کر دیئے۔

اسی وقت مرزا خورشید نے ایک مالا لا کر ایڈیٹر صاحب کے گلے میں ڈال دی اور کہا۔ ''صاحبو! فدوی نے ابھی اپنے معزز صدر صاحب کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے، اجازت ہو تو سنا دوں۔''

چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔ ''ہاں، ہاں، ضرور سنایئے۔''

اونکا ناتھ بھنگ تو آئے دن پیا کرتے تھے اور ان کا دماغ اس نشے کا عادی ہو گیا تھا، مگر شراب پینے کا پہلا ہی موقع تھا۔ بھنگ کا نشہ رفتہ رفتہ نیند کی طرح آتا تھا اور دماغ پر بادل کی طرح چھا جاتا تھا۔ احساس قائم رہتا تھا۔ انہیں خود معلوم ہوتا رہتا تھا کہ اس وقت ان کی تقریر بڑی لچھے دار ہے اور ان کا تخیل بہت بلند ہے۔ شراب کا نشہ ان پر شیر کی طرح جھپٹا اور دبوچ بیٹھا۔ کہتے کچھ ہیں اور منہ سے نکلتا کچھ ہے۔

پھر یہ بات بھی جاتری رہی۔ وہ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں، اس کا خیال ہی نہ رہ گیا۔ یہ خواب کے رومان والے عجائبات نہ تھے بلکہ بیداری کا وہ چکر تھا جس میں مجسم نا مجسم ہو جاتا ہے۔ خدا جانے یہ بات ان کے دماغ میں کیسے آ گئی کے قصیدہ پڑھنا کوئی بہت برا کام ہے۔ میز پر ہاتھ مار کر بولے۔ ''نہیں ہرگز نہیں، یہاں کوئی قصیدہ نہیں ہوگا۔ ہم پریذیڈنٹ ہیں۔ ہمارا حکم ہے۔ ہم ابی (ابھی) اس سبا (سبھا) کو توڑ سکتے ہیں۔ ابی (ابھی) توڑ سکتے ہیں۔ سبی (سبھی) کو نکال

سکتے ہیں۔کوئی ہمارا کچھ نہیں کرسکتا۔ہم پریذیڈنٹ ہیں،کوئی اور پریذیڈنٹ نئی (نہیں) ہے۔''

مرزا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔''حضور اس قصیدہ میں تو آپ کی تعریف کی گئی ہے۔''

ایڈیٹر صاحب نے سرخ مگر بے نور آنکھوں سے دیکھا۔''تم نے ہماری تعریپ (تعریف) کیوں کی؟ کیوں کی؟ بولو کیوں ہماری تعریپ (تعریف)؟ کسی کا نوکر نئیں (نہیں) ہم کسی سالے کا دیا نہیں کھاتے۔ہم خود ایڈیٹر ہیں۔ہم 'بجلی' کا ایڈیٹر ہے۔اس میں اس کا تعریپ کرے گا۔دیو جی! ہم تمہارا تعریپ نہیں کرے گا۔ہم کوئی بڑا آدمی نئی (نہیں) ہے۔ہم سب کا گلام (غلام) ہے۔ ہم آپ کے پاؤں کا دھول ہے۔مالتی دیوی ہماری لچھمی ہے۔ہماری سرسوتی، ہماری رادھا!''

یہ کہتے ہوئے وہ مالتی کے پیروں کی طرف جھکے اور منہ کے بل فرش پر گر پڑے۔مرزا نے دوڑ کر انہیں سنبھالا اور کرسیاں ہٹا کر وہیں زمین پر لٹا دیا، پھر ان کے کانوں کے پاس منہ لے جا کر بولے۔''رام رام ست ہے! کہیئے تو آپ کا جنازہ نکالوں؟''

رائے صاحب نے کہا۔''کل دیکھنا کتنا بگڑتا ہے۔ایک ایک کو اپنے اخبار میں کوسے گا اور اس طرح کہ آپ بھی یاد کریں گے۔ایک ہی پاجی ہے، کسی پر حم نہیں کرتا۔لکھنے میں تو اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ایسا گدھا آدمی کیسے اتنا اچھا لکھتا ہے، یہ ایک راز ہے۔''

کئی آدمیوں نے ایڈیٹر صاحب کو اٹھایا اور لے جا کر ان کے کمرے میں لٹا دیا، مگر پنڈال میں دھنش یگیہ شروع ہو گیا تھا۔ کئی بار ان لوگوں کو بلانے کے لیے آدمی آ چکے تھے۔ حاکم بھی پنڈال میں آ پہنچے تھے۔ لوگ ادھر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ دفعتاً ایک افغان آ کر کھڑا ہو گیا۔ گورا رنگ، بڑی بڑی مونچھیں، اونچا قدم چوڑا سینہ، آنکھوں میں بے خوفی کا جنون بھرا ہوا، ڈھیلا لمبا کرتام، پیروں میں شلوارم دردوزی کام کی صدری، سر پر پگڑی اور کلاہ، ایک کندھے چمڑے کا بیگ لٹکائے، دوسرے کندھے پر بندق رکھے اور کمر میں ت لوار باندھے نجانے کدھر سے آ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا۔ ''خبردار کوئی یہاں سے مت جاؤ۔ ہمارے ساتھ کے آدمی پر ڈاکہ پڑا ہے۔ یہاں کا جو سردار ہے وہ ہمارا آدمی کو لوٹ لیا ہے، اس کا مال تم کو دینا ہوگا۔ ایک ایک کوڑی دینا ہوگا۔ کہاں ہے سردار؟ اس کو بلاؤ!''

رائے صاحب نے سامنے آ کر غصہ بھری آواز میں کہا۔ ''کیسی لوٹ؟ کیسا ڈاکہ؟ یہ لوگوں کا کام ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں لوٹتا۔ صاف صاف کہو، کیا معاملہ ہے؟''

افغان نے آنکھیں نکالیں اور بندوق کا کندہ زمین پر پٹک کر بولا۔ ''ام (ہم) سے پوچھتا ہے، کیسا لوٹ؟ کیسا ڈاکہ؟ تم لوٹتا ہے۔ تمہارا آدمی لوٹتا ہے۔ ام (ہم) یہاں کی کوٹھی کا مالک ہے۔ اماری (ہماری) کوٹھی میں پچیس جوان ہے۔ ہمارا آدمی روپیہ تصیل (تحصیل) کرلاتا ہے۔ ایک ہزار روہ ت لوٹ لیا۔ اور کہتا ہے کیسی لوٹ؟ کیسا ڈاکہ؟ ہم بتائے گا کیسا ڈاکہ ہوتا ہے۔ امارا پچیسیوں جوان

ابھی آتا ہے۔ام (ہم) تمہارا گاؤں لوٹ لے گا۔کوئی سالا کچھ نہیں کر سکتا، کچھ نہیں کر سکتا۔''

کھنا نے افغان کے تیور دیکھتے تو چپکے سے اٹھے کہ نکل جائیں۔اس نے زور سے ڈانٹا۔'' کاں (کہاں) جاتا ہے تم؟ کوئی کہیں نہیں جا سکتا۔نہیں ام (ہم) سب کو کتل (قتل) کر دے گا۔ابی (ابھی) فیر کر دے گا۔امارا (ہمارا) تم کچھ نہیں کر سکتا۔ام تمہاری پولیس سے نہیں ڈرتا۔پولیس کا آدمی ہمارا سکل (شکل) دیکھ کر بھاگتا ہے۔امارا اپنا کانسل ہے۔ام اس کو خط لکھ کر لاٹ صاحب کے پاس جا سکتا ہے۔ام یاں (یہاں) سے کسی کو نئی (نہیں) جانے دے گا۔ہم کسی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔تم سب آدمی دوسروں کے مال لوٹ کرتا ہے۔اور ریاں (یہاں) معشوق کے ساتھ شراب پیتا ہے۔''

مس مالتی اس کی آنکھ بچا کر کمرے سے نکلنے لگیں کہ وہ باز کی طرح ٹوٹ کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا۔''تم ان بد معاشوں سے ہمارا مال دلوائے نئی (نہیں) ام تم کو اٹھا لے جائے گا اور اپنی کوٹھی میں جشن منائے گا۔تمہارا حسن پر ہم عاشق ہو گیا۔یا تو ام کو (ہم کو) ایک ہزار بی ابی (ابھی) دے دے یا تم کو ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔تم کو ام نہیں چھوڑے گا۔ام تمہارا عاشق ہو گیا ہے۔ہمارا دل اور جگر پھٹا جاتا ہے۔امارا اس جگہ پچیس جوان ہے۔اس ضلع میں ہمارا پانچ سو جوان کام کرتا ہے۔ام اپنے قبیلے کا خان ہے۔امارے قبیلہ میں دس ہزار سپاہی ہے۔ہم کابل کے امیر سے لڑ سکتا ہے۔انگریز سرکار ام کو بیس ہزار سالانہ خراج دیتا ہے۔اگر تم ہمارا روپیہ نہیں دے گا تو ام گاؤں لوٹ لے گا اور تمہارا معشوق کو

اٹھالے جائے گا۔خون کرنے میں ہم کومزہ آتا ہے۔''

مجلس پرخوف چھا گیا۔مس مالتی اپنا چہکتا بھول گئیں۔کھنا کی پنڈلیاں کانپ رہی تھیں۔بے چارے چوٹ چپیٹ کے ڈر سے یک منزلہ بنگلے میں رہتے تھے۔ زینہ پر چڑھنا ان کے لیے سولی پر چڑھنے سے کم نہ تھا۔گرمی میں بھی دہشت کے مارے کمرے میں سوتے تھے۔رائے صاحب کوچھتری پن کا گھمنڈ تھا۔وہ اپنے ہی گاؤں میں ایک پٹھان سے ڈر جانا مضحکہ انگیز سمجھتے تھے' مگر اس کی بندوق کو کیا کرتے ؟انہوں نے ذرا بھی چیں چپڑ کی اوراس نے بندق داغ دی۔

ہوش میں تو ہوتے ہی ہیں یہ سب اورنشانہ بھی ان سب کا کتنا بے خطا ہوتا ہے۔اگر اس کے ہاتھ میں بندوق نہ ہوتی تو رائے صاحب اس سے سینگیں ملانے کو تیار ہو جاتے۔مشکل یہی تھی کہ کم بخت کسی کو باہر نہیں جانے دیتا ورنہ دم کے دم سے سارا گاؤں جمع ہو جاتا اوراس کے پورے جتھے کو مار پیٹ کر رکھ دیتا۔

آخرانہوں نے دل مضبوط کیااور جان پر کھیل کر بولے۔''ہم نے آپ سے کہہ دیا کہ ہم چور ڈاکو نہیں ہیں۔میں یہاں کے کونسل کا ممبر ہوں اور یہ دیوی جی لکھنو کی مشہور ڈاکٹر ہیں۔یہاں سبھی شریف اور معزز لوگ جمع ہیں۔ہمیں بالکل خبر نہیں کہ آپ کے آدمیوں کو کس نے لوٹا۔آپ جا کر تھانے میں رپٹ کیجیے۔''

خان نے زمین پر پیر پٹکے، پینترے بدلے اور بندوق کو کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لیتا ہوا دھاڑا۔''مت بک بک کرو،کونسل کا ممبر کو ہم اسی طرح پیروں سے مسل دیتا ہے (زمین پر پاؤں رگڑتا ہے)ہمارا ہاتھ مضبوط ہے۔ہمارا دل مضبوط ہے۔ہم خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔تم ہمارا روپیہ نہیں دے گا تو ہم

(رائے صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ابھی بھی تم کو قتل کر دے گا۔''

اپنی طرف بندوق کا سرا دیکھ کر رائے صاحب جھک کر میز کے برابر آ گئے۔ عجیب مصیبت تھی۔ شیطان خواہ مخواہ کہتا ہی جاتا ہے کہ تم نے ہمارے روپے لوٹ لیے۔ نہ کچھ سنتا ہے، نہ کچھ سمجھتا ہے اور نہ کسی کو باہر جانے آنے دیتا ہے۔ نوکر چاکر، سپاہی پیادے سب دھنش یگیہ دیکھنے میں مصروف تھے۔ زمینداروں کے نوکر، یوں بھی کاہل اور ۳ رکام چور ہوتے ہیں۔ جب تک دس دفعہ نہ پکارا جائے' بولتے ہی نہیں اور ساوقت تو وہ ایک اچھے کام میں لگے ہوئے تھے۔ دھنش یگیہ ان کے لیے صرف تماشا نہیں بلکہ بھگوان کی لیلا تھی۔ اگر ایک آدمی بھی ادھر آ جاتا تو سپاہیوں کو خبر ہو جاتا اور دم بھر میں خان کی ۹ ساری خانی نکل جاتی۔ داڑھی کا ایک ایک بال نچ جاتا۔ کتنا غصہ ور ہے، ہوتے بھی تو جلاد ہیں۔ نہ مرنے کا غم نہ جینے کی خوشی۔

مرزا سے انگریزی میں بولے۔ ''اب کیا کرنا چاہیے؟''

مرزا صاحب نے حیرت سے دیکھا۔ ''کیا بتاؤں، کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ میں آج اپنا پستول گھر ہی چھوڑ آیا ورنہ مزا چکھا دیتا۔''

کھنا رونی صورت بنا کر کر بولے۔ ''کچھ روپے دے کر کسی طرح اس بلا کو ٹالیے۔''

رائے صاحب نے مالتی کی طرف دیکھا۔ ''دیوی جی اب آپ کی کیا صلاح ہے؟''

مالتی کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ بولی ''ہوگا کیا؟ میری اتنی بے عزتی ہو رہی ہے۔ آپ

لوگ بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ بیس مردوں کے ہوتے ایک اجڈ پٹھان میری اتنی درگت کر رہا ہے اور آپ لوگوں کے خون میں ذرا بھی گرمی نہیں آتی۔ آپ کو جان پیاری ہے؟ کیوں ایک آدمی باہر جا کر شور نہیں مچاتا؟ کیوں آپ لوگ اس پر جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے بندوق نہیں چھین لیتے؟ بندوق ہی تو چلائے گا؟ چلانے دو۔ ایک یا دو کی جان ہی تو جائے گی؟ جانے دو۔''

مگر دیوی جی مرجانا جتنا آسان سمجھتی تھیں اور لوگ نہ سمجھتے تھے۔ کوئی آدمی باہر نکلنے کی پھر ہمت کرے اور پٹھان غصے میں آ کر دس پانچ فیر کر دے تو یہاں صفایا ہو جائے گا۔ بہت ہوگا تو اسے پھانسی کی سزا ہوگی۔ وہ بھی کیا ٹھیک؟ ایک بڑے قبیلے کا سردار ہے۔ اسے پھانسی دیتے ہوئے سرکار بھی سوچ بچار کرے گی۔ اوپر سے دباؤ پڑے گا۔ سیاست کے مقابلے میں انصاف کو کون پوچھتا ہے؟ ہمارے اوپر الٹے مقدمے دائر ہو جائیں گے اور زائد پولیس تعینات کر دی جائے تو تعجب نہیں۔ کتنے مزے سے ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ اب تک ڈرامے کا لطف اٹھاتے ہوتے۔ اس شیطان نے آ کر ایک نئی بلا کھڑی کر دی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنا دو ایک خون کیے مانے گا بھی نہیں۔

کھنا نے مالتی کو پھٹکارا۔ ''دیوی جی آپ تو ہمیں لتاڑ رہی ہیں جیسے اپنی جان بچانا کوئی پاپ ہے۔ جان سبھی جانداروں کو پیاری ہوتی ہے اور ہمیں بھی تو کوئی شرم کی بات نہیں۔ آپ ہماری جان اتنی سستی سمجھتی ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے رنج ہوتا ہے۔ ایک ہزار ہی کا تو معاملہ ہے۔ آپ کے پاس مفت کے ہزار ہیں۔ وہ دے کر کیوں نہیں رخصت کر دیتیں؟ آپ خود اپنی بے عزتی کرا رہی ہیں۔ اس میں

ہمارا کیا قصور۔''

رائے صاحب نے گرم ہو کر کہا۔ ''اگر اس نے دیوی جی کو ہاتھ لگایا تو چاہے میری لاش یہیں تڑپنے لگے، میں اس سے بھڑ جاؤں گا۔ آخر وہ بھی آدمی ہی تو ہے۔''

مرزا نے شبہ سے سر ہلا کر کہا۔ ''رائے صاحب! آپ ابھی ان سب کے مزاج سے واقف نہیں ہیں۔ یہ فائر کرنا شروع کرے گا تو پھر کسی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ ان کا نشانہ بے خطا ہوتا ہے۔''

مسٹر تنخا آنے والے چناؤ کا مسئلہ حل کرنے آئے تھے اور دس پانچ ہزار کا نپٹارا کر کے گھر جانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ یہاں جان ہی عذاب میں پڑ گئی۔ بولے۔ ''سب سہل طریقہ وہی ہے جو ابھی کھنا جی نے بتایا۔ ایک ہزار ہی کی بات ہے اور روپے موجود ہیں تو پھر آپ لوگ کیوں اتنا پس و پیش کر رہے ہیں؟''

مس مالتی نے تنخا کو حقارت بھری آنکھوں سے دیکھا۔ بولیں۔ ''آپ لوگ اتنے بزدل ہیں، یہ میں نہ سمجھتی تھی۔''

''میں بھی یہ نہ سمجھتا تھا کہ آپ کو روپے اتنے پیارے ہیں اور وہ بھی مفت کے روپے۔''

''جب آپ لوگ میری بے عزتی دیکھ سکتے ہیں تو اپنے گھر عورتوں کی بھی بے عزتی دیکھ سکتے ہوں گے؟''

''تو آپ بھی پیسے کے لیے اپنے گھر کے مردوں کو قربان کر دینے میں تامل نہ کریں گی؟''

خان اتنی دیر تک جھلایا ہوا سان لوگوں کی گٹ پٹ سن رہا تھا۔ اب یکا یک گرج کر بولا۔ ''ام اب نہیں مانے گا۔ ام اتنی دیر سے یہاں کھڑا ہے، تم لوگ کوئی جواب نہیں دیتا (جیب سے سیٹی نکال کر) تم کو ایک لمحہ اور دیتا ہے، اگر تم روپیہ نہیں دیتا تو ہم سیٹی بجائے گا اور ہمارا پچیس جوان یہاں آجائے گا۔'' پھر آنکھوں سے عشق کا اظہار کرتے ہوئے مس مالتی سے بولا۔ ''تم امارے ساتھ چلے گا، دلدار! ام تمہارے اوپر فدا ہو جائے گا۔ اپنا جان تمارے قدمون میں رکھ دے گا۔ اتنا آدمی تمارا عاشق ہے مگر کوئی سچا عاشق نہیں ہے۔ سچا عاشق کیسا ہوتا ہے، ہم دکھا دے گا۔ تمارا اشارا پاتے ہی ام اپنے سینے میں خنجر چبھا سکتا ہے۔''

مرزا نے گھگھیا کر کہا۔ ''دیوی جی! خدا کے لیے اس موذی کو روپے دے دیجیے۔''

کھنا نے دست بستہ التجا کی۔ ''ہم پر رحم کرو مس مالتی!''

رائے صاحب تن کر بولے۔ ''ہرگز نہیں۔ آج جو کچھ ہونا ہے ہو جانے دیجیے، یا تو ہم خود مر جائیں گے یا ان ظالموں کو سدا کے لیے سبق دے دیں گے۔''

ٹنخا نے رائے صاحب کو ڈانٹ بتائی۔ ''شیر کی ناند میں گھسنا کوئی بہادری نہیں ہے، میں اسے حماقت سمجھتا ہوں۔''

مگر مس مالتی کے دل خیالات کچھ اور ہی تھے۔ خان کی محبت بھری نگاہوں نے انہیں مطمئن کر دیا تھا اور اب اس تماشے میں انہیں کچھ منچلے پن کا ثبوت مل رہا تھا۔ ان کا جی کچھ دیر ان جوانمردوں کے بیچ میں رہ کر ان کے وحشیانہ عشق کا لطف اٹھانے کے لیے للچا رہا تھا۔ مہذبانہ عشق کے لیے ان کا دل بیقرار تھا، جیسے موسیقی کا

لطف اٹھانے کے بعد کوئی مست ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کو دوڑے۔

انہوں نے خان کے سامنے آ کر بے خوفی سے کہا۔ ''تمہیں روپے نہیں ملیں گے۔''

خان نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ''تو ام تم کو لوٹ لے جائے گا۔''

''تم اتنے آدمیوں کے درمیان سے ہمیں نہیں لے جا سکتے۔''

''ام تم کو ایک ہزار آدمیوں کے درمیان سے لے جا سکتا ہے۔''

''تم کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔''

''ہم معشوق کے لیے اپنے بدن کا ایک ایک بوٹی کٹوا سکتا ہے۔''

اس نے مالتی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اسی وقت ہوری نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ راجہ جنک کا مالی بنا ہوا تھا اور اس کے کھیلوں نے دیہاتیوں کو ہنساتے ہنساتے لوٹ پوٹ کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ مالک ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ وہ بھی تو آ کر دیکھیں کے دیہاتی اس کام میں کتنے ہوشیار ہوتے ہیں۔ ان کے یار دوست بھی دیکھیں۔ کیسے مالک کو بلائے؟ وہ موقع کھوج رہا تھا اور جیوں ہی فرصت ملی، دوڑا ہوا یہاں آیا۔ مگر یہاں کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ سب لوگ بالکل چپ تھے اور کانپتے ہوئے خوف بھری نگاہوں سے خان کو دیکھ رہے تھے اور خان مالتی کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس نے یہ دیکھ کر سب کچھ بھانپ لیا۔ اس وقت رائے صاحب نے پکارا۔ ''ہوری، دوڑ کر جا اور سپاہیوں کو بلا لا! جلد دوڑ!''

ہوری پیچھے مڑا ہی تھا کہ خان نے اس کے آگے بندوق تان کر ڈانٹا۔ ''کہاں جاتا ہے سور، ہم گولی مار دے گا۔''

ہوری گنوار تھا، سرخ پگڑی دیکھ کر اس کی جان نکل جاتی تھی مگر مست سانڈ پر لاٹھی لے کر ٹوٹ پڑتا تھا۔ وہ بزدل نہ تھا مرنا اور مارنا دونوں ہی جانتا تھا مگر پولیس کے ہتھکنڈوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ بندھا بندھا کون پھرے؟ گھوس (رشوت) کے روپے کہاں سے لائے؟ بال بچے کس پر چھوڑے؟ پر جب مالک للکارتے ہوں تو پھر کس کا ڈر؟ تب تو وہ موت کے منہ میں بھی کود سکتا ہے۔

اس نے جھپٹ کر خان کی کمر پکڑی اور ایسا اڑنگا مارا کہ خان چاروں شانے چت زمین پر آ رہے اور لگے پشتو میں گالیاں دینے۔ ہوری ان کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور زور سے داڑھی پکڑ کر کھینچی۔ داڑھی اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ خان نے فوراً اپنا کلاہ اتار کر پھینک دیا اور زور لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ارے! ارے یہ تو مسٹر مہتا ہیں! او ہی!

لوگوں نے چاروں طرف سے مہتا کو گھیر لیا۔ کوئی ان کے گلے لگتا تھا اور کوئی پیٹھ پر تھپکی دیتا تھا۔ مسٹر مہتا کے چہرے پر نہ تبسم تھا نہ غرور، خاموش کھڑے تھے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

مالتی نے نقلی غصے سے کہا۔ ''آپ نے یہ بہروپیا پن کہاں سیکھا؟ میرا دل ابھی تک دھڑک رہا ہے۔''

مہتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ذرا ان بھلے مانسوں کی جوانمردی کا امتحان لے رہا تھا۔ جو گستاخی ہوئی ہو اسے معاف کیجیے گا۔''

یہ کھیل جب ختم ہوا تو ادھر پنڈال میں دھنش یگیہ بھی ختم ہو چکا تھا اور سوشل مزاحیہ ڈرامے کی تیاری ہو رہی تھی، مگر ان لوگوں کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ صرف مہتا صاحب دیکھنے گئے اور شروع سے آخر تک جمے رہے۔ انہیں بہت مزا آرہا تھا۔ بیچ بیچ میں تالیاں بجاتے جا رہے تھے۔ اور ''پھر کہو، پھر کہو'' کا اصرار کر کے ایکٹروں کا حوصلہ بھی بڑھاتے تھے۔ رائے صاحب نے اس کھیل میں ایک مقدمے باز دیہاتی زمیندار کا خاکہ اڑایا تھا۔ کہنے کو تو مزاحیہ تھا مگر درد و الم سے بھرا ہوا۔ ہیرو کا بات بات میں قانونی دفعات کا حوالہ دینا، بیوی پر صرف اس لیے مقدمہ چلانا کہ اس نے کھانا تیار کرنے میں ذرا سی دیر کی تھی۔ پھر وکیلوں کے نخرے اور دیہاتی گواہوں کی چالاکیاں اور جھانسے بازیاں، گواہی کے لیے فوراً تیار ہو جانا مگر اجلاس پر جاتے وقت خوب مناون کرانا اور طرح طرح کی فرمائش کر کے الو بنانا، یہ سبھی مناظر دیکھ کر خوب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ سب سے بہترین منظر وہ تھا جس میں وکیل گواہوں کو ان کے بیانات کا سبق پڑھا رہا تھا۔ گواہوں کا بار بار بھول جانا، وکیل کا بگڑنا، پھر ہیرو کا عہتقانی لہجے میں گواہوں کو سمجھانا اور بالآخر اجلاس پر گواہوں کا بدل جانا، ایسا پر لطف اور صحیح خاکہ تھا کہ مہتا صاحب اچھل پڑے اور تماشا ختم ہونے پر ہیرو کو گلے سے لگا لیا اور سبھی ایکٹروں کو ایک ایک تمغہ دینے کا اعلان کر دیا۔ رائے صاحب کے متعلق ان کے دل میں عقیدت کے جذبات جاگ اٹھے۔ رائے صاحب اسٹیج کے پیچھے ڈرامے کی نگرانی کر رہے تھے۔ مہتا صاحب دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گئے اور بیخود ہو کر بولے ''آپ کی نگاہ اتنی تیز ہے۔ اس کا مجھے سان گمان بھی نہ تھا۔''

دوسرے روز ناشتہ کے بعد شکار کا پروگرام تھا کہ وہیں کسی ندی کے کنارے پر کھانا پکے، خوب جی بھر کے نہائیں، غوطے لگائیں اور شام کو لوگ واپس آئیں۔ اس طرح دیہاتی زندگی کا لطف حاصل کیا جائے۔ مہمانوں میں صرف وہی لوگ رہ گئے، جن کا رائے صاحب سے گہرا تعلق تھا۔ مسز کھنا کے سر میں درد تھا، بس وہ نہ جا سکیں۔ ایڈیٹر صاحب تو اس جماعت سے جلے ہوئے تھے اور ان لوگوں کے خلاف ایک سلسلہ مضامین نکالنے اور اچھی طرح خبر لینے کے خیال میں محو تھے۔ ''سب کے سب چھٹے ہوئے غنڈے ہیں۔ حرام کے پیسے اڑاتے ہیں اور موجھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اس کی انہیں کیا خبر؟ ان کے پڑوس میں کون مر رہا ہے، انہیں اس کی کیا پروا؟ انہیں تو اپنے عیش و عشرت سے کام ہے۔ یہ مہتا جو فلسفی بنا پھرتا ہے، اسے یہی دھن ہے کہ زندگی کو ہر طرح مکمل بناؤ۔ مہینے میں ایک ہزار مار لاتے ہو، تمہیں اختیار ہے کہ زندگی کو مکمل بناؤ یا اس سے بھی زیادہ۔ جسے یہ فکر مارے ڈالتی ہے کہ لڑکوں کا بیاہ کیسے ہو یا بیماری کے لیے ڈاکٹر کیسے آئیں یا اب کے گھر کا کرایہ کہاں سے آئے گا۔ وہ اپنی زندگی کیسے مکمل بنائے؟ کھلے سانڈ بنے ہوئے دوسروں کے کھیت میں منہ مارتے پھرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ دنیا میں سب سکھی ہیں۔ تمہاری آنکھیں جب کھلیں گی، جب انقلاب ہوگا اور تم سے کہا جائے گا کہ بچہ کھیت میں چل کر ہل چلاؤ۔ تب دیکھیں گے کہ تمہاری زندگی کیسے مکمل ہوتی ہے اور وہ جو ہے مالتی، جو بہتر گھاٹوں کا پانی پی کر بھی مس بنی پھرتی ہے، شادی نہیں کرے گی کیونکہ اس سے زندگی بندش میں پڑ جائے گی اور بندش میں زندگی کا کامل ارتقاء نہیں ہو پاتا۔ وہ ارتقاء تو اسی میں ہے کہ دنیا کو لوٹے جاؤ

اور آزاد عیش کیے جاؤ، ساری بندشیں توڑ دو، دھرم اور سماج کو گولی مارو، فرائض کو پاس نہ پھٹکنے دو۔ بس تمہاری زندگی مکمل ہوگئی! اس سے زیادہ آسان اور کیا ہوگا؟ ماں باپ سے نہیں پٹتی تو انہیں دھتا بتاؤ، بیاہ مت کرو۔ یہ بندھن ہے اور بچے ہوں گے تو یہ موہ کا جال ہے! مگر ٹیکس کیوں دیتے ہو۔ قانون بھی تو بندھن ہے۔ اسے کیوں نہیں توڑتے؟ اس سے کیوں کنی کاٹتے ہو؟ جانتے ہو نا کہ قانون کی ذرا بھی خلاف ورزی کی اور بیڑیاں پڑ جائیں گی۔ بس وہی بندھن توڑو جو اپنی ہوس رانیوں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ رسی کو سانپ بنا کر پیٹو اور تمیں مار خان بنو۔ زندہ سانپ کے پاس جاؤ ہی کیوں؟ وہ پھنکار بھی مارے گا تو لہر آنے لگے گی۔ اسے آتا دیکھو تو دم دبا کر بھاگ کھڑے ہو۔ یہ تمہاری مکمل زندگی ہے۔''

شکایت جماعت آٹھ بجے روانہ ہوئی۔ کھنا نے کبھی شکار نہ کھیلا تھا۔ بندوق کی آواز سے کانپ اٹھتے تھے مگر مس مالتی جا رہی تھیں تو وہ کیسے رک سکتے؟ مسٹر کھنا کو ابھی تک چناؤ کے بارے میں بات کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ شاید وہاں مل جائے۔ رائے صاحب اپنے اس علاقے میں عرصے سے نہ گئے تھے۔ وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی علاقے میں جانے آنے سے اسامیوں کے ساتھ کچھ تعلق بھی قائم رہتا ہے اور اپنا عرب بھی۔ کارندے اور پیادے بھی چوکس رہتے ہیں۔ مرزا خورشید کو زندگی کے نئے تجربات حاصل کرنے کا شوق تھا۔ خصوصاً جن میں ہمت دکھانی پڑے۔ مس مالتی تنہا تنہا کیسے رہتیں؟ انہیں شائقین کا جمگھٹا چاہیے۔ صرف مہتا صاحب شکار کھیلنے کے لیے سچے حوصلے سے جا رہے تھے۔ رائے صاحب کی خواہش تو تھی کہ خوراک کا سامان، باورچی، کہار، خدمتگار،

سب ساتھ چلیں، لیکن مہتا نے مخالفت کی۔

کھنا نے کہا۔ ''آخر وہاں کھائیں گے یا بھوکوں مریں گے؟''

مہتا نے جواب دیا۔ ''کھائیں گے کیوں نہیں، لیکن آج ہم سب لوگ خود اپنا سارا کام کریں گے۔ دیکھنا تو چاہیے کے بلا نوکر کے بھی ہم زندہ رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ مس مالتی پکائیں گی اور ہم لوگ کھائیں گے۔ دیہاتوں میں تھالیاں اور تیل مل ہی جاتے ہیں اور ایندھن کی کوئی کمی ہی نہیں۔ شکار ہم کریں گے ہی۔''

مالتی نے گلہ کیا۔ ''معاف کیجیے۔ آپ نے رات میں میری کلائی اتنے زور سے پکڑی کہ ابھی تک دکھ رہی ہے۔''

''کام تو ہم لوگ کریں گے، آپ صرف بتلاتی جائیں گی۔''

مرزا خورشید بولے۔ ''اجی آپ لوگ تماشا دیکھتے رہیے گا۔ میں سارا انتظام کر دوں گا۔ بات ہی کون سی ہے؟ جنگل میں ہانڈی اور برتن ڈھونڈنا حماقت ہے۔ ہرن کا شکار کیجیے، بھونیے، کھایئے اور وہیں درختوں کے سائے میں خراٹے لیجیے۔''

یہی تجویز منظور ہوئی۔ دو موٹر روانہ ہوئے۔ ایک مس مالتی چلا رہی تھیں اور دوسرا خود رائے صاحب۔ بیس پچیس میل کے بعد پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ دونوں طرف اونچی پہاڑیوں کا سلسلہ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ سڑک بھی پیچدار ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ دور کی چڑھائی کے بعد یکا یک ڈھال آ گئی اور موٹر تیزی سے نیچے کی طرف چلے۔ دور سے دریا نظر آ رہا تھا، کسی مریض کی طرح کمزور اور بے حس، جس کے کنارے برگد کے گھنے سایہ میں موٹر روک دیئے گئے اور لوگ اترے۔ یہ مشورہ

ہوا کہ دو دو کی ٹولی بنے اور شکار کھیل کر بارہ بجے تک یہاں آ جائیں۔ مس مالتی مہتا کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔ کھنا دل مسوس کر رہ گئے۔ جس خیال سے آئے تھے، اس میں جیسے پنچر ہو گیا۔ اگر جانتے کے مالتی دھوکا دے گی تو گھر واپس لوٹ جاتے، مگر رائے صاحب کا ساتھ بھی اتنا دلچسپ نہ سہی تاہم، برا نہ تھا ان سے بہت سے معاملے کی باتیں کرنا تھیں۔ خورشید اور ٹنخا بچ رہے۔ ان کی ٹولی بنی بنائی تھی۔ تینوں ٹولیاں ایک ایک سمت کو چل دیں۔

کچھ دور تک پتھریلی پگڈنڈی پر مہتا کے ساتھ چلنے کے بعد مالتی نے کہا۔ ''تم تو چلے ہی جاتے ہو، ذرا دم تو لے لینے دو۔''

مہتا مسکرائے۔ ''ابھی تو ہم میل بھر بھی نہیں آئے، ابھی سے تھک گئیں؟''

''تھکی نہیں، پر کیوں نہ ذرا دم لے لو؟''

''جب تک کوئی شکار ہاتھ نہ آ جائے ہمیں آرام کرنے کا حق نہیں۔''

''میں شکار کھیلنے نہیں آئی تھی۔''

مہتا نے انجان بن کر کہا۔ ''اچھا، یہ میں نہ جانتا تھا۔ تو پھر کیا کرنے آئی تھیں؟''

''اب تم سے کیا بتاؤں؟''

ہرنوں کا ایک جھنڈ چرتا ہوا نظر آیا۔ دونوں ایک چٹان کی آڑ میں چھپ گئے۔ نشانہ لگا کر گولی چلائی گئی۔ نشانہ خالی گیا اور جھنڈ بھاگ نکلا۔

مالتی نے پوچھا۔ ''اب؟''

''کچھ نہیں، چلو، پھر کوئی شکار ملے گا۔''

دونوں کچھ دیر تک چپ چاپ چلتے رہے، پھر مالتی نے ذرا رک کر کہا۔ ''گرمی سے برا حال ہو رہا ہے۔ آؤ اس پیڑ کے نیچے بیٹھ جائیں۔''

''ابھی نہیں۔ تم بیٹھنا چاہتی ہو تو بیٹھو، میں تو نہیں بیٹھتا۔''

''بڑے بے رحم ہو تم، سچ کہتی ہو۔''

''جب تک کوئی شکار نہ مل جائے، بیٹھ نہیں سکتا۔''

''تم تو مجھے مار ہی ڈالو گے! اچھا بتاؤ کہ رات تم نے مجھے اتنا کیوں ستایا؟ مجھے تم پر بڑا غصہ آ رہا ہے۔ یاد ہے کہ تم نے مجھے کیا کہا تھا؟ تم ہمارے ساتھ چلے گا؟ میں نہ جانتی تھی کہ تم اتنے شریر ہو۔ اچھا، سچ کہنا کہ تم اس وقت مجھے اپنے ساتھ لے جاتے؟''

مہتا نے کوئی جواب نہ دیا، جیسے سنا ہی نہیں۔

دونوں کچھ دور چلتے رہے۔ ایک تو جیٹھ کی دھوپ، دوسرے پتھریلا راستہ، مالتی تھک کر بیٹھ گئی۔ مہتا کھڑے کھڑے بولے۔ ''اچھی بات ہے تم آرام کر لو، میں یہیں آ جاؤں گا۔''

''مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟''

''میں جانتا ہوں تم اپنی حفاظت کر سکتی ہو۔''

''کیسے جانتے ہو؟''

''نئے جگ کی دیویوں میں یہی تو صفت ہے۔ وہ مرد کا سہارا نہیں چاہتیں بلکہ اس کے دوش بدوش چلنا چاہتی ہیں۔''

مالتی نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''تم کورے فلسفی ہو، مہتا! سچ!''

مہتا نے بندوق کندھے پر رکھ کر کہا۔تم نے مجھے نہیں بلکہ اپنے آپ کو بد دعا دی ۔شکار مل جاتا تو میں تمہیں دس منٹ کی مہلت دیتا۔اب تو تم کو فوراً چلنا پڑے گا۔

مالتی اٹھ کر مہتا کا ہاتھ پکڑتی ہوئی بولی۔''فلاسفروں کے شاید دل نہیں ہوتا۔تم نے اچھا کیا شادی نہیں کی۔اس غریب کو مار ہی ڈالتے! مگر میں یوں نہ چھوڑوں گی۔تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔''

مہتا نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور آگے بڑھے۔

مالتی آبدیدہ ہو کر بولی۔''میں کہتی ہوں نہ جاؤ ورنہ میں اسی چٹان پر سر پٹک دوں گی۔''

مہتا نے تیزی سے قدم بڑھائے۔مالتی انہیں دیکھتی رہی۔جب وہ بیس قدم نکل گئے تو جھنجھلا کر اٹھی اور ان کے پیچھے دوڑی۔تنہا آرام کرنے میں تو کوئی لطف نہ تھا۔

قریب جا کر بولی۔''میں تمہیں اتنا حیوان نہ سمجھتی تھی۔''

''میں جو ہرن ماروں گا اس کی کھال تمہیں بھینٹ کروں گا۔''

''کھال جائے بھاڑ میں! میں تم سے بات نہ کروں گی۔''

''کہیں ہم لوگوں کے ہاتھ کچھ نہ لگا اور دوسروں نے اچھے شکار مارے تو مجھے بڑی جھینپ ہوگی۔''

ایک چوڑا نالہ منہ پھیلائے آگے پڑا تھا' جس کے بیچ کی چٹانیں دانتوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔دھار میں اتنا زور تھا کہ لہریں اچھلی پڑتی تھیں۔سورج سر پر آ پہنچا اور اس کی پیاسی کرنیں پانی میں کھیل رہی تھیں۔

مالتی نے خوش ہو کر کہا۔ ''اب تو لوٹنا پڑے گا۔''

''کیوں؟ اس پار چلیں گے، وہیں تو شکار ملے گا۔''

''دھار کس زور کی ہے۔ میں تو بہہ جاؤں گی۔''

''اچھی بات ہے۔ تم یہیں بیٹھو، میں جاتا ہوں۔''

''ہاں آپ جائیے مجھے۔ اپنی جان سے بیر نہیں ہے۔''

مہتا نے پانی میں قدم رکھا اور پیروں کو سادھتے ہوئے چلے۔ جیوں جیوں آگے جاتے تھے، پانی گہرا ہوتا جاتا تھا، حتیٰ کے سینے تک آ گیا۔

مالتی گھبرا اٹھی۔ اندیشے سے دل بیقرار ہو گیا۔ ایسی بے چینی تو اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ بلند لہجے میں بولی ''پانی گہرا ہے، ٹھہر جاؤ! میں بھی آتی ہوں۔''

''نہیں تم پھسل جاؤ گی۔ دھار تیز ہے۔''

مالتی ساڑھی اوپر چڑھا کر نالے میں گھس پڑی، مگر دس ہاتھ جاتے جاتے پانی اس کی کمر تک آ گیا۔

مہتا گھبرائے۔ دونوں ہاتھوں سے اسے لوٹ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ''تم یہاں نہ آؤ مالتی!'' یہاں تمہارے گلے تک پانی ہے۔

مالتی نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر کہا۔ ''ہونے دو۔ تمہاری یہی مرضی ہے کہ میں مر جاؤں تو تمہارے پاس ہی مروں گی۔''

''مالتی پیٹ تک پانی میں تھی۔ دھار اتنی تیز تھی کہ معلوم ہوتا تھا اب قدم اکھڑا۔ مہتا لوٹ پڑے اور مالتی کو ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔''

مالتی نشیلی آنکھوں میں غصہ بھر کر کہا۔ ''میں نے تم جیسا بیدرد آدمی کبھی نہیں

دیکھا تھا۔ بالکل پتھر ہو! خیر، آج ستالو جتنا ستاتے بنے، میں بھی کبھی سمجھوں گی۔''

مالتی کے پیر اکھڑتے ہوئے معلوم ہوئے۔ وہ بندوق سنبھالتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔

مہتا نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''تم یہاں کھڑی نہیں رہ سکتیں، میں تمہیں اپنے کندھے پر بٹھائے لیتا ہوں۔''

مالتی نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا ''تو اس پار جانا اتنا ضروری ہے؟''

مہتا نے جواب نہ دیا۔

بندوق کو کنپٹی سے کندھے پر دبا لیا اور مالتی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کندے پر بٹھایا۔

مالتی اپنی خوشی کو چھپاتی ہوئی بولی۔ ''اگر کوئی دیکھ لے؟''

''تو دیکھ لے۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے؟''

''بھدا تو لگتا ہے۔''

دو قدم کے بعد اس نے درد بھری آواز میں کہا۔ ''اچھا بتاؤ کہ اگر میں یہیں ڈوب جاؤں تو تمہیں رنج ہو گا یا نہیں؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ تمہیں بالکل رنج نہ ہو گا۔''

مہتا بولے۔ ''تو ت، سمجھتی ہو کہ میں انسان نہیں ہوں۔''

''میں تو یہی سمجھتی ہوں، کیوں چھپاؤں؟''

''سچ کہتی ہو، مالتی؟''

''تم کیا سمجھتے ہو؟''

''میں پھر کبھی بتاؤں گا۔''

پانی مہتا کے گلے تک آ گیا، کہیں اگلا قدم اٹھاتے ہی سر تک نہ آ جائے۔ مالتی کا دل دھڑکنے لگا۔ بولی۔ ''مہتا! ایشور کے لیے اب آگے مت جاؤ، ورنہ میں پانی میں کود پڑوں گی۔''

اس سنکٹ میں مالتی کو ایشوریا د آیا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتی تھی۔ جانتی تھی کہ ایشور کہیں بیٹھا نہیں ہے جو آ کر انہیں بچا لے۔ مگر دل کو جس سہارے اور سکت کی ضرورت تھی وہ اور کہاں تھا؟ پانی کم ہونے لگا۔ مالتی نے خوش ہو کر کہا۔ ''اب تم مجھے اتار دو۔''

''نہیں نہیں، چپ چاپ بیٹھی رہو۔ کہیں آگے کوئی گڑھا نہ ہو۔''

''تم سمجھتے ہو گے کہ کتنی خودغرض ہے۔''

''مجھے اس کی اجرت دے دینا۔''

مالتی کے دل میں گدگدی ہوئی۔ ''بولی کیا اجرت لو گے؟''

''یہی کہ جب تمہاری زندگی میں کوئی ایسا ہی موقع آئے تو مجھے بلا لینا۔''

دونوں کنارے پر آ گئے۔ مالتی نے ریت پر اپنی ساڑھی نچوڑی، جوتے کا پانی نکالا، منہ ہاتھ دھویا، مگر یہ الفاظ اپنے بھید بھرے مطلب کے ساتھ اس کے سامنے ناچتے رہے۔

اس نے تجربے کا لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دن یاد رہے گا۔''

مہتا نے پوچھا۔ ''تم بہت ڈر رہی تھیں؟''

''پہلے تو ڈری مگر پھر مجھے یقین ہو گیا کہ تم، ہم دونوں کی حفاظت کر سکتے ہو۔''

مہتا نے فخر سے مالتی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر تکان کی سرخی کے ساتھ چمک بھی تھی۔ بولے۔ ''مجھے یہ سن کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ تم نہ سمجھ سکو گی مالتی؟''

''تم نے سمجھایا کب؟ الٹا اور جنگلوں گھسیٹتے پھرتے ہو۔ ابھی پھر لوٹتے وقت یہی نالا پار کرنا ہوگا۔ تم نے کیسی آفت میں جان ڈال دی، مجھے تمہارے ساتھ رہنا پڑے تو ایک دن نہ پٹے۔''

مہتا مسکرائے۔ ان الفاظ کا اشارہ خوب سمجھ رہے تھے۔

''تم مجھے اتنا دشٹ سمجھتی ہو! اور جو میں کہوں کہ تم سے محبت کرتا ہوں، مجھ سے بیاہ کرو گی؟''

''ایسے سنگدل سے کون بیاہ کرے گا؟ رات دن جلا کر مار ڈالو گے!'' اور محبت بھری آنکھوں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہو۔ ''اس کا مطلب تم خوب سمجھتے ہو۔ اتنے نادان نہیں۔''

مہتا نے جیسے ہوش میں آ کر کہا۔ ''تم سچ کہتی ہو مالتی! میں کسی عورت کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ مجھ سے کوئی عورت پریم کا سوانگ نہیں کر سکتی۔ میں اس کے دل کی گہرائی تک پہنچ جاؤں گا، پھر مجھے اس سے مغائرت ہو جائے گی۔''

مالتی کانپ اٹھی۔ ان باتوں میں کتنی سچائی تھی، پوچھا۔ ''اچھا بتاؤ کیسی محبت سے مطمئن ہو گے؟''

''بس یہی کے جو دل میں ہو، وہی زبان پر ہو۔ میرے نزدیک رنگ روپ اور ناز و انداز کی قیمت نہیں ہے، جتنی ہونی چاہیے۔ میں وہ خوراک چاہتا ہوں جس سے روح کی آسودگی ہو۔ متحرک اور جاذب اشیاء کی ضرورت نہیں۔''

مالتی نے ہونٹ سکیڑ کر گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ ''تم سے کوئی پیش نہ پائے گا۔ ایک ہی گھاگ ہو۔ اچھا بتاؤ، میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

مہتا نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔ ''تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ دانا ہو، ہوشیار ہو، طباع ہو، رحم دل ہو، شوخ ہو، خوددار ہو، تیاگ کر سکتی ہو، محبت نہیں کر سکتیں۔''

مالتی نے تیز نگاہ سے تاک کر کہا۔ ''جھوٹے ہو تم، بالکل جھوٹے! مجھے تمہارا یہ دعویٰ بے دلیل معلوم ہوتا ہے کہ تم عورت کے دل تک پہنچ جاتے ہو۔''

دونوں نالے کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے، بارہ بج چکے تھے مگر اب مالتی کو ذرا آرام کی خواہش تھی، نہ واپسی کی۔ آج کی گفتگو میں اسے ایسا مزا آ رہا تھا جو اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس نے کتنے عالموں اور لیڈروں کو ایک مسکراہٹ میں، ایک چتون میں، ایک بات میں احمق بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ ایسی ریت کی دیوار پر وہ زندگی کی بنیاد نہیں قائم کر سکتی تھی۔ آج اسے وہ سخت اور ٹھوس پتھریلی زمین مل گئی جو پھاوڑوں سے چنگاریاں نکال رہی تھی اور یہ سختی اسے زیادہ سے زیادہ فریفتہ کیے لیتی تھی۔

دھائیں کی آواز آئی۔ ایک لال سرنالے پر اڑا جا رہا تھا۔ مہتا نے نشانہ مارا۔ چڑیا چوٹ کھا کر بھی کچھ دور اڑی۔ پھر بیچ دھار میں گر پڑی اور لہروں کے ساتھ بہنے لگی۔

''ابھی جا کر لاتا ہوں، جاتا کہاں ہے؟''

یہ کہتے ہی وہ ریت میں دوڑے اور بندوق کنارے پر رکھ کر پانی میں کود پڑے اور بہاؤ کی طرف تیرنے لگے مگر نصف میل تک پورا زور لگانے پر بھی وہ چڑیا

کو نہ پا سکے۔ چڑیا مر کر بھی گویا اڑی جا رہی تھی۔ دفعتاً انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی کنارے کی ایک جھونپڑی سے نکلی۔ چڑیا کو بہتا دیکھ کر ساڑھی کو رانوں تک چڑھایا اور پانی میں کود پڑی۔ ایک لمحے میں اس نے چڑیا پکڑ لی اور مہتا کو دکھاتی ہوئی بولی۔ ''پانی سے نکل آؤ بابو جی! تمہاری چڑیا یہ ہے۔''

مہتا صاحب لڑکی کی چستی اور ہمت دیکھ کر دنگ ہو گئے، فوراً کنارے کی طرف بڑھے اور دو منٹ میں اس کے پاس جا پہنچے۔

لڑکی کا رنگ تھا تو سیاہ اور گہرا سیا، کپڑے بہت ہی میلے اور گھنونے، زیور کے نام پر صرف ہاتھوں میں دو موٹی چوڑیاں، سر کے بال الجھے ہوئے، بکھرے ہوئے۔ چہرے کا کوئی حصہ ایسا نہیں جسے سندر یا سڈول کہا جا سکے، مگر اتنے سڈول اور کسے ہوئے اور پھر تیلے ہو گئے تھے کہ شباب کی تصویر کے لیے اس سے بہتر نمونہ ملنا مشکل تھا۔ اس کی عمدہ صحت گویا مہتا کے دل میں سکت اور چمک لا رہی تھی۔

مہتا نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بڑے موقع سے پہنچ گئیں، ورنہ مجھے نہ جانے کتنی دور تیرنا پڑتا۔''

لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں نے تمہیں تیرتے دیکھا تو دوڑی۔ شکار کھیلنے آئے ہو گے؟''

''ہاں آئے تو تھے شکار ہی کھیلنے مگر دوپہر ہو گئی اور ایک یہی چڑیا ملی ہے۔''

''تیندوا مارنا چاہو تو میں اس کی جگہ دکھا دوں۔ رات کو یہاں روج (روز) وہ پانی پینے آتا ہے۔ کبھی کبھی دوپہر میں بھی آتا ہے۔''

پھر ذرا شرما کر سر جھکائے ہوئے بولی۔ ''اس کی کھال ہمیں دینی پڑی گی۔ چلو

میرے دوارے پر، وہاں پیپل کی چھایا ہے۔ یہاں دھوپ میں کب تک کھڑے رہوگے؟ کپڑے بھی تو بھیگے ہوئے ہیں۔''

مہتا نے اس کے بدن سے لپٹی ہوئی بھیگی ساڑھی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تمہارے کپڑے بھی تو بھیگے ہوئے ہیں۔''

اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''آنہہ، ہمارا کیا، ہم تو جنگل کے جیو ہیں، ۔دن دن بھر دھوپ اور پانی میں کھڑے رہتے ہیں۔تم تھوڑے ہی رہ سکتے ہو۔''

لڑکی کتنی سمجھدار ہے اور بالکل گنوار۔

''تم کھال لے کر کیا کروگی؟''

''ہمارے دادا ہاٹ میں بیچتے ہیں۔یہی تو ہمارا کام ہے۔''

''لیکن دوپہر یہاں کاٹیں، تو تم کھلاؤ گی کیا؟''

لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے کھانے لایک (لائق) ہمارے گھر میں کیا ہے؟ مکے کی روٹیا کھاؤ تو دھری ہیں چڑھے کا سالن پکادوں گی۔تم بتاتے جانا جیسے بنانا ہو۔تھوڑا دودھ بھی ہے ہماری گائے کو ایک بار تیندوے نے گھیر تھا۔ ۔وہ اس کو سینگوں سے بھگا کر چلی آئی تھی۔تب سے تیندوا اس سے ڈرتا ہے۔''

''لیکن میں اکیلا نہیں ہوں۔میرے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔''

''تمہاری گھر والی ہوگی؟''

''نہیں گھر والی تو ابھی نہیں ہے، جان پہچان کی ہے۔''

''تو میں دوڑ کر ان کو بلائے لاتی ہوں۔تم چل کر چھانہہ میں بیٹھو۔''

''نہیں، نہیں میں بلائے لاتا ہوں۔''

''تم تھک گئے ہوگے۔ سہر کے باسی جنگل میں کاہے کو آتے ہوگے؟ ہم تو جنگلی آدمی ہیں۔ کنارے ہی پر تو کھڑی ہوں گی؟''

جب تک مہتا کچھ بولیں، وہ ہوا ہوگئی۔ مہتا اور پر چڑھ کر پیپل کے سایہ میں بیٹھے تو اس آزادانہ زندگی سے انہیں رغبت پیدا ہوگئی۔؟ سامنے کا پہاڑی سلسلہ فلسفے کے اصولوں کی طرح نا قابل عبور اور لا متناہی دور تک پھیلا ہوا گویا فہم و فراست کو دعوت دے رہا تھا، گویا دل اس عقل کو، اس نور کو، اس عمق کو اس کی مجسم اور عظیم صورت میں دیکھ رہا ہو۔ دور کی ایک بہت بلند چوٹری پر ایک چھوٹا سا مندر تھا جو اس نا قابل فہم مقام میں گیان کی طرح اونچا مگر کھویا ہوا سا کھڑا تھا۔ گویا پرند وہاں تک پر مار کر آرام و آسائش حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر کہیں جگہ نہیں پاتا.....مہتا انہی خیالات میں غرق تھے کہ وہ لڑکی مس مالتی کو ساتھ لیے آ پہنچی۔ ایک جنگلی پھول کی طرح دھوپ میں کھلی ہوئی اور دوسری گملے کے پھول کی طرح دھوپ سے زرد اور مرجھائی ہوئی۔

مالتی نے بے دلی سے کہا۔ ''پیپل کی چھاؤں بہت اچھی لگ رہی ہے، کیوں؟ اور یہاں بھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔''

لڑکی دو بڑے بڑے مٹکے اٹھا لائی اور بولی۔ ''تم جب تک یہیں بیٹھو، میں دوڑ کر پانی لاتی ہوں پھر چولہا جلاؤں گی اور میرے ہاتھ کا کھاؤ تو میں چھن بھر میں باٹیاں بنا دوں گی۔ نہیں، نہیں تو اپنے آپ سینک لینا۔ ہاں گیہوں کا آٹا میرے گھر میں نہیں ہے اور یہاں کہیں کوئی دکان بھی نہیں ہے کہ لا دوں۔''

مالتی کو مہتا پر غصہ آ رہا تھا۔ بولی۔ ''تم یہاں کیا آ کر پڑ رہے؟''

مہتا نے چڑاتے ہوئے کہا۔ ''ایک روز اس صحرائی زندگی کا لطف بھی تو اٹھاؤ۔ دیکھو مکا کی روٹیوں میں کتنی لذت ہے۔''

''مجھ سے وہ روٹیاں کھائی ہی نہ جائیں گی اور کسی طرح نگل بھی جاؤں تو ہضم نہ ہوں گی۔ تمہارے ساتھ آ کر میں بہت پچھتا رہی ہوں۔ راستہ بھر دوڑا کے مار ڈالا اور اب یہاں لا کر پٹک دیا۔''

مہتا نے کپڑے اتار دیئے تھے اور صرف ایک گیلا جانگھیا پہنے ہوئے بیٹھے تھے۔ لڑکی کو مٹکے لے جاتے دیکھا تو اس کے ہاتھ سے چھین لیے اور کنوئیں پر پانی بھرنے چلے۔ فلسفہ کے عمیق مطالعے میں بھی انہوں نے اپنی صحت کی حفاظت کی تھی اور دونوں مٹکے لے کر چلتے ہوئے ان کے بھرے ہوئے بازوؤں، چوڑے سینے اور چٹھے دار رانوں سے کسی یونانی مجسمے کے متناسب اعضاء کی طرح ان کی قوت کا پتہ مل رہا تھا۔ لڑکی انہیں پانی کھینچتے ہوئے شوق کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اب اس کے رحم کے نہیں بلکہ اس کی عقیدت کے مستحق ہو گئے تھے۔

کنواں بہت گہرا تھا، کوئی ساٹھ ہاتھ۔ مٹکے بھاری تھے اور مہتا صاحب ورزش کے عادی ہوتے ہوئے بھی ایک مٹکا کھینچتے کھینچتے سست پڑ گئے۔ لڑکی نے دوڑ کر ان کے ہاتھوں سے رسی چھین لی اور بولی۔ ''تم سے نہ کھنچے گا۔ تم جا کر گھاٹ پر بیٹھو، میں بھرے لاتی ہوں۔''

مہتا اپنی مردیت کی یہ توہین نہ سہہ سکے۔ رسی اس کے ہاتھ سے پھر لے لی اور زور لگا کر ایک لمحہ میں دوسرا مٹکا بھی کھینچ لیا۔ پھر دونوں ہاتھوں میں دونوں مٹکے لیے ہوئے جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ لڑکی نے آناً فاناً آگ جلائی

اور چڑے کے پر جھلس دیئے۔ پھر چھرے سے اس کی بوٹیاں بنائیں اور چولہے میں آگ لے جا کر گوشت چڑھا دیا اور چولہے کے پچھلے حصہ پر کڑھائی میں دودھ ابالنے لگی۔

اور مالتی بھوئیں چڑھائے چارپائی پر اداس پڑی ہوئی اس منظر کو اس طرح دیکھ رہی تھی، گویا اس کے آپریشن کی تیاری ہو رہی ہو۔

مہتا جھونپڑی کے دروازے کے دروازے پر کھڑے ہو کر لڑکی کی خانہ داریوں کو شوق و رغبت سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''مجھے بھی تو کوئی کام بتاؤ، میں کیا کروں؟''

لڑکی نے ملائم جھڑکی کے ساتھ کہا۔ ''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ جا کر بائی کے پاس بیٹھو، بیچاری بہت بھوکی ہیں۔ دودھ گرم ہوا جاتا ہے، اسے پلا دینا۔''

اس نے ایک گھڑے سے آٹا نکالا اور گوندھنے لگی۔ مہتا اس کے اعضاء کی خوشگوار حرکت دیکھتے رہے۔ لڑکی بھی رہ رہ کر انہیں کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے اپنا کام کرنے لگتی تھی۔

مالی نے پکارا۔ ''تم وہاں کیا کھڑے ہو، میرے سر میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ آدھا ایسا پھٹا پڑتا ہے جیسے گر جائے گا۔''

مہتا نے آ کر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے دھوپ لگ گئی ہے۔''

''میں کیا جانتی تھی کہ تم مجھے مار ڈالنے کے لیے یہاں لائے ہو؟''

''تمہارے ساتھ کوئی دوا بھی تو نہیں ہے؟''

''کیا میں مریض کو دیکھنے آ رہی تھی جو دوا لے کر چلتی؟ میرا ایک دواؤں کا

بکس ہے، وہ سمری میں ہے۔ اف! سر پھٹا جاتا ہے۔''

مہتا اس کے سرہانے زمین پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ اس کا سر سہلانے لگے۔ مالتی نے آنکھیں بند کر لیں۔

لڑکی ہاتھوں میں آٹا بھرے ہوئے، سر کے بال بکھیرے، آنکھیں دھوئیں سے سرخ اور اشک آلود، کل بدن پسینہ سے تر جس سے اس کا ابھرا ہوا سینہ صاف جھلک رہا تھا، آ کر کھڑی ہو گئی اور مالتی کو آنکھیں بند کیے پڑا دیکھ کر بولی۔ ''بائی کو کیا ہو گیا ہے؟''

مہتا بولے۔ ''سر میں بڑا درد ہے۔''

''پورے سر میں ہے کہ آدھے سر میں؟''

''آدھے سر میں بتاتی ہے۔''

''داہنی طرف ہے کہ بائیں طرف؟''

''بائیں طرف۔''

''میں ابھی دوڑ کر ایک دوا لاتی ہوں جسے گھس کر لگاتے ہی اچھا ہو جائے گا۔''

''تم اس دھوپ میں کہاں جاؤ گی؟''

لڑکی نے سنا ہی نہیں۔ تیزی سے ایک طرف جا کر پہاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد مہتا نے اسے اونچی پہاڑی پر چڑھتے دیکھا۔ دور سے بالکل گریا سی لگ رہی تھی۔ دل میں سوچا کہ اس جنگلی چھوکری میں خدمت کا کتنا جذبہ اور کتنا عملی علم ہے، لو اور دھوپ میں آسمان پر چڑھی چلی جا رہی ہے۔

مالتی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ بولی۔ ''کہاں گئی وہ کلوٹی؟ غضب کی کالی

ہے جیسے آبنوس کا کندہ۔ اسے بھیج دو۔ رائے صاحب سے کہہ آئے کہ موٹر یہاں بھیج دیں۔ اسے دھوپ میں میرا دم نکل جائے گا۔''

''کوئی دوا لانے گئی ہے۔ کہتی ہے کہ اس سے آدھے سیس کا درد بہت جلد دور ہو جاتا ہے۔''

''ان کی دوائیں ان ہی کو نفع کرتی ہیں، مجھے نہ کریں گی۔ تم تو اس چھوکری پر لٹو ہو گئے۔ کتنے چھچھورے ہو جیسے روح ویسے فرشتے۔''

مہتا کو تلخ و تند کہنے میں تامل نہ ہوتا تھا۔ بولے۔ ''کچھ باتیں تو اس میں ایسی ہیں کہ اگر تم میں ہوتیں تو تم سچ مچ دیوی ہو جاتیں۔''

''اس کی خوبیاں اسے مبارک ہوں۔ مجھے دیوی بننے کی ہوس نہیں ہے۔''

''تم کہو تو میں جا کر موٹر لاؤں، اگرچہ میں نہیں کہہ سکتا کہ موٹر یہاں آ بھی سکے گی یا نہیں۔''

''اس کلوٹی کو کیوں نہیں بھیج دیتے؟''

''وہ تو دوا لینے گئی ہے، پھر کھانا پکائے گی۔''

''تو آج آپ اس کے مہمان ہیں۔''

مہتا نے اس حملے چڑ کر کہا۔ ''اس لڑکی کی جانب میرے دل میں جو محبت و عقیدت ہے، وہ ایسی ہے کہ اگر میں اس کی طرف بدنگاہی سے دیکھوں تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔ میں اپنے کسی دلی دوست کی خاطر بھی اس دھوپ اور لو میں اس اونچی پہاڑی پر نہ جاتا اور ہم صرف گھڑی بھر کے مہمان ہیں، اسے وہ جانتی ہے۔ وہ کسی غریب عورت کے لیے بھی اسی مستعدی سے دوڑ کر جائے گی۔ میں اس امر کو

صرف تحریر یا تقریر کے ذریعہ ادا کر سکتا ہوں کہ دنیا میں سب لوگ بھائی بھائی ہیں اور سبھی میں برادرانہ محبت ہونی چاہیے مگر وہ ان جذبات پر عمل کر کے دکھا سکتی ہے۔ کہنے سے کرنا مشکل ہے، یہ تو تم بھی جانتی ہو۔''

مالتی نے طنز سے کہا۔ ''بس بس وہ دیوی ہے' میں مان گئی۔ اس کے سینہ میں ابھار، کمر میں لچک، جسم میں وزن ہے۔ دیوی ہونے کے لیے اور کیا چاہیے؟''

مہتا تلملا اٹھے۔ فوراً اٹھے۔ کپڑے پہنے جو سوکھ گئے تھے، بندوق اٹھائی اور چلنے کو تیار ہو گئے۔ مالتی نے پھنکار چھوڑی۔ ''تم نہیں جا سکتے، مجھے تنہا چھوڑ کر!''

''پھر کون جائے گا؟''

''وہی تمہاری دیوی۔''

مہتا بدحواس سے کھڑے تھے۔ عورت مرد پر کتنی آسانی سے فتح پا سکتی ہے، اس کا آج انہیں زندگی میں پہلا تجربہ ہوا تھا۔

وہ دوڑی ہانپتی چلی آ رہی تھی۔ وہی کالی کلوٹی لڑکی۔ ہاتھ میں ایک چھاڑ لیے ہوئے۔ پاس آ کر مہتا کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر بولی۔ ''میں وہ جڑی کھوج لائی۔ ابھی گھس کر لگاتی ہوں۔ مگر تم کہاں جا رہے ہو؟ گوس (گوشت) تو پک گیا ہوگا۔ میں باٹیاں سینکے دیتی ہوں، دو ایک کھا لینا۔ بائی دودھ پی لیں گی۔ ٹھنڈے میں چلے جانا۔''

اس نے بلا تامل مہتا کی اچکن کے بٹن کھول دیئے۔ مہتا بہت ضبط کیے ہوئے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ اس دہقانی لڑکی کے قدم چوم لیں۔

مالتی نے کہا اپنی دوائی رہنے دے۔ ندی کے کنارے برگد کے نیچے ہمارا موٹر

کھڑا ہے، وہاں اور لوگ ہوں گے۔ اس سے جا کر کہنا، موٹر یہاں لائیں۔ دوڑی ہوئی جا!

لڑکی نے مایوسانہ نگاہوں سے مہتا کو دیکھا۔ اتنی محنت سے جڑی لائی۔ اس کی یہ بے قدری۔ اس گنوارن کی دوا انہیں نہیں جچی تو نہ سہی، اس کا من رکھنے ہی کو ذرا سی لگوا لیتیں تو کیا ہوتا؟

اس نے جڑی کو زمین پر رکھ کر پوچھا۔ ''تب تک تو چولہا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ بائی جی کہو تو روٹیاں سینک کر رکھ لوں۔ بابو جی کھانا کھا لیں، تم دودھ پی لو اور دونوں جنے آرام کرو۔ تب تک میں موٹر والے کو بلا لوں۔''

وہ جھونپڑی میں گئی، بجھی ہوئی آگ پھر جلائی۔ دیکھا تو گوشت ابل گیا تھا۔ کچھ جل بھی گیا تھا۔ جلد جلد روٹیاں سینکیں۔ دودھ گرم تھا، اسے ٹھنڈا کیا اور ایک کٹورے میں مالتی کے پاس لائی۔ مالتی نے کٹورے کے بھدے پن پر منہ بنایا لیکن دودھ نہ چھوڑ سکی۔ مہتا جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھ کر ایک تھالی میں گوشت اور روٹیاں کھانے لگے۔ لڑکی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ مالتی نے لڑکی سے کہا۔ ''انہیں کھانے دے، کہیں بھاگے نہیں جاتے، تو جا موٹر لا۔''

لڑکی نے مہتا کی طرف ایک مرتبہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ کیا چاہتی ہے؟ ان کا مطلب کیا ہے؟ اسے مالتی کے چہرے پر مریضوں کی سی عاجزی اور احساس مندی اور التجا کی جھلک نہ دکھائی دی۔ اس کی جگہ غرور اور رعونت کی جھلک تھی۔ دہقانی لڑکی کے دل کی پرکھ میں ہوشیار تھی۔ بولی۔ ''کسی کی لونڈی نہیں ہوں بائی جی! تم بڑی ہو گی تو اپنے گھر کی۔ میں تم سے مانگنے تو نہیں جاتی۔ موٹر لینے نہ جاؤں

گی۔''

مالتی نے ڈانٹا۔''اچھا تو نے گستاخی پر کمر باندھی ہے، بتا تو کس علاقے میں رہتی ہے؟''

''رائے صاحب کا علاقہ ہے۔''

''تو تجھے ان ہی رائے صاحب کے ہاتھوں ہنٹروں سے پٹواؤں گی۔''

''مجھے پٹوانے سے تمہیں سکھ ملے تو پٹوالینا بائی جی! کوئی رانی مہرانی تھوڑے ہی ہوں کہ لسکر (لشکر) بھیجنا پڑے۔''

مہتا نے دو چار نوالے کھائے تھے کہ مالتی کی یہ باتیں سنیں۔ نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ جلدی ہاتھ دھویا اور بولے۔''وہ نہیں جائے گی، میں جا رہا ہوں۔''

مالتی بھی کھڑی ہوگئی۔''اسے جانا پڑے گا۔''

مہتا نے انگریزی میں کہا۔''اس کی توہین کر کے تم اپنی توقیر بڑھا نہیں رہی ہو مالتی!''

مالتی نے پھنکاری بتائی۔''ایسی ہی لونڈیاں تو مردوں کو پسند آتی ہیں جن میں کوئی اور گن ہو یا نہ ہو مگر جوان کی خدمت دوڑ دوڑ کر خوشی سے کریں اور اپنے بھاگ کو سراہیں کہ اس مرد نے مجھ سے کچھ کام کرنے کو تو کہا۔ بس وہی تو دیویاں ہیں! میں سمجھتی تھی کہ ویسی مردمی کم سے کم تم میں نہیں ہے، لیکن تم بھی دل کے ویسے ہی نکلے۔''

مہتا علم النفس کے ماہر تھے۔ مالتی کے خیالات کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ حسد کی ایسی انوکھی مثال انہیں کبھی نہ ملی تھی۔ اس عورت میں جو اتنی نرم مزاج، اتنی فرخدل

اور اتنی ہنس مکھ تھی، حسد کی ایسی تیز آگ!

بولے، ''کچھ بھی کہو مگر میں اسے نہ جانے دوں گا۔ اس کی خدمتوں اور مہربانیوں کا یہ صلہ دے کر میں اپنی نظروں میں ذلیل بن سکتا۔'' مہتا کی آواز میں کچھ ایسی سختی تھی کے مالتی آہستہ سے اٹھی اور جانے کو تیار ہوگئی۔ اس نے جل کر کہا۔ ''اچھا تو میں ہی جاتی ہوں۔ تم اس کے چرنوں کی پوجا کر کے بعد کو آنا۔''

مالتی دو تین قدم چلی گئی تو مہتا نے اس لڑکی سے کہا۔ ''اب مجھے اجازت دو بہن! تمہاری یہ محبت، تمہاری یہ بے غرضانہ خدمت ہمیشہ یاد رہے گی۔''

لڑکی نے آبدیدہ ہو کر دونوں ہاتھوں سے انہیں پرنام کیا اور جھونپڑی میں چلی گئی۔

دوسری ٹولی رائے صاحب اور کھنا کی تھی۔ رائے صاحب تو اپنے اسی ریشمی کرتے اور ریشمی چادرے میں تھے مگر کھنا نے شکاری پوشاک پہن رکھی تھی جو شاید اسی دن کے لیے تیار کرائی گئی تھی کیونکہ کھنا کو اسامیوں کے شکار سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ جانوروں کا شکار کھیلتے؟ کھنا پستہ قد اور اکہرے بدن کے شکیل آدمی تھے۔ گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، منہ پر چیچک کے داغ، بات چیت میں بڑے ہوشیار!

کچھ دور چلنے کے بعد کھنا نے مہتا صاحب کا ذکر چھیڑ دیا جو کل ہی سے ان کے سر پر کسی نحوست کی طرح سوار تھے۔ بولے۔ ''یہ مہتا بھی کچھ عجیب آدمی ہے۔ مجھے تو کچھ بناہوا معلوم ہوتا ہے۔''

رائے صاحب مہتا کی عزت کرتے تھے اور انہیں سچا، بے ریا آدمی سمجھتے تھے۔ مگر کھنا سے کچھ لین دین بھی تھا اور کچھ مزاج میں بھی امن پسندی تھی۔ پس مخالفت نہ کر سکے۔ بولے۔ ''میں تو انہیں صرف تفریح کی چیز سمجھتا ہوں، کبھی ان سے بحث نہیں کرتا اور کرنا بھی چاہوں تو اتنا علم کہاں سے لاؤں؟ جس نے زندگی دائرے میں کبھی پری ہی نہیں رکھا، وہ اگر زندگی کے بارے میں کسی نئے اصول کا راگ الا پتا ہے تو مجھے اس پر ہنسی آتی ہے۔ مزے سے ایک ہزار ماہوار وصاول کرتے ہیں، نہ جورو نہ جاتا، نہ کوئی فکر نہ تکلف، وہ فلسفہ نہ بگھاریں تو کون بگھارے؟ آپ آزاد رہ کر زندگی کو مکمل بنانے کا خواب دیکھتے ہیں، ایسے آدمی سے کیا بحث کی جائے؟''

''میں نے سنا کہ چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔''

''بے فکرے پن میں چال چلن ٹھیک رہ سکتا ہے؟ سوسائٹی میں رہو اور اس کے فرائض انجام دو، جب پتہ چلے۔''

''مس مالتی نجانے کیا دیکھ کر ان پر فریفتہ ہوئی جاتی ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف تمہیں جلا رہی ہے۔''

''مجھے وہ کیا خاک جلائیں گی؟ میں انہیں کھلونے سے زیادہ نہیں سمجھتا۔''

''یہ تو نہ کہو مسٹر کھنا! مس مالتی پر جان تو دیتے ہو تم!''

''یوں تو میں بھی آپ پر وہی الزام لگا سکتا ہوں۔''

''میں انہیں واقعی کھلونا سمجھتا ہوں۔ آپ البتہ انہیں مورت بنائے ہوئے ہیں۔''

کھانے زور سے قہقہہ لگایا حالانکہ ہنسی کی کوئی بات نہ تھی۔ ''اگر ایک لوٹا جل چڑھا دینے سے بردان مل جائے تو کیا برا ہے؟''

اب کے رائے صاحب نے زور کا قہقہہ مارا جس کا کوئی مطلب نہ تھا۔ ''تب آپ نے اس دیوی کو سمجھا ہی نہیں۔ آپ جتنا اس کی پوجا کریں گے اتنا ہی آپ سے دور بھاگیں گی اور جتنا ہی دور بھاگے گا، اتنا ہی آپ کی طرف دوڑیں گی۔''

''میری طرف! میں اس شوقین جماعت سے بالکل باہر ہوں۔ مسٹر کھنا سچ کہتا ہوں۔ مجھ میں جتنی عقل اور طاقت ہے، وہ اس علاقے کے انتظام ہی میں خرچ ہو جاتی ہے۔ گھر کے جتنے لوگ ہیں سبھی اپنی اپنی دھن میں مست ہیں۔ کوئی پرستش میں اور کوئی عیش و عشرت میں اور ان دب اجگروں کو خوراک دینا میرے ذمے

ہے۔میرا فرض ہے!میرے بہت سے تعلقدار بھائی عیش کر رہے ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں،مگر وہ لوگ گھر پھونک کر تماشا دیکھتے ہیں!قرض کا بار سر پر بڑھتا جا رہا ہے، روزانہ ڈگریاں ہو رہی ہیں، جس سے لیتے ہیں اسے دینا نہیں جانتے، چاروں طرف بد نامی ہی بدنامی ہے۔ میں تو ایسی زندگی سے مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔معلوم نہیں کن کرموں کے پھل سے میری آتما میں ذرا سی جان باقی رہ گئی ہے جو مجھے دیس اور سماج کے بندھن میں باندھے ہوئے ہے۔ستیا گرہ کی تحریک شروع ہوئی۔جیل گیا اور لاکھوں روپے کی زیر باری اٹھائی اور ابھی تک اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ مجھے اس کا پچھتاوا نہیں ہے۔بالکل نہیں!مجھے فخر ہے۔ میں اس آدمی کو آدمی نہیں سمجھتا جو قوم اور ملک کے بہبود کی کوشش نہ کرے اور قربانی نہ کرے۔ مجھے کیا اچھا لگتا ہے کہ بے جان کسانوں کا خون چوسوں اور اپنے کنبے والوں کی نفس پرستیوں کے ذرائع مہیا کروں۔مگر کروں کیا؟ جس انتظامی فضا میں میری پرورش اور ریالیدگی ہوئی،اس سے نفرت ہونے پر بھی اس کا موہ چھوڑ نہیں سکتا اور اسی چکر میں رات دن پڑا رہتا ہوں کہ کسی طرح عزت آبرو بچی رہے اور ضمیر کا خون نہ ہونے پائے۔ ایسا آدمی مس مالتی ہی کیا،کسی بھی عورت کے چکر میں پڑے تو اس کا ستیاناس سمجھئے۔ہاں ذرا سی تفریح کر لینا دوسری بات ہے۔''

کھنا بھی جری شخص تھے،میدان میں آنے بڑھنے والے۔دو بار جیل ہو آئے تھے۔کسی سے دبنا نہ جانتے تھے۔کھدر پہنتے تھے اور فرانسیسی شراب پیتے تھے۔ موقع پر بڑی بڑی تکلیفیں جھیل سکتے تھے،جیل میں شراب چھوئی تک نہیں تھی اور اے کلاس میں رہ کر سی کلاس کی روٹیاں کھاتے رہے،اگر چہ انہیں ہر طرح کا آرام مل

سکتا تھا، مگر میدان جنگ میں چلنے والا رتھ بھی تو تیل کے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔

ان کے لیے زندگی میں ذرا سی شوقینی ، ذرا سی رنگینی لازمی تھی۔ بولے۔

''آپ سنیاسی بن سکتے ہیں۔ مگر میں نہیں بن سکتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو دنیا دار نہیں وہ وہ لڑائی میں پورے حوصلہ سے شریک نہیں ہو سکتا۔ جو عورت سے محبت نہیں کر سکتا، اس کی حب الوطنی پر میرا یقین نہیں۔''

رائے صاحب مسکرائے۔ ''آپ مجھی پر آوازے کسنے لگے۔''

''آوازے نہیں، ٹھیک بات ہے۔''

''شاید ہو۔''

''آپ اپنے دل میں اتر کر دیکھئے تو پتہ چلے۔''

''میں نے تو دیکھ لیا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کے وہاں خواہ کتنی ہی برائیاں ہوں مگر زہر کی ہوس نہیں ہے۔''

''تب تو مجھے آپ پر رحم آتا ہے۔ آپ جو اتنے مغموم اور متفکر ہیں، اس کا واحد سبب آپ کی نفس کشی ہے۔ میں تو یہ ناٹک کھیل کر ہی رہوں گا خواہ اس کا انجام رنج ہی کیوں نہ ہو۔ وہ مجھ سے مذاق کرتی ہے اور دکھاتی ہے کہ مجھے تیری پروا نہیں۔ مگر میں ہمت ہارنے والا انسان نہیں ہوں۔ میں اب تک اس کا مزاج نہیں سمجھ سکا۔ نشانہ کہاں ٹھیک بیٹھے گا، اس کا تصفیہ نہیں کر سکا۔ جس دن یہ کنجی ہاتھ آ گئی، بس فتح ہے۔''

''لیکن وہ کنجی آپ کو شاید ہی ملے۔ شاید مہتا آپ سے بازی مار لے جائیں۔''

ایک ہرن کئی ہرنیوں کے ساتھ چر رہا تھا، بڑے سینگوں والا اور بالکل سیاہ۔ رائے صاحب نے نشانہ لگایا۔ کھنا نے روکا۔ ''کیوں ہتیا کرتے ہو یار! بیچارا چر رہا ہے۔ چرنے دو۔ دھوپ تیز ہوگئی ہے۔ آیئے کہیں بیٹھ جائیں۔ آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

رائے صاحب بندوق چلائی مگر ہرن بھاگ گیا۔ بولے۔ ''ایک شکار ملا بھی تو نشانہ خالی گیا۔''

''ایک ہتیا سے بچے۔''

''ہاں کہیے کیا بات کرنے کو کہہ رہے تھے۔''

''آپ کے علاقے میں ایکھ ہوتی ہے؟''

''بڑی کثرت سے۔''

''تو پھر کیوں نہ ہمارے شکر مل میں شریک ہو جایئے۔ حصے دھڑا دھڑ بک رہے ہیں۔ آپ زیادہ نہیں تو ایک ہزار حصے خرید لیں۔''

''غضب کیا، میں اتنے روپے کہاں سے لاؤں گا؟''

''اتنے نامی گرامی تعلقدار اور آپ کو روپیوں کی کمی! کل پچاس ہزار ہی تو ہوتے ہیں اور اس میں بھی تو ابھی پچیس ہی فیصد دینا ہے۔''

''نہیں بھائی صاحب، میرے پاس اس وقت بالکل روپے نہیں ہیں۔''

''روپے جتنے چاہیں مجھ سے لیں۔ بینک آپ کا ہے۔ ہاں ابھی آپ نے اپنی زندگی کا بیمہ نہ کرایا ہوگا۔ میری کمپنی کی ایک بڑھیا پالیسی لے لیجیے۔ سود و ماہوار بڑی آسانی سے دے سکتے ہیں اور بعد کو ایک یکجائی رقم مل جائے گی۔ چار پانچ

ہزار لڑکوں کے لیے اس سے بہتر بندوبست آپ نہیں کر سکتے۔ ہمارے قواعد دیکھئے۔ ہم باہمی امداد کے اصول پر پورا عمل کرتے ہیں۔ دفتر اور عملے کے خرچ کے سوا نفع کی ایک پائی بھی کسی کی جیب میں نہیں جاتی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ اس طریقے پر کمپنی کیسے چل رہی ہے اور میری صلاح سے تھوڑا سا سٹے کا کام شروع کر دیجیے۔ یہ جو آج صدہا کروڑ پتی بنے ہوئے ہیں' سب اسی کی بدولت بنے ہوئے ہیں۔ روئی، شکر، گیہوں، ربر کی جنس کا سٹہ کیجیے، منٹوں میں لاکھوں کا نپٹا را ہوتا ہے۔ کام ذرا بے تکا ہے۔ بہت سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں' مگر وہی جوانا ڑی ہیں۔ آپ جیسے تجربہ کار، تعلیم یافتہ اور دوراندیش لوگوں کے لیے تو اس سے بہتر نفع کا کام ہی نہیں ہے۔ بازار کا چڑھاؤ اتار کوئی ناگہانی واقعہ نہیں، یہ بھی ایک سائنس ہے، ایک بار اسے غور سے دیکھ لیجیے تو کیا مجال کہ دھوکہ ہو جائے۔''

رائے صاحب کو کمپنیوں پر اعتبار نہ تھا۔ دو ایک بار اس کا انہیں تلخ تجربہ بھی ہو چکا تھا' لیکن مسٹر کھنا کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے ترقی کرتے ہوئے دیکھا تھا اور ان کے کمال، فن کے قائل ہو گئے تھے۔ ابھی دس سال پہلے جو شخص بینک میں کلرک تھا' وہ صرف اپنی محنت اور ذہانت سے شہر میں پوجا جاتا ہے۔ اس کی صلاح کو یوں ہی ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ اس مسئلہ میں اگر کھنا ان کے رہنما بن جائیں تو انہیں بہت کچھ کامیابی ہو سکتی ہے۔ ایسا موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیا جائے۔ ہر طرح کے سوالات کرتے رہے۔ دفعتاً ایک دیہاتی ایک بڑی ٹوکری میں کچھ جڑیں، پتیاں اور پھول لیے جاتا ہوا دکھائی دیا۔

کھنا نے پوچھا۔ ''ارے کیا بیچتا ہے؟''

دیہاتی ڈر گیا کہ کہیں بیگار میں نہ پکڑا جائے۔ بولا، ''کچھ تو نہیں مالک، یہی گھاس پات ہے۔''

''کیا کرے گا ان کا؟''

''بیچوں گا مالک، جڑی بوٹی ہے۔''

''کون کون سی جڑی بوٹی ہے۔''

دیہاتی نے اپنا دوا خانہ کھول کر دکھایا۔ معمولی چیزیں تھیں جو جنگل کے آدمی اکھاڑ لے جاتے ہیں اور شہری عطاروں کے ہاتھ دو چار آنے میں بیچ آتے ہیں۔ جیسے مکوے، کنگھی، شہد بیئی، ککرونده، تخم دھتورا، مدار کے پھول، کرنج، کھونکچی وغیرہ ہر چیز دکھاتا تھا اور رٹے ہوئے لفظوں میں ان کے اوصاف بھی بتلاتا جاتا تھا۔ ''یہ مکوے ہے سرکار! تاپ ہو، منداگنی ہو، تلی ہو، دھڑکن ہو، سول ہو، کھانسی ہو ایک خوراک میں آرام ہو جاتا ہے۔ یہ دھتورے کے بیج ہیں مالک! گٹھیا ہو، بائی.....'' کھنا نے ایک روپیہ پھینک دیا اور اسے پڑاؤ پر رکھ آنے کو کہا۔ غریب نہ منہ مانگے دام ہی نہیں پائے بلکہ دگنے پائے، دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

رائے صاحب نے پوچھا ''آپ یہ گھاس پات لے کر کیا کریں گے؟''

کھنا نے مسکرا کر کہا ''ان کی اشرفیاں بناؤں گا۔ میں کیمیا گر ہوں۔ ی آپ کو شاید نہیں معلوم۔''

''تو یا وہ منتر ہمیں بھی سکھا دو۔''

''ہاں ہاں! شوق سے۔ میری شاگردی کیجیے۔ پہلے سوا سیر لڈو لا کر چڑھائیے، تب بتاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ مجھے طرح طرح کے آدمیوں سے سابقہ

پڑتا ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو جڑی بوٹیوں پر جان دیتے ہیں۔ بس انہیں اتنا معلوم ہو جائے کہ یہ کسی فقیر کی دی ہوئی جڑی بوٹی ہے، پھر آپ کی خوشامد کریں گے، ناک رگڑیں گے اور آپ وہ چیز انہیں دے دیں تو سدا کے لیے آحسان مند بن جائیں گے۔ ایک روپے میں اگر دس بیس احمقوں پر احسان کا نمدہ کسا جا سکے تو کیا برا ہے؟ ذرا سے احسان سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں۔''

رائے صاحب نے شوق بھرے تعجب سے پوچھا۔ ''مگر ان بوٹیوں کے گن آپ کو یاد کیسے رہتے ہیں۔''

کھنا نے قہقہہ لگایا۔ ''آپ بھی رائے صاحب مزے کی بات کرتے ہیں۔ جس بوٹی میں جو گن چاہے بتا دیجیے، یہ آپ کی لیاقت پر منحصر ہے۔ صحت تو روپے میں آٹھ آنے اعتقاد سے ہوتی ہے۔ آج جوان بڑے بڑے افسروں کو دیکھتے ہیں اور ان لمبی دم والے عالموں اور ان رئیسوں کو، یہ سب کورانہ اعتقاد والے ہوتے ہیں۔ میں تو علم نباتات کے پروفیسر کو جانتا ہوں جو ککرونڈے کے نام سے بھی واقف نہیں۔ ان عالموں کا مذاق تو ہمارے سوامی جی خوب اڑاتے ہیں۔ آپ کو تو کبھی ان کے درشن ہوئے ہوں گے۔ اب کے آئیں گے تو ان سے ملاؤں گا۔ جب سے میرے باغیچے میں ٹھہرے ہیں، رات دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ ہوس تو انہیں چھو بھی نہیں گئی۔ صرف ایک بار دودھ پیتے ہیں۔ ایسا عالم مہاتما میں نے نہیں دیکھا۔ نجانے کتنے برسوں تک ہمالیہ پر تپسیا کرتے رہے۔ پورے پہنچے ہوئے سادھو ہیں۔ آپ ان کے مرید ضرور ہو جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ

کی ساری پریشانیاں ہوا ہو جائیں گی۔ آپ کو دیکھتی ہی وہ آپ کا ماضی، حال، مستقبل سب کہہ سنائیں گے۔ ایسے ہنس مکھ ہیں کہ دیکھتے ہی دل شگفتہ ہو جاتا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ خود اتنے بڑے مہاتما ہیں مگر سنیاس، تیاگ، مندرا، مٹھ اور پنتھ ان سب کو ڈھونگ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رواجی بندشوں کو توڑو اور انسان بنو۔ دیوتا بننے کا خیال چھوڑ دو، دیوتا بن کر تم انسان نہ رہ جاؤ گے۔''

رائے صاحب کے دل میں شبہ ہوا۔ مہاتماؤں پر انہیں بھی پورا اعتقاد تھا جو ذی اقتدار لوگوں میں عموماً ہوتا ہے۔ دکھی دل کو دھیان میں جو تسکین ملتی ہے اس کے لیے وہ بھی للچاتے رہتے ہیں۔ جب مالی مشکلات کے سبب مایوس ہو جاتے تو دل میں آتا کہ دنیا سے منہ موڑ کر گوشہ تنہائی میں جا بیٹھیں اور نجات کی سبیل کریں۔ دنیاوی بندشوں کو وہ بھی عوام کی طرح روحانی ترقی کی راہ کا روڑا سمجھتے تھے اور ان سے دور ہو جانا ہی ان کی زندگی کا بھی معیار تھا' مگر سنیاس اور تیاگ کے علاوہ بندشوں کے توڑنے کی اور کیا تدبیر ہے؟

بولے۔ ''مگر جب وہ سنیاس کو ڈھونگ کہتے ہیں تو خود کیوں سنیاس لیا ہے؟''

''انہوں نے سنیاس کب لیا ہے صاحب؟ وہ تو کہتے ہیں کہ انسان کو اخیر اخیر تک کام کرتے رہنا چاہیے۔ آزاد خیالی ان کی نصائح کی جان ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آزاد خیالی کا مطلب کیا؟''

''سمجھ میں تو میری بھی نہیں آیا۔ اب کے آپ آئیے تو ان سے گفتگو ہو۔ وہ پریم کو، زندگی کی سچائی کہتے ہیں اور اس کی ایسی عمدہ صراحت کرتے ہیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔''

''مس مالتی کو ان سے ملایا نہیں؟''

''آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔ مالتی کی بھلا ان سے گفتگو ہو۔ وہ پریم کو، زندگی کو سچائی.....''

بات ختم نہ ہوئی تھی کہ سامنے کی جھاڑی میں سرسراہٹ سن کر وہ چونک پڑے اور جان بچانے کی غرض سے رائے صاحب کے پیچھے آ گئے۔ جھاڑی سے ایک تیندوا نکلا اور آہستہ آہستہ سامنے کی طرف چلا۔

رائے صاحب نے بندوق اٹھائی اور نشانہ لگانا چاہتے تھے۔ کھنا نے کہا۔ ''یہ کیا کرتے ہیں آپ؟ خواہ مخواہ اسے چھیڑ رہے ہیں۔ کہیں لوٹ پڑے تو؟''

''لوٹ کیا پڑے گا؟ وہیں ڈھیر ہو جائے گا۔''

''تو مجھے اس ٹیلے پر چڑھ جانے دیجیے۔ میں شکار کا ایسا شائق نہیں۔''

''تب کیا شکار کھیلے چلے تھے؟''

''شامت اور کیا؟''

''رائے صاحب نے بندوق نیچی کر لی۔''

''بڑا بڑھیا شکار نکل گیا۔ ایسے موقعے کب ملتے ہیں۔''

''میں تو اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ خطرناک مقام ہے۔''

''ایک آدھ شکار تو مار لینے دیجیے۔ خالی ہاتھ لوٹتے شرم آتی ہے۔''

''آپ مجھے مہربانی کر کے موٹر تک پہنچا دیجیے، پھر چاہے آپ تیندوے کا شکار کریں یا چیتے کا۔''

''سچ آپ بڑے ڈرپوک ہیں، مسٹر کھنا۔''

''مفت اپنی جان خطرے میں ڈالنا بہادری نہیں ہے۔''

''اچھا تو آپ خوشی سے واپس جا سکتے ہیں۔''

''تنہا؟''

''راستہ بالکل صاف ہے۔''

''جی نہیں، آپ کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

رائے صاحب نے بہت سمجھایا مگر کھنا نے ایک نہ مانی۔ ڈر کے مارے ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس وقت اگر جھاڑ سے ایک گلہری بھی نکل آتی تو وہ چیخ مار کر گر پڑتے۔ بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی، پسینہ سے تر بتر ہو گئے تھے۔ رائے صاحب کو مجبور ہو کر ان کے ساتھ لوٹنا پڑا۔ جب دونوں بڑی دور نکل آئے تو کھنا کے ہوش ٹھکانے ہوئے، بولے۔ ''خطرہ سے نہیں ڈرتا، لیکن خطرہ مول لینا حماقت ہے۔''

''اجی جاؤ بھی، ذرا سا تیندوا دیکھ لیا تو جان نکل گئی۔''

''میں شکار کھیلنا اس وقت کا رواج سمجھتا ہوں جب انسان حیوان تھا۔ اب اس وقت سے تہذیب بہت آگے بڑھ گئی ہے۔''

''میں مس مالتی سے آپ کی قلعی کھولوں گا۔''

''میں اہنسا کا ماننا شرم کی بات نہیں سمجھتا ہوں۔''

''اچھا تو یہ آپ کا اہنسا والا مسئلہ تھا؟ شاباش!''

کھنا نے غرور سے کہا۔ ''جی ہاں، یہ میرا وہی مسئلہ تھا۔ آپ بدھ اور شنکر کے نام پر فخر کرتے ہیں اور بے زبان جانوروں کا خون کرتے ہیں۔ شرم آپ کو آنی چاہیے نہ کہ مجھے۔''

کچھ دور تک دونوں پھر چپ چاپ چلتے رہے۔ کھنا بولے۔ ''تو آپ کب تک آئیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پالیسی فارم آج ہی بھر دیں اور شکر مل کے حصوں کے بھی میرے پاس دونوں فارم موجود ہیں۔''

رائے صاحب نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔ ''ذرا سوچ لینے دیجیے۔''

''اس میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔''

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

تیسری ٹولی خورشید اور مسٹر ٹنخا کی تھی۔ خورشید کے لیے ماضی اور مستقبل سادہ کاغذ جیسا تھا۔ وہ حال میں رہتے تھے۔ نہ ماضی کا پچھتاوا نہ مستقبل کی فکر۔ جو کچھ آگے آجاتا تھا' اسی میں دل و جان سے لگ جاتے تھے۔ دوستوں کی جماعت میں وہ مذاق کے پتلے تھے۔ کونسل میں ان سے زیادہ حوصلہ مند ممبر کوئی نہ تھا۔ جس سوال کے پیچھے پڑ جاتے' منسٹروں کو رلا دیتے۔ کسی کے ساتھ رو رعایت کرنا نہ جانتے تھے۔ بیچ بیچ میں ہنسی بھی کر جاتے تھے۔ ان کے لیے آج زندگی کا دن تھا۔ کل کا پتہ نہیں۔ غصہ ور بھی ایسے کے خم ٹھونک کر سامنے آجاتے تھے۔ انکسار کے آگے سجدہ کرتے تھے، مگر جہاں کسی نے شان دکھائی اور یہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے۔ نہ اپنا لینا یاد رکھتے تھے، نہ دوسروں کا دینا۔ شراب و شاعری کا شوق تھا۔ عورت صرف تفریح کی چیز تھی۔ بہت دن ہوئے' دل کا دیوالہ نکال چکے تھے۔

ٹنخا صاحب بڑے کاٹ پیچ کے آدمی تھے۔ سودا پٹانے میں، معاملہ سلجھانے میں، اڑنگا لگانے میں، بالو سے تیل نکالنے میں، گلا دبانے میں اور دم جھاڑ کر نکل جانے میں بڑے ہوشیار تھے۔ کہئے تو ریت میں ناؤ چلا دیں، پتھر پر دوب اگا دیں، تعلقداروں کو مہاجنوں سے قرض دلانا، نئی کمپنیاں کھلوانا، چناؤ کے وقت امیدواروں کو کھڑا کرنا، یہی ان کا کام تھا۔ خاص کر چناؤ کے وقت ان کی قسمت چمک اٹھتی تھی۔ کسی مالدار امیدوار کو کھڑا کرتے، دل و جان سے اس کا کام کرتے اور دس بیس ہزار بنا لیتے۔ جب کانگریس کا زور تھا تو کانگریس امیدوار کے مددگار

تھے۔ جب فرقہ وارانہ جماعتوں کا زور ہوا تو ہندو سبھا کی طرف سے کام کرنے لگے، مگر اس لاٹ پھیر کو ٹھیک ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس ایسے دلائل تھے جن کی تردید نہ ہو سکتی تھی۔ شہر کے سبھی رؤسا، سبھی امراء اور سبھی حکام سے ان کا یارانہ تھا۔ دل میں چاہے لوگ ان کے طریقے پسند نہ کریں مگر وہ ایسے منکسر مزاج تھے کہ کوئی ان کے منہ پر نہ کہہ سکتا تھا۔

مرزا خورشید نے رومال سے ماتھے کا پسینہ پوچھ کر کہا۔ ''آج تو شکار کھیلنے لائق دن نہیں ہے۔ آج تو کوئی مشاعرہ ہونا چاہیے تھا۔''

وکیل صاحب نے تائید کی۔ ''جی ہاں، وہیں باغ میں، بڑی بہار رہتی۔''

ذرا دیر بعد ٹنخا نے معاملہ کی گفتگو شروع کی۔ ''اب کے چناؤ میں بڑے بڑے گل کھلیں گے، آپ کے لیے بھی مشکل ہے۔''

مرزا بے پروائی سے بولے۔ ''اب کے میں کھڑا ہی نہ ہوں گا۔''

ٹنخا نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''مفت کی ہائے ہائے میں کون پڑے؟ فائدہ ہی کیا؟ مجھے اب اس ڈیموکریسی پر اعتقاد نہیں رہا۔ ذرا سا کام اور مہینوں کی بحث! ہاں عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے اچھی بحث ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ ایک گورنر رہے، خواہ وہ ہندوستانی ہو یا ق انگریز، اس سے بحث نہیں۔ ایک انجن جس گاڑی کو بڑے مزے سے ہزاروں میل کھینچ لے جا سکتا ہے، اسے دس ہزار آدمی بھی مل کر اتنی تیزی سے نہیں کھینچ سکتے۔ میں تو سارا تماشا دیکھ کر کونسل سے بیزار ہو گیا ہوں۔ میرا بس چلے تو کونسلوں میں آگ لگا دوں۔ جسے ہم ڈیموکریسی کہتے ہیں وہ

اصل میں بڑے بڑے تاجروں اور ذمہ داروں کا راج ہے اور کچھ نہیں۔ چناؤ میں وہی بازی لے جاتا ہے جس کے پاس روپیہ ہے۔ روپے کے زور سے اسے سبھی آسانیاں مل جاتی ہیں۔ بڑے بڑے پنڈت، بڑے بڑے مولوی، بڑے بڑے لکھنے اور بولنے والے، قلم اور زبان سے پبلک کو جدھر چاہیں موڑ دیں۔ سبھی سونے کے دیوتا کے پیروں پر ناک رگڑتے ہیں۔ میں نے تو ارادہ کرلیا ہے کہ اب چناؤ کے پاس نہ جاؤں گا۔ میرا پروپیگنڈا اب ڈیموکریسی کے خلاف ہوگا۔''

مرزا صاحب نے روایتوں سے ثابت کیا کہ قدیم زمانہ کے بادشاہوں کا معیار کتنا بلند تھا۔ آج تو ہم ان کی طرف تاک بھی نہیں سکتے۔ ہماری آنکھوں میں چکاچوند آجائے گی۔ بادشاہ کو خزانے کی ایک کوڑی بھی نجی خرچ میں لانے کا اختیار نہ تھا۔ وہ کتابیں نقل کرکے، کپڑے سی کر، لڑکوں کو پڑھا کر اپنا گزر کرتا تھا۔ مرزا نے ایسے بادشاہوں کی ایک طویل فہرست گنا دی۔ کہاں تو وہ رعایا پرور بادشاہ اور کہاں آج کل کے منسٹر لوگ جنہیں پانچ چھ سات آٹھ ہزار ماہوار ملنا چاہئیں۔ یہ لوٹ ہے یا ڈیموکریسی؟

ہرنوں کا جھنڈ چرتا ہوا نظر آیا۔ مرزا کے چہرے پر شکار کا جوش چمک اٹھا۔ بندوق سنبھالی اور نشانہ مارا۔ ایک کالا ہرن گر پڑا۔ ''وہ مارا!'' اس مجنونانہ آواز کے ساتھ مرزا بھی بے تحاشا دوڑ پڑے۔ بالکل بچوں کی طرح اچھلتے کودتے اور تالیاں بجاتے ہوئے۔

پاس ہی ایک درخت پر ایک شخص لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ وہ بھی فوراً درخت سے اتر کر مرزا کے ساتھ دوڑا۔ ہرن کی گردن میں گولی لگی تھی۔ اس کے پیر کانپ رہے

تھے اور اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ لکڑہارے نے ہرن کو مغموم نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''اچھا پٹھا تھا۔ من بھر سے کم نہ ہوگا۔ حکم تو ہو تو میں اٹھا کر پہنچا دوں۔''

مرزا کچھ بولے نہیں۔ وہ ہرن کی درد بھری آنکھوں کو دیکھ رہے تھے۔ ابھی ایک منٹ قبل اس میں زندگی تھی۔ ذرا سا پتا بھی کھڑکتا تو کان کھڑے کر کے چوکڑیاں بھرتا ہو نکل بھاگتا۔ اپنے ساتھیوں اور بال بچوں کے ساتھ خدا کی اگائی ہوئی گھاس چر رہا تھا' مگر اب بے بس پڑا ہے۔ اس کی کھال ادھیڑ لو، اس کی بوٹیاں کر ڈالو' اس کا قیمہ بنا ڈالو' اسے خبر بھی نہ ہوگی۔ اس کی بوٹیاں کر لو۔ زندگی میں جو کشش تھی، جو لطف تھا وہ کیا اس بے جان لاش میں ہے؟ کتنا سڈول جسم تھا۔ کتنی پیاری آنکھیں، کتنا دلکش جلوہ! اس کی قلانچیں دل میں خوشی کی لہریں پیدا کر دیتی تھیں۔ اس کی چوکڑیوں کے ساتھ ہمارا دل بھی چوکڑیاں بھرنے لگتا تھا۔ اس کی جانداری اپنے ساتھ ہر جگہ زندگی سی بکھیرتی چلی جاتی..... جس طرح پھول اپنی خوشبو پھیلاتا ہے' لیکن اب اسے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔

لکڑہارے نے پوچھا۔ ''کہاں پہنچانا ہوگا مالک؟ مجھ دو چار پیسے دے دینا۔''

مرزا صاحب جیسے دھیان سے چونک پڑے۔ بولے۔ ''اچھا اٹھا لے۔ کہاں چلے گا؟''

''جہاں حکم ہو مالک۔''

''نہیں جہاں تیری مرضی ہو وہاں لے جا۔ میں تجھے دیتا ہوں۔''

لکڑہارے نے مرزا کی طرف تعجب سے دیکھا۔ کانوں پر یقین نہ آیا۔ بولا۔ ''ارے نہیں مالک، ہجور (حضور) نے شکار کیا ہے۔ سو ہم کیسے کھالیں؟؟''

''نہیں، نہیں، میں خوشی سے کہتا ہوں کہ تم اسے لے جاؤ۔ تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''کوئی آدھا کوس ہوگا مالک۔''

''تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ دیکھوں گا کہ تمہارے بال بچے کیسے خوش ہوتے ہیں؟''

''اسے تو میں نہ لے جاؤں گا سرکار! آپ اتنی دور سے آئے، اس کڑی دھوپ میں شکار کیا، میں کیسے اٹھالے جاؤں؟''

''اٹھا اٹھا دیر نہ کر۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ تو بھلا آدمی ہے۔''

لکڑہارے نے ڈرتے ڈرتے اور رہ رہ کر مرزا کے چہرے کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہ کہیں بگڑ نہ جائیں، ہرن کو اٹھایا۔ یکا یک اس نے ہرن کو چھوڑ دیا اور کھڑا ہو کر بولا۔ ''میں سمجھ گیا مالک، مجبور نے اس کی حلال نہیں کی۔''

مرزا جی نے ہنس کر کہا۔ ''بس، بس تو نے خوب سمجھا۔ اب اٹھالے اور گھر چل۔''

مرزا صاحب مذہب کے اتنے پابند نہ تھے۔ انہوں نے دس سال سے نماز نہ پڑھی تھی۔ دو مہینے میں ایک دن پورا روزہ رکھ ڈالتے تھے۔ بالکل بلا کچھ کھائے پیے، مگر لکڑہارے کو اس خیال سے جو تسلی ہوئی تھی کہ ہرن اب ان لوگوں کے کھانے کی چیز نہیں رہ گیا، اسے پھینکا نہ کرنا چاہتے تھے۔ لکڑہارے نے ہلکے دل سے ہرن کو گردن پر رکھ لیا اور گھر کی طرف چلا۔ ٹٹھا ابھی تک بے پروائی سے وہیں

درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دھوپ میں ہرن کے پاس جانے کی تکلیف کیوں گوارا کرتے؟ کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ لیکن جب لکڑہارے کو دوسری طرف جاتے دیکھا تو آکر مرزا سے بولے۔ ''آپ ادھر کہاں جارہے ہیں حضرت؟ کیا راستہ بھول گئے۔''

مرزا نے خطاوار کی طرح مسکرا کر کہا۔ ''میں نے شکار اس غریب آدمی کو دے دیا۔ اب ذرا اس کے گھر جارہا ہوں۔ آپ بھی آیئے نا۔''

ٹنخا نے مرزا کو تعجب سے دیکھا اور بولے۔ ''آپ اپنے ہوش میں ہیں یا نہیں؟''

''کہہ نہیں سکتا، مجھے خود نہیں معلوم۔''

''شکار اسے کیوں دے دیا؟''

''اس لیے کہ اسے پا کر اس کو جتنی خوشی ہوگی، اتنی مجھے یا آپ کو نہ ہوگی۔''

ٹنخا کھسیا کر بولے۔ ''جایئے! سوچا تھا کہ خوب کباب اڑائیں گے، سو آپ نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ خیر! رائے صاحب اور مہتا کچھ نہ کچھ لائیں ہی گے۔ کوئی غم نہیں۔ میں اس چناؤ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نہیں کھڑے ہونا چاہتے تو نہ سہی آپ کی جیسی مرضی، مگر آپ کو اس میں کیا تامل ہے کہ جو لوگ کھڑے ہو رہے ہیں، ان سے اس کی اچھی قیمت وصول کی جائے۔ میں آپ سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ کسی پر بھید نہ کھلنے دیں کہ آپ کھڑے نہیں ہو رہے ہیں۔ رؤسا کے ووٹ تو سولہوں آنے ان کی طرف ہیں، حکام بھی ان کے مددگار ہیں۔ پھر بھی پبلک پر آپ جو اثر ہے اس سے وہ گھبرا رہے ہیں۔

آپ چاہیں تو آپ کو ان سے دس بیس ہزار روپے محض یہ ظاہر کر دینے کے لیے مل سکتے ہیں کہ آپ ان کی خاطر بیٹھے جاتے ہیں....نہیں مجھے عرض کر لینے دیجیے۔اس معاملے میں آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے۔آپ بے فکر بیٹھے رہیئے۔ میں آپ کی طرف سے ایک فسٹونکال دوں گا اور اسی شام کو آپ مجھ سے دس ہزار نقد وصول کر لیجیے۔''

مرزا صاحب نے ان کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔''میں روپے پر اور آپ پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

مسٹر ٹنخا نے کچھ بھی برا نہیں مانا، ماتھے پر شکن تک نہ آنے دی۔

''مجھ پر آپ جتنی لعنتیں چاہیں بھیجیں، مگر روپے پر لعنت بھیج کر آپ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔''

''میں ایسے روپے کو حرام سمجھتا ہوں۔''

''آپ شریعت کے اتنے پابند تو نہیں ہیں؟''

''لوٹ کی کمائی کو حرام سمجھنے کے لیے شروع کے پابند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تو اس معاملے میں آپ اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتے؟''

''جی نہیں۔''

''اچھی بات ہے۔اسے جانے دیجیے۔کسی بیمہ کمپنی کے ڈائریکٹر ہو جانے میں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟ آپ کو کمپنی کا ایک حصہ بھی نہ خریدنا پڑے گا۔ آپ صرف اپنا نام دے دیجیے گا۔''

''جی نہیں، مجھے یہ بھی منظور نہیں ہے۔میں کئی کمپنیوں کا ڈائریکٹر، کئی کا مینجنگ

ایجنٹ، کئی کانچیئر مین تھا۔ دولت انسان کو کتنا خودغرض بنا دیتی ہے' کتنا عیش پسند، کتنا بےغیرت!''

وکیل صاحب کو پھر کوئی تجویز پیش کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ مرزا صاحب کے دانشمند اور با اثر ہونے میں انہیں جو یقین تھا، وہ بہت کم ہو گیا۔ ان کے لیے دولت ہی سب کچھ تھی اور ایسے شخص سے جو دولت ٹھکراتا ہو' ان کا کوئی میل نہ ہو سکتا تھا۔

لکڑہارا ہرن کو کندھے پر رکھے لپکا چلا جا رہا تھا۔ مرزا نے بھی قدم بڑھایا۔ مگر موٹے جسم والے ٹنخا صاحب پیچھے رہ گئے۔ انہوں نے پکارا۔ ''ذرا سنئے مرزا جی۔ آپ تو بھاگے جا رہے ہیں۔''

مرزا نے بلا رکے جواب دیا۔ ''وہ غریب بوجھ لیے کتنی تیزی سے چلا جا رہا ہے، ہم کیا اپنا بدن لے کر اس کے برابر نہیں چل سکتے؟''

لکڑہارے نے ہرن کو ایک ٹھنٹھ پر اتار کر رکھ دیا اور خود دم لینے لگا۔

مرزا صاحب نے آ کر پوچھا۔ ''تھک گئے کیوں؟''

لکڑہارے نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''بہت بھاری ہے سرکار۔''

''تو لاؤ کچھ دور میں لے چلوں۔''

لکڑہارا ہنسا۔ مرزا ڈیل ڈول میں اس سے کہیں زیادہ اونچے اور موٹے تازے تھے۔ پھر بھی وہ دبلا پتلا آدمی ان کی بات پر ہنسا۔ مرزا پر جیسے چابک پڑ گیا۔ ''تم ہنستے کیوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اسے نہیں اٹھا سکتا؟''

لکڑہارے نے گویا معافی مانگی۔ ''سرکار، آپ لوگ بڑے آدمی ہو، بوجھ

اٹھانا تو ہم جیسے مجوروں (مزدوروں) کا کام ہے۔''

''میں تمہارا دگنا جو ہوں۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے مالک؟''

مرزا کی مردانگی اپنی زیادہ توہین نہ سہہ سکی۔ انہوں نے بڑھ کر ہرن کو گردن پر اٹھالیا اور چل پڑے مگر مشکل سے پچاس قدم چلے ہوں گے کہ گردن پھٹنے لگی، پیر کانپنے لگے اور آنکھوں میں تتلیاں اڑنے لگیں۔ کلیجہ مضبوط کیا اور کوئی بیس قدم پھر چلے۔ کم بخت کہاں رہ گیا، جیسے اس لاش میں سیسہ بھر دیا گیا ہو۔ ذرا مسٹر ننخا کی گردن پر رکھ دوں تو مزا آجائے' لیکن بوجھ اتاروں کیسے؟ دونوں اپنے دل میں کہیں گے کہ بڑا جوانمردی دکھانے چلے تھے۔ پچاس ہی قدم میں بول گئے۔

لکڑہارے نے چٹکی لی۔ ''کہو مالک کیسے رنگ ڈھنگ ہیں؟ بہت ہلکا ہے نا؟''

مرزا کو بوجھ کچھ ہلکا معلوم ہونے لگا۔ بولے۔ ''اتنی دور تو لے ہی جاؤں گا جتنی دور تم لائے ہو۔''

''کئی دن گردن دکھے گی مالک۔''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں یوں ہی پھولا ہوا ہوں۔''

''نہیں مالک، اب تو ایسا نہیں سمجھتا مدا (لیکن) آپ حیران نہ ہوں۔ وہ چٹان ہے۔ اس پر اتار دیجیے۔ میں ابھی اسے اتنی ہی دور اور لے جاسکتا ہوں۔''

''مگر یہ اچھا نہیں لگتا کہ میں یوں ہی چلوں اور آپ لدے رہیں۔''

مرزا صاحب نے چٹان پر ہرن کو اتار کر رکھ دیا۔ وکیل صاحب بھی آپہنچے۔

مرزا نے دانہ پھینکا۔ ''اب تو آپ کو بھی کچھ دور چلنا پڑے گا جناب!''

وکیل صاحب کی نگاہ میں مرزا صاحب کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بولے۔ ''معاف کیجیے، مجھے اپنی پہلوانی کا دعویٰ نہیں ہے۔''

''بہت بھاری ہے، سچ۔''

''اجی رہنے بھی دیجیے۔''

''آپ اگر اسے سو قدم لے چلیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ میرے سامنے جو تجویز رکھیں گے، اسے منظور کرلوں گا۔''

''میں ان چکموں میں نہیں آتا۔''

''میں چکمہ نہیں دیتا ہوں واللہ! آپ جس حلقے سے کہیں گے کھڑا ہو جاؤں گا اور جب حکم دیں گے بیٹھ جاؤں گا۔ جس کمپنی کا ڈائریکٹر ممبر، گماشتہ، کنویسر جو کچھ کہیے گا، بن جاؤں گا۔ بس سو قدم لے چلیے۔ میری تو ایسے ہی دوستوں سے نبھتی ہے، جو موقع پڑنے پر سب کچھ کر سکتے ہوں۔''

ٹخا کاجی چلبلا اٹھا۔ مرزا اپنے قول کے پکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہ تھا۔ ہرن کیا ایسا بہت بھاری ہوگا۔ آخر مرزا اتنی دور لے ہی تو آئے بہت زیادہ تھکے تو نہیں معلوم ہوتے۔ اگر انکار کرتے ہیں تو سنہرا موقع ہاتھ سے جاتا ہے۔ آخر ایسا کون سا پہاڑ ہے؟ بہت ہوگا چار پانچ پنسیری ہوگا۔ دو چار دن گردن ہی تو دکھے گی۔ جیب میں روپے ہوں تو تھوڑی سی بیماری سکھ کی چیز ہے۔

''سو قدم کی رہی۔''

''ہاں سو قدم میں گنتا چلوں گا۔''

''دیکھئے نکل نہ جایئے گا۔''

''نکل جانے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

ٹنخا نے جوتے کا فیتہ پھر سے باندھا، کوٹ اتار کر لکڑ ہارے کو دیا، پتلون کو اوپر چڑھایا، رومال سے منہ پونچھا اور اس طرح ہرن کو دیکھا جیسے اوکھلی میں سر ڈالنے جا رہے ہوں۔ پھر ہرن کو اٹھا کر گردن پر رکھنے کی کوشش کی۔ دو تین بار زور لگانے پر لاش گردن پر تو آ گئی مگر گردن نہ اٹھ سکی۔ کمر جھک گئی، ہانپ اٹھے اور لاش زمین پر پٹکنے ہی والے تھے کہ مرزا نے انہیں سہارا دے کر آگے بڑھایا۔

ٹنخا نے ایک قدم اور اس طرح اٹھایا جیسے دلدل میں چل رہے ہوں۔ مرزا نے بڑھاوا دیا۔ ''شاباش میرے شیر! واہ، واہ۔''

ٹنخا نے ایک قدم اور رکھا۔ معلوم ہوا گردن ٹوٹی جاتی ہے۔

''مار لیا میدان! شاباش! جیتا رہ پٹھے!''

ٹنخا دو قدم اور بڑھے۔ آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔

''بس، ایک بار اور زور مارو دوست! سو قدم کی شرط غلط، پچاس ہی قدم رہی!''

وکیل صاحب کا برا حال تھا، وہ بے جان ہرن شیر کی طرح انہیں دبوچے ہوئے ان کے دل کا خون پی رہا تھا۔ ساری طاقت جواب دے چکی تھی۔ صرف لالچ کسی آہنی شہتیر کی طرح چھت کو سنبھالے ہوئے تھا۔ ایک سے پچیس ہزار تک گوٹی تھی، مگر بالآخر وہ شہتیر بھی جواب دے گیا، لالچ کی کمر ٹوٹ گئی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، سر پر چکر آیا اور وہ شکار گردن پر لیے ہوئے پتھیر لی زمین

پر گر پڑے۔

مرزا نے فوراً اٹھایا اور اپنے رومال سے ہوا کرتے ہوئے ان کی پیٹھ ٹھونکی۔

''زور تو یار تم نے خوب مارا مگر قسمت ہی کھوٹی ہے۔''

ٹخا نے ہانپتے ہوئے ایک لمبا سانس کھینچ کر کہا۔''آپ نے آج میری جان ہی لے لی تھی۔ دو من سے کم نہ ہوگا سسرا۔''

مرزا نے ہنستے ہوئے کہا۔''لیکن بھائی جان! میں بھی تو اتنی دور اٹھا کر لایا ہوں۔''

وکیل صاحب نے خوشامد کرنی شروع کی۔''مجھے تو آپ کی فرمائش پوری کرنی تھی۔ آپ کو تماشا دیکھنا تھا، وہ آپ نے دیکھ لیا۔ اب آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا؟''

''آپ نے معاہدہ کب پورا کیا؟''

''کوشش تو جان توڑ کر کی۔''

''اس کی سند نہیں۔''

لکڑہارے نے پھر اس کو اٹھالیا اور بھاگا چلا جا رہا تھا۔ وہ دکھا دینا چاہتا تھا کہ تم لوگوں نے کانکھ کانکھ کر دس قدم اٹھالیا تو یہ نہ سمجھو کہ پاس ہو گئے۔ اس میدان میں میں تم سے کمزور ہونے پر بھی آگے ہی رہوں گا۔ ہاں کاگذ (کاغذ) تم چاہے جتنا کالا کرواور جھوٹے مقدمے چاہے جتنے بناؤ۔

ایک نالا ملا جس میں بہت تھوڑا پانی تھا۔ نالے کے اس پار ٹیلے پر ایک چھوٹا سا پانچ چھ گھروں کا پرہ تھا اور کئی لڑکے املی کے درخت کے نیچے کھیل رہے

تھے۔لکڑہارے کو دیکھ کر سب نے دوڑتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا اور پوچھا۔ ''کس نے مارا؟ باپو! کیسے مارا؟ کیسے گولی لگی؟ اس کے کیوں لگی اور ہرنوں کے کیوں نہ لگی؟'' لکڑہارا ''ہوں ہوں'' کرتا املی کے نیچے پہنچا اور ہرن کو اتار کر قریب کی جھونپڑی سے دونوں اصحاب کے لیے چارپائی لینے دوڑا۔ اس کے چاروں بچے لڑکوں کو بھگا دینے کی کوشش کرنے لگے۔ سب سے چھوٹے لڑکے نے کہا۔ ''ہمارا ہے۔''

اس کی بڑی بہن نے جو چودہ پندرہ برس کی تھی، مہمانوں کی طرف دیکھ کر چھوٹے بھائی کو ڈانٹا۔ ''چپ! نہیں تو سپاہی پکڑ لے جائے گا۔''

مرزا نے لڑکے کو چھیڑا۔ ''تمہارا نہیں ہے، ہمارا ہے۔''

لڑکے نے ہرن پر سوار ہو کر اپنا قبضہ ثابت کر دیا اور بولا۔ ''باپو تو لائے ہیں۔''

بہن نے سکھایا۔ ''کہہ دے بھیا کہ تمہارا ہے۔''

ان بچوں کی ماں بکریوں کے لیے پتیاں توڑ رہی تھی، دو نئے بھلے مانسو کو دیکھ کر اس نے ذرا سا گھونگھٹ نکال لیا اور شرمائی کہ اس کی ساڑھی کتنی میلی، کتنی پھٹی اور اٹینکی ہے، وہ اس بھیس میں مہمانوں کے سامنے کیسے جائے؟ اور گئے بغیر کام نہیں چلنے کا، پانی وانی دینا ہوگا۔

ابھی دوپہر ہونے میں کچھ کسر تھی، مگر مرزا نے اسی گاؤں میں دوپہر کاٹنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ گاؤں کے آدمیوں کو جمع کیا، شراب آئی، شکار پکا، قریب کے بازار سے گھی اور میدہ منگایا اور گاؤں بھر کو دعوت دی۔ چھوٹے، بڑے، عورت مرد سبھی نے دعوت اڑائی۔ مردوں نے خوب شراب پی اور مست ہو کر شام تک گاتے

رہے اور مرزا صاحب بچوں کے ساتھ بچہ، شرابیوں کے ساتھ شرابی، بوڑھوں کے ساتھ بوڑھے اور جوانوں کے ساتھ جوان بنے ہوئے تھے۔ اتنی ہی دیر میں گاؤں بھر سے ان کا اتنا گہرا میل جول ہو گیا تھا، گویا وہیں کے باشندے ہوں۔ لڑکے تو ان پر لدے پڑتے تھے۔ کوئی ان کی پھندنے دار ٹوپی سر پر رکھے لیتا تھا۔ کوئی ان کی رائفل کندھے پر رکھ کر اکڑتا ہوا چلتا تھا اور کوئی ان کی رسٹ واچ کھول کر اپنی کلائی پر باندھ لیتا تھا۔ مرزا نے خود دیسی شراب پی اور جھوم جھوم کر جنگلی آدمیوں کی طرح گاتے رہے۔

جب یہ لوگ شام کے وقت یہاں سے رخصت ہوئے تو گاؤں بھر کے عورت مرد انہیں بڑی دور تک بھیجنے گئے۔ کئی تو رو رہے تھے! ایسی خوش قسمتی کا موقع ان غریبوں کی زندگی میں شاید اول ہی مرتبہ آیا ہو کہ کسی شکار نے ان سب کی ضیافت کی ہو۔ ضرور یہ کوئی راجہ نواب ہے، نہیں تو اتنا دریا دل اور کس کا ہوتا ہے؟ ان کے درسن کا ہے کو ہوں گے۔

کچھ دور چلنے کے بعد مرزا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولے۔ ''بیچارے کتنے خوش تھے! کاش میری زندگی میں ایسے موقعے روز آتے! آج کا دن بڑا مبارک تھا۔''

ٹخا نے بڑی بے رخی سے کہا۔ ''آپ کے لیے مبارک ہو گا۔ میرے لیے تو منحوس ہی نکلا۔ مطلب کی کوئی بات نہ ہوئی۔ تمام دن جنگلوں اور پہاڑوں کی خاک چھاننے کے بعد اپنا سا منہ لیے لوٹے جاتے ہیں۔''

مرزا نے رکھائی سے کہا۔ ''مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے۔''

دونوں جب برگدے کے نیچے پہنچے تو دونوں ٹولیاں لوٹ چکی تھیں۔ مہتا منہ لٹکائے ہوئے تھے۔ مالتی اداس سی الگ بیٹھی تھی، جو نئی بات تھی۔ رائے صاحب اور کھنا دونوں بھوکے ہی رہ گئے تھے اور کسی کہ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ وکیل صاحب خوش تھے اور وہ خوشی روحانی تھی۔

(8)

جب سے ہوری کے گھر میں گائے آ گئی ہے، گھر کی رونق ہی کچھ اور ہو گئی ہے۔ دھنیا کا گھمنڈ تو اس کی بساط سے باہر ہو رہا تھا۔ جب دیکھو وہی گائے کا چرچا ہے۔

بھوسہ ختم ہو گیا تھا۔ ایکھ میں کچھ چری بوئی گئی تھی، اسی کو کاٹ کتر کر مویشیوں کو کھلانا پڑتا تھا۔ آنکھیں آسمان کی طرف لگی رہتی تھیں کہ کب پانی برسے اور گھاس اگے۔ ادھا ساڑھ گزر گیا اور بارش نہیں ہوئی۔

یکا یک ایک روز بادل اٹھے اور ساڑھ کا پہلا ڈونگرا پڑا۔ کسان خریف کی فصل ہونے کے لیے ہل لے کر نکلے ہی تھے کہ رائے صاحب کے کارندے نے کہلا بھیجا کہ جب تک لگان نہ بیباق ہو جائے گا کسی کھیت میں ہل نہ جانے دیا جائے گا۔ کسانوں پر جیسے بجلی گری اور کبھی تو اتنی سختی نہ ہوتی تھی۔ اب کے یہ کیسا حکم؟ کوئی گاؤں چھوڑ کر بھاگا تھوڑا ہی جاتا ہے۔ اگر کھیتوں میں ہل نہ چلے تو روپیہ کہاں سے آئے گا؟ نکلیں گے تو کھیت ہی سے.....سب مل کر کارندے کے پاس جا

کر روئے۔ کارندے کا نام تھا پنڈت انوکھے رام۔ آدمی برے نہ تھے مگر مالک کا حکم تھا۔ اسے کیسے ٹالیں؟ اس دن رائے صاحب نے کیسی دیا اور دھرم کی باتیں کی تھیں اور آج آسامیوں پر یہ ظلم! ہوری مالک کے پاس جانے کو تیار ہوا مگر پھر سوچا کہ انہوں نے کارندے کو ایک بار جو حکم دے دیا' اسے کیوں ٹالنے لگے۔ وہ سب کا سرغنہ ہو کر کیوں برا بنے؟ جب اور کوئی کچھ نہیں بولتا تو وہی کیوں آگ میں کودے، جو سب کے سر پڑے گی' اسے وہ بھی جھیل لے گا!

کسانوں میں ہاہل مچی ہوئی تھی۔ سبھی گاؤں کے مہاجنوں کے پاس روپے لینے کے لیے دوڑتے۔ گاؤں میں آج کل لنگڑ وشاہ کی خوب چل رہی تھی۔ اب کے برس اسے سن میں اچھا نفع ہوا تھا۔ گیہوں اور اسی میں بھی لین دین کا کام ہوتا تھا۔ سب سے بڑے مہاجن تھے۔ جھنگری سنگھ جو شہر کے ایک بڑے مہاجن کے ایجنٹ تھے' ان کی ماتحتی میں کئی آدمی اور تھے جو آس پاس کے دیہاتوں میں گھوم گھوم کر لین دین کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے موٹے مہاجن تھے جو دو آنے روپے سود پر بغیر لکھا پڑھی کے روپے دیتے تھے۔ گاؤں والوں کو بھی لین دین کا کچھ ایسا خبط تھا کہ جس کے پاس دس بیس روپے جمع ہو جاتے' وہی مہاجن بن بیٹھتا۔ ایک وقت میں تو ہوری نے بھی مہاجنی کی تھی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ لوگ ابھی تک یہی سمجھتے تھے کہ ہوری کے پاس گڑے ہوئے تو پے ہیں۔ آخر وہ روپیہ کہاں گیا؟ بٹوارے میں نکلا نہیں۔ ہوری نے کوئی تیرتھ برت یا بھوج کیا نہیں، روپیہ گیا تو کہاں گیا۔ جوتے پھٹ جانے پر بھی اس کے گھٹے بنیت رہتے ہیں؟

کسی نے کسی دیوتا کو سیدھا کیا، کسی نے کسی کو۔ کسی نے آنہ روپیہ سود دینا

منظور کیا، کسی نے دو آنے ہوری کی خوداری بالکل جاتی نہ رہی تھی۔ جن لوگوں کے روپے اس پر باقی تھے، ان کے پاس کونسا منہ لے کر جائے، جھنگری سنگھ کے سوا اسے اور کوئی نہ سوجھا۔ وہ پکا کاغذ لکھاتے تھے۔ نژرانہ الگ لیتے تھے، دستوری الگ اور اسٹامہ کی تحریر الگ۔ اس پر ایک سال کا سود پیشگی کاٹ کر دیتے تھے۔ پچیس روپے کا تمسک لکھو تو مشکل سے سترہ روپے ملتے تھے۔ مگر اس آڑے وقت میں اور کیا کیا جائے؟ رائے صاحب کی زبردستی ہے، ورنہ اس وقت کسی کے سامنے کیوں ہاتھ پھیلانا پڑتا۔

جھنگری سنگھ بیٹھے ہوئے داتون کر رہے تھے، ٹھگنے موٹے، چندوے کالے، لمبی ناک اور بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی تھے۔ بالکل ناٹک کے مسخرے کی طرح! اور وہ تھے بھی بڑے ہنسوڑ، اسی گاؤں میں اپنی سسرال بنا کر مردوں سے سالے یا سسر اور عورتوں سے سالی یا سرہج کا ناتہ جوڑ لیا کرتے تھے۔ راستے میں لڑکے انہیں چڑاتے پنڈت جی پالکی اور جھنگری سنگھ انہیں جھٹ پٹ اشیر باد دیتے۔ ''تمہاری آنکھیں پھوٹیں تمہارا گھٹنا ٹوٹے، تمہیں مرگی آوے، تمہارے گھر میں آگ لگ جائے۔'' وغیرہ۔ لڑکے اس اشیر باد سے کبھی آسودہ نہ ہوتے تھے، مگر لین دین کے معاملے میں وہ بڑے سخت تھے۔ سود کی ایک پائی نہ چھوڑتے تھے اور وعدے پر روپیہ لیے بغیر دروازے سے نہ ٹلتے تھے۔

ہوری نے جا کر سلام کیا اور اپنا دکھڑا رو سنایا۔

جھنگری سنگھ نے مسکرا کر کہا ''وہ سب پرانا روپیہ کیا کر ڈالا؟''

''پرانے روپے ہوتے ٹھاکر، تو مہاجنوں سے اپنا پنڈ نہ چھڑا لیتا۔ بیاج

بھرتے کسی کو اچھا لگتا ہے۔''

''گڑے روپے نہ نکلیں' چاہے سود کتنا ہی دینا پڑے، تم لوگوں کا یہی ڈھنگ ہے۔''

''کہاں کے گڑے روپے ٹھاکر صاحب؟ کھانے کو تو ہوتا نہیں۔ لڑکا جوان ہو گیا، بیاہ کا کہیں ٹھکانا نہیں بڑی لڑکی بھی بیاہنے لایک (لائق) ہوگئی۔ روپیہ ہوتا تو کس دن کے لیے گاڑ رکھتے؟''

جھنگری سنگھ نے جب سے اس کے دروازے پر گائے دیکھی تھی، اس پر دانت لگائے ہوئے تھے۔ گائے کا ڈیل ڈول اور سڈول پن کہہ رہا تھا کہ اس میں پانچ سیر سے کم دودھ نہیں ہے۔ دل میں سوچ لیا تھا کہ کسی اروب میں ڈال کر گائے اڑا لینی چاہیے۔ آج وہ موقع آ گیا تھا۔

بولے اچھا بھائی تمہارے پاس کچھ نہیں ہے! اب راجی (راضی) ہوئے؟ جتنے روپے چاہو لے جاؤ لیکن تمہارے بھلے کے لیے کہتے ہیں کہ کچھ گہنے ہوں تو گرو رکھ کر روپے لے لو! اسٹام لکھو گے تو سود بڑھے گا اور جھمیلے میں پڑ جاؤ گے۔

ہوری نے قسم کھائی کے گھر میں گہنے کے نام کچا تاگا بھی نہیں ہے۔ دھنیا کے ہاتھوں میں کڑے ہیں تو وہ بھی گلٹ کے۔ جھنگری سنگھ نے چہرے سے ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا 'تو ایک بات کرو۔ یہ نئی گائے جو لائے ہو اسے ہمارے ہاتھ بیچ ڈالو۔ سود، اسٹام، سب بکھیروں سے بچ جاؤ، چار آدمی جو دام کہیں' وہ ہم سے لے لو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم اسے اپنے سوکھ (شوق) کے لیے لائے اور بیچنا نہیں چاہتے، لیکن یہ سنکٹ تو ٹالنا ہی پڑے گا۔''

ہوری پہلے تو اس بات پر ہنسا۔ وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کرنا چاہتا تھا' لیکن ٹھاکر نے ایسا نیچا بچھایا، مہاجنی ہتھکنڈوں کا ایسا بھیانک روپ دکھایا کہ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ٹھاکر ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ جب ہاتھ میں روپیہ آجائے تو گائے لوٹا لینا۔ تیس روپے کا کاگذ (کاغذ) لکھنے پر کہیں پچیس روپے ملیں گے اور اگر تین چار برس نہ دیئے گئے تو پورے سو ہو جائیں گے۔ پہلے کا تجربہ یہی بتا رہا تھا کہ قرض وہ مہمان ہے جو ایک بار آکر جانے کا نام نہیں لیتا۔ بولا ''میں گھر جا کر سب سے صلاح کرلوں تو بتاؤں۔''

''صلاح نہیں کرنا ہے، ان سے کہہ دینا ہے کہ روپیہ ادھار لینے میں اپنی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں ٹھاکر! ابھی آکے جواب دیتا ہوں۔''

لیکن گھر آکر اس نے جونہی یہ بات کہی کہ کرام مچ گیا۔ دھنیا تو کم چلائی مگر دونوں لڑکیوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ نہیں دیتے اپنی گائے۔ روپیہ جہاں سے چاہو لاؤ، سونا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس سے تو کہیں اچھا یہ ہے کہ مجھے بیچ ڈالو تو گائے سے کچھ بیسی (بیشی) ہی مل جائے گا۔ ہوری بے چارہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ دونوں لڑکیاں سچ مچ گائے پر جان دیتی تھیں۔ روپا تو اس کے گلے سے لپٹ جاتی تھی، کتنی محبت بھری آنکھیں سے اسے دیکھتی تھی۔ اس کا بچھڑا کتنا سندر ہوگا۔ ابی سے اس کا نام بھی رکھ دیا گیا تھا مٹرو، وہ اسے اپنے ساتھ لے کر سوئے گی۔ اس گائے کے پیچھے دونوں بہنوں میں کئی بار لڑائی ہو چکی تھی۔ سونا کہتی کہ مجھے زیادہ چاہتی ہے اور روپا کہتی ہے کہ مجھے، اس کا فیصلہ ابی تک نہ ہو سکا تھا اور دونوں

کے دعوے برابر قائم تھے۔

مگر ہوری نے آگاہ پیچھا سمجھا کہ آخر دھنیا کو کسی طرح راضی کر لیا۔ ایک دوست سے گائے ادھار لے کر بیچ ڈالنا بھی بہت ہی وہیات بات، مگر مصیبت میں تو آدمی کا دھرم تک چلا جاتا ہے۔ پھر یہ کون سی چیز؟ ایسا نہ ہو تو پھر مصیبت سے لوگ اتنا ڈریں کیوں؟ گوبر نے بھی کوئی خاص اعتراض نہ کیا۔ وہ آج کل اور ہی دھن میں مست تھا۔ یہ طے کیا گیا کہ جب دونوں لڑکیاں رات کو سو جائیں تو گائے جھنگری سنگھ کے یہاں پہنچا دی جائے، گوبر اس دردناک منظر سے بھاگ کر کہیں چلا گیا تھا۔ وہ گائے کو جاتے کیسے دیکھ سکے گا؟ اپنے آنسوؤں کو کیسے روکے گا؟ ہوری بھی اوپر ہی سخت بنا ہوا تھا، اندر سے وہ بھی بے چین تھا۔ ایسا کوئی مائی کا لال نہیں جو اس وقت اس کو پچیس روپے ادھار دے دے، چاہے، پھر پچیس کے پچاس ہی لے لے۔ وہ گائے کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو ایسا معلوم کہ اس کی سیاہ سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ گویا کہہ رہی ہے ''کیا چار ہی دن میں تمہارا دل مجھ سے بھر گیا۔ تم نے تو بچپن (قول) دیا تھا کہ جیتے جی اسے نہ بیچوں گا۔ یہی بچن تھا تمہارا؟ میں نے تم سے کبھی کسی بات کا گلہ بھی نہیں کیا، جو کچھ روکھا سوکھا تم نے دے دیا، وہی کھا کر آسودہ ہو گئی، بولو!''

دھنیا نے کہا ''لڑکیا تو سو گئیں، اب اسے لے کیوں نہیں جاتے؟ جب بیچنا ہی ہے تو ابھی سہی۔''

ہوری نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''میرا تو ہاتھ نہیں اٹھتا دھنیا! اس کا منہ نہیں دیکھتی، رہنے دے! روپے سود پر لے لوں گا۔ بھگوان نے چاہا تو سب ادا ہو جائیں

گے۔ تین چار سو ہوتے ہی کیا ہیں، ایک بار اوکھ جگ جائے۔'' دھنیا نے فخر یہ محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ بولی ''اور کیا۔ اتنی تپسیا کے بعد تو گھر میں گئو آئی تو اسے بھی بیچ دو۔ لے لو کل روپے۔ جیسے اور چکا دیئے جائیں گے، ویسے ہی یہ بھی چکا دیں گے۔''

اندر بڑی امس ہو رہی تھی۔ ہوا بند تھی۔ ایک پتی بھی نہ ہلتی تھی۔ بادل چھائے ہوئے تھے، مگر بارش کے آثار نہ تھے۔ ہوری نے گائے کو لے جا کر باہر باندھ دیا۔ دھنیا نے ٹوکا بھی کہ کہاں لیے جاتے ہو۔ مگر ہوری نے سنا نہیں، بولا ''باہر ہوا میں باندھ باندھے دیتا ہوں۔ آرام سے رہے گی۔ اس میں بھی تو جان ہے۔''

گائے باندھ کر وہ اپنے منجھلے بھائی سوبھا کو دیکھنے گیا، جسے ادھر کئی مہینہ سے دمہ کا مرض ہو گیا تھا۔ دوا دارو کا دام نہیں، کھانے پینے کا بندوبست نہیں اور کام کرنا پڑتا تھا جان توڑ کر۔ اس لیے اس کی حالت دن بدن بگڑتی جاتی تھی۔ سوبھا منخوار آدمی تھا۔ لڑائی جھگڑوں سے کوسوں دور بھاگنے والا۔ کسی سے مطلب نہیں، اپنے کام سے کام۔ ہوری اسے چاہتا تھا۔ ادھر وہ بھی ہوری کا ادب کرتا تھا۔ دونوں میں روپے پیسے کی باتیں ہونے لگیں۔ رائے صاحب کے اس نئے فرمان کی تنقید ہو رہی تھی۔

کوئی گیارہ بجتے بجتے ہوری لوٹا تو اسے معلوم ہوا جیسے گائے کے پاس کوئی آدمی کھڑا ہے۔ پوچھا ''کون ہے وہاں کھڑا؟'' ہیرا بولا ''میں ہوں دادا، تمہارے الاؤ میں آگ لینے آیا تھا۔''

ہیرا اس کے الاؤ میں آگ لینے آیا ہے۔ اس ذرا سی بات پر ہوری کو بھائی کی

لگاوٹ کا پتہ چلا۔ گاؤں میں اور بھی الاؤ ہیں۔ آگ ہی لے رہا ہے تو اپنا ہی سمجھ کر ۔سارا گاؤں اس الاؤ میں آگ لینے آتا تھا۔ جوگاؤں میں سب سے بڑا تھا مگر ہیرا کا آنا دوسری بات تھی اور اس دن کی لڑائی کے بعد ہیرا کے من میں میل نہیں رہتا۔ گسہ ور (غصہ ور) ہے پر دل کا سا پھ (صاف) ہے۔

اس نے محبت کے لہجہ میں پوچھا ''تما کھو ہے کہ لاؤں؟''

''نہیں تما کھو ہے دادا۔''

''سو بھا تو آج بہت بے حال ہے۔''

''کوئی دوائی نہیں کھاتا تو کیا کیا جائے؟ اس کے حساب میں تو سارے بید، ڈاکٹر، حکیم اناڑی ہیں۔ بھگوان کے پاس جتنی بدھی تھی، وہ اس کے اور اس کے گھر والے کے حصہ میں پڑ گئی ہے۔''

ہوری نے تشویش سے کہا ''یہی تو برائی ہے۔ اس میں اپنے سامنے کسی کو گنتا ہی نہیں اور چڑ چڑے تو بیماری میں سبھی ہو جاتے ہیں، تمہیں یاد نہیں جب تمہیں نفنز (انفلونیزا) ہو گیا تو دوائی اٹھا کر پھینک دیتے تھے۔ تمہارے دونوں ہاتھ پکڑتا تھا۔ تب تمہاری بھابھی منہ میں دوائی ڈالتی تھی، اس پر تم اسے تمام گالیاں دیتے تھے۔''

''ہاں دادا، بھلا وہ بات بھول سکتا ہوں، تم نے اتنا نہ کیا ہوتا تو تم سے رونے کے لیے کیسے بچا رہتا؟''

ہوری کو ایسا معلوم ہوا کہ ہیرا کہ آواز بھاری ہو گئی ہے۔ اس کا گلا ابھی بھرا آیا۔ بولا ''بیٹا! لڑائی جھگڑا تو زندگی کا دھرم ہے۔ اس سے جو اپنے ہیں، وہ پرائے تھوڑے ہی ہو جاتے ہیں۔ جب گھر میں چار آدمی رہتے ہیں، تبھی لڑائی جھگڑے

ہوتے ہیں۔جس کے آدمی ہے ہی نہیں'اس کے یہاں کون لڑے گا؟''

دونوں نے ساتھ چلم پی۔پھر ہیرا اپنے گھر گیا اور ہوری اندر کھانا کھانے چلا گیا۔

دھنیا غصہ سے بولی۔''سیر سپاٹے سے چھٹی نہیں ملی۔میں سب جانتی ہوں۔ مجھ کو سارا پتہ مل گیا ہے۔بھولا کی وہ رانڈ لڑکی نہیں ہے جھنیا'وہ اسی کے پھیر میں پڑا رہتا ہے۔ہوری کے کانوں میں بھی یہ بھنک پڑی تھی مگر اسے یقین نہ ہوا تھا۔گوبر بے چارا ان باتوں کو کیا جانے۔بولا''کسی نے کہا تم سے کچھ؟''

دھنیا تیز پڑی''تم سے چھپی ہوگی وہ'سبھی جگہ چرچا ہے۔یہ ہے'بھگا اور بہتر گھاٹ کا پانی پیے ہوئے،اسے انگلیوں پر نچا رہی ہے اور یہ سمجھا کہ وہ اس پر جان دیتی ہے،تم اسے سمجھا دو نہیں تو کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو کہیں کے نہ رہو گے۔''

ہوری کا دل امنگ پر تھا،چھیڑ کی سوجھی''جھنیا دیکھنے سننے میں تو بری نہیں ہے۔اسی سے کر لے۔گائی۔ایسی سستی مہریا اور کہاں ملی جاتی ہے۔''

دھنیا کو یہ چھیڑ تیر سی لگی''جھنیا اس گھر میں آئے منہ جھلس دوں رانڈ کا۔گوبر کی چہیتی ہے تو اسے لے کر جہاں چاہے رہے۔''

''اور جو گوبر اسی گھر میں لاوے۔''

''تو یہ دونوں لڑکیاں کس کے گلے باندھو گے؟ پھر برادری میں تمہیں کون پوچھے گا؟ کوئی دوارے پر کھڑا تک تو ہوگا نہیں۔''

''اسے اس کی کیا پروا؟''

''اس طرح نہیں چھوڑوں گی لالہ کو!مرمر کے میں نے پالا ہے اور جھنیا آ کر

راج لے گی! منہ میں آگ لگا دوں گی رانڈ کے!''

یکا یک گوبر آ کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا ''دادا سندریا کو کیا ہو گیا؟ کیا کالے نے کاٹ لیا؟ وہ تو پڑی تڑپ رہی ہے۔''

ہوری چوکے میں جا چکا تھا۔ تھالی سامنے چھوڑ کر باہر نکل آیا اور بولا ''کیا اسگن منہ سے نکالنے ہو۔ ابھی تو میں دیکھے آ رہا ہوں۔ لیٹی ہوئی تھی۔''

تینوں باہر گئے۔ چراغ لے کر دیکھا۔ سندریا کہ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ پیٹ پھول گیا تھا اور چاروں پاؤں پھیل گئے تھے۔ دھنیا سر پیٹنے لگی۔ ہوری پنڈت داتا دین کے پاس دوڑا۔ گاؤں میں وہی مویشی ڈاکٹر تھے، جی سونے جا رہے تھے، دوڑے ہوئے آئے۔ دم کے دم میں سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ گائے کو کسی نے کچھ کھلا دیا، علامت صاف تھی۔ صاف زہر دیا گیا ہے، لیکن گاؤں میں ایسا کون دشمن ہے جس نے زہر دیا ہو؟ ایسی واردات تو اس گاؤں میں کبھی ہوئی ہی نہیں باہر کا کون آدمی گاؤں میں آیا؟ ہوری کی کسی سے عداوت بھی نہ تھی کہ اس پر شبہ کیا جائے، ہیرا سے کچھ کہا سنی ہوئی تھی مگر وہ بھائی بھائی کا جھگڑا تھا۔ سب سے زیادہ دکھی تو ہیرا ہی تھا۔ دھمکی دے رہا تھا کہ جس نے یہ ہتھیاروں کا کام کیا ہے، اسے پائے تو لہو پی جائے۔ وہ لاکھ غصہ ور ہو مگر اتنی کمینہ حرکت نہیں کر سکتا۔

آدھی رات تک جمگھٹا رہا۔ سبھی ہوری کے دکھ میں دکھی تھے اور ہتھیارے کو گالیاں دیتے تھے۔ وہ اس وقت پکڑا جا سکتا تو اس کی جان کی خیر نہ تھی۔ جب یہ حال ہے تو کوئی جانوروں کو باہر کیسے باندھے گا؟ ابھی تک رات میں سبھی جانور

باہر پڑے رہتے تھے۔ کسی طرح کی چنتا نہ تھی، لیکن اب تو ایک نئی مصیبت آ کھڑی ہوئی تھی۔ کیا گائے تھی کے بس دیکھتا رہے۔ پوجنے لائک۔ پانچ سیر سے کم دودھ نہ تھا۔ سوسو کا ایک ایک بچھڑا ہوتا۔ ہوتے دیر نہ ہوئی کہ پہاڑ پھٹ پڑا۔

جب سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے تو دھنیا ہوری کو کوسنے لگی ''تمہیں کوئی لاکھ سمجھائے پر کرو گے اپنے ہی من کی ۹۔ تم گائے کھول کر آنگن سے چلے، تب تک میں جورو کتی رہی کے باہر نہ لے جاؤ، ہمارے دن پتلے ہیں۔ نجانے کب کیا ہو جائے۔ پر نہیں اسے گرمی لگ رہی ہے۔ اب کھوب (خوب) ٹھنڈی ہوگئی اور تمہارا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ ٹھاکر مانگتے تھے، دے دیا ہوتا تو ایک بوجھ سر سے اتر جاتا اور انسان کا احسان ہوتا۔ مگر پھر یہ تھپڑ کیسے پڑتا؟ کوئی بری بات ہونے والی ہوتی ہے تو مت پہلے ہی ماری جاتی ہے۔ اتنے دن آرام سے گھر میں بندھی رہی، نہ گرمی لگی نہ جوڑی آئی۔ اتنی جلدی سب کی پہچان ہوگئی تھی کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ باہر سے آئی ہے۔ بچے اس کی سینگوں سے کھیلتے رہتے تھے۔ سر تک نہ ہلاتی تھی۔ جو کچھ ناند میں ڈال دو، چاٹ پونچھ کر صاف کر دیتی تھی۔ لچھی تھی، ابھاگوں کے گھر کیا رہتی؟''

سونا اور روپا بھی اس ہلچل میں جاگ اٹھی تھیں اور زار و قطار رو رہی تھیں۔ اس کی خدمت کا بار زیادہ تر ان ہی دونوں پر تھا۔ ان کی ساتھی ہوگئی تھی، دونوں کھا کر اٹھتیں تو ایک ایک ٹکڑا روٹی اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھیں۔ کیسا جیبھ (زبان) نکال کر کھا لیتی تھی اور جب تک ان کے ہاتھ کو رنہ پا لیتی، کھڑی تاکتی رہتی بھاگ چھوٹ گئے!

گوبر اور دونوں لڑکیاں رو رو کر سو گئے تھے۔ ہوری بھی لیتا۔ دھنیا اس کے سرہانے پانی کا لوٹا رکھنے آئی تو ہوری نے آہستہ سے کہا ''تیرے پیٹ میں بات پچتی نہیں، کچھ سن پائے گی تو گاؤں بھر میں ڈھنڈورا پیٹتی پھرے گی۔''

دھنیا نے احتجاج کیا ''بھلا سنوں تو۔ میں نے کون سی بات پیٹ دی کہ یوں ہی نام بدنام کر دیا۔''

''اچھا تیرا سک (شک) کسی پر ہوتا ہے؟''

''میرا شک تو کسی پر نہیں ہے۔ کوئی باہر آدمی تھا۔''

''کسی سے کہے گی تو نہیں؟''

''کہوں گی نہیں تو گاؤں والے مجھے گہنے کیسے گڑھوا دیں گے۔''

''اگر کسی سے کہا تو مار ہی ڈالوں گا۔''

''مجھے مار سکھی نہ رہو گے۔ اب دوسری مہریا نہیں ملی جاتی۔ جب تک ہوں تمہارا گھر سنبھالے ہوئے ہوں، جس دن مر جاؤں گی سر پر ہاتھ دھر کر روؤ گے۔ ابھی مجھ میں ساری برائیاں ہی برائیاں ہیں، تب آنکھوں سے آنسو بہیں گے۔''

''میرا شک تو ہیرا پر ہوتا ہے۔''

''جھوٹ، بالکل جھوٹ! ہیرا اتنا نیچ نہیں ہے۔ وہ منہ کا ہی برا ہے۔''

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سچ نہیں ہے۔ وہ منہ کا ہی برا ہے۔''

''میں نے اپنی آنکھوں دیکھا! کب؟''

''وہی میں سوبھا کو دیکھ کر آیا تو وہ سندریا کی نانند کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا، کون ہے، تو بولا میں ہوں ہیرا۔ الاؤ سے آگ لینے آیا تھا۔ تھوڑی دیر مجھ

سے بات کرتا رہا۔ مجھے چلم پلائی۔ وہ ادھر گیا، میں گھر میں آیا اور وہیں گوبر نے پکار مچائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں گائے باندھ کر سو بھا کے گھر گیا ہوں اور اس نے ادھر آ کر کچھ کھلا دیا۔ شایت (شاید) پھر یہ دیکھنے آیا تھا کہ مری یا نہیں۔''

دھنیا نے سرد آہ کھینچ کر کہا ''اس طرح کہ ہوتے ہیں بھائی، جنہیں بھائی کا گلا کاٹنے میں بھی ہچک نہیں ہوتی۔ افواہ! ہیرامن کا اتنا کالا ہے! اور داڑھی جار کو میں نے ہی پال پوس کر بڑا کیا۔''

''اچھا جا، سورہ! مگر کسی سے بھول کر بھی چرچا نہ چلانا۔''

''کون، تڑکا ہوتے ہی لالہ کو تھانے نہ پہنچاؤں تو اپنے اصل باپ کی نہیں! یہ ہتیارا بھائی کہنے لایک (لایق) ہے۔ یہی بھائی کا کام ہے۔ وہ بیری ہے، پکا بیری! اور بیری کو مارنے میں پاپ نہیں، چھوڑنے میں پاپ ہے۔''

ہوری نے دھمکایا ''میں کہے دیتا ہوں دھنیا! انرتھ ہو جائے گا۔''

دھنیا جوش میں بولی ''انرتھ نہیں انرتھ کا باپ ہو جائے، میں بنا لالا کو بڑے گھر بجھوائے مانوں گی نہیں۔ تین سال چکی پسواؤں گی، تین سال وہاں سے چھوٹیں گیتو ہتیا لگے گی۔ تیرتھ کرنا پڑے گا۔ بھوج دینا پڑے گا۔ اس دھوکے میں نہ رہیں لالا! اور گواہی دلاؤں گی تم سے، لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھا کر۔''

اس نے اندر جا کر اڑ بند کر لیے اور ہوری باہر خود کو کوستا ہوا پڑ رہا۔ ''جب میرے ہی پیٹ میں بات نہ پچی تو دھنیا کے پیٹ میں کیا پچے گی؟ اب یہ چڑیل ماننے والی نہیں۔ ہٹ پر آ جاتی ہے تو کسی کو سنتی ہی نہیں۔ آج میں نے اپنی جندگی (زندگی) میں سب سے بڑی بھول کی تھی۔''

چاروں طرف سنسنان تاریکی چھائی تھی۔ دونوں بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں کبھی کبھی بج اٹھتی تھیں۔ دس قدم پر مردہ گائے پڑی ہوئی تھی اور ہوری بڑے ہی پچھتاوے میں پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اندھیرے میں اجالے کی لکیر کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔

(9)

علی الصباح ہوری کے مکان میں ایک پورا ہنگامہ تھا۔ ہوری دھنیا کو مار رہا تھا اور دھنیا اسے گالیاں دے رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں باپ کے پاؤں سے لپٹی ہوئی چلا رہی تھیں اور گوبر ماں کو بچا رہا تھا۔ بار بار ہوری کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے دھکیل دیتا مگر جیوں ہی دھنیا کے منہ سے کوئی گالی نکل جاتی، ہوری اپنے ہاتھ چڑا کر اسے دو چار گھونسے، لات جما دیتا۔ اس کا بوڑھا غصہ جیسے کسی چھپی اور جمع کی ہوئی طاقت کو باہر نکال لایا تھا۔ سارے گاؤں میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ سمجھانے بجھانے کے بہانے تماشا دیکھنے آ پہنچے۔ سوبھا لاٹھی ٹیکتا آ کھڑا ہوا۔ داتا دین نے ڈانٹا ''ایں یہ کیا ہے ہوری! تم باؤلے ہو گئے ہو کیا؟؟ کوئی اس طرح گھر کی لچھمی پر ہاتھ چھوڑتا ہے؟ تمہیں تو یہ روگ نہ تھا، کیا ہیرا کی چھوت تمہیں بھی لگ گئی؟''

ہوری نے پالاگن کر کے کہا ''مہراج! تم اس بھگت (وقت) نہ بولو۔ میں آج اس کی جان چھڑا کر تب دم لوں گا۔ میں جتنا ہی طرح دیتا ہوں، اتنا ہی یہ سر چڑھتی جاتی ہے۔''

دھنیا غصہ میں روتی ہوئی بولی ''مہراج! تم گواہ رہنا۔ میں آج اس کے ہتھیارے بھائی کو جہل (جیل) بجھوا کر تب پانی پیوں گی۔ اس کے بھائی نے گائے کو بس کھلا کر مار ڈالا ہے۔ اب جو میں تھانے میں رپٹ لکھانے جاتی ہوں تو یہ ہتیارا مجھے مارتا ہے۔ میں نے اس کے پیچھے اپنی جندگانی (زندگانی) ملیا میٹ کر دی، اس کا یہ انعام دے رہا ہے۔''

ہوری نے دانت پیس کر اور آنکھیں نکال کر کہا ''پھر وہی بات منہ سے نکالی! تو نے دیکھا تھا ہیرا کو بس دیتے؟''

''تو کسم (قسم) کھا جا کہ تو نے ہیرا کو گائے کے پاس کھڑا نہیں دیکھا؟''

''ہاں میں نے نہیں دیکھا، کسم کھاتا ہوں۔''

''بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کسم کھا۔''

ہوری نے گوبر کے سر پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھ کر، کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''میں کسم کھاتا ہوں کہ میں نے ہیرا کو ناند کے پاس نہیں دیکھا۔''

دھنیا نے زمین پر تھوک کر کہا ''تھڑی ہے تیری جھٹائی پر! تو نے آپ مجھ سے کہا کہ ہیرا چور کی طرح ناند کے پاس کھڑا تھا اور اب بھائی کے لیے جھوٹ بولتا ہے۔ تھڑی ہے! اگر میرے بیٹے کا بال بیکا ہوا تو گھر میں آگ لگا دوں گی۔ ساری گرہستی میں آگ لگا دوں گی۔ بھگوان! آدمی منہ سے بات کہہ کر اتنی بے سرمی سے پلٹ جاتا ہے!''

ہوری پاؤں پٹک کر بولا ''دھنیا! رس مت دلا، نہیں تو برا ہوگا۔''

''مار تو رہا ہے اور مار لے، جو تو اپنے باپ کا بیٹا ہوگا تو آج مجھے مار کر تب پانی

پڑے گا! پاپی نے مارتے مارتے مجھ بھرکس کر دیا۔ پھر بھی اس کا جی نہیں بھرا۔ مجھے مار کر سمجھاتا ہے کہ بڑا بیر ہوں۔ بھائیوں کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ پاپی کہیں کا بیتا را!''

پھر وہ فریاد کر کے رونے لگی۔ اس گھر میں آ کر اس نے کیا کیا دکھ درد نہیں جھیلا۔ کس کس طرح اپنا پیٹ تن نہیں کاٹا۔ کس کس طرح ایک ایک لتے کو ترسی، کس طرح ایک ایک پیسہ جان کی طرح بچا کر رکھا، کس طرح گھر بھر کو کھلا کر اور آپ پانی پی کر سو رہی اور آج اس سارے بلدانوں (قربانیوں) کا یہ بدلہ! بھگوان بیٹھیہ انیائے دیکھ رہے ہیں اور اسے بچانے نہیں دوڑتے!

رفتہ رفتہ رائے عامہ اب دھنیا کے موافق ہونے لگی۔ اس میں اب کسی کو شک نہ رہا کہ ہیرا نے ہی گائے کو زہر دیا۔

ہوری نے بالکل جھوٹی قسم کھائی ہے، اس کا بھی لوگوں کو یقین ہو گیا۔ گوبر کو باپ کی اس جھوٹی قسم اور اس کی وجہ سے آنے والی مصیبت کے اندیشے نے ہوری کے مخالف بنا دیا۔ اس پر جو داتا دین نے ڈانٹا تو ہوری ہار کھا گیا اور چپکے سے چلا گیا۔ راستی کی فتح ہوئی۔

داتا دین نے سوبھا سے پوچھا ''تم جانتے ہو سوبھا! کیا بات ہوئی؟''

سوبھا زمین پر لیٹا ہوا بولا ''میں مہاراج آٹھ دن سے باہر نہیں نکلا، ہوری دادا کبھی کبھی جا کر کچھ دے آتے ہیں، اسی سے کام چلتا ہے۔ کل رات میں بھی وہ میرے پاس گئے تھے۔ کس نے کیا کیا' میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں کل سانجھ کو ہیرا میرے گھر کھرپی مانگنے گیا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک جڑی کھودنا ہے۔ پھر تب سے اس

سے میری بھینٹ نہیں ہوئی۔''

دھنیا شہہ پا کر بولی ''پنڈت دادا! یہ اسی کا کام ہے۔ سوبھا کے گھر سے کھرپی مانگ کر لایا اور کوئی جڑی کھود کر گائے کو کھلا دی۔ اس رات کو جو جھگڑا ہوا تھا' اسی دن سے وہ رنج مانے بیٹھا ہے۔''

داتا بولے ''یہ بات ثابت ہو گئی تو اسے ہتیا لگے گی، پولیس کچھ کرے یا نہ کرے' دھرم تو بنا ڈنڈ دیئے نہ رہے گا، چلی تو جا رو پیا! ہیرا کو بلا لا۔ کہنا کہ پنڈت دادا بلا رہے ہیں۔ اگر اس نے ہتیا نہیں کی ہے تو گنگا جلی اٹھا لے اور چورے پر چل کر سوگند کھائے۔''

دھنیا بولی ''مہراج! اس کی سوگند کا بھروسہ نہیں، جھٹ پٹ کھا لے گا۔ جب اس نے جھوٹی سوگند کھالی جو بڑا دھرماتما بنتا ہے تو ہیرا کا کیا بسواس؟''

اب گوبر بولا ''کھالے جھوٹی سوگند، بنس کا انت (خاتمہ) ہو جائے، بوڑھے جیے رہیں، جوان جی کر کیا کریں گے؟''

روپا ایک لمحے میں آ کر بولی ''کاکا گھر میں نہیں پنڈت دادا! کاکی کہتی ہے کہ کہیں چلے گئے ہیں۔''

داتا دین نے لمبی داڑھی پھٹکار کر کہا ''تو نے پوچھا نہیں کہ کہاں چلے گئے ہیں؟ گھر میں چھپا بیٹھا نہ ہو۔ دیکھ تو سونا اندر تو نہیں بیٹھا ہے؟''

دھنیا نے ٹوکا ''اسے نہ بھیجو دادا! ہیرا کے سر ہتیا سوار ہے۔ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔''

داتا دین نے خود لکڑی سنبھالی اور خبر لائے کہ ہیرا کہیں سچ مچ چلا گیا ہے۔ پنیا

کہتی ہے، لٹیا ڈور اور ڈنڈا سب لے کر گئے ہیں۔ پنیا نے پوچھا بھی کہ کہاں جاتے ہو، پر بتایا نہیں۔ اس نے پانچ روپے آلے (طاق) میں رکھے تھے۔ روپے وہاں نہیں ہیں۔ شاید روپے بھی لیتا گیا۔

دھنیا ٹھنڈے دل سے بولی ''منہ میں کالکھ لگا کر کہیں بھاگ گیا ہوگا۔''

سوبھا بولا۔ ''بھاگ کر کہاں جائے گا؟ گنگا نہانے نہ چلا گیا ہو۔''

دھنیا نے شک ظاہر کیا ''گنگا جاتا تو روپے کیوں لے جاتا؟ اور آج کل کوئی پرب نہان بھی تو نہیں ہے۔''

اس شک کو کوئی دور نہ کر سکا۔ خیال مضبوط ہو گیا۔ آج ہوری کے گھر کھانا نہیں پکا، نہ کسی نے بیلوں کو پانی دیا۔ سارے گاؤں میں سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ دو دو چار چار آدمی جگہ جگہ جمع ہو کر اسی واقعہ پر رائے زنی کر رہے تھے۔ ہیرا ضرور کہیں بھاگ گیا۔ دیکھا ہوگا کہ بھید کھل گیا۔ اب جہل (جیل) الگ جانا پڑے گا اور ہتیا الگ لگے گی۔ بس کہیں بھاگ گیا۔ پنیا بھی رو رہی تھی کہ کچھ کہا نہ سنا، نہ جانے کہاں چل دیئے۔

جو کچھ کسر رہ گئی تھی، وہ شام کے وقت حلقہ کے تھانیدار نے آ کر پوری کر دی۔ گاؤں کے چوکیدار نے اس حلقے کی رپٹ کی، جو اس کا فرض تھا۔ پھر تھانیدار صاحب اپنے فرض سے کب چوکنے والے تھے۔ اب گاؤں والوں کو بھی ان کی خاطر مدارات کر کے اپنا فرض پورا کرنا چاہیے۔ داتا دین، جھنگری سنگھ، نوکھے رام، ان کے چاروں پیادے، منکر و شاہ اور لالہ پٹیشوری سبھی آ پہنچے اور داروغہ جی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ ہوری کی طلبی ہوئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا

کہ وہ تھانیدار کے سامنے آیا ایسا ڈر رہا تھا جیسے پھانسی ہو جائے گی۔ دھنیا کو پیٹتے وقت اس کا ایک ایک عضو پھڑک رہا تھا۔ داروغہ جی کے آگے کچھوے کی طرح اندر ہی اندر سمٹا جاتا تھا۔ داروغہ نے اسے محققانہ نگاہوں سے دیکھا اور اس کے دل تک پہنچ گئے۔ قیافہ شناسی میں انہیں اچھی مہارت تھی۔ کتابی علم النفس میں کورے ہوں مگر عملاً اس کے ماہر تھے۔ یقین ہو گیا کہ آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھے ہیں۔

ہوری کا چہرہ کہے دیتا تھا کہ اس کے لیے صرف ایک دھمکی کافی ہے۔

داروغہ نے پوچھا ''تجھے کس پر شبہ ہے؟''

ہوری نے زمین چھوئی اور ہاتھ جوڑ کر بولا ''میرا شبہ کسی پر نہیں ہے سرکار! گائے اپنی موت مری، بوڑھی ہو گئی تھی۔''

دھنیا بھی آ کر پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ فوراً بولی ''گائے ماری ہے تمہارے بھائی ہیرا نے۔'' ''سرکار ایسے مورکھ نہیں ہیں کہ جو کچھ تم کہہ دو گے، مان لیں گے۔ یہاں جانچ کرنے آئے ہیں۔''

داروغہ جی نے پوچھا۔ ''یہ کون عورت ہے؟''

کیہ آدمیوں نے داروغہ جی سے گفتگو کرنے کی خوش نصیبی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ ایک ساتھ بولے ہر ایک نے اپنے دل کو اس خیال سے تسکین دی کے پہلے میں بولا ''ہوری کے گھر والی ہے سرکار!''

''تو اسے بلاؤ۔ میں پہلے اسی کا بیان لکھوں گا۔ وہ کہاں ہے ہیرا؟''

خاص لوگوں نے ایک آواز سے کہا ''وہ تو آج تڑکے سے کہیں چلا گیا ہے سرکار!''

''میں اس کے گھر کی تلاشی لوں گا۔''

تلاشی! ہوری کا سانس نیچے اوپر ہونے لگا۔ اس کے بھائی ہیرا کے گھر کی تلاشی ہوگی اور ہیرا گھر میں نہیں ہے، تو پھر ہوری کے جیتے جی اور اس کے دیکھتے یہ تلاشی نہ ہونے پاوے گی اور دھنیا سے اس کا کوئی ناتا نہیں ہے، جہاں چاہے جائے۔ جب اس کی آبرو بگاڑنے پر آ گئی ہے تو اس کے گھر میں کیسے رہ سکتی ہے؟ جب گلی گلی ٹھوکر کھائے گی، تب پتہ چلے گا۔

گاؤں کے خاص لوگوں نے اس سنکٹ کو ٹالنے کے لیے کانا پھوسی شروع کی۔

داتا دین نے اپنا گنجا سر ہلا کر کہا ''یہ سب کمانے کے ڈھنگ ہیں۔ پوچھو ہیرا کے گھر میں کیا رکھا ہے؟''

پٹیشوری لالا بہت لمبے تھے مگر لمبے ہو کر بھی بیوقوف نہ تھے۔ اپنا لمبا، کالا منہ اور لمبا کر کے بولے ''اور یہاں آیا ہے کس لیے؟ اور جب آیا ہے تو بنا کچھ لیے دیئے گیا کب ہے؟''

جھگری سنگھ نے ہوری کو بلا کر کان میں کہا۔ ''نکالو جو کچھ دینا ہو، یوں گلا نہ چھوٹے گا۔''

داروغہ نے اب ذرا گرج کر کہا۔ ''میں ہیرا کے گھر کی تلاشی لوں گا۔''

ہوری کا چہرہ ایسا فق ہو گیا کہ گویا جسم کا سارا خون خشک ہو گیا ہو۔ تلاشی اس کے گھر ہوئی، تو ایک ہی بات ہے۔ ہیرا الگ تھی پر دنیا تو جانتی ہے کہ اس کا بھائی

ہے، مگر اس سے اس کا کچھ بس نہیں۔ اس کے پاس روپے ہوتے تو پچاس لا کر داروغہ جی کے پاؤں پر رکھ دیتا اور کہتا۔ ''سرکار! میری آبرو اب تیرے ہاتھ ہے''، مگر اس کے پاس تو زہر کھانے کو ایک پیسہ نہیں ہے۔ دھنیا کے پاس دو چار روپے پڑے ہوں، پر وہ چڑیل بھلا کب دینے لگی؟ پھانسی کی سزا پائے ہوئے آدمی کی طرح سر جھکائے اپنی بے عزتی کو سختی سے محسوس کرتا ہوا خاموش کھڑا رہا۔

داتا دین نے ہوری کو آگاہ کیا ''اب اس طرح کھڑے رہنے سے کام نہ چلے گا ہوری، روپے کی کوئی تدبیر کرو۔''

ہوری عاجزانہ بولا ''اب میں کیا کروں مہراج؟ ابھی تو پہلے ہی کی گٹھری سر پر لدی ہے اور کس منہ سے مانگوں؟ پر اس سنکٹ سے ابار لو۔ جیتا رہا تو کوڑی کوڑی چکا دوں گا۔ میں مر جاؤں تو گوبر تو ہے ہی۔''

لیڈروں میں مشورہ ہونے لگا۔ ''تھانیدار کو کیا بھینٹ کیا جائے۔'' داتا دین نے پچاس تجویز کیے۔ جھنگری سنگھ کی رائے میں سو سے کم پر سودا نہ ہوگا۔ نوکھے رام بھی سو کے حق میں تھے اور ہوری کے لیے سو اور پچاس میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس تلاش میں سنکٹ اس کے سر سے ٹل جائے، چاہے پوجا کتنی ہی چڑھانی پڑے۔ مرد کو ایک من لکڑی سے جلاؤ یا دس من سے، اسے کیا پروا؟

مگر پٹیشوری سے یہ بے انصافی دیکھی گئی۔ کوئی ڈاکہ یا قتل ہوا نہیں۔ صرف تلاشی ہو رہی ہے، بس بیس روپے بہت ہیں۔

لیڈروں نے لعنت ملامت کی۔ ''تو پھر تمہی تھانیدار سے بات چیت کرنا، ہم لوگ پاس نہ جائیں گے۔ کون گھر کیا کھائے؟''

ہوری نے پٹیشوری کے قدم پر سر رکھ دیا۔ ''بھیا! میرا ادھار کرو، جب تک جیوں گا تمہاری تابعداری کروں گا۔''

داروغہ جی نے پھر اپنے چوڑے سینہ اور بڑے پیٹ کا پورا زور لگا کر کہا۔ ''کہاں ہے ہیرا کا گھر؟ میں اس کے گھر کی تلاشی لوں گا۔''

پٹیشوری نے آگے بڑھ کر داروغہ جی کے کان میں کہا۔ ''تلاشی لے کر کیا کرو گے سرکار؟ اس کا بھائی آپ کی تابعداری کے لیے حاضر ہے۔''

دونوں آدمی ذرا الگ جا کر باتیں کرنے لگے۔

''کیسا آدمی ہے؟''

''بہت ہی گریب (غریب) ہجور (حضور)۔ کھانے کا ٹھکانا بھی نہیں۔''

''سچ!''

''ہاں! ہجور (حضور)۔ ایمان سے کہتا ہوں۔''

''ارے تو کیا ایک پچاسے کا بھی ڈول نہیں ہے؟''

''کہاں کی بات سرکار! دس مل جائیں تو ہزار سمجھئے۔ پچاس تو پچاس جنم میں بھی ممکن نہیں۔ اور سوہ بھی جب کوئی مہاجن کھڑا ہو جائے۔''

داروغہ جی نے ایک منٹ تک غور کر کے کہا۔ ''تو پھر اسے ستانے سے کیا فائدہ؟ میں ایسوں کو نہیں ستاتا جو آپ ہی مر رہے ہوں۔''

پٹیشوری نے دیکھا کہ نشانہ اور آگے جا پڑا۔ بولے۔ ''نہیں سرکار ایسا نہ کریں، نہیں تو پھر ہم کہاں جائیں گے۔ ہمارے پاس دوسری کونسی کھیتی ہے؟''

''تم علاقہ کے پٹواری ہو جی، کیسی باتیں کرتے ہو؟''

''جب ایسا کوئی موقع آجاتا ہے، آپ کی بدولت ہم بھی پا جاتے ہیں، نہیں تو پٹواری کو کون پوچھتا ہے؟''

''اچھا جاؤ تیس روپے دلوا دو، بیس روپے ہمارے اور دس تمہارے۔''

''چار مکھا ہیں، ان کا تو خیال کیجیے۔''

''اچھا نصف نصف پر رکھو جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

پٹیشوری نے جھنگری سے کہا، جھنگری نے ہوری کو اشارے سے بلایا، اپنے گھر لے گئے، تیس روپے گن کر اسے دیئے اور احسان رکھتے ہوئے بولے۔ ''آج ہی کاگذ (کاغذ) لکھ دینا۔ تمہارا منہ دیکھ کر روپے دے رہا ہوں، تمہاری بھلمنسی پر۔''

ہوری نے روپے لیے اور انگوچھے کے چھور میں باندھے ہوئے خوش خوش داروغی جی کی طرف چلا۔

یکا یک دھنیا جھپٹ کر آگے آئی اور انگوچھا ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ گانٹھ مضبوط نہ تھی۔ جھٹکے کے زور سے کھل گئی اور سارے روپے زمین پر بکھرے گئے۔ ناگن کی طرح پھنکار کر بولی ''یہ روپے کہاں لیے جا رہا ہے؟ بتا! بھلا چاہتا ہے تو سب روپے لوٹا دے۔ نہیں کہے دیتی ہوں! گھر کے آدمی رات دن مریں، دانے دانے کو ترسیں، چیتھڑا پہننے کو نہ ملے اور انجلی بھر روپے لے کر چلا ہے اجت (عزت) بچانے! ایسی بڑی ہے تیری اجت جس کے گھر میں چوہے لوٹیں، وہ بھی اجت والا ہے! دروگا (داروغہ) تلاشی ہی تو لے گا، لے لے، جہاں چاہے تلاسی۔ ایک تو سو روپے کی گائے گئی، اس پر پلیتھن! واہ رے تیری اجت!''

ہوری لہو کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ کل مجمع جیسے تھرا اٹھا۔ لیڈروں کے سر جھک گئے

اور تھانیدار کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ اپنی زندگی میں ان کی ایسی توہین ہوئی تھی۔

ہوری متحیر سا کھڑا رہا۔ زندگی میں آج پہلی بار دھنیا نے اسے بھرے اکھاڑے میں پٹک دیا۔ آسمان تکا دیا۔ اب وہ کیسے اٹھائے؟

مگر داروغہ جی اتنی جلد ہار ماننے والے نہ تھے، کھسیا کر بولے۔ ''مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شیطان کی خالہ نے ہیرا کو پھنسانے کے لیے گائے کو خود زہر دے دیا ہے۔''

دھنیا ہاتھ مٹکا کر بولی۔ ''ہاں دے دیا۔ اپنی گائے تھی۔ مار ڈالی پھر؟ کسی دوسرے کا جانور تو نہیں مارا؟ تمہارے جانچ یہی نکلتا ہے تو یہی لکھو پہنا دو میرے ہاتھ میں ہتھکڑی۔ دیکھ لیا تمہارا نیائے اور تمہاری بدھی کی پہنچ، گریبوں (غریبو) کا گلا کاٹنا دوسری بات ہے اور دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کرنا دوسری بات ہے۔''

ہوری آنکھوں سے انگارے برساتا دھنیا پر جھپٹا مگر گوبر آگے کھڑا ہو گیا اور تیزی سے بولا ''اچھا دادا اب بہت ہوا، پیچھے ہٹ گیا اور دھنیا شیر وہ کر بولی ''تو ہٹ جا گوبر! دیکھوں تو وہ کیا کرتا ہے میرا۔ داروغہ جی بیٹھے ہیں، اس کی ہمت دیکھوں۔ گھر میں تلاشی ہونے سے اس کی اجت جاتی ہے اور اپنی عورت کو سارے گاؤں کے سامنے لتیانے سے اس کی اجت نہیں جاتی! یہی تو بیروں کا دھرم ہے! بڑا بیر ہے تو کسی مرد سے لڑ! جس کی بانہہ پکڑ کر اسے مار کر بیر نہ دکھاوے گا، تو سمجھتا ہوگا کہ میں اسے روٹی کپڑا دیتا ہوں، تو لے آج سے اپنا گھر سنبھال۔ دیکھوں تو کہ کسی گاؤں میں تیری چھاتی پر مونگ دل کر رہتی ہوں کہ نہیں اور تیرے گھر سے اچھا کھاؤں گی، اچھا پہنوں گی، جی میں آوے تو دیکھ لے۔''

ہوری مغلوب ہو گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ عورت سے مرد کتنا کمزور ہے، کتنا بے بس۔

لیڈروں نے روپے چن کر اٹھا لیے تھے اور داروغہ جی کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کر رہے تھے کہ دھنیا نے ایک ٹھوکر اور جمائی۔ ''جس کے روپے ہوں، اسے لے جا کر دے دو۔ ہمیں کسی سے ادھار نہیں لینا ہے اور جو دینا ہے تو اسی سے لینا۔ میں دمڑی بھی نہ دوں گا، اسے لے جا کر دے دو۔ ہمیں کسی سے ادھار نہیں لینا ہے اور جو دینا ہے تو اسی سے لینا۔ میں دمڑی بھی نہ دوں گا، چاہے مجھے حاکم کی کچہری تک جانا پڑے۔ ہم باکی (باقی) چکانے کو پچیس روپے مانگتے تھے تو کسی نے نہ دیا۔ آج انجلی بھر روپے ٹھنا ٹھن نکال کر دے دیئے۔ میں سب جانتی ہوں۔ یہاں تو حصہ بانٹ ہونے والا تھا۔ سبھی کے منہ میٹھے ہوتے۔ یہ ہتیارے گاؤں کیمکھیا ہیں۔ گریبوں کا کھون (خون) پینے والے۔ سود، بیاج، ڈیڑھی سوائی، نجر (نذر) بھینٹ، گھوس رسوت، جیسے ہو گیریبوں کو لوٹو۔ اس پر سوراج چاہیے، جیل جانے سے سوراج نہ ملے گا۔ سوراج ملے گا، دھرم سے نیاؤ سے۔''

لیڈروں کے منہ میں کالک سی لگ گئی تھی اور داروغہ جی کے منہ پر جھاڑو سا پھر گیا تھا۔ اپنی اپنی عزت رکھنے کے لیے ہیرا کے گھر کی طرف چلے۔

راستے میں تھانیدار نے تسلیم کیا۔ ''عورت ہے بڑی دلیر!''

پٹیشوری لالا بولے۔ ''دلیر کیا ہے سرکار کرکسا ہے۔ ایسی عورت کو تو گولی مار دے۔''

''تم لوگوں کا قافیہ تنگ کر دیا اس نے۔ چار چار تو ملتے ہی۔''

''سرکار کے بھی تو پندرہ گئے۔''

''میرے کہاں جا سکتے ہیں، نہ دے گا تو گاؤں کے مکھیا دیں گے اور پندرہ کی جگہ پورے پچاس پورے! آپ لوگ فوراً انتظام کیجیے۔''

پٹیشوری نے ہنس کر کہا۔ ''سرکار بڑے دل لگی باز ہیں۔''

داتا دین بولے۔ ''بڑی آدمیوں کے یہی لچھن ہیں۔ ایسے بھاگوانوں کے درشن کہاں ہوتے ہیں۔''

داروغہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ چاپلوسی پھر کیجیے گا۔ اس وقت تو مجھے پچاس روپے دلائیے نقد اور یہ سمجھ لو کہ آنا کانی کی تو میں چاروں کے گھر کی تلاشی لوں گا۔ بہت ممکن ہے کہ تم نے ہیرا کو اور ہوری کو پھنسا کر ان سے پچاس اینٹھ لینے کے لیے یہ حرکت کی ہو۔''

ایڈرلوگ ابھی تک یہ سمجھ رہے تھے کہ داروغہ جی مذاق کر رہے ہیں۔

جھنگری سنگھ نے آنکھ مار کر کہا۔ ''نکالو پچاس روپے پٹواری صاحب۔''

نوکھے رام نے تائید کی۔ ''پٹواری صاحب کا الاکا (علاقہ) ہے۔ انہیں آپ کی کھاطر (خاطر) کرنی چاہیے۔''

پنڈت نوکھے رام کی چوپال آ گئی۔ داروغہ جی ایک پلنگ پر بیٹھ گئے اور بولے۔

''تم لوگوں نے کیا طے کیا؟ روپے نکالتے ہو یا تلاشی کراتے ہو۔''

داتا دین نے عذر کیا ''مگر سرکار.....''

''میں اگر مگر کچھ نہیں سننا چاہتا۔''

جھنگری سنگھ نے جرأت کی۔ ''سرکار یہ تو سراسر.....''

''میں پندرہ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر اتنی دیر میں پورے پچاس نہ آ گئے تو تم سب کے گھروں کی تلاشی ہوگی اور گنڈا سنگھ کو جانتے ہو۔ اس کا مارا پانی نہیں مانگتا۔''

پٹیشوری نے تریز ہو کر کہا۔ ''آپ کو اختیار ہے، تلاشی لے لیں۔ یہ اچھی دل لگی ہے کہ کام کون کرے اور پکڑا کون جائے۔''

''میں نے پچیس سال تھانہ داری کی ہے، جانتے ہو۔''

''لیکن ایسا اندھیر تو کبھی نہیں ہوا۔''

''تم نے ابھی اندھیر دیکھا کہاں؟ کہو تو وہ بھی دکھا دوں۔ ایک ایک کو پانچ پانچ سال کے لیے بھیجوں۔ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایک ڈاکے میں کل گاؤں کو کالا پانی دلا سکتا ہوں۔ اس دھوکے میں نہ رہنا۔''

چاروں آدمی چوپال کے اندر جا کر صلاح کرنے لگے۔

پھر کیا ہوا کسی کو معلوم نہیں۔ ہاں داروغہ جی گھوڑے پر سوار ہو کر چلے تو چاروں لیڈر لوگ پیچھے دوڑ رہے تھے۔ گھوڑا دور نکل گیا تو لوٹے، اس طرح گویا کسی عزیز کی لاش جلا کر مرگھٹ سے لوٹ رہے ہوں۔

یکا یک داتا دین بولے۔ ''میرا سراپ (بددعا) نہ پڑے تو منہ نہ کھاؤں۔''

نوکھے رام نے تائید کی۔ ''ایسا دھن کبھی پھلتے نہ دیکھا۔''

پٹیشوری نے پیشین گوئی کی۔ ''حرام کی کمائی حرام میں جائے گی۔''

جھنگری سنگھ کو آج خدائی انصاف میں شبہ پڑ گیا تھا۔ بھگوان نہ جانے کہاں

ہے کہ یہ اندھیر دیکھ کر بھی پاپیوں کو ڈنڈ نہیں دیتا۔
اس وقت ان لوگوں کی تصویر کھینچنے لائق تھی۔

(10)

ہیرا کا کہیں پتہ نہ چلا اور دن گزرتے جاتے تھے۔ ہوری سے جہاں تک بن پڑا، دوڑ دھوپ کی، پھر ہار کر بیٹھ رہا۔ کھیتی باڑی کی بھی فکر کرنی تھی۔ اکیلا آدمی کیا کیا کرتا؟ اور اب اپنی کھیتی سے زیادہ فکر تھی، پنیا کی کھیتی کی۔ پنیا اب تنہا ہو کر اور بھی تیز پڑ گئی تھی۔ ہوری کو اب اس کی خوشامد کرتے گزرتی تھی۔ ہیرا تھا، وہ پنیا کو دبائے رہتا تھا۔ اس کے چلے جانے سے اب پنیا پر کوئی آنکس نہ رہ گیا تھا۔ ہوری کے مخالفت ہیرا سے تھی۔ پنیا عورت تھی، اس س وہ کیا تنا تنی کرتا اور پنیا اس کے مزاج سے واقف تھی اور اس کی شرافت کا اسے خوب مزا چکھاتی تھی۔ خیریت یہی ہوئی کے کارندہ صاحب نے پنیا سے بقیا لگان وصول کرنے کے لیے کوئی سختی نہیں کی، صرف تھوڑی سی نذر پا کر راضی ہو گئے۔ ورنہ ہوری اپنے بقایا کے ساتھ اس کا بقایا ادا کرنے کے لیے بھی قرض لینے کو تیار تھا۔ ساون میں دھان نہ لگا سکا لیکن پنیا کے کھیتوں میں کیسے نہ لگائے جاتے؟ ہوری نے پہر پہر رات گئے تک کام کر کے اس کے دھان لگائے۔ اب ہوری ہی تو اس کا محافظ ہے۔ اگر پنیا کو کوئی تکلیف ہوتی، دنیا اس پر تو ہنسے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہوری کو خریف کی فصل میں بہت تھوڑا اناج ملا اور پنیا کے یہاں اسے رکھنے کی جگہ نہ تھی۔

ہوری اور دھنیا میں اس دن سے برابر کھید گی چلی آتی تھی۔ گوبر سے بھی ہوری کی بول چال بند تھی۔ ماں بیٹے نے مل کر گویا اس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اپنے گھر میں پردیسی بنا ہوا تھا۔ دو کشتیوں میں سوار ہونے والے کی جو درگت ہوتی ہے، وہی اس کی ہو رہی تھی۔ گاؤں میں بھی اب اس کی اتنی عزت نہ تھی۔ دھنیا اپنی ہمت سے صرف عورتوں کی بلکہ مردوں کی بھی لیڈر بن بیٹھی تھی۔ مہینوں تک قرب و جوار کے علاقوں میں اس واقعہ کا خوب چرچا رہا، حتیٰ کے وہ ایک آسمانی صورت اختیار کرتا جاتا تھا۔ دھنیا نام ہی اس کا جی یا دیوی کا اشٹ ہے، اسے داروغہ جی نے جیوں ہی اس کے آدمی کے ہاتھوں ہتھکڑی ڈالی کہ دھنیا نے دیوی جی کو یاد کیا۔ دیوی اس کے سر آ گئی، ۔پھر تو اس میں اتنی سکت آ گئی کہ اس نے ایک ہی جھٹکے میں اپنے مرد کی ہتھکڑی توڑ ڈالی اور داروغہ کی مونچھیں پکڑ کر اکھاڑ لیں۔ پھر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ داروغہ نے جب بہت منت کی، تب جا کر اسے چھوڑا۔ کچھ دن تو دھنیا کے درشن کو آتے رہے۔ وہ بات تو پرانی پڑ گئی مگر گاؤں میں دھنیا کی عزت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس میں عجیب ہمت ہے جو وقت پر مردوں کے بھی کان کاٹ سکتی ہے۔

مگر رفتہ رفتہ دھنیا میں ایک تبدیلی ہو رہی تھی۔ ہوری کو پنیا کی کھیتی میں لگا ہوا دیکھ کر بھی وہ کچھ نہ بولتی تھی اور یہ اس لیے نہیں کہ وہ ہوری کی طرف سے بالکل بے پروا ہو گئی تھی بلکہ اس لیے، کہ پنیا پر اب رحم آتا تھا۔ ہیرا کا گھر سے بھاگ جانا اس کا بدلا پورا کرنے کے لیے کافی تھا۔

اسی اثنا میں ہوری کو بخار آنے لگا۔ فصلی بخار پھیلا ہی تھا، ہوری بھی اسی کی زد

میں آ گیا اور کئی سال کے بعد جو بخار آیا تو اس نے سارا بقایا وصول کر لیا۔ ایک مہینے تک ہوری بستر پر پڑا رہا۔ اس بیماری نے ہوری کو کچل ڈالا م، مگر دھینا پر بھی فتح حاصل کر لی۔ شوہر جب مر رہا ہے، تو اس سے کیسا بیر؟ ایسی حالت میں تو بیریوں سے بھی بیر نہیں رہتا، پھر وہ تو اپنا مرد ہے۔ لاکھ برا ہو مگر اس کے ساتھ زندگی کے پچیس سال کٹے ہیں۔ آرام ملا ہے تو اسی کے ساتھ اور تکلیف جھیلی ہے تو اسی کے ساتھ۔ اب چاہے وہ اچھا یا برا، اپنا ہے۔ داری جار نے مجھے سب کے سامنے مارا۔ سارے گاؤں کے سامنے میرا پانی اتار لیا، لیکن تب سے کتنا لجاتا ہے کہ سیدھے تاکتا بھی نہیں۔ کھانے آتا ہے تو سر جھکائے کھا کر اٹھ جاتا ہے ڈرتا رہتا ہے کہ میں کچھ کہہ نہ بیٹھوں۔

ہوری جب اچھا ہوا تو شوہر و زن میں میل ہو گیا تھا۔

ایک دن دھنیا نے کہا ''تمہیں اتنا گسہ (غصہ) کیسے آ گیا؟ مجھے تو تمہارے اوپر کتنا ہی گسہ آوے، پر ہاتھ نہ اٹھاؤں گی۔''

ہوری نادم ہو کر بولا ''اب اس کا چرچا نہ کر دھنیا۔ میرے اوپر کوئی بھوت سوار تھا۔ اس کا مجھے کتنا دکھ ہوا ہے، یہ میں جانتا ہوں۔''

''اور جو میں بھی اسی رس میں ڈوب مری ہوتی؟''

''تو کیا میں رونے کے لیے بیٹھا رہتا؟ میری لاش بھی تیرے ساتھ چتا پر جاتی۔''

''اچھا چپ رہو، بے بات مت بکو۔''

''گائے گئی سو گئی، میرے سر ایک بپتا ڈال گئی۔ پنیا کی چنتا مجھے مار ڈالتی

ہے۔''

''اسی لیے تو کہتے ہیں کہ بھگوان کسی کا گھر بڑا نہ بنا دے۔ چھوٹوں کو کوئی نہیں سنتا، نیکی بدی سب بڑوں کے سر جاتی ہے۔''

ماگھ کے دن تھے۔ مہاوٹ لگ رہی تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک تو جاڑوں کی راتم، دوسرے ماگھ کی برکھا۔ موت کا سناٹا تھا۔ ہوری کھانا کھا کر پنیا کے مٹر کے کھیت کی مینڈ اپنی جھونپڑی میں لیٹا ہوا تھا۔ چاہتا تھا کہ ٹھنڈ کو بھول جائے اور سو رہے، مگر تار تار کمبل اور پھٹی ہوئی رضائی اور ٹھنڈ سے گیلا پوال اتنے بیریوں کے سامنے آنے کی ہمت نیند میں نہ تھی۔ تمباکو بھی نہ ملا کہ اس سے دل بہلتا۔ اپلا سلگایا تھا، پر وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ بوائی پھٹے پیروں کو پیٹ میں ڈال کر اور ہاتھوں کو رانوں کے بیچ میں دبا کر اور کمبل میں منہ چھپا کر اپنے ہی گرم سانسوں سے اپنے کو گرمی پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''پانچ سال ہوئے، یہ رضا بنوائی تھی۔ دھنیا نے ایک طرح سے جبراً بنوا دی تھی۔ وہی جب ایک بار کابلی سے کپڑے لیے تھے جسے کے پیچھے کتنی آفت ہوئی اور کتنی گالیاں کھانا پڑیں اور یہ کمبل تو اس کے جنم سے بھی پہلے کا ہے۔ بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ اس میں سوتا تھا، جوانی میں سوتا تھا، جوانی میں گوبر کو لے کر اس کمبل میں اس کے جاڑ کٹتے تھے، اور بڑھاپے میں آج وہی بوڑھا کمبل اس کا ساتھی ہے، مگر اب وہ کھانے کو چبانے والا دانت نہیں، بلکہ دکھنے والا دانت ہے۔ زندگی میں ایسا تو کوئی دن ہی نہیں آیا کہ زمیندار اور مہاجن کو دے۔ کبھی کچھ بچا ہوا اور بیٹھے بٹھائے یہ ایک جنجال پڑ گیا۔ نہ کرو تو دنیا ہنسے اور کرو تو یہ کھٹکا لگا رہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ سب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ

پنیا کو لوٹے لیتا ہے اور اس کی ساری اپج اپنے گھر میں بھرے لیتا ہے۔ احسان تو کیا ہوگا، الٹا کلنک لگتا ہے۔ ادھر بھولا کئی بار یاد دلا چکے ہیں کہ کہیں سگائی کا ڈول کرو، اب کام نہیں چلتا۔ سو بھا اس سے کئی بار کہہ چکا ہے کہ پنیا کا خیال اس کی طرف سے اچھا نہیں ہے۔ نہ ہو پنیا کی گرہستی تو اسے سنبھالنی ہی پڑے گی، چاہے ہنس کر سنبھالے یا رو کر۔ دھنیا کا دل بھی ابھی تک صاف نہیں ہے۔ نہ ہو پنیا کی گرہستی تو اسے سنبھالنی ہی پڑے گی، چاہے ہنس کر سنبھالے یا رو کر۔ دھنیا کا دل بھی ابھی تک صاف نہیں ہوا۔ ابھی تک اس کے دل میں ملال بھرا ہوا ہے۔ مجھے سب آدمیوں کے سامنے اسے مارنا نہ چاہیے تھا۔ جس کے ساتھ پچیس سال بیت گئے اسے مارنا اور کل گاؤں کے سامنے مارنا میرا کمینہ پن تھا، مگر دھنیا نے بھی تو میری آبرو اتارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میرے سامنے سے کیسا کترا کر نکل جاتی جیسے کبھی کی جان پہچان ہی نہیں۔ کوئی بات کہنی ہوتی تو سونا یا روپا سے کہلاتی۔ دیکھتا ہوں کہ اس کی ساڑھی پھٹ گئی ہے مگر کل مجھ سے کہا بھی تو سونا کی ساڑھی کے لیے۔ اپنی ساڑھی کا نام تک نہ لیا۔ سونا کی ساڑھی ابھی دو ایک مہینے جوڑ گانٹھ کر چل سکتی ہے۔ اس کی ساڑھی تو تھیگڑوں (پیوندوں) سے بالکل گدڑی ہو گئی ہے اور پھر میں ہی کون اس کا من رکھ رہا ہوں؟ اگر میں ہی اس کے من کی دو چار باتیں کرتا رہتا تو کون چھوٹا ہو جاتا۔ یہی تو ہوتا کہ وہ تھوڑا سا منا دن کراتی، دو چار لگنے والی باتیں سناتی، تو کیا مجھے چوٹ لگ جاتی؟ پھر میں بوڑھا ہو کر بھی الو بنا رہا۔ وہ تو کہو اس بیماری نے آ کر اسے نرم کر دیا، نہیں تو نہ جانے کب تک منہ پھلائے رہتی۔

اور آج ان دونوں میں جو باتیں ہوئی تھیں، وہ گویا بھوکے کے لیے غذا تھیں۔ وہ دل سے بولی تھی اور ہوری مگن ہو گیا تھا۔ جی میں آیا کہ اس کے پیروں پر سر رکھ دے اور کہے ''میں نے تجھے مارا ہے، تو لے میں بھی سر ہوری مگن ہو گیا تھا۔ جی میں آیا کہ اس کے پیروں پر رکھ دے اور کہے ''میں تجھے مارا ہے، تو لے میں بھی سر جھکائے دیتا ہوں۔ جتنا چاہے مار لے، جتنی گالیاں دینا چاہے دے لے۔''

یکا یک اسے جھونپڑی کے سامنے چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ اس نے کان لگا کر سنا، ہاں کوئی ہے۔ پٹواری کی لڑکی ہو گی یا چاہت پنڈت کی گھر والی ہو۔ مٹر اکھاڑنے آئی ہو گی۔ نہ جانے کیوں ان لوگوں کی نیت اتنی کھوٹی ہے۔ سارے گاؤں سے اچھا پہنتے ہیں، گھر میں ہجاروں (ہزاروں) روپے گڑے ہوئے ہیں، لین دین کرتے ہیں، ڈیوڑھی سوائی چلاتے ہیں، گھوس لیتے ہیں، دستوری لیتے ہیں، ایک نہ ایک معاملہ کھڑا کر کے اسے پیستے ہی رہتے ہیں، پھر بھی نیت کا یہ حال ہے! باپ جیسا ہو گا ویسی سنتان بھی تو ہو گی۔ اور آپ نہیں آتے عورتوں کو بھیجتے ہیں۔ ابھی اٹھ کر ہاتھ پکڑ لوں تو کیا پانی رہ جائے؟ چھوٹا کہنے کو چھوٹا ہے، پھر جو بڑا ہے اس کا جی تو اور بھی چھوٹا ہے، عورت ذات کا ہاتھ بھی نہیں پکڑتے بنتا۔ آنکھوں دیکھ کر بھی مکھی نگلنی پڑتی ہے۔ اکھاڑ لے، بھائی جتنا تیرا جی چاہے۔ سمجھ لے کہ میں نہیں ہوں۔ بڑے لوگ اپنی لاج نہ رکھیں، چھوٹوں کو تو ان کی لاج رکھنی ہی پڑتی ہے۔''

مگر نہیں، یہ تو دھنیا ہے۔ پکار رہی ہے۔

دھنیا نے پکارا۔ ''سو گئے کہ جاگتے ہو۔''

ہوری جھپٹ کر اٹھا اور جھونپڑی کے باہر آیا۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ دیوی مگن ہو کر اسے بردان دینے آئی ہے، اس کے ساتھ ہی اس بادل بوندی اور جاڑے پالے میں اتنی رات گئے اس کا آنا اندیشے کی بات تھی۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہوئی ہے۔

بولا۔ ''ٹھنڈ کے مارے نیند بھی نہیں آتی ہے۔ تم اس جاڑے پالے میں کیسے آئیں؟ سب کسل تو ہے۔''

''ہاں سب کسل ہے۔''

''گوبر کو بھیج کر مجھے کیوں نہیں بلوایا۔''

دھنیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ جھونپڑی میں آ کر پوال پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ''گوبر نے تو منہ پر کالکھ لگا دی، اس کی کرنی کا کیا پوچھتے ہو، جس بات کو میں ڈرتی ہوں، وہی ہو کر رہی۔''

''کیا ہوا؟ کسی سے مار پیٹ کر بیٹھا۔''

''اب میں کیا جانوں، کیا کر بیٹھا؟ چل کر پوچھو اسی رانڈ سے!''

''کس رانڈ سے؟ کیا کہتی ہے تو؟ بورا تو نہیں گئی ہے۔؟''

''ہاں بورا کیوں نہ جاؤں گی، بات ہی ایسی ہوئی ہے کہ چھاتی دونی ہو جائے۔''

ہوری کے دل میں روشنی کا ایک طویل خط کھنچ گیا۔

''صاف صاف کیوں نہیں کہتی؟ کس رانڈ کو کہہ رہی ہے؟''

''اسی جھنیا کو اور کس کو۔''

''تو جھنیا کی ایہاں آئی ہے؟''

''اور کہاں جاتی؟ پوچھتا کون؟''

''گوبر کیا گھر میں نہیں ہے؟''

گوبر کا کہیں پتہ نہیں، جانے کہاں بھاگ گیا۔ اسے پانچ مہینے کا پیٹ ہے۔''

ہوری سب کچھ سمجھ گیا۔ گوبر کو بار بار ہیرن ٹولہ جاتے دیکھ کر وہ کھٹک گیا، مگر اسے کھلاڑی نہ سمجھتا تھا۔ نوجوانوں میں کچھ لگاوٹ ہوتی ہی ہے، اس میں کوئی نئی بات نہیں مگر جس روئی کے گالے کو نیلے آسمان میں ہوا جھونکے سے اڑتا دیکھ کر وہ صرف مسکرا دیا تھا، وہی سارے آسمان میں پھیل کر اس کے راستے کو اتنا تاریک بنا دے گا۔ یہ تو کوئی دیوتا بھی نہ جان سکتا تھا۔ گوبر ایسا بدچلن! وہ سیدھا سادا گنوار جسے وہ ابھی بچہ سمجھتا تھا مگر اسے بھوج پڑ جانے کی فکر نہ تھی، پنچایت کا خوف نہ تھا، جھنیا کیسے گھر میں رہے گی، اس کی فکر اسے نہ تھی، اسے تو گوبر کی فکر تھی۔ لڑکا شرمیلا ہے، اناڑی ہے، پانی وار ہے، کہیں کوئی نادانی نہ کر بیٹھے۔

گھبرا کر بولا۔ ''جھنیا نے کچھ کہا نہیں کہ گوبر کہاں گیا؟ اس سے تو کہہ کر ہی گیا ہوگا۔''

دھنیا جھلا کر بولی ''تمہاری عقل تو گھاس کھا گئی ہے۔ اس کی چہیتی تو یہاں بیٹھی ہے۔ وہ بھاگ کر جائے گا کہاں؟ یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہوگا۔ دو دھ تھوڑے ہی پیتا ہے کہ کھو جائے گا۔ مجھے تو اس کلمنہی (سیاہ رو) جھنیا کی چنتا ہے کہ اسے کیا کروں۔ اپنے گھر میں تو میں چھن بھر بھی نہ رہنے دوں گی۔ جس دن گائے لانے گیا ہے، اسی دن سے دونوں میں تاک جھانک ہونے لگی ہے۔ پیٹ نہ رہتا تو

ابھی بات کھلتی۔ مگر پتہ چل گیا تو جھنیا لگی گھبرانے۔ کہنے لگی کہ کہیں بھاگ چلو۔ گوبر ٹالتا رہا۔ ایک عورت کے ساتھ لے کر کہاں جائے، کچھ نہ سوجھا۔ پر جب وہ آج سر ہوگئی کہ مجھے یہاں سے لے چلو نہیں تو میں جان دے دوں گی تو بولا 'تو چل کر میرے گھر میں رہ۔ کوئی کچھ نہ بولے گا۔ میں اماں کو مناؤں گا، تب یہ کل منہی اس کے ساتھ چل پڑی، کچھ دور تو وہ آگے آگے آتا رہا، پھر نہ جانے کدھر سرک گیا۔ یہ کھڑی کھڑی اسے پکارتی رہی۔ جب رات بھیگ گئی اور وہ نہ لوٹا۔ یہ بھاگی ہوئی یہاں چلی آئی۔ میں نے تو کہہ دیا ہے کہ جو کیا ہے، اس کا پھل بھوگ۔ ابھاگن نے میرے لڑکے کو چوپٹ کر دیا کر دیا۔ تب اسے بیٹھی رو رہی ہے، اٹھتی ہی نہیں۔ کہتی ہے کہ اپنے گھر کون منہ سے جاؤں؟ بھگوان ایسی سنتان سے تو بانجھ ہی رکھے تو اچھا۔ سیرے ہوتے ہوتے سارے گاؤں میں کاؤں کاؤں مچ جائے گی۔ ایسا جی ہوتا ہے کہ بس کھالوں، میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ میں اپنے گھر میں نہ رکھوں گی۔ گوبر کو رکھنا ہو تو اپنے سر پر رکھے، میرے گھر میں ایسوں کے لیے جگہ نہیں ہے اور اگر تم بیچ میں بولے تو پھر یا تم رہو گے یا میں رہوں گی۔''

ہوری بولا۔ ''تجھ سے بنا نہیں۔ اسے گھر میں آنے ہی نہ دینا چاہیے تھا۔''

''سب کچھ کہہ کے ارگئی، ٹلتی ہی نہیں، دھرنا دیئے بیٹھی ہے۔''

''اچھا چل دیکھوں کیسے نہیں اٹھتی، گھسیٹ کر باہر نکال دوں گا۔''

''داری جا بھوگا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ پر چپ ہی سادھے بیٹھا رہا۔ باپ بھی ایسے بے حیا ہوتے ہیں۔''

''وہ کیا جانتا تھا کہ ان میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔''

''جانتا کیوں نہیں؟ گوبر رات دن گھیرے رہتا تھا تو کیا اس کی آنکھیں پھوٹ گئی تھیں۔ سوچنا چاہیے تھا نا کہ یہاں کیوں دوڑ دوڑ آتا ہے۔''

''چل میں جھنیا سے پوچھتا ہوں نا۔''

دونوں جھونپڑی سے نکل کر گاؤں کی طرف چلے۔ ہوری نے کہا۔ ''پانچ گھڑی رات سے اوپر گئی ہوگی۔''

دھنیا بولی ''ہاں اور کیا، مگر کیسا سوتا پڑ گیا ہے کہ کوئی چور آئے تو گاؤں بھر کو لوٹ لے جائے۔''

''چور ایسے گاؤں میں نہیں آتے۔ امیروں کے گھر آتے ہیں۔''

دھنیا نے ذرا رک کر ہوری کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ''دیکھو شور نہ مچانا۔ نہیں تو سارا گاؤں جاگ اٹھے گا اور بات پھیل جائے گی۔''

ہوری نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لاؤں گا اور گاؤں باہر کر دوں گا۔ بات تو ایک دن کھلنی ہے، پھر آج ہی کیوں نہ کھل جائے؟ وہ میرے گھر آئی کیوں؟ جائے جہاں گوبر ہو۔ اس کے ساتھ بد اعمال کیا تو کیا ہم سے پوچھ کر کیا تھا۔''

دھنیا نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ سے کہا۔ ''تم اس کا ہاتھ پکڑو گے تو چلا ئے گی۔''

''تو چلایا کرے۔''

''مگر اتنی رات گئے اس اندھیرے سناٹے میں جائے کہاں۔ یہ تو سوچو۔''

''جائے جہاں اس کے سگے ہوں۔ ہمارے گھر میں اس کا کیا رکھا ہے۔''

''ہاں۔ پر اتنی رات گئے گھر سے نکالنا ٹھیک نہیں۔ پاؤں بھاری ہیں، کہیں ڈر ڈر جائے تو اور آپھت (آفت) ہو۔ اسی دسا میں کچھ کرتے دھرتے بھی تو نہیں بنتا۔''

''ہمیں کیا کرنا ہے، مرے یا جیئے۔ جہاں چاہے جائے۔ کیوں اپنے منہ میں کالکھ لگاؤں؟ میں تو گوبر کو بھی نکال باہر کروں گا۔''

دھنیا نے بہت متفکر ہو کر کہا۔ ''کالکھ جو لگنی تھی وہ تو لگ گئی۔ وہ اب جیتے جی نہیں چھوٹ سکتی۔ گوبر نے ناؤ دبا دی۔''

''گوبر نے نہیں ڈبائی، ڈبائی اسی نے۔ وہ تو بچہ تھا، اس کے پنجے میں آ گیا۔''

''کسی نے ڈبائی ہو، اب تو ڈوب ہی گئی۔''

دونوں دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ دفعتاً دھنیا نے ہوری کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا ''دیکھو تمہیں میری سوگند، اس پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ وہ تو آپ ہی رو ہی ہے۔ بھاگ کر کھوٹی نہ ہوتی تو یہ دن ہی کیوں آتا۔''

ہوری کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دھنیا کی یہ نسوانی محبت اس تاریکی میں بھی گویا چراغ کی طرح اس کی فکرمند صورت کو منور کر رہی تھی۔ دونوں کے دل میں گویا گزرا ہوا شباب جاگ اٹھا تھا۔ ہوری کو اس ڈھلی ہوئی عورت میں بھی وہی نرم و نازک دل والی لڑکی نظر آئی جو پچیس سال پہلے اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ اس کے گلے لگنے میں بھی کتنا اتھاہ پریم تھا جو سارے کلنک، ساری تکلیفوں اور سب سماجی رواجی بندشوں کو اپنے اندر سمیٹے لیتا تھا۔

دونوں نے دروازے پر آ کر کواڑی درازوں سے اندر جھانکا۔ ڈیوٹ پر تیل

کی کپی جل رہی تھی اور اس کی دھندلی روشنی میں جھنیا گھٹنے پر سر رکھے، دروازے کی طرف منہ کئے، اندھیرے میں اس خوشی کو تلاش کر رہی تھی جو ابھی ایک لمحہ قبل اپنا دل فریب جلوہ دکھا کر غائب ہوگئی تھی۔ وہ آفت کی ماری طنز کے تیروں سے زخمی اور زندگی کے صدموں سے پریشان کسی پیڑ کی چھاؤں کھوجتی پھرتی تھی اور اسے ایک مکان مل بھی گیا تھا، جس کی پناہ میں وہ خود محفوظ مسرور سمجھ رہی ہے، مگر آج وہ مکان اپنے سارے سکھ کا ساز و سامان لیے ہوئے الہ دین کے شاہی محل کی طرح غائب ہوگیا تھا اور مستقبل ایک خوفناک دیو کی طرح اسے نگل جانے کو کھڑا تھا۔

دفعتاً دروازہ کھلتے اور ہوری کو آتے دیکھ کر وہ خوف سے کانپتی ہوئی اٹھی اور ہوری کے قدموں پر گر کر روتی ہوئی بولی ''دادا! اب تمہارے سوائے مجھے دوسرا ٹھور نہیں ہے۔ چاہے مارو، چاہے کاٹو، پر اپنے دوارے سے دور دراؤ مت!''

ہوری نے جھک کر پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا ''ڈر مت بیٹی، ڈر مت، تیرا گھر ہے، تیرا دوار ہے، تیرے ہم ہیں۔ آرام سے رہ۔ جیسی تو بھولا کی بیٹی ہے ویسی ہی میری بیٹی ہے۔ جب تک ہم جیتے ہیں کسی بات کا کھٹکا مت کر۔ ہمارے رہتے کوئی تجھے ٹیڑھی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے گا۔ برادری کا بھوج جو لگے گا، وہ سب ہم دے دیں گے۔ تیرے لیے کوئی چنتا کی بات نہیں۔''

جھنیا دلاسا پا کر اور بھی ہوری کے قدموں سے لپٹ گئی اور بولی ''دادا! اب تم ہی میرے پاس ہو اور اماں! تم ہی میری ماں ہو۔ میں اناتھ ہوں۔ مجھے سرن (پناہ) دو گے۔ نہیں تو میرے کاکا اور بھائی مجھے کچا کھا جائیں گے۔''

دھنیا رقت کے جوش کو اب نہ روک سکی۔ بولی۔ ''تو چل گھر میں بیٹھ، میں دیکھ لوں گی کا کا اور بھیا کو۔ سنسار میں ان ہی کا راج نہیں ہے۔ بہت کریں گے اپنے گہنے لے لیں گے۔ پھینک دینا اتار کر!''

ابھی ذرا دیر پہلے دھنیا نے غصے کے جوش میں ابھاگنی، کلنکن اور کل منہی، نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا تھا۔ جھاڑو مار کر گھر سے نکالنے جا رہی تھی۔ اب جو جھنیا نے محبت، عفو اور تسکین سے بھرے ہوئے یہ کلمے سنے تو ہوری کے پاؤں چھوڑ کر دھنیا کے پاؤں سے لپٹ گئی اور وہی پاک باز عورت جس نے ہوری کے سوا کسی مرد کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہ تھا، اس پاپی جھنیا کو گلے لگائے اس کے آنسو پونچھ رہی تھی اور اس کے دبے ہوئے دل کو اپنی ملائم باتوں سے تسلی دے رہی تھی، جیسے کوئی چڑیا اپنے بچوں کو پروں میں چھپائے بیٹھی ہو!''

ہوری نے دھنیا کو اشارہ کیا کہ اسے کچھ کھلا پلا دے اور جھنیا سے پوچھا۔

''کیوں بیٹی، تجھے معلوم ہے کہ گوبر کدھر گیا ہے؟''

جھنیا نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے تو کچھ نہیں کہا، میرے کارن تمہارے اوپر.....'' یہ کہتے کہتے اس کی آواز آنسوؤں سے رندھ گئی۔

ہوری اپنی بے چینی نہ چھپا سکا۔

''جب تو نے آج اسے دیکھا وہ کچھ دکھی تھا؟''

''باتیں تو ہنس ہنس کے کر رہے تھے۔ من کا حال رام جانے۔''

''تیرا من کیا کہتا ہے؟ ہے گاؤں ہی میں کہ کہیں باہر چلا گیا؟''

''مجھے تو شک ہوتا ہے کہیں باہر چلے گئے ہیں۔''

''یہی میرا من بھی کہتا ہے۔کیسی نادانی کی۔ہم اس کے بیری تھوڑے ہی تھے۔جب بھلی یا بری ایک بات ہوگئی تو اسے نباہنا پڑتا ہے۔اس طرح بھاگ کر تو اس نے ہماری جان سنکٹ میں ڈال دی۔''

دھنیا نے جھنیا کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جاتے ہوئے کہا۔''منہ چور کہیں کا! جس کی بانہہ پکڑی۔اس کا نباہ کرنا چاہیے کہ منہ میں کالکھ پوت کر بھاگ جانا چاہیے؟ اب تو آوے،گھر میں گھسنے نہ دوں۔''

ہوری وہیں پوال پر لیٹا۔گوبر کہاں گیا؟ یہ سوال اس کے دل کے آسمان میں کسی پرند کی طرح منڈلانے لگا۔

(11)

ایسے غیر معمولی واقعہ پر گاؤں میں جو کچھ ہلچل مچنا چاہیے تھی وہ مچی اور مہینوں تک مچتی رہی۔جھنیا کے دونوں بھائی لاٹھیاں لیے گوبر کو کھوجتے پھرتے تھے۔ بھولا نے قسم کھائی کہ اب نہ جھنیا کا منہ دیکھیں گے اور نہ اس گاؤں کا۔ہوری سے انہوں نے اپنے بیاہ کی جو بات چیت کی تھی وہ اب بند ہوگئی تھی۔اب وہ اپنی گائے کے روپے لیں گے اور نقد اور اس میں دیر ہوئی تو ہوری پر دعویٰ کر کے اس کا گھر بار نیلام کرالیں گے۔گاؤں والوں نے ہوری کو برادری سے خارج کر دیا۔کوئی اس کا حقہ نہیں پیتا،نہ اس کے گھر پانی پیتا ہے۔کنویں سے پانی بند کر دینے کی کچھ بات چیت تھی،مگر دھنیا کا غصہ سب دیکھ چکے تھے۔بس کسی کو آگے آنے کی ہمت نہ

پڑی۔ دھنیا نے سب کو سنا سنا کر کہہ دیا کہ کسی نے اسے پانی بھرنے سے روکا تو اس اور اپنا خون ایک کر دوں گی۔

اس للکار نے سبھی کے پتے پانی کر دیئے۔ سب سے دکھی ہے جھنیا جس کے سبب یہ سارا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ اور گوبر کی کوئی کھوج خبر نہ ملنا، اس دکھ کو اور بھی بڑھائے دیتا ہے۔ تمام دن منہ چھپائے گھر میں پڑی رہتی ہے۔ باہر نکلے تو چاروں طرف سے طنز یہ تیروں کی بارش ہوتی ہے کہ جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ دن بھر گھر کا کام دھندا کرتی رہتی ہے اور جب فراغت پاتی ہے تو رو لیتی ہے۔ ہر وقت تھر تھر کانپتی رہتی ہے کہ دھنیا کہیں کچھ کہہ نہ بیٹھے۔ صرف کھانا تو نہیں پکا سکتی کیوں کہ اس کے ہاتھ کا پکایا کوئی کھائے گا نہیں، باقی سارا کام اس نے اپنے اوپر لے لیا ہے۔ گاؤں میں جہاں چار عورت مرد جمع ہوتے ہیں، یہی تذکرہ ہونے لگتا۔

ایک دن دھنیا بازار سے چلی آ رہی تھی کہ راستے میں پنڈت داتا دین مل گئے۔ دھنیا نے سر نیچا کر لیا اور چاہتی تھی کہ کترا کر نکل جائے مگر پنڈت جی چھیڑ کا موقع پا کر کب چوکنے والے تھے، چھیڑ ہی تو بیٹھے۔ ''گوبر کا کچھ پتہ چلا کہ نہیں؟ ایسا کپوت نکلا کہ گھر کی ساری مریادہ بگاڑ دی۔''

دھنیا کے دل میں خود یہی خیال آتا رہتا تھا۔ اداس من سے بولی ''برے دن آتے ہیں بابا تو آدمی کی مت ماری جاتی ہے اور کیا کہوں۔''

داتا دین بولے۔ ''تمہیں اس پاجن کو گھر میں نہ رکھنا چاہیے تھا۔ دودھ میں مکھی پڑ جاتی ہے تو آدمی اسے نکال پھینک دیتا ہے اور دودھ پی جاتا ہے سوچو،

دیکھو کتنی بدنامی اور جگ ہنسائی ہو رہی ہے۔ وہ گھر میں نہ رہتی تو کچھ نہ ہوتا۔ لڑکوں سے اس طرح بھول ہوتی رہتی ہے۔ جب تک برادری کا بھوج نہ دوگی اور برہمنوں کو نہ کھلاؤ گی، تب تک کیسے ادھار ہوگا، اسے گھر میں نہ رکھتے تو کچھ نہ ہوتا۔ ہوریتو پاگل ہے ہی، پر تو کیسے دھوکا کھا گئی۔''

داتا دین کا لڑکا ماتا دین ایک چماری سے آشنائی کیے ہوئے تھے، اسے سارا گاؤں جانتا تھا، مگر وہ تلک لگاتا تھا، پوتھی پتر اپڑھتا تھا، بھاگوت کہتا تھا اور پروہتی کا کام کرتا تھا۔ اس کے وقار میں ذرا بھی کمی نہ تھی۔ وہ روزانہ اشنان پجا کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ کر دیتا تھا۔ دھنیا جانتی تھی کہ جھنیا کو گھر میں رکھ لینے ہی سے یہ ساری بلا آئی ہے۔ اسے نہ جانے کیسے دیا آ گئی، ورنہ اسی رات کو جھنیا کو نکال دیتی تو کیوں اتنی بدنامی ہوتی۔ مگر یہ خوف بھی تو تھا کہ تب اس کے لیے کنواں تالاب کے سوا اور ٹھکانا کہاں تھا؟ ایک نہیں بلکہ دو جانوں کی قیمت دے کر وہ اپنے مریادکو کیسے بچاتی؟ پھر جھنیا کے پیٹ میں جو بچہ ہے، وہ دھنیا ہی کے کلیجہ کا ٹکڑا ہے۔ ہنسی کے ڈر سے اس کی جان کیسے لے لیتی؟ اور پھر جھنیا کی بے کسی اور عاجزی بھی تو اسے متاثر کرتی رہتی تھی۔ وہ باہر سے جلی بھنی آتی مگر جیوں ہی جھنیا لوٹے میں پانی لا کر دیتی اور اس کے پیر دھلانے لگتی، اس کا غصہ پانی ہو جاتا، بے چاری لاج اور دکھ سے آپ ہی دبی ہوئی ہے اسے اور کیا دبائے؟ مرے کو اور کیا مارے۔

اس نے تند لہجے میں کہا۔ ''ہم کو گھرانے کی مریادا اتنی پیاری نہیں ہے مہراج! کہ اس کے پیچھے ایک جیو کی ہتیا کر ڈالتے۔ بیاہتا نہ سہی، پر اس کی بانہہ تو پکڑی ہے۔ میرے ہی بیٹے نے۔ کس منہ سے نکال دیتی؟ وہی کام بڑے بڑے کرتے

ہیں۔ ذرا ان سے کوئی کچھ نہیں بولتا، انہیں کلنک ہی نہیں لگتا، وہی کام چھوٹے آدمی کرتے ہیں تو ان کی مریادا دھو جاتی ہے، ناک کٹ جاتی ہے۔ بڑے آدمیوں کو اپنی ناک دوسروں کی جان سے پیاری ہوگی، ہمیں تو اپنی ناک اتنی پیاری نہیں۔''

داتا دین ہار ماننے والے جیو نہ تھے۔ وہ دس گاؤں کے نارد تھے۔ یہاں کی وہاں اور وہاں کی یہاں لگانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ چوری تو نہ کرتے تھے۔ اس میں جان جوکھم کا معاملہ تھا مگر چوری کے مال میں حصہ لینے کے وقت ضرور پہنچ جاتے تھے۔ کہیں پیٹھ میں دھول نہ لگنے دیتے تھے۔ زمیندار کو آج تک لگان کی ایک پسائی نہ دی تھی، قرقی آتی تو کنویں میں گرتی چلتے نوکھے رام کے لیے دھرے کچھ نہ بنتا، مگر آسامیوں کو سود پر روپیہ قرض دیتے تھے۔ کسی عورت کو کوئی زیور بنوانا ہے تو داتا دین اس کی خدمے کے لیے حاضر ہیں۔

شادی بیاہ طے کرنے میں انہیں بڑا لطف آتا ہے۔ نیک نامی بھی ملتی ہے اور دکشنا بھی۔ بیماری میں علاج معالجے بھی کرتے ہیں اور جھاڑ پھونک بھی۔ جیسی مریض کی مرضی اور صحبت یافتہ ایسے ہیں کہ جوانوں میں جوان بن جاتے ہیں، بچوں میں بچے اور بوڑھوں میں بوڑھے۔ چور کے بھی ساتھی ہیں اور شاہ کے بھی۔ گاؤں میں کسی کو ان پر اعتبار نہیں ہے، مگر ان کی باتوں میں کچھ ایسی کشش ہے کہ لوگ بار بار دھوکا کھا کر بھی ان کی پناہ لیتے ہیں۔

سر اور ڈاڑھی ہلا کر بولے ''یہ تو ٹھیک کہتی ہے دھنیا! دھرماتما لوگوں کا یہی دھرم ہے، پر سماجی ریت رواج کا نباہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔''

اسی طرح پٹیشوری لالا نے ہوری کو چھیڑا۔ وہ گاؤں میں دھرماتما مشہور تھے۔

پورنماشی کو ہمیشہ ست نارائن کی کتھا سنتے تھے، مگر پٹواری ہونے کی وجہ سے اپنے کھیت بیگار میں جتواتے تھے۔ بیگار میں سینچواتے تھے اور اسامیوں کو آپس میں لڑا کر رقمیں مارتے تھے، فصل کی چیزیں آسامیوں سے لے کر کچہری اور تھانہ کے عملوں کو بھینٹ کرتے رہتے تھے۔ اس سے کل علاقے میں ان کی اچھی دھاک تھی۔ اگر کوئی ان کے ہتھے چڑھا تو غ داروغہ گھنڈا سنگھ تھے، جو حال ہی میں اس علاقے میں تعینات ہو کر آئے تھے۔ پراپکاری بھی تھے۔ بخار کے دنوں میں سرکاری کونین تقسیم کرتے تھے، کوئی بیمار ہو تو اس کی خیر و عافیت پوچھنے ضرور جاتے تھے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے آپس ہی میں طے کرا دیتے تھے۔ شادیوں میں پالکی، قالین اور محفل کا سامان منگنی دے کر لوگوں کا کام نکال دیتے تھے۔ یہ سب کرتے ہوئے بھی موقع پر نہ چوکتے تھے مگر جس کا کھاتے تھے، اس کا گاتے بھی تھے۔

بولے۔ ''پرتم نے کیا روگ پال لیا ہوری؟''

ہوری نے پیچھے پھر کر پوچھا ''تم نے کیا کہا لالہ؟ میں نے سنا نہیں۔''

پٹیشوری پیچھے سے قدم بڑھاتے ہوئے برابر آ کر بولے۔ ''کہہ رہا تھا کہ دھنیا کے ساتھ کیا تمہاری عقل بھی گھاس کھا گئی ہے؟ جھنیا کو کیوں نہیں اس کے باپ کے گھر بھیج دیتے؟ ناحق اپنی ہنسی کرا رہے ہو۔ نہ جانے کس کا بچہ لے کر آئی ہے اور تم نے گھر میں رکھ لیا ہے۔ ابھی تمہاری دو دو لڑکیاں بیاہنے کو بیٹھی ہوئی ہیں۔ سوچو کیسے بیڑا پار ہوگا۔''

ہوری اس طرح نکتہ چینی اور خیر خواہی کی باتیں سنتے سنتے پک گیا تھا۔ بولا ''یہ میں سب سمجھتا ہوں لالہ، پر تمہی بتاؤ کہ کروں کیا؟ میں جھنیا کو نکال دوں تو بھولا

اسے رکھ لیں گے؟ اگر وہ راجی (راضی) ہوں تو آج میں اسے ان کے گھر پہنچا دوں۔ اگر تم انہیں منا لو تو جنم بھر تمہارا اپکار مانوں۔ مگر وہاں تو ان کے دونوں لڑکے ہتیا پراتا رو ہیں، پھر میں اسے کیسے نکال دوں، ایک تو نالائیک (نالائق) آدمی ملا کہ اس کی باہنہ پکڑ کر دگا (دغا) دے گیا۔ اب بھی نکال دوں گا تو وہ کہیں محنت مجوری (مزدوری) بھی تو نہ کر سکے گی۔ کہیں جا کر ڈوب مری تو کسے پاپ لگے گا۔ رہے لڑکیوں کے بیاہ، سو بھگوان مالک ہے۔ جب اس کا سمے آوے گا، تب کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آوے گی۔ لڑکی تو ہماری برادری میں آج تک کبھی کنواری نہیں رہی۔ برادری کے ڈر سے میں ہتیارے کا کام نہیں کر سکتا۔''

ہوری منکسر مزاج شخص تھا۔ ہمیشہ سر جھکائے چلتا اور چار باتیں برداشت کر لیتا تھا۔ ہیرا کے علاوہ گاؤں میں کوئی اور اس کا بدخواہ نہ تھا، مگر سماج اتنا بڑا انرتھ (اندھیر) کیسے سہہ لے؟ اور اس کی سرکشی تو دیکھو کہ سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتا۔ عورت مرد جیسے سماج کو چیلنج دے رہے ہیں کہ دیکھا ہمارا کوئی کیا کیے لیتا ہے، تو سماج بھی دکھا دے گا کہ اسے کچھ نہ سمجھنے والے لوگ سکھ کی نیند نہیں سو سکتے۔

اسی رات کو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے گاؤں کے لیڈروں کی نشست ہوئی۔

داتا دین بولے۔ ''میری عادت کسی کی برائی کرنے کی نہیں ہے۔ سنسار میں کیا کیا کلکرم نہیں ہوتا۔ مجھ سے کیا مطلب؟ مگر یہ رانڈ دھنیا تو مجھ سے لڑنے پر تل گئی، بھائیوں کا حصہ دبا کر ہاتھ میں چار پیسے ہو گئے تو اب کچال کے سوائے اور کیا سوجھے گا۔ نیچ جات (ذات) جہاں پیٹ بھر روٹی کھائی اور ٹیڑھے چلے، اسی لیے

شاستروں میں کہا ہے کہ نیچ ذات لتیائے بھلا۔''

پٹیشوری نے نریل کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہی تو ان میں برائی ہے کہ جہاں چار پیسے دیکھے اور آنکھیں بدلیں۔ آج ہوری نے ایسی ہیکڑی جتائی کے میں اپنا منہ لے کر رہ گیا۔ نہ جانے اپنے کو کیا سمجھتا ہے۔ اب سو، اس بدکاری کا گاؤں میں کیا نتیجہ ہوگا۔ جھنیا کو دیکھ کر دوسری بدھواؤں کا من بڑھے گا کہ نہیں؟ آج بھولا کے گھر میں یہ بات ہوئی، کل سماج کا انکس جاتا رہا تو پھر دیکھو کہ سنسار میں کیسے کیسے انرتھ ہونے لگتے ہیں۔''

جھنگری سنگھ دو بیویوں کے شوہر تھے۔ پہلی بیوی پانچ لڑکے لڑکیاں چھوڑ کر مری تھی۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً پینتالیس سال تھی، مگر آپ نے دوسری شادی کی اور جس سے اولاد نہ ہوئی تو تیسرا بیاہ کر ڈالا۔ اب ان کی عمر پچاس سال تھی اور دو جوان بیویاں گھر میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں پھیل رہی تھیں، مگر ٹھاکر صاحب کے ڈر سے کوئی کچھ کہہ نہ سکتا تھا اور کہنے کی گنجائش بھی تو ہو۔ شوہر کی آڑ میں سب کچھ جائز ہے۔ مصیبت تو اسے ہے جس کی کوئی آڑ نہیں۔ ٹھاکر صاحب عورتوں کی سختی سے نگرانی کرتے تھے اور انہیں غرور تھا کہ ان کی بیویوں کا گھونگھٹ تک بھی نہ دیکھا ہوگا۔ مگر گھونگھٹ کے پردے میں کیا ہوتا ہے، اس کی انہیں کیا خبر؟

بولے۔ ''ایسی عورت کا تو سر کاٹ لے۔ ہوری نے اس رنڈی کو گھر میں رکھ کر سماج میں بیج بویا ہے۔ ایسے آدمی کو گاؤں میں رہنے دینا گاؤں بھر کو بھرشٹ (ناپاک) کرنا ہے۔ رائے صاحب کو اس کی اطلاع دینی چاہیے، صاف

صاف کہہ دینا چاہیے کہ اگر گاؤں میں یہ انرتھ چلا تو کسی کی آبرو سلامت نہ رہے گی۔''

پنڈت نوکھے رام کارکن بڑے اعلیٰ درجہ کے برہمن تھے۔ان کے دادا کسی راجہ کے دیوان تھے مگر اپنا سب کچھ بھگوان کے چرنوں پر چڑھا کر سادھو ہو گئے تھے۔ان کے باپ نے بھی وہی بھگتی ترکہ میں پائی تھی۔علی الصباح پوجا پر بیٹھ جاتے تھے اور دس بجے تک بیٹھے ہوئے رام نام جپا کرتے تھے،مگر بھگوان کے سامنے سے اٹھتے ہی ان کی فطرت اس رکاوٹ سے بگڑ کر ان کے دل قول اور عمل سبھی کو زہر آلود بنا دیتی تھی۔اس کی تجویز میں ان کے اختیارات کی توہین تھی۔ پھولے ہوئے گالوں میں دھنسی ہوئی آنکھیں نکال کر بولے۔''اس میں رائے صاحب سے کیا پوچھنا؟ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔لگا دو سو روپے تاوان۔آپ گاؤں چھوڑ کر بھاگے گا۔ادھر میں بے دخلی (بیدخلی) بھی دائر کیے دیتا ہوں۔''

پٹیشوری نے کہا''مگر لگان تو ادا کر چکا ہے۔''

جھنگر سنگھ نے تائید کی۔''ہاں لگان ہی کے لیے ہم نے تیس روپے لیے ہیں۔''

نوکھے رام نے گھمنڈ سے کہا۔''لیکن ابھی رسید تو نہیں دی۔ثبوت کیا ہے' لگان ادا کر دیا ہے۔''

اتفاق رائے سے یہی طے ہوا کہ ہوری پر سو روپے جرمانہ کیا جائے۔صرف ایک دن گاؤں کے آدمیوں کو جمع کر کے ان کی منظوری لے لینے کا ناٹک ہونا ضروری تھا۔ممکن تھا کہ اس میں دس پانچ روز دیر ہو جاتی مگر آج ہی رات کو جھنیا

کے لڑکا پیدا ہوا اور دوسرے ہی روز گاؤں والوں کی پنچائت بیٹھ گئی۔ ہوری اور دھنیا دونوں اپنی اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے بلائے گئے۔ چوپال میں اتنی بھیڑ تھی کہ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ پنچائت نے فیصلہ کیا کہ ہوری پر سو روپے نقد اور تیس من غلے کا تاوان عائد کیا جائے۔

دھنیا بھری سبھا میں اور بھرے ہوئے گلے سے بولی ''پنچو! گریب (غریب) کو ستا کر سکھ نہ پاؤ گے، اتنا سمجھ لینا۔ ہم تو مٹ جائیں گے۔ کون جانیں کہ اس گاؤں میں رہیں یا نہ رہیں۔ مگر میرا سراپ تم کو بھی جرو (ضرور) سے جرور لگے گا۔ مجھ پر اتنا کڑا ڈنڈ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ میں نے اپنی بہو کو اپنے گھر میں کیوں رکھا۔ کیوں اسے گھر سے نکال کر سڑک کی بھکارن نہیں بنا دیا، یہی نیاؤ ہے، ایں۔''

پٹیشوری لالہ بولے۔ ''وہ تیری بہو ہے کہ ہرجائی؟''

ہوری نے دھنیا کو ڈانٹا۔ ''تو کیوں بولتی ہے دھنیا پنچ پرمیسر رہتے ہیں، ان کا جو نیائے ہے، وہی میرے سر آنکھوں پر۔ اگر بھگوان کی یہی مرجی (مرضی) کہ ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائیں تو ہمارا کیا بس؟ ہمارے پاس جو کچھ ہے، وہ کھلیان میں ہے۔ ایک دانہ بھی گھر میں نہیں آیا۔ جتنا چاہے لے لو۔ سب لینا چاہو تو لے لو، ہمارا بھگوان مالک ہے۔ جتنی کمی پڑے، اس میں ہمارے بیل لے لینا۔''

دھنیا دانت پیس کر بولی۔ ''میں نہ ایک دانہ اناج دوں گی اور نہ ایک کوڑی، جس میں بوتا ہو، چل کر مجھ سے لے لے۔ اچھی دل لگی ہے۔ سوچا ہوگا کہ ڈنڈے کے بہانے اس کی سب جیجات (جائیداد) لے لو اور نجرانہ (نذرانہ) لے کر دوسروں کو دے دو۔ باگ بگیچا (باغ باغیچہ) بیچ کر مجے (مزے) سے تر مال

اڑاؤ۔ دھنیا کے جیتے جی یہ نہیں ہونے کا اور تمہاری لالسا (خواہش) تمہارے من ہی رہے گی۔ ہمیں نہیں رہنا ہے برادری میں۔ برادری میں رہ کر ہماری مکتی نہ ہو جائے گی۔ اب بھی اپنے پسینے کی کمائی کھاتے ہیں، تب بھی اپنے پسینے کی کمائی کھائیں گے۔''

ہوری نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''دھنیا! تیرے پیروں پڑتا ہوں، تو چپ رہ! ہم سب برادری چاکر ہیں، اس کے باہر نہیں جا سکتے۔ وہ جو ڈنڈ لگاتی ہے، اسے سر جھکا کر مان لے۔ نکو بن کر جینے سے گلے میں پھانسی لگا لینا اچھا ہے۔ آج مر جائیں تو برادری ہی تو اس مٹی کو بار لگاوے گی۔ برادری ہی تارے گی تو تریں گے۔ پنچو! مجھے اپنے جوان بیٹے کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو، اگر میرے پاس کھلیان کے اناج کے سوائے اور کوئی جنس ہو۔ میں برادری کو دھوکا نہ دوں گا۔ پنچوں کو میرے بال بچوں پر ترس آوے تو ان کی کچھ پرورس کریں۔ نہیں مجھے تو ان کا حکم ماننا ہے۔''

دھنیا جھلا کر وہاں سے چلی گئی اور ہوری پھر رات گئے تک کھلیان سے اناج ڈھو ڈھو کر جھنگری سنگھ کی چوپال میں ڈھیر کرتا رہا۔ بیس من جوتھا، پانچ من گیہوں اور اتنا ہی مٹر، تھوڑا سا چنا اور کچھ تلہن بھی تھا۔ اکیلا آدمی اور دو گرہستیوں کا بوجھ! یہ جو کچھ ہوا، وہ دھنیا کی محنت سے ہوا۔ جھنیا اندر کا سارا کام کر لیتی تھی اور دھنیا اپنی لڑکیوں کے ساتھ کھیتی میں لگ گئی تھی۔ دونوں نے سوچا تھا کہ گیہوں اور تلہن سے لگان کی ایک قسط ادا ہو جائے گی اور ہو سکا تو تھوڑا سود دے دیں گے، جو کھانے کے کام آئے گا۔ جیسے تیسے پانچ چھ مہینے کٹ جائیں گے تب تک جوار، باجرا، مکا،

دھان کے دن آ جائیں گے۔ وہ ساری امید مٹی میں مل گئی۔ اناج تو ہاتھ سے گیا یہ، سو روپے کی گٹھری اور سر پر لد گئی۔ اب کھانے کا کہیں ٹھکانا نہیں اور گوبر کا کیا حال ہوا، رام جانے! اگر دل اتنا کچا تھا تو ایسا کام کیوں کیا؟ مگر ہونی کون ٹال سکتا ہے؟ برادری کا وہ خوف تھا کہ اپنے سر پر لاد کر اناج ڈھو رہا تھا، گویا اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہو۔ زمیندار، ساہوکار، سرکار کس کا اتنا رعب تھا؟ کل بال بچے کیا کھائیں گے، یہ فکر روح کو خشک کیے دیتی تھی، مگر برادری کا خوف بھوت کی طرح سر پر سوار ہو کر کوڑے لگا رہا تھا۔ برادری سے الگ رہ کر جینے کا تو وہ خیال ہی نہ کر سکتا تھا۔ شادی، بیاہ، مونڈن، چھیدن جینا، مرنا سب کچھ تو برادری کے ہاتھ میں ہے، برادری اس کی زندگی میں پیٹر کی جڑ جمائے ہوئے تھی اور اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو رہی تھی۔ برادری سے نکل کر اس کی زندگی کا جامہ تار تار ہو جائے گا۔

جب کھلیان میں صرف ڈیڑھ دو من جو اور رہ گیا تو دھنیا نے دوڑ کر ہوری کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی ''اچھا اب رہنے دو! ڈھو تو چکے برادری کی لاج، اب بچوں کے لیے بھی کچھ چھوڑ دو گے کہ سب برادری ہی کے بھاڑ میں جھونک دو گے؟ میں تم سے ہار جاتی ہوں۔ میرے بھاگ میں نہیں جیسے مورکھ کا ساتھ بدا تھا۔''

ہوری نے اپنے ہاتھ چھڑا کر ٹوکری میں باقی غلہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہو گا دھنیا، پنچوں کی آنکھ بچا کر ایک دانہ بھی رکھ لینا میرے لیے حرام ہے۔ میں لے جا کر سب کا سب وہاں ڈھیر کیے دیتا ہوں۔ پھر پنچوں کے من میں دیا اپجے گی تو کچھ میرے بال بچوں کے لیے دے دیں گے، نہیں تو بھگوان مالک ہیں۔''

دھنیا تلملا کر بولی۔ ''یہ پنچ نہیں ہیں راچھس ہیں۔ پکے اور پورے راچھس؟ یہ سب ہماری جگہ جمین (زمین) چھین کر مال مارنا چاہتے ہیں۔ ڈنڈ باندھ کا تو بہانہ ہے۔ سمجھاتی جاتی ہوں، پر تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ تم ان راچھسوں سے دیا کا آسرا رکھتے ہو۔ سوچتے ہو کہ دس پانچ من تجھے دے دیں گے تو منہ دھو رکھو!''

جب ہوری نہ مانا اور ٹوکری سر پر رکھنے لگا تو دھنیا نے دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت کے ساتھ ٹوکری پکڑ لی اور بولی۔ ''اسے تو میں نہ لے جانے دوں گی، چاہے تم میری جان ہی لے لو۔ مر مر کر ہم نے کمایا ہے، پہر رات گئے تک ہم نے سینچا تو اسی لیے کے پنچ لوگ مونچھوں پر تاؤ دے کر بھوگ لگا دیں اور ہمارے بچے دانے دانے کو ترسیں؟ تم نے اکیلے ہی سب کچھ نہیں کر لیا ہے۔ میں بھی اپنی لڑکیوں کے ساتھ کتی ہوئی ہوں۔ سیدھے سے ٹوکری یہیں رکھ دو نہیں تو آج سدا کے لیے ناتا ٹوٹ جائے گا، کہے دیتی ہوں۔''

ہوری سوچ بچار میں پڑ گیا۔ دھنیا کا کہنا سچ تھا۔ اسے اپنے بال بچوں کی کمائی چھین کر تاوان دینے کا حق ہے۔ وہ گھر کا مالک اس لیے ہے کہ سب کو پالے پوسے۔ اس لیے نہیں کہ کمائی چھین کر برادری کی نظر میں سرخرو بنے۔ ٹوکری اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ آہستہ سے بولا ''تو ٹھیک کہتی ہے دھنیا۔ دوسروں کے حصے پر میرا کوئی بس نہیں ہے۔ جو کچھ بچا ہے، وہ لے جا میں جا کر پنچوں سے کہے دیتا ہوں۔''

دھنیا اناج کی ٹوکری گھر میں رکھ کر اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ پوتے کی پیدائش کی خوشی میں گلا پھاڑ پھاڑ کر سوہر گا رہی تھی کہ سارا گاؤں سن لے۔ آج یہ

پہلا موقع تھا کہ ایسے مبارک وقت میں برادری کی کوئی عورت وہاں نہ تھی۔ زچہ خانے سے جھنیا نے کہلا کر بھیجا تھا کہ سوہر گانے کا کام نہیں ہے، مگر دھنیا کب ماننے لگی؟ اگر برادیری کو اس کی پروانہیں ہے تو وہ بھی برادری کی پروانہیں کرتی۔

اسی وقت ہوری اپنے گھر کو اسی روپے پر جھنگری سنگھ کے یہاں رہن کر رہا تھا۔ تاوان کے روپے کا اس کے سوا اور کوئی بندوبست نہ کر سکتا تھا۔ بیس روپے تلہن، گیہوں اور مٹر کے مل گئے، باقی کے لیے گھر لکھنا پڑا۔ نوکھے رام تو چاہتے تھے کہ بیل بکوا لیے جائیں، لیکن پیشوری اور داتا دین نے اس کی مخالفت کی۔ بیل بک گئے تو ہوری کھیتی کیسے کرے گا۔ برادری اس کی جائیداد سے روپے وصول کرے مگر ایسا تو نہ کرے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائے پس اس طرح بیل بچ گئے۔

ہوری رہن نامہ لکھ کر کوئی گیارہ بجے رات کو گھر آیا تو دھنیا نے پوچھا۔ ''اتنی رات تک وہاں کیا کرتے رہے؟''

ہوری نے جلاہے کا غصہ ڈاڑھی پر اتارتے ہوئے کہا۔ ''کرتا کیا رہا، اس کپوت کی کرنی بھرتا رہا! بھاگا آپ تو آگ لگا کر بھاگ گیا، اب مجھے بجھانا پڑ رہا ہے۔ اسی روپے میں گھر رہن کرنا پڑا۔ کرتا کیا؟ اب حکا (حقہ) کھل گیا۔ برادری نے اوپرا دھ چھما (معاف) کر دیا۔''

دھنیا نے ہونٹ چبا کر کہا۔ ''نہ حکا کھلتا تو ہمارا کیا بگڑ جاتا تھا؟ چار پانچ مہینے نہیں کسی کا حکا پیا، تو کیا چھوٹے ہو گئے؟ میں کہتی ہوں کہ تم اتنے بھوندو کیوں ہو؟ میرا سے سامنے تو بڑے گیان والے بنتے ہو۔ پر باہر تمہارا منہ کیوں بند ہو جاتا ہے؟ لے دے کے باپ دادوں کی نسانی ایک گھر بچ رہا تھا، سو آج تم نے اس کا

بھی وارانیارا کر دیا۔ اسی طرح کل یہ تین چار بیگھے دھرتی ہے، اسے بھی لکھ دینا اور تب گلی گلی بھیک مانگنا۔ میں پوچھتی ہوں کہ تمہارے منہ میں جیبھ نہ تھی کہ ان پنچوں سے پوچھتے کہ تم کہاں کہ بڑے دھرماتما ہو جو دوسروں پر ڈانٹر باندھ لگاتے پھرتے ہو؟ تمہارا تو منہ دیکھنا بھی پاپ ہے۔''

ہوری نے ڈانٹا۔ ''چپ رہ بہت بڑھ بڑھ کر نہ بول، تو برادری کے چکر میں ابھی نہیں پڑی ہے، نہیں تو منہ سے بات نہ نکلتی۔''

دھنیا مشتعل ہوگئی۔ ''کون سا پاپ کیا ہے جس کے لیے برادری سے ڈریں؟ کسی کے گھر چوری کی ہے؟ کسی کا مال کاٹا ہے؟ مہریا رکھ لینا پاپ نہیں ہے، ہاں رکھ کے چھوڑ دینا پاپ ہے۔ آدمی کا بہت سیدھا ہونا بھی برا ہے۔ اس کے سیدھے پن کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ کتنے ہی منہ چاٹنے لگتے ہیں۔ آج ادھر تمہاری سراہنا ہوری ہوگی کہ برادری کی کیسی مریادرکھ لی، میرے بھاگ پھوٹ گئے تھے کہ تم جیسے مرد سے پالا پڑا۔ کبھی سکھ کی روٹی نہ ملی۔''

''میں تیرے باپ کے پاؤں پڑنے گیا تھا؟ وہی تجھے میرے گلے باندھ گیا۔''

''پتھر پڑ گیا تھا ان کی سمجھ پر اور انہیں کیا کہوں؟ نہ جانے کیا دیکھ کر لٹو ہو گئے، ایسے بڑے سندر بھی تو نہ تھے تم۔''

بحث مذاق میں منتقل ہوگئی۔ اسی روپے گئے، لاکھ روپے کا پوتا تو مل گیا؟ اسے تو کوئی نہ چھین لے گا۔ گوبر گھر لوٹ آوے، دھنیا الگ جھونپڑی میں سکھی رہے گی۔''

ہوری نے پوچھا۔ ''بچہ کس پر پڑا ہے۔''

دھنیا نے ہنس کر جواب دیا۔ ''بالکل گوبر پر پڑا ہے۔ سچ!''

''تگڑا تو ہے؟''

''ہاں اچھا ہے۔''

(12)

رات کو گوبر جھنیا کے ساتھ چلا، تو ایسے کانپ رہا تھا جیسے اس کی ناک کٹ گئی ہو۔ جھنیا کو دیکھتے ہی سارے گاؤں میں کہرام مچ جائے گا۔ لوگ ہر طرف سے آ کر کیسا واویلا مچاویں گے، دھنیا کتنی گالیاں دے گی، یہ سوچ سوچ کر اس کے پیر پیچھے رہے جاتے تھے۔ ہوری کا تو اسے خوف نہ تھا۔ وہ صرف ایک بار دھاڑیں گے، پھر چپ ہو جائیں گے۔ خوف تھا دھنیا کو زہر کھانے لگے گی اور گھر میں آگ لگانے لگے گی۔ نہیں، اس وقت جھنیا کے ساتھ نہیں جا سکتا۔

مگر کہیں دھینا نے جھنیا کو گھر میں گھسنے ہی نہ دیا اور جھاڑو لے کر مارنے دوڑی تو وہ بیچاری کہاں جائے گی؟ اپنے گھر تو لوٹ ہی نہیں سکتی، کہیں کنویں میں کود پڑے یا گلے میں پھانسی لگا لے تو کیا ہو؟ اس نے لمبا سانس لیا بھگوان کی سرن (پناہ)؟

مگر اماں اتنی بے درد نہیں ہیں کہ مارنے دوڑیں، غصے میں دو چار گالیاں دیں گی مگر جب جھنیا ان کے پاؤں پکڑ کر رونے لگے گی تو انہیں دیا آ ہی جائے گی۔

تب تک وہ آپ کہیں چھپا رہے گا۔ جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تب وہ ایک دن چپکے سے آئے گا اور اماں کو منا لے گا۔ اگر اس بیچ میں کہیں اسے مجوری مل جائے اور دو چار روپیہ لے کر گھر لوٹے گا، تب پھر دھنیا کا منہ بند ہی ہو جائے گا۔

جھنیا بولی۔ ''میری تو چھاتی دھڑک رہی ہے۔ میں کیا جانتی تھی کہ تم میرے گلے میں یہ روگ باندھ دو گے۔ نہ جانے کس بری ساعت میں تم نے دیکھا تھا۔ نہ تم گائے لینے آتے۔ نہ یہ سب ہوتا۔ تم آگے آگے جا کر جو کچھ کہنا سننا ہو، وہ کہہ سن لینا میں پیچھے سے آ جاؤں گی۔''

گوبر نے کہا۔ ''میں نہیں، پہلے تم جانا اور کہنا کہ میں ہاٹ سے سودا بیچ کر گھر جا رہی تھی، رات ہو گئی ہے، اب کیسے جاؤں؟ تب تک میں آ جاؤں گا۔''

جھنیا نے متفکرانہ کہا۔ ''تمہاری اماں بہت گسیل (غصہ ور) ہیں، میرا جی کانپتا ہے۔ کہیں مجھے مارنے لگیں تو کیا کروں گی۔''

گوبر نے دھیرج دلایا۔ ''اماں کی عادت ایسی نہیں ہے۔ ہم لوگوں تک کو تو کبھی ایک تھپڑ مارا نہیں ہے، تمہیں کیا ماریں گی؟ ان کو جو کچھ کہنا ہو گا، مجھے کہیں گی۔ وہ تم سے تو بولیں گی بھی نہیں۔''

گاؤں قریب آ گیا۔ گوبر نے رک کر کہا۔ ''اب تم جاؤ۔''

جھنیا نے ضد کی۔ ''تم بھی دیر نہ کرنا۔''

''نہیں، نہیں چھن بھر میں آتا ہوں، تو چل تو!''

''میرا جی نہ جانے کیسا ہو رہا ہے، تمہارے اوپر گسہ (غصہ) آتا ہے۔''

''تم اتنی ڈرتی کیوں ہو؟ میں تو آ ہی رہا ہوں۔''

''اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ کسی دوسری جگہ بھاگ چلتے۔''

''جب اپنا گھر ہے تو کیوں کہیں بھاگیں۔تم ناحق (ناحق) ڈر رہی ہو۔''

''جلدی سے آؤ گے نا؟''

ہاں۔ہاں، ابھی آتا ہوں۔

''مجھ سے دگا (دغا) تو نہیں کر رہے ہو کہ مجھے گھر بھیج کر تم کہیں چلتے بنو؟''

''اتنا نیچ نہیں ہوں جھونا۔ جب تیری باہنہ پکڑی ہے تو مرتے دم تک نباہوں گا۔''

جھنیا گھر کی طرف چلی۔گوبر لیے بھر دبدھے میں پڑا ہوا کھڑا رہا۔پھر یکا یک سر پر منڈلانے والا لعنت ملامت کا خیال خوفناک شکل اختیار کر کے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔کہیں سچ مچ اماں مارنے دوڑیں تو کیا ہو گا؟ اس کے پیر زمین سے چپک گئے۔اس کے اور اس کے گھر کے درمیان میں آموں کا چھوٹا سا باغ تھا۔جھنیا کی کالی پرچھائیں آہستہ آہستہ جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔اس کے حواسوں میں بڑی تیزی آ گئی تھی۔اس کے کانوں میں ایسی بھنک پڑی جیسے اماں جھنیا کو گالی دے رہی ہیں۔اس کے دل کی کچھ ایسی حالت ہو رہی ہے گویا سر پر گنڈاسے کا ہاتھ پڑنے والا ہو۔بدن کا سارا خون جیسے خشک ہو گیا ہو۔ایک لمحے کے بعد اس نے دیکھا جیسے دھنیا گھر سے نکل کر کہیں جا رہی ہو۔دادا کے پاس جاتی ہو گی۔ سایت (شاید) دادا کھاپی کر مٹر کے کھیت پر چلے گئے ہوں گے۔وہ اس کھیت کی طرف چلا۔جو اور گیہوں کے کھیتوں کو کچلتا روندتا ہوا اس طرف بھاگا جا رہا تھا، گویا پیچھے کوئی دوڑ آ رہی ہو۔وہ ہے دادا کی جھونپڑی! وہ رک گیا اور دبے پاؤں جا کر

اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس کا قیام ٹھیک نکلا۔ وہ پہنچا ہی تھا کہ دھنیا کی آواز سنائی دی۔ وہ گجب (غضب) ہو گیا! اماں اتنی بے درد ہیں! ایک انا تھ لڑکی پر انہیں کچھ بھی دیا نہیں آتی اور جو میں ابھی سامنے جا کر پھٹکار دوں کہ تم کو جھنیا سے بولنے کی کوئی مجال نہیں ہے، تو ساری سیکھی (شیخی) نکل جائے۔ اچھا دادا بھی بگڑ رہے ہیں۔ کیلے کے لیے آج ٹھیکرا ابھی تیز ہو گیا۔ میں ان کا ادب کرتا ہوں، یہ اسی کا پھل ہے۔ یہ تو دادا بھی وہیں جا رہے ہیں۔ اگر جھنیا کو انہوں نے مارا پیٹا تو مجھ سے سہا نہ جائے گا۔ بھگوان! اب تمہارا یہ بھروسہ ہے۔ میں نہ جانتا تھا کہ اس سنکٹ میں جان پڑے گی۔ جھنیا مجھے اپنے من میں کتنا مکار، ڈرپوک اور کمینہ سمجھ رہی ہو گی، مگر اسے مار کیسے سکتے ہیں؟ گھر سے نکال بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیا گھر میں میرا حصہ نہیں؟ اگر جھنیا پر کسی نے ہاتھ اٹھایا تو آج مہابھارت ہو جائے گا۔ ماں باپ جب تک لڑکوں کی رچھا کریں تب تک ماں باپ ہیں، جب ان میں ماتا ہی نہیں تو کیسے ماں باپ؟

ہوری جیوں جھونپڑی سے نکلا گوبر بھی دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے چلا، مگر دروازے پر اجالا دیکھ کر اس کے پیر رک گئے۔ اس اجالے کی لکیر کے اندر وہ قدم نہیں رکھ سکتا۔ وہ اندھیرے ہی میں دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی ہمت نے جواب دے دیا، ہائے! بیچاری جھنیا پر یہ لوگ جھلا رہے ہیں اور وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے کھیل کھیل جو ایک چنگاری پھینک دی تھی، وہ سارے کھلیان کو بھسم کر دے گی، یہ اس نے نہ سمجھا تھا اور اب اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سامنے آ کر کہے ''ہاں میں نے چنگاری پھینک تھی۔'' جن سہاروں سے وہ اپنے دل کو

سنبھالے ہوئے تھا، وہ سب اس زلزلے میں گر پڑے اور وہ جھونپڑا بھی گر پڑا وہ پیچھے لوٹا۔ اب وہ جھنیا کو کیا منہ دکھائے؟

وہ کوئی سو قدم چلا مگر اس طرح جیسے سپاہی میدان سے بھاگے۔ اس نے جھنیا سے محبت اور وفا کی جو باتیں کہی تھیں، وہ سب یاد آنے لگیں۔ وہ وصال کی میٹھی باتیں یاد آئیں، جب وہ اپنی مجنونانہ سانسوں میں اپنی نشیلی چتونوں میں گویا اپنی جان نکال کر اس کے قدموں میں رکھ دیتا تھا۔ جھنیا کسی مجبور پرندے کی طرح اپنے چھوٹے سے گھونسلے میں اپنی تنہائی کی زندگی کاٹ رہی تھی۔ وہاں نر کا مجنونانہ اصرار تھا، نہ وہ ابلتی ہوئی خوشی تھی اور نہ بچوں کی میٹھی آوازیں، مگر صیاد کا دام اور فریب بھی تو وہاں نہ تھا۔ گوبر نے اس کے تنہائی والے گھونسلے میں جا کر اسے کچھ سکھ پہنچایا نہیں، یہ کون جانے، مگر اس عذاب میں تو ڈال ہی دیا تھا۔ وہ سنبھل گیا۔ بھاگتا ہوا سپاہی گویا اپنے ایک ساتھی کا بڑھاوا سن کر پیچھے لوٹ پڑا۔

اس نے دروازے پر آ کر دیکھا تو کواڑ بند ہو گئے تھے۔ کواڑوں کے دروازوں سے روشنی کی شعاعیں باہر نکل رہی تھیں۔ اس نے ایک درز سے اندر جھانکا۔ دھنیا اور جھنیا بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہوری کھڑا تھا۔ جھنیا کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں اور دھنیا سمجھا رہی تھی۔ ''بیٹی! تو چل گھر میں بیٹھ؟ میں تیرے کاکا اور بھائیوں کو دیکھ لوں گی۔ جب تک ہم جیستے ہیں کسی بات کی چنتا نہیں ہے۔ ہمارے رہتے تجھے کوئی تیڑھی آنکھ دیکھ بھی نہ سکے گا۔''

گوبر خوش ہو گیا۔ آج وہ کسی قابل ہوتا تو دادا اور اماں کو سونے سے منڈھ دیتا اور کہتا ''اب تم کچھ کام نہ کرو۔ آرام سے بیٹھے بیٹھے کھاؤ اور جتنا دن بچ کرنا چاہو

کرو! جھنیا کے متعلق اب اسے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ وہ اسے زور سے گاؤں بھر کا منہ بند کر سکے اور دادا اور اماں سے گھر آنے کا کانک نہ سمجھ کر گھر آنے کا تلک سمجھیں ۔ دل پر جتنا گہرا صدمہ ہوتا ہے، وہ اپنے تدعمل کی صورت میں اتنا ہی متوثر ہوتا ہے۔ اس بدنامی نے گوبر کے دل کو متھ کر وہ رتن نکال لیا، جو ابھی تک چھپا پڑا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس میں مصمم ارادہ پیدا ہو گیا۔ اب تک وہ کم سے کم کام کرنا اور زیادہ سے زیادہ کھانا اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال ہی نہ آیا تھا کہ گھر والوں کے ساتھ بھی اس کا کچھ فرض ہے۔ آج والدین کے اس اعلیٰ عفو نے گویا اس کے دل میں نور پیدا کر دیا۔ جب دھنیا اور جھنیا اندر چلی گئیں تو ہوری اسی جھونپڑی میں جا بیٹھا اور آئندہ کے لیے منصوبے باندھنے لگا۔

شہر میں بیل داروں کو پانچ چھ آنے روز ملتے ہیں، یہ اس نے سن رکھا تھا۔ اگر اسے چھ آنے روج ملیں اور وہ ایک آنہ روج میں گجر (گزر) کرے تو پانچ آنہ روز کی بچت ہو گی۔ مہینے میں دس روپے ہوتے ہیں اور سال میں سوا سو۔ وہ سوا سو کی تھیلی لے کر گھر آئے تو کس کی مجال ہے، جو اس کے سامنے منہ کھول سکے؟ یہی داتا دین اور یہی پٹیشوری آ کر اس کی ہاں میں ہاں ملائیں گے اور جھنیا تو گھمنڈ سے پھول اٹھے گی۔ دو چار سال وہ اسی طرح کماتا رہے تو گھر کا سارا دکھ دلدر دور ہو جائے، ابھی تو سارے گھر کی کمائی بھی سوا سو نہیں ہوتی، اب وہ اکیلا سوا سو کمائے گا۔ لوگ یہی تو کہیں گے کہ مجوری کرتا ہے۔ کہا کریں۔ مجوری کرنا کوئی پاپ تو نہیں ہے۔ اور سدا چھ آنے ہی تھوڑے ملیں گے۔ جیسے جیسے وہ کام میں ہشیار ہو گا،

ویسے ویسے مجوری بھی تو بڑھے گی۔ تب وہ دادا سے کہے گا ''کہ اب تم گھر میں بیٹھ کر بھگوان کا بھجن کرو۔ اس کھیتی میں جان کھپانے کے سوا اور کیا رکھا ہے؟ سب سے پہلے ایک پچھائیں گائے لے گا جو چار پانچ سیر دودھ دے گی اور دادا سے کہے گا کہ تم گئو ماتا کی سیوا کرو جس سے تمہارا لوک (دنیا) بھی بنے گا اور پرلوک (عقبیٰ) بھی۔''

اور کیا ایک آنے میں اس کا گجر (گزر) آرام سے نہ ہوگا؟ گھر لے کر کیا کرنا ہے! کسی جگہ پڑ رہے گا۔ سینکڑوں مندر اور دھرم سالے ہیں۔ اور پھر وہ جس کی جموری کرے گا، وہ کیا رہنے کی جگہ نہ دے گا؟ آٹا روپے کا دس سیر آتا ہے، ایک آنہ کا ڈھائی پاؤ ہوا۔ ایک آنہ کا تو وہ آٹا ہی کھائے گا۔ لکڑی، دال، نمک، ساگ یہ سب کہاں سے آئیں گے؟ دونوں جون کے لیے سیر بھر تو آٹا ہی چاہیے۔ اوہ! کھانے کی کچھ نہ پوچھو۔ مٹھی بھر چنے سے بھی کام چل سکتا ہے اور حلوا پوری کھا کر بھی کام چل سکتا ہے۔ ادھر ادھر سے اپلے چن لیے تو لکڑی کا کام چل گیا۔ کبھی ایک پیسے کی دال لے لی اور کبھی آلو۔ آلو بھون کر بھرتا بنا لیا۔ یہاں دن کاٹنا ہی ہے کہ چین کرنا ہے؟ پتل پر آٹا گوندھا اور اپلوں پر باٹیاں سینکیں، آلو بھون کر بھرتا بنا لیا اور مجے سے سو رہے۔ گھر ہی پر کون دونوں جون روٹی ملتی ہے؟ ایک جون تو چپ بن ہی ملتا ہے۔ وہاں ایک جون چربن ہی پر کاٹ لیں گے۔

اسے شک ہوا کہ اگر کبھی مجوری نہ ملی تو کیا کرے گا۔ مگر مجوری کیوں نہ ملے گی؟ جب وہ جی توڑ کر کام کرے گا تو سو آدمی اسے بلائیں گے۔ کام سب کو پیارا ہوتا۔ یہاں بھی تو سوکھا پالا پڑتا ہے۔ اوکھ میں دیمک لگتی ہے، گیہوں میں گروی

لگتی ہے اور سرسوں میں لاہی لگ جاتی ہے۔ اسے رات کو کوئی کام مل جائے گا تو اسے بھی نہ چھوڑے گا۔ دن بھر مجوری کی، رات کو کہیں چوکیداری کر لے گا۔ دو آنے بھی رات کو مل جائیں گے تو چاندی ہے۔ جب لوٹے گا تو سب کے لیے ساڑھیاں لائے گا۔ جھنیا کے لیے ہاتھ کا کنگن جرور (ضرور) بنوائے گا اور دادا کے لیے منڈاسہ (صافہ) لائے گا۔

یہی خیالی پلاؤ پکاتا ہوا وہ سو گیا، مگر ٹھنڈ میں نیند کہاں؟ کسی طرح رات کاٹی اور تڑکے ہی اٹھ کر لکھنو کی سڑک پکڑی۔ بیس ہی کوس تو ہے۔ سانجھ (شام) تک پہنچ جائے گا۔ گاؤں کا کون آدمی وہاں پہنچا جاتا ہے اور وہ اپنا پتہ، ٹھکانا ہی کیوں لکھے گا؟ نہیں تو دادا دوسرے ہی دن سر پر سوار ہو جائیں گے۔ اسے کچھ پچھتاوا تھا تو یہی کہ جھنیا سے کیوں نہ صاف صاف کہہ دیا کہ ابھی تو گھر جا۔ میں تھوڑے دنوں میں کچھ کما دھما کر لوٹوں گا، مگر تب وہ گھر جاتی ہی کیوں؟ کہتی کلہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اسے وہاں کہاں کہاں باندھے پھرتا؟

دن چڑھنے لگا۔ رات کو کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوک لگی، پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ کہیں بیٹھ کر دم لینے کی خواہش ہوئی۔ بلا کچھ نہ کھائے اب وہ نہیں چل سکتا۔ مگر پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے، سڑک کے کنارے جھر، بیریوں کی جھاڑیاں تھیں۔ اس نے تھوڑے سے بیر توڑ لیے اور پیٹ کو بہلاتا ہوا چلا۔ ایک گاؤں میں گڑ پکنے کی مہک آئی۔ اب جی نہ مانا۔ وہاں جا کر لوٹا۔ ڈور مانگا اور پانی بھر کر چلو سے پینے بیٹھا تو ایک کسان نے کہا ''ارے بھائی! کیا یوں ہی پانی پیو گے۔ تھوڑا سا گڑ کھالو۔ اب کے اور چلا لیں کولہو اور بنا لیں کھانڈ۔ اگلے سال تک مل تیار ہو جائے

گی تو ساری اوکھ کھڑی بک جائے گی۔ گڑ اور کھانڈ کے بھاؤ چینی ملے گی تو ہمارا گڑ کون لے گا۔ اس نے ایک کٹورے میں گڑ کی کئی پنڈیاں لا کر دیں، گوبر نے گڑ کھا کر پانی پیا۔ تما کو تو پیتے ہو گے؟ گوبر نے بہانہ کیا۔ ابھی چلم نہیں پیتا۔ بوڑھے نے خوش ہو کر کہا ''بڑا اچھا کرتے ہو بھیا! برا روگ ہے۔ ایک بار پکڑ لے تو پھر جیتے جی نہیں چھوڑتا۔''

انجن کو کوئلہ پانی مل گیا۔ رفتار تیز ہوئی۔ جاڑے کے دن نہ جانے کب دوپہر ہو گئی، ایک جگہ دیکھا کہ ایک نوجوان عورت ایک پیڑ کے نیچے شوہر سے ستیا گرہ کیے بیٹھی تھی۔ شوہر سامنے کھڑا اسے منا رہا تھا۔ دو چار راہ گیر تماشا دیکھنے کھڑے ہو گئے تھے۔ گوبر بھی کھڑا ہو گیا۔ مناؤں سے زیادہ دلچسپ زندگی کا اور کون ناٹک ہو گا۔

عورت نے شوہر کی طرف گھور کر کہا ''میں نہ جاؤں گی، نہ جاؤں گی، نہ جاؤں گی؟''

مرد نے گویا الٹی میٹم دیا۔ ''نہ جائے گی؟''

''نہ جاؤں گی۔''

''نہ جائے گی۔''

''نا جاؤں گی۔''

مرد نے اس کے بال پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔ عورت زمین پر لٹو گئی۔

مرد نے ہار کر کہا۔ ''میں کہتا ہوں کہ اٹھ کر چل۔''

عورت نے استقلال سے کہا۔ ''میں تیرے گھر سات جنم نہ جاؤں گی۔

چاہے، بوٹی بوٹی کاٹ ڈال۔''

''میں تیرا گلا کاٹ لوں گا۔''

''تو پھانسی پاؤ گے۔''

مرد نے اس کے بال چھوڑ دیئے اور سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ مردانگی انتہائی حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس کے آگے اب وہ نہ جا سکتی تھی۔

ایک لمحے میں وہ پھر کھڑا ہوا اور ہاری ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''تو چاہتی کیا ہے؟''

عورت بھی اٹھ بیٹھی اور نہ ڈبنے والی آواز میں بولی۔ ''میں یہی چاہتی ہوں کہ تو مجھے چھوڑ دے۔''

''کچھ مجھ سے کہے گی بھی کہ کیا بات ہوئی؟''

''میرے بھائی باپ کو کوئی کیوں گالی دے۔''

''کس نے گالی دی تیرے بھائی باپ کو؟''

''جا کر اپنے گھر میں پوچھ۔''

''چلے گی تب ہی تو پوچھوں گا۔''

''تو کیا پوچھے گا؟ کچھ دم بھی ہے۔ جا کر اماں کے آنچل میں منہ چھپا کر سو رہ! وہ تیری ماں ہو گی، میری کوئی نہیں ہے۔ تو اس کی گالیاں سن، میں کیوں سنوں؟ ایک روٹی کھاتی ہوں تو چار روٹی کا کام کرتی ہوں۔ کیوں کسی کی دھونس سہوں؟ میں تیرا ایک پوت کا چھلا بھی نہیں جانتی۔''

راہ گیروں کو اس جھگڑے میں ناٹک کا مزہ آ رہا تھا، مگر اس کے جلد ختم ہونے

کی کوئی امید نہ تھی۔ منزل کھوٹی ہو رہی تھی۔ ایک ایک کر کے لوگ کھسکنے لگے۔ گوبر کو مردکی بے رحمی بری لگ رہی تھی۔ بھیڑ کے سامنے تو کچھ نہ کہہ سکتا تھا، مگر میدان خالی ہوا تو بولا

''بھائی مرد عورت کے بیچ میں بولنا تو نہ چاہیے، پر اتنی بید ردی بھی اچھی نہیں ہوتی۔''

مرد نے کوڑی سی آنکھیں نکال کر کہا۔ ''تم کون ہو؟''

گوبر دھن نے بلا خوف سے کہا۔ ''میں کوئی بھی ہوں، پھر بے جا بات دیکھ کر سبھی کو برا لگتا ہے۔''

مرد نے سر ہلا کر کہا۔

''معلوم ہوتا ہے ابھی مہریا نہیں آئی تبھی اتنا درد ہے۔''

''مہریا آئے گی تو بھی اس کا جھونڈ پجڑ نہ کھینچوں گا۔''

''اچھا تم اپنی راہ لو۔ میری عورت ہے، میں اسے ماروں گا، کاٹوں گا۔ تم کون ہوتے ہو بیچ میں بولنے والے؟ چلے جاؤ سیدھے سے، یہاں کھڑے مت رہو۔''

گوبر کا گرم خون اور گرم ہو گیا۔ وہ کیوں چلا جائے۔ سڑک سرکار کی ہے، کسی کے باپ کی نہیں ہے۔ وہ جب تک چاہے کھڑا رہ سکتا ہے۔ وہاں سے اسے ہٹانے کی مجال کسے ہے۔

مرد نے ہونٹ چبا کر کہا۔ ''تو تم نہ جاؤ گے، آؤ؟''

گوبر نے انگوچھا کمر میں باندھ لیا اور لڑنے کے لیے تیار ہو کر بولا۔ ''تم آؤ یا نہ آؤ، پر میں تو تبھی جاؤں گا جب میری اچھا (مرضی) ہو گی۔''

''یہ کون جانتا ہے کہ کس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔''

''تو تم نہ جاؤ گے؟''

''نہ۔''

مرد مٹھی باندھ کر گوبر کی طرف جھپٹا۔ اسی وقت عورت نے اس کی دھوتی پکڑ لی اور اسے اپنی طرف کھینچی ہوئی گوبر سے بولی۔ ''تم کیوں لڑائی لینے پر اتارو ہو رہے ہو جی، اپنی راہ کیوں نہیں جاتے؟ یہاں کوئی تماسا ہے۔ ہمارا آپس کا جھگڑا ہے۔ کبھی وہ مجھے مارتا ہے تو کبھی میں اسے ڈانٹتی ہوں، تم سے کیا مطلب؟''

گوبر پٹکا پا کر وہاں سے چل دیا۔ دل میں کہا۔ ''یہ عورت مار کھانے ہی لائق ہے۔''

گوبر آگے نکل گیا تو عورت نے اپنے شوہر کو ڈانٹ بتائی۔ تم سب سے لڑنے کیوں لگتے ہو۔ اس نے کون سی بری بات کہی تھی کہ تمہارے چوٹ لگ گئی؟ برا کام کرو گے تو دنیا برا کہے گی ہی، پر ہے وہ کسی بھلے گھر کا اور اپنی برادری ہی کا جان پڑتا ہے۔ کیوں اسے اپنی بہن کے لیے نہیں ٹھیک کر لیتے۔''

شوہر نے شبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا اب تک کنوارا بیٹھا ہوگا۔''

''تو پوچھ ہی کیوں نہ لو۔''

مرد نے دس قدم دوڑ کر گوبر کو آواز دی اور ہاتھ سے ٹھہر جانے کا اشارہ کیا۔ گوبر نے سمجھا کہ شاید پھر اس کے سر پر بھوت سوار ہے، جب ہی تو للکار رہا ہے، بنا مار کھائے نہ مانے گا۔ اپنے گاؤں میں کتا بھی بھاگھ بن جاتا ہے۔ اچھا آنے دو۔ مگر اس کے منہ پر لڑائی کا للکار نہ تھی۔ دوستی کا بلاوا تھا۔ اس نے گاؤں نام اور

ذات پوچھی، گوبر نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ اس مرد کا نام کودئی تھا۔

کودئی نے مسکرا کر کہا۔ ''ہم دونوں میں دنگا ہوتے ہوتے بچا۔ تم چلے آئے تو میں نے سوچا کہ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں ناحک (ناحق) تم سے تن بیٹھا۔ کچھ کھیتی باڑی تو گھر میں ہوتی ہے نا؟''

گوبر نے بتایا کہ اس کے موروثی پانچ بیگھہ کھیت ہیں اور ایک ہل کی کھیتی ہوتی ہے۔

''میں نے تمہیں جو برا بھلا کہا ہے، اس کی ماپھی (معافی) دو بھائی! اس میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ عورت گن میں لچھمی ہے پر کبھی اس پر نہ جانے کون سا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ اب تمہیں کیا بتاؤں اماں پر میرا کیا بس ہے؟ پیدا تو انہی نے کیا ہے اور پالا پوسا ان ہی نے ہے۔ جب کوئی بات ہوگی تو میں تو کچھ کہوں گا، وہ عورت ہی سے کہوں گا۔ پر اپنا بس ہے۔ تم ہی سوچو کہ میں بے جا تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہاں مجھے اس کا جھونٹا پکڑ کر گھسیٹنا نہ تھا، مگر عورت جات (ذات) کچھ تاڑنا (سزا) دیئے بنا بھی تو بس میں نہیں رہتی۔ چاہتی ہے کہ اماں سے الگ ہو جائیں۔ تم ہی سوچو کہ کیسے الگ ہو جاؤں اور کس سے الگ ہو جاؤں؟ اپنی اماں سے؟ جس نے جنم دیا؟ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ چاہے عورت رہے یا جائے۔''

گوبر کو بھی اپنی رائے بدلنی پڑی۔ بولا ''ماتا کا تو آدر کرنا سب ہی کا دھرم ہے بھائی! ماتا کون ارن ہو سکتا ہے۔''

کودئی نے اسے اپنے گھر چلنے کو کہا۔ آج وہ کسی طرح لکھنو نہیں پہنچ سکتا۔ کوس دو کوس جاتے جاتے سانجھ ہو ہی جائے گی۔ رات کو کہیں نہ کہیں تو ٹکنا ہی پڑے

گا۔

گوبر نے مذاق کیا۔ ''لگائی مان گئی؟''

''نہ مانے گی تو کیا کرے گی؟''

''مجھے تو اس نے ایسی پھٹکار بتائی کہ میں لجا گیا۔''

''وہ اب پچھتا رہی ہے۔ چلو تنک ماتا جی کو سمجھا دینا۔ مجھ سے تو کچھ کہتے نہیں بنتا، انہیں بھی سوچنا چاہیے کہ بہو کو باپ بھائی کی گالی کیوں دیتی ہے۔ ہماری بھی بہن ہے۔ چار دن میں س کی سگائی ہو جائے گی۔ اس کی ساس ہمیں گالیاں دے گی تو اس سے سنا جائے گا۔ سب دوکھ لگائی ہی کا ہے، ماتا کا بھی دوکھ ہے۔ جب ہر بات میں وہ اپنی بیٹی کا پچھ کریں گی تو ہمیں برا لگے ہی گا۔ اس میں اتنی بات اچھی ہے کہ گھر سے روٹ کر چلی جائے۔ پر گالی کا جواب گالی سے نہیں دیتی۔''

گوبر کو رات کے لیے کوئی ٹھکانہ چاہیے تھا۔ کودئی کے ساتھ ہولیا۔ دونوں پھر اسی جگہ آئے جہاں عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اب گھر گرہستن بن گئی تھی۔ ذرا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا اور کچھ لجا سی رہی تھی۔ کودئی نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ تو آتے ہی نہ تھے، کہتے تھے کہ ایسی ڈانٹ سننے کے بعد ان کے گھر کیسے جائیں۔''

عورت نے گھونگھٹ کی آڑ سے گوبر کو دیکھ کر کہا۔ ''اتنی ہی ڈانٹ میں ڈر گئے؟ لگائی آجائے گی، تب کہاں بھاگو گے؟''

گاؤں قریب ہی تھا۔ گاؤں کیا تھا، پروا تھا دس بارہ گھروں کا، جو آدھے کھپریل کے تھے اور آدھے پھوس کے۔ کودئی نے اپنے گھر پہنچ کر کھاٹ نکالی اور اس پر ایک دری بچھا دی۔ شربت بنانے کو کہہ کر چلم بھر لایا اور لمحہ بھر بعد ہی عورت لوٹے

میں شربت لے کر آئی اور گوبر کو پانی کا ایک چھینٹا مار کر گویا معافی مانگ لی۔ وہ اب اس کا نندوئی ہو رہا تھا، پھر کیوں نہ ابھی سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دے؟

(13)

گوبر منہ اندھیرے ہی اٹھا اور کودئی سے رخصت ہوا۔ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا بیاہ ہو چکا ہے۔ پس اس سے بیاہ کا کوئی چرچا ہی نہ کیا گیا۔ اس بھلمنسا ہت نے سارے گھر کو گرویدہ کر لیا تھا۔ کودئی ماں کو تو اس نے ایسے میٹھے لفظوں میں اور اس کے ماں والے درجے کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی عمدہ نصیحت دی کہ اس نے خوش ہو کر دعا دی تھی۔

''تم بڑی ہو ماتا جی! پوجنے لایو ہو۔ پتر ماتا کے رن (قرض) سے سو جنم لے کر ارن (سبکدوش) نہیں ہو سکتا، لاکھ جنم لے کر بھی ارن نہیں ہو سکتا۔ کروڑ جنم لے کر بھی نہیں.....''

بوڑھی اس بے حساب بھگتی پر مگن ہو گئی۔ اس کے بعد گوبر نے جو کچھ کہا' اس میں بڑھیا کو اپنی بھلائی دکھائی دی۔

طبیب ایک مرتبہ مریض کو شفا دے دے، پھر مریض اس کے ہاتھ سے زہر کو بھی خوشی سے پی لے گا۔

''اب جیسے آج ہی بہو گھر سے روٹھ کر چلی تو کسی کی ہتک ہوئی؟ بہو کون جانتا ہے، کس کی لڑکی ہے، کس کی ناتن ہے، کون جانتا ہے؟ ممکن ہے کہ اسد کا باپ

گھسیارا ہی رہا ہو.....''

بڑھیا نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''گھسیارا تو ہے ہی بیٹا، پکا گھسیارا۔ تڑکے اس کا منہ دیکھ لو تو دن بھر پانی نہ ملے۔''

گوبر بولا ''تو ایسے آدمی کی ہنسی ہی کیا ہو سکتی ہے؟ ہنسی ہوئی تمہاری اور تمہارے آدمی کی جس نے پوچھا۔ یہی پوچھا کہ کس کی بہو ہے۔ پھر وہ ابھی لڑکی ہے نا سمجھ، الہڑ! نیچ ماں باپ کی لڑکی ہے، اچھی کہاں سے بن جائے؟ تم کو تو جیسے بوڑھے طوطے کو رام نام پڑھانا پڑے گا۔ مارنے سے تو وہ پڑھے گا نہیں، اسے تو پریم ہی سے پڑھایا جا سکتا ہے۔ طعنہ بھی دو، پر اس کے منہ مت لگو۔ اس کا تو کچھ نہیں بگڑتا تمہاری ہی ہتک ہوتی ہے۔''

جب گوبر چلنے لگا تو بڑھیا نے کھانڈ اور ستو ملا کر اسے کھانے کو دیا۔ گاؤں کے اور کئی آدمی مزدوری کی تلاش میں شہر جا رہے تھے۔ بات چیت میں راستہ کٹ گیا اور نو بجتے بجتے سب کی سب امین آباد کے بازار میں جا پہنچے۔ گوبر حیران تھا کہ اتنے آدمی شہر کہاں سے آ گئے؟ آدمی پر آدمی گرا پڑتا تھا۔ اس دن بازار میں چار پانچ سو مزدوروں سے کم نہ تھے۔ معمار، بڑھئی، لوہار، بیلدار، کھاٹ بننے والے، ٹوکری ڈھونے والے اور سنگ تراش۔ سبھی کا مجمع تھا۔ گوبر یہ بھیڑ بھاڑ دیکھ کر نراس ہو گیا۔ اتنے سارے مجوروں کو کیا کام مل جاتا ہے؟ اور اس کے ہاتھ میں تو کوئی اوزار بھی نہیں ہے، کوئی کیا جانے گا کہ وہ کون سا کام کر سکتا ہے؟ کوئی اسے کیوں رکھنے لگا؟ بلا اوزار کے اسے کون پوچھے گا؟

رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے مزدوروں کو کام ملتا جاتا تھا۔ کچھ لوگ مایوس ہو کر گھر

لوٹے جا رہے تھے۔ زیادہ تر وہ بوڑھے اور نکمے بچ رہے تھے، جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ان ہی میں گوبر بھی تھا مگر ابھی آج اس کے پاس کھانے کو ہے۔ کوئی غم نہیں۔ یکا یک مرزا خورشید نے مزدوروں کے بیچ میں آ کر اونچی آواز میں کہا ''جس کو چھ آنے کھانے کو ہے۔ کوئی غم نہیں۔ یکا یک مرزا خورشید نے مزدوروں کے بیچ میں آ کر بیچ میں آ کر اونچی آواز میں کہا ''جس کو چھ آنے پر آج کام کرنا ہو، وہ میرے ساتھ آئے۔ سب کو چھ آنے ملیں گے۔ پانچ بجے چھٹی ملے گی۔''

دس پانچ معماروں اور بڑھیوں کے علاوہ سب کے سب اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ چار سو خستہ حالوں کی ایک بڑی فوج سج گئی۔ آگے مرزا تھے۔ کندھے پر موٹا سونٹا رکھے ہوئے اور پیچھے بھوکوں مرنے والوں کی لمبی قطار تھی، جیسے بھڑیں ہوں۔''

ایک بوڑھے نے مرزا سے پوچھا۔ ''کون کام کرنا ہے، مالک؟''

مرزا نے جو کام بتایا اس پر سب اور بھی تعجب میں آ گئے۔ صرف ایک کبڈی کھیلنا! یہ کیا آدمی ہے جو کبڈی کھیلنے کے لیے چھ آنے دے رہا ہے، سنکی تو نہیں ہے کوئی؟ بہت دھن پا کر آدمی سنکی ہو جاتا ہے۔ بہت پڑھ لینے پر بھی آدمی سنکی ہو جاتا ہے۔ کچھ کو یہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں یہ مخول تو نہیں ہے۔ یہاں سے گھر پر لے جا کر کہہ دے کہ کوئی کام نہیں ہے تو اس کا کوئی کیا کر لے گا؟ وہ چاہے کبڈی کھلائے، چاہے آنکھ مچولی اور چاہے گلی ڈنڈا، مگر مزدوری پہلے دے دے۔ ایسے جھکی آدمی کا کیا بھروسہ؟

گوبر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''مالک! ہمارے پاس کچھ کھانے کو نہیں ہے،

پیسے مل جائیں تو کچھ لے کر کھالوں۔''

مرزا نے فوراً چھ آنے پیسے اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے اور للکار کر بولے۔

''مزدوری سب کو چلتے چلتے پیشگی دے دی جائے گی، اس کی فکر مت کرو۔''

مرزا صاحب نے شہر کے باہر تھوڑی سی زمین لے رکھی تھی۔ مزدوروں نے جا کر دیکھا تو ایک بڑا احاطہ گھرا ہوا تھا اور اس کے اندر صرف ایک چھوٹی سی پھوس کی جھونپڑی تھی جس میں تین چار کرسیاں تھیں اور ایک میز جس پر کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ جھونپڑی بیلوں سے ڈھکی ہوئی، بہت عمدہ معلوم ہوتی تھی۔ احاطہ میں ایک طرف آم، لیموں اور امرود کے پودے لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف کچھ پھول، زمین کا زیادہ حصہ پرتی پڑا ہوا تھا۔ مرزا نے سب کو ایک قطار میں کھڑا کر کے پہلے ہی اجرت تقسیم کر دی۔ اب کسی کو ان کے پاگل ہونے میں شبہ نہ رہا۔

گوبر پیسے پہلے ہی پا چکا تھا، مرزا نے اسے بلا کر پودے سینچنے کا کام سونپا۔ اسے کبڈی کھیلنے کو نہ ملے گی۔ دل مسوس کر رہ گیا۔ ان بوڑھوں کو اٹھا کر پٹکتا، مگر کچھ پروا نہیں، بہت کبڈی کھیل چکا ہوں۔ پیسے تو پورے مل گئے۔

آج مدت کے بعد بوڑھوں کو کبڈی کھیلنا نصیب ہوا۔ بیشتر تو ایسے تھے جنہیں یاد بھی نہ آتا تھا کہ کبھی کھیلی ہے یا نہیں۔ دن بھر شہر میں پستے تھے، پھر عرات گئے گھر پہنچتے تھے اور جو کچھ روکھا سوکھا مل جاتا تھا، اسے کھا کر پڑ رہتے تھے۔ علی الصباح پھر وہی چرخہ شروع ہو جاتا تھا۔ زندگی بے مزا اور بے لطف، صرف ایک دھڑ لے پر چلی جا رہی تھی۔ آج جو یہ موقع ملا تو بوڑھے بھی جوان بن گئے۔ ادھر مرے بوڑھے ٹھٹھریاں لیے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، جانگھوں کے اوپر تک

دھوتیاں یا تہمد چڑھائے خم ٹھونک ٹھونک کر اچھل رہے تھے، گویا ان کی بوڑھی ہڈیوں میں جوانی سرایت کر گئی ہو۔ جھٹ پٹ پالے بن گئے۔ دو ہیرو بن گئے۔ ساتھیوں کا چناؤ ہونے لگا اور بارہ بجتے بجتے کھیل شروع ہو گیا۔ جاڑوں کی ٹھنڈی دھوپ ایسے کھیلوں کے لیے بہت خوشگوار ہوتی ہے۔

ادھر کے پھاٹک پر مرزا صاحب تماشائیوں کو ٹکٹ بانٹ رہے تھے۔ ان پر اس طرح کا کوئی نہ کوئی خبط ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ امیروں سے پیسہ لے کر غریبوں کو بانٹ دینا اس بوڑھی کبڈی کا اشتہار کئی روز سے ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے پوسٹر چسپاں کیے گئے تھے۔ نوٹس تقسیم ہوئے تھے۔ یہ کھیل اپنے ڈھنگ کا نرالا ہو گا۔ جیسے پہلے کبھی نہ ہوا ہو گا۔ ہندوستان کے بوڑھے آج بھی کیسے جوان مرد ہوتے ہیں، جنہیں یہ دیکھنا ہو، وہ آئے اور اپنی آنکھوں دیکھ لے! جس نے یہ تماشا نہ دیکھا، وہ پچھتائے گا۔ ایسا نادر موقع پھر نہ ملے گا۔ ٹکٹ دس روپے سے لے کر دو آنے تک کے تھے۔ تین بجتے بجتے پورا احاطہ بھر گیا۔ موڑوں اور فٹنوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ دو ہزار سے کم کا مجمع نہ تھا۔ رؤسا کے لیے کرسیاں اور بنچوں کا انتظام تھا اور عوام کے لیے صاف ستھری زمین۔

مس مالتی، مہتا، کھنا، ٹنخا اور رائے صاحب سبھی موجود تھے۔

کھیل شروع ہوا تو مرزا نے مہتا سے کہا۔ ''آیئے ڈاکٹر صاحب ایک پالی ہماری اور آپ بھی ہو جائے گی۔''

مس مالتی بولیں۔ ''فلاسفر ہی سے ہو سکتا ہے۔''

مرزا نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ ''تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں فلاسفر نہیں

ہوں؟ میرے پاس ڈگری کی دم نہیں ہے مگر ہوں میں فلاسفر۔ آپ میرا امتحان لے سکتے ہیں مہتا جی۔''

مالتی نے پوچھا ''اچھا بتائیے کہ آپ آئیڈیلسٹ ہیں یا میٹریلسٹ (روحانیت کے قائل ہیں یا مادیت کے)؟''

''میں دونوں ہوں۔''

''یہ کیوں کر؟''

''بہت اچھی طرح۔ جب جیسا موقع دیکھا ویسا بن گیا۔''

''تو آپ کا کوئی طے شدہ اصول نہیں ہے؟''

جس بات کا آج تک کبھی تصفیہ نہ ہوا ہو اور نہ کبھی ہوگا۔ اس کے متعلق میں بھلا کیا بے کر سکتا ہوں؟ اور لوگ آنکھیں پھوڑ کر اور کتابیں چاٹ کر جس نتیجے پر پہنچے ہیں، وہاں میں یوں ہی پہنچ گیا۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ کسی فلاسفر نے عقلی گدے لگانے کے سوا اور بھی کچھ کیا ہے۔

ڈاکٹر مہتا نے اچکن کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ ''تو چلیے ہماری اور آپ کی ہو جائے اور کوئی مانے یا نہ مانے میں آپ کو فلاسفر مانتا ہوں۔''

مرزا نے کھنا سے پوچھا۔ ''آپ کے لیے بھی کوئی جوڑ ٹھیک کریں؟''

مالتی۔ ''ہاں ہاں انہیں ضرور لے جائیے، مسٹر ٹنخا کے ساتھ۔''

کھنا جھینپتے ہوئے بولے۔ ''جی نہیں مجھے معاف کیجیے۔''

مرزا نے رائے صاحب سے پوچھا۔ ''آپ کے لیے کوئی جوڑ لاؤں؟''

رائے صاحب بولے۔ ''میرا جوڑ تو اونکارناتھ کا ہے، مگر وہ آج نظر نہیں

آتے۔'' مرزا اور مہتا بھی برہنہ بدن، صرف جانگھیا پہنے ہوئے میدان میں پہنچ گئے تھے۔ ایک ادھر دوسرے ادھر۔ کھیل شروع ہو گیا۔

عوام ان بوڑھی کلیلوں پر ہنستے تھے، تالیاں بجاتے تھے، گالیاں دیتے تھے، للکارتے اور بازیاں لگاتے تھے۔ وہ ذرا ان بوڑھے بابا کو دیکھو کس شان سے جا رہے ہیں۔ جیسے سب کا مور کر ہی لوٹیں گے۔ اچھا، دوسری طرف سے بھی ان کے بڑے بھائی نکلے۔ دونوں کیسے پینترے بدل رہے ہیں۔ ان ہڈیوں میں ابھی بڑا جیوٹ ہے بھائی! ان لوگوں نے جتنا گھی کھایا ہے، اتنا تو ہمیں اب پانی بھی میسر نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان دولت مند ہو رہا ہے۔ ہوتا ہو گا، ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ ان بوڑھوں جیسے جیوٹ کے جوان بھی آج مشکل سے نکلیں گے، وہ ادھر والے بوڑھے نے اسے دبوچ لیا۔ بے چارہ چھوٹنے کے لیے کتنا زور مار رہا ہے، مگر اب نہیں جا سکتے بچہ۔ ایک کو تین لپٹ گئے۔ اس طرح لوگ اتنی دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی ساری توجہ میدان پر تھی۔ کھلاڑیوں کے دھکے مکے اچھل کود، دھر پکڑ اور ان کے مرنے جینے میں سبھی محو ہو رہے تھے۔ کبھی چاروں طرف سے قہقہے اٹھتے، کبھی کوئی بے انصافی یا دھوکے بازی دیکھ کر لوگ 'چھوڑ دو' کا شور برپا کرتے اور کچھ لوگ تو طیش میں آ کر پالی کی طرف دوڑ پڑتے، لیکن جو تھوڑے سے لوگ پنڈال میں اعلیٰ درجے کے ٹکٹ لے کر بیٹھے تھے، انہیں اس کھیل میں زیادہ مزہ نہ آ رہا تھا۔ وہ اس سے زیادہ اہمیت کی گفتگو میں مصروف تھے۔

کھنا نے جنجر کا گلاس خالی کر کے سگار جلایا اور رائے صاحب سے بولے۔

''میں نے آپ سے کہہ دیا کہ بینک اس سے کم سود پر کسی طرح منظوری نہ دے گا اور یہ رعایت بھی میں نے آپ کے ساتھ کی ہے کیونکہ آپ سے گھر کا معاملہ ہے۔'' رائے صاحب نے مونچھوں کے اندر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر گھر ہی والوں کو الٹے چھرے سے حلال کرنا چاہتے ہیں۔''

''یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ سورج تاپ سنگھ نے آپ سے صرف سات فیصد لیا ہے۔ مجھ سے نو فیصد مانگ رہے ہیں اور اس پر احسان بھی رکھتے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔''

کھنا نے قہقہہ لگایا۔ گویا یہ بات ہنسنے ہی کے لائق تھی۔ ان شرطوں پر میں آپ سے بھی وہی سود لے لوں گا۔ ہم نے ان کی جائیداد رہن رکھ لی ہے اور شاید وہ جائیداد پھر ان کے ہاتھ نہ جائے گی۔

''میں بھی اپنی کوئی جائیداد نہ دوں گا۔ نو فیصد سے کہیں بہتر ہے کہ فالتو جائیداد الگ کر دوں، میری جیکسن روڑ والی کوٹھی آپ نکلوا دیں، کیش لے لیجیے گا۔''

''اس کوٹھی کا آسانی سے نکلنا ذرا مشکل ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ جگہ بستی سے کتنی دور ہے، مگر خیر دیکھوں گا، آپ اس کی قیمت کا کیا اندازہ کرتے ہیں؟''

رائے صاحب نے ایک لاکھ پچیس ہزار بتائے۔ پندرہ بیگھے زمین تو ہے اس کے ساتھ۔ کھنا متحیر ہو گئے۔ بولے۔ ''آپ آج کے پندرہ سال پہلے کا خواب دیکھ رہے ہیں رائے صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ادھر کی جائیدادوں کی

قیمت میں پچاس فیصد ہوگا آپ سے۔''

''اوروں سے شاید دس فیصد ہو، کیوں؟ کیا کروگے اتنے روپے لے کر؟''

''آپ جو چاہے، دے دیجیے گا۔ اب تو راضی ہوئیے۔ شکرمل کے حصے ابھی تک آپ نے نہ خریدے۔ اب بہت تھوڑے بیچ رہے ہیں، ہاتھ ملتے رہ جائیے گا۔ بیمہ پالیسی بھی آپ نہ لی۔ آہ میں ٹال مٹول کی بری عادت ہے۔ جب اپنی نفع کی باتوں میں اتنا ٹال مٹول ہے، تب دوسروں کو آپ لوگوں سے کیا نفع ہوسکتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ریاست آدمی کی عقل چر جاتی ہے۔ میرا بس چلے تو میں تعلقداروں کی ریاستیں ضبط کرلوں۔''

مسٹر ٹنخا، مالتی پر جال پھینک رہے تھے۔ مالتی نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ چناؤ کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتی۔ مگر ٹنخا آسانی سے ہار ماننے والے آدمی نہ تھے، آکر کہنیوں کے بل میز پر ٹیک لگا کر بولے۔ ''آپ ذرا اس معاملے پر پھر غور کریں، میں کہتا ہوں کہ ایسا موقع شاید آپ کو پھر نہ ملے۔ رانی صاحبہ چندا کا آپ کے مقابلہ میں روپے میں ایک آنہ چانس بھی نہیں ہے۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ کونسل میں صرف ایسے لوگ جائیں جنہوں نے زندگی میں کچھ تجربہ حاصل کیا ہو اور عوام کی کچھ خدمت بھی کی ہو۔ جس عورت نے عیش و عشرت کے سوا کچھ جانا ہی نہیں، جس نے عوام کو ہمیشہ اپنے موٹر کا پٹرول سمجھا، مس کی سب سے قیمتی خدمات وہ پارٹیاں ہیں جو گورنروں اور سیکرٹریوں کو دی جاتی ہیں، اس کے لیے کونسل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ نئی کونسلوں میں بہت کچھ اختیار نمائندوں کے ہاتھ میں ہوگا اور میں نہیں چاہتا کہ وہ اختیار نا مستحقوں کے ہاتھ میں جائے۔''

مالتی نے گلا چھڑانے کے لیے کہا۔ ''لیکن صاحب! میرے پاس دس بیس ہزار الیکشن میں خرچ کرنے کے لیے کہاں ہیں؟ رانی صاحبہ تو دو چار لاکھ خرچ کر سکتی ہیں۔ مجھے بھی سال میں ہزر پانچ سو روپے ان سے مل جاتے ہیں۔ یہ رقم بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔''

''پہلے آپ بتا دیں کہ آپ جانا چاہتی ہیں یا نہیں؟''

''جانا تو چاہتی ہوں بشرطیکہ فری پاس مل جائے۔''

''جی نہیں، معاف کیجیے میں ہار کی ذلت نہیں اٹھانا چاہتی۔ جب رانی صاحب روپے کے تھیلیاں کھول دیں گی اور ایک ایک ووٹ پر ایک ایک اشرفی چڑھنے لگے گی تو شاید آپ بھی ادھر ہی ووٹ دیں گے۔''

''آپ کے خیال میں چناؤ محض روپے سے جیتا جا سکتا ہے۔''

''جی نہیں، شخصیت بھی ایک چیز ہے لیکن میں نے صرف ایک مرتبہ جیل جانے کے سوا اور عوام کی کیا خدمت کی ہے؟ اور سچ پوچھتے تو اس بار بھی میں اپنے مطلب سے گئی تھی، اسی طرح جیسے رائے صاحب اور کھنا گئے تھے۔ اس نئے تمدن کی بنیاد دولت ہے۔ علم اور خدمت، خاندان اور ذات، سب دولے کے سامنے ہیچ ہیں۔ کبھی کبی تاریخ میں ایسے موقع آ جاتے ہیں جب دولت کو تحریک کے مقابلہ میں نیچا دیکھنا پڑتا ہے۔ مگر اسے مستثنیات میں سمجھئے۔ میں اپنی ہی بات کہتی ہوں۔ کوئی غریب عورت دواخانے میں آ جاتی ہے تو اس سے بولتی تک نہیں، مگر عورت کوئی موٹر پر آ گئی تو دروازے تک جا کر استقبال کرتی ہوں اور ایسی ناز برداری کرتی ہوں گویا وہ مجسم دیوی ہو۔ میرا اور رانی صاحبہ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ جیسی کو

نسلیں بن رہی ہیں، ان کے لیے رانی صاحبہ موزسوں ہیں۔

ادھر میدان میں مہتا کی ٹیم کمزور پڑتی جاتی تھی۔ نصف سے زیادہ کھلاڑی مر چکے تھے۔ مہتا نے اپنی زندگی میں کبھی کبڈی نہ کھیلی تھی۔ مرزا اس فن میں استاد تھے۔ مرزا کی تعطیلیں ناٹک کی مشق میں گزرتی تھیں۔ بھیس بنانے میں وہ اچھے اچھوں کو متعجب کر دیتے تھے۔ مرزا کی ساری دلچسپی اکھاڑے میں تھی، پہلوانوں کے بھی اور پریوں کے بھی!''

مالتی کا دھیان ادھر ہی لگا ہوا تھا۔ اٹھ کر رائے صاحب بولی ''مہتا کی پارٹی تو بری طرح پٹ رہی ہے۔''

رائے صاحب اور کھنا میں جیسے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ رائے صاحب اس سے اکتائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مالتی نے انہیں گویا گلوخلاصی دے دی، اٹھ کر بولے۔

''جی ہاں، پٹ تو رہی ہے۔ مرزا پکا کھلاڑی ہے۔''

''مہتا کو یہ کیا سنک سوجھی۔ مفت اپنی بھد اکرا رہا ہے۔''

''اس میں کاہے کا بھد۔ دل لگی ہی تو ہے۔''

''مہتا کی طرف سے جو باہر نکلتا ہے، وہی مر جاتا ہے۔''

''ایک لمحہ بعد اس نے پوچھا'' کیا اس کھیل میں ہاف ٹائم نہیں ہوتا۔''

کھنا کو شرارت سوجھی۔ بولے۔'' آپ چلے تھے مرزا سے مقابلہ کرنے۔ سمجھے تھے کہ یہ بھی فلسفہ ہے۔''

''میں پوچھتی ہوں اس کھیل میں ہاف ٹائم نہیں ہوتا؟''

کھنا نے پھر چڑایا۔ ''اب کھیل ہی ختم ہوا جاتا ہے۔ مزہ آئے گا جب مرزا صاحب مہتا کو دبوچ کر رگڑیں گے اور مہتا صاحب چیں بولیں گے۔''

''میں تم سے نہیں پوچھتی، رائے صاحب سے پوچھتی ہوں۔''

رائے صاحب بولے ''اس کھیل میں کیسا ہاف ٹائم؟ ایک ہی آدمی تو سامنے آتا ہے۔''

''اچھا مہتا کا ایک آدمی اور مر گیا۔''

کھنا بولے۔ ''آپ دیکھتی رہیے۔ اسی طرح سب مر جائیں گے اور آخر مہتا صاحب بھی مریں گے۔''

مالتی جل گئی۔ ''آپ کی تو ہمت نہ پڑی باہر نکلنے کی۔''

''میں دیہاتی کھیل نہیں کھیلتا۔ میرے لیے ٹینس ہے۔''

''ٹینس میں بھی تمہیں سیکڑوں گیم دے چکی ہوں۔''

''آپ سے جیتنے کا مجھے دعویٰ کب ہے؟''

''اگر دعویٰ ہو تو تیار ہوں۔''

مالتی انہیں پھٹکار بتا کر پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ کسی کو مہتا سے ہمدردی نہیں ہے۔ کوئی صاحب یہ نہیں کہتا کہ اب کھیل ختم کر دیا جائے۔ مہتا بھی عجیب احمق آدمی ہیں، کچھ دھاندلی کیوں نہیں کر بیٹھتے؟ یہاں بھی اپنی انصاف پسندی دکھا رہے ہیں۔ ابھی ہار کر لوٹیں گے تو چاروں طرف سے تالیاں پڑیں گی۔ اب شاید بیس آدمی اور ان کی طرف ہوں گے اور لوگ کتنے خوش ہو رہے ہیں۔

جیوں جیوں خاتمہ آتا جاتا تھا، لوگ بیتاب ہوتے جاتے اور پالی کی طرف

بڑھتے جاتے تھے۔ رسکی کا جو ایک کنگھرا سا بنایا گیا تھا، وہ تو ڑ دیا گیا۔ والنٹیر روکنے کی کوشش کررہے تھے مگر اس شوق کے نشے میں ان کی ایک بھی نہ چلتی تھی حتیٰ کہ بڑھاؤ آخری حد تک آ پہنچا مہتا تنہا بچ گئے۔ اب انہیں گونگے کا پارٹ کھیلنا پڑے گا۔ اب سارا دارومدار ان ہی پر ہے۔ اگر وہ بچ کر اپنی پالی میں لوٹ آتے ہیں تو ان کی پارٹی کی خیر ہے ورنہ شکست کی ساری ذلت وندامت لیے ہوئے انہیں لوٹنا پڑتا ہے۔ وہ دوسری طرف کے جتنے آدمیوں کو چھو کر اپنی پالی میں آئیں گے وہ سب مرجائیں گے اور اتنے ہی آدمی ان کی طرف جی اٹھیں گے۔ سب کی آنکھیں مہتا پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ مہتا چلے۔ لوگوں نے چاروں طرف سے آ کر پالی کو گھیر لیا۔ انتہائی محویت تھی۔ مہتا کتنے اطمینان سے دشمنوں کی طرف جارہے ہیں۔ ان کی ہر حرکت لوگوں پر منعکس ہوتی جاتی ہے۔ کسی کی گردن ٹیڑھی ہوئی جاتی ہے، تو کوئی آگے جھکا پڑتا ہے۔ فضا گرم ہوگئی ہے۔ پارہ حرارت کے انتہائی نقطے تک پہنچ گیا ہے۔ مہتا مخالف جماعت میں داخل ہوئے، وہ جماعت پیچھے ہٹتی جاتی ہے۔ ان کا سنگھٹن اتنا مضبوط ہے کہ مہتا کی پکڑ میں کوئی نہیں آرہا ہے۔ بہتوں کو جو امید تھی کہ مہتا کم سے کم اپنی پارٹی کے دس پانچ آدمیوں کو جلا ہی دیں گے، وہ مایوس ہوتے جارہے ہیں۔

دفعتاً مرزا ایک چھلانگ مارتے ہیں اور مہتا کی کمر پکڑ لیتے ہیں۔ مہتا اپنی کمر چھڑانے کے لیے زور لگا رہے ہیں۔ مرزا کو پالی کی طرف کھینچے لیے آرہے ہیں۔ لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔ اب اس کا پتہ مشکل ہے کہ کون کھلاڑی ہے اور کون تماشائی، سب ایک میں مل جل گئے ہیں۔ مرزا اور مہتا میں کشتی ہورہی ہے۔ مرزا کے

کئی بڈھے مہتا کی طرف لپکے اور ان سے لپٹ گئے۔۔مہتا زمین پر چپ چاپ پڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ کسی طرح کھینچ کر دو ہاتھ اور لے جائیں تو ان کے پچاسوں آدمی جی اٹھتے ہیں۔مگر وہ ایک پانچ بھی نہیں کھسک سکے۔مرزا ان کی گردن پر بیٹھے ہوئے ہیں۔مرزا کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے، آنکھیں بیر بہوٹی بنی ہوئی ہیں، پسینہ ٹپک رہا ہے اور مرزا اپنے موٹے جسم کا بوجھ لیے ہوئے ان کی پیٹ پر اچک رہے ہیں۔ مالتی نے قریب جا کر جوش میں کہا۔''مرزا خورشید یہ فیئر نہیں ہے، بازی ڈران رہی۔''

خورشید نے مہتا کی گردن پر ایک رگڑا لگا کر کہا۔''جب یہ چیں نہ بولیں گے، میں ہرگز نہ چھوڑوں گا۔کیوں نہیں چیں بولتے ؟''

مالتی اور آگے بڑھی۔''چیں بلانے کے لیے آپ اتنا جبر نہیں کر سکتے۔''

مرزا نے مہتا کی پیٹھ پر اچھل کر کہا۔''بیشک کر سکتا ہوں۔آپ ان سے کہہ دیں کہ چیں بولیں۔میں ابھی اٹھا جاتا ہوں۔''

مہتا نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر مرزا نے ان کی گردن دبا دی۔

مالتی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''یہ کھیل نہیں دشمنی ہے۔''

''دشمنی ہی سہی۔''

اسی وقت جیسے کوئی زلزلہ آ گیا۔مرزا صاحب زمین پر پڑے ہوئے تھے اور مہتا دوڑتے ہوئے پالی کی طرف جا رہے تھے اور ہزاروں آدمی پاگلوں کی طرح ٹوپیاں، پگڑیاں اور چھڑیاں اچھال رہے تھے۔کیسے یہ کایا پلٹ ہوئی، کوئی نہ سمجھ

سکا۔

مرزا نے مہتا کو گود میں اٹھالیا اور لیے ہوئے شامیانے تک آئے۔ ہر شخص کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔ ''ڈاکٹر صاحب نے بازی مار لی۔'' اور ہر شخص اس ہاری ہوئی بازی کے یکبارگی پلٹ جانے پر متعجب تھا۔ سبھی مہتا کے جیوٹ اور دم اور استقلال کی تعریف کررہے تھے۔

مزدوروں کے لیے پہلے ہی سے نارنگیاں منگالی گئی تھیں، انہیں ایک ایک نارنگی دے کر رخصت کیا گیا۔ شامیانے میں مہمانوں کے چائے کافی کا انتظام تھا۔ مہتا اور مرزا ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھے۔ مالتی، مہتا کے پاس بیٹھی۔

مہتا نے کہا۔ ''مجھے آج ایک نیا تجربہ ہوا۔ عورت کی ہمدردی ہار کو جیت بنا سکتی ہے۔''

مرزا نے مالتی کی طرف دیکھا۔ ''اچھا یہ بات تھی! جبھی تو مجھے حیرت ہورہی تھی کہ آپ یکا یک اوپر کیسے آگئے۔''

مالتی شرم سے سرخ ہوئی جاتی تھی۔ بولی۔ ''آپ بڑے بےمروت آدمی ہیں مرزا جی! مجھے آج معلوم ہوا۔''

''قصور ان کا تھا۔ یہ کیوں چیں نہیں بولتے تھے۔''

''میں تو چیں نہ بولتا۔ چاہے آپ میری جان ہی لے لیتے۔''

کچھ دیر دوستوں میں گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر شکریہ اور مبارکباد کی تقریریں ہوئیں اور مہمان رخصت ہوئے۔ مالتی کو بھی ایک مریض کے یہاں جانا تھا۔ پس وہ بھی چلی گئی۔ صرف مرزا اور مہتا رہ گئے۔ انہیں ابھی نہانا تھا۔ مٹی میں لت پت

ہو رہے تھے۔ کپڑے جیسے پہنے؟ گوبر پانی کھینچ لایا اور دونوں نہانے لگے۔

مرزا نے پوچھا۔ ''شادی کب تک ہوگی؟''

مہتا نے حیرت سے پوچھا۔ ''کس کی؟''

''آپ کی۔''

''میری شادی! کس کے ساتھ؟''

''واہ آپ تو ایسا اڑ رہے ہیں گویا یہ بھی کوئی چھپانے کی بات ہے۔''

''نہیں نہیں، میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے بالکل خبر نہیں ہے۔ کیا میری شادی ہونے جا رہی ہے؟''

''اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ مس مالتی آپ کی رفیق بن کر رہے گی۔''

مہتا متانت سے بولے۔ ''آپ قیاس بالکل غلط ہے۔ مرزا جی! مس مالتی خوبصورت ہیں، خوش مزاج ہیں، سمجھدار ہیں، روشن خیال ہیں اور بھی ان میں کتنی ہی خوبیاں ہیں مگر میں اپنی زندگی کی رفیقہ جو بات دیکھنا چاہتا ہوں، وہ ان میں نہیں اور نہ شاید ہو سکتی ہے۔ میرے ذہن میں عورت وفا اور ایثار کی مورت ہے جو اپنی بے زبانی اور اپنی قربانی سے اپنے کو بالکل مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ قالب مرد کا رہتا ہے مگر جان عورت کی ہوا کرتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ مرد اپنے کو کیوں نہیں مٹاتا، عورت ہی سے کیوں یہ امید کرتا ہے۔ مرد میں وہ سکت ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے کو مٹائے گا تو کچھ نہ رہ جائے گا۔ وہ کسی گپھا میں جا بیٹھے گا اور وصال حق کا خواب دیکھنے لگے گا۔ اس میں جلال کی زیادتی ہے اور وہ اپنے گھمنڈ میں یہ سمجھ کر کہ وہ عقل کا پتلا ہے، سیدھا خدا میں جذب ہو جانے کا تصور کیا

کرتا ہے۔عورت زمین کی طرح صبر وسکون اور برداشت والی ہے۔مرد میں عورت کے اوصاف آجاتے ہیں تو وہ مہاتما بن جاتا ہے اور عورت میں مرد کے گن آجاتے ہیں تو وہ بدکار بن جاتی ہے۔مرد ارغب ہوتا ہے،اس عورت کی طرف جو بہمہ وجوہ مکمل ہو۔مالتی نے ابھی مجھے راغب نہیں کیا۔میں آپ سے کن الفاظ میں کہوں کہ عورت میری نگاہوں میں کیا ہے۔دنیا میں جو کچھ خوبصورتی ہے۔اسی کے مجسمہ کو میں عورت کہتا ہوں۔میں اس سے یہ امید رکھتا ہوں کہ میں اسے مار بھی ڈالوں تو اس کے دل میں بدی کا خیال تک نہ آئے۔اگر میں اس کی آنکھوں کے سامنے کسی عورت کو پیار کروں تو بھی وہ حسد نہ کرے۔ایسی عورت پا کر میں اس کے قدموں پر گر پڑوں گا اور اس پر اپنے آپ کو نچھاور کروں گا۔''

مرزا نے سر ہلا کر کہا۔''ایسی عورت آپ کو اس دنیا میں تو شاید ہی ملے۔''

مہتا نے ہاتھ مار کر کہا۔''ایک نہیں ہزاروں،ورنہ دنیا ویران ہو جاتی۔''

''ایسی ایک ہی مثال دیجیے۔''

''مسز کھنا ہی کو لیجیے۔''

''لیکن کھنا۔''

''کھنا بدنصیب ہیں جو ہیرا پا کر اسے کانچ کا ٹکڑا سمجھ رہے ہیں۔سوچیے کتنا ایثار ہے اور اس کے ساتھ ہی کتنی محبت ہے۔کھنا کے صورت پرست دل میں شاید اس کے لیے ذرا بھی جگہ نہیں ہے مگر آج کھنا پر کوئی آفت آجائے تو وہ خود کو ان پر قربان کر دے گی۔کھنا آج اندھے یا کوڑھی ہو جائیں تو بھی اس کی وفاداری میں فرق نہ آئے گا۔ابھی کھنا اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں مگر آپ دیکھیں گے کہ ایک

دن وہ اس کے پیر دھو دھو کر پیئں گے۔ میں ایسی بیوی نہیں چاہتا جس سے میں پروفیسر آئین سٹائین کے اصولوں پر بحث کر سکوں یا جو میری کتابوں کے پروف دیکھا کرے، میں ایسی عورت چاہتا ہوں جو میری زندگی کو پاک اور روشن بنا دے، اپنی محبت اور قربانی سے۔''

خورشید نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے کوئی بھولی بات یاد کر کے کہا۔ ''آپ کا خیال بہت درست ہے مسٹر مہتا! ایسی عورت اگر کہیں مل جائے تو میں بھی شادی کر لوں، مگر امید نہیں ہے کہ مجھے ملے۔''

مہتا نے ہنس کر کہا ''آپ بھی کھوج میں رہیے اور میں بھی ہوں۔ شاید قسمت جاگ اٹھے۔''

''مگر مس مالتی آپ کو چھوڑنے والی نہیں، کہتے ہو تو لکھ دوں۔''

''ایسی عورت سے صرف میں دل بہلاوا کر سکتا ہوں، بیاہ نہیں۔ بیاہ تو خود کو سراپا نذر دینا ہے۔''

''اگر بیاہ یہی ہے تو محبت کیا ہے۔''

''محبت جب اسی نذر کی صورت پکڑ لیتی ہے، جب ہی بیاہ ہے اور اس سے قبل عیاشی ہے۔''

مہتا نے کپڑے پہنے اور رخصت ہو گئے۔ شام ہو گئی تھی۔ مرزا نے جا کر دیکھا تو گوبر ابھی تک پیڑوں کو سینچ رہا تھا۔ مرزا نے خوش ہو کر کہا۔ ''جاؤ تمہاری چھٹی ہے، کل پھر آؤ گے؟''

گوبر نے عاجزی سے کہا ''میں کہیں نوکری کرنا چاہتا ہوں مالک!''

''نوکری کرنا ہے تو ہم تجھے رکھ لیں گے۔''

''کتنا ملے گا مالک؟''

''جتنا تو مانگے۔''

''میں کیا مانگوں، آپ جو چاہیں دے دیں۔''

گوبر محنت سے نہیں ڈرتا۔ اسے روپے ملیں تو آٹھوں پہر کام کرنے کو تیار ہے۔ پندرہ روپے ملیں تو کیا پوچھنا۔ وہ تو جان بھی دے دے گا۔ بولا ''میرے لیے ایک کوٹھڑی مل جائے تو وہیں پڑا رہوں گا۔''

''ہاں، ہاں جگہ کا انتظام میں کروں گا۔ اسی جھونپڑی میں ایک طرف تم بھی پڑ رہنا۔''

گوبر کو جیسے بیکنٹھ مل گیا۔

(14)

ہوری کی پوری فصل جرمانے کی نذر ہو چکی ہے۔ بیسا کھ تو کسی طرح کٹ گیا، مگر جیٹھ لگتے لگتے گھر میں غلے کا ایک دانہ نہ رہا۔ پانچ آدمی کھانے والے گھر میں دانہ ندارد۔ دونوں وقت نہ ملے تو ایک وقت تو ملنا ہی چاہیے۔ پیٹ بھر نہ ملے تو آدھا پیٹ سہی۔ فاقے سے کوئی کتنے دن رہ سکتا ہے۔ ادھار لے تو کس سے؟ گاؤں کے سبھی چھوٹے بڑے مہاجنوں سے تو منہ چڑانا پڑتا ہے۔ مزدوری بھی کرے تو کس کی؟ جیٹھ میں تو اپنا ہی کام ڈھیروں تھا۔ ایک میں پانی لگا ہوا تھا، مگر

خالی پیٹ محبت بھی کیسے ہو۔

شام ہوگئی تھی۔ چھوٹا بچہ رو رہا تھا۔ ماں کو کھانا نہ ملے تو دودھ کہاں سے ہو؟ سوبائی سب بات سمجھتی تھی مگر روپا کیا سمجھے؟ بار بار روٹی چلا رہی رہی تھی۔ دن بھر تو کچی امیوں سے جی بہلا مگر اب تو کوئی ٹھوس چیز چاہیے۔ ہوری دو لاری سیٹھانی سے اناج ادھار مانگنے گیا تھا مگر وہ دکان بند کر کے بازار چلی گئی تھی۔ منگرو شاہ نے صرف انکار ہی نہیں بلکہ ڈانٹ بھی بتائی۔ ادھار مانگنے چلے ہیں۔ تین سال سے دھیلا بیاج نہیں دیا۔ اس پر ادھار دیئے جاؤ اب دوسرے جنم میں دیں گے! کھوٹی نیت ہو جاتی ہے تو یہی حال ہوتا ہے۔ بھگوان سے بھی یہ کھوٹائی نہیں دیکھی جاتی۔ کارندے کی ڈانٹ پڑی تو کیسے چپکے سے روپے اگل دیئے۔ میرا روپیہ ہی نہیں ہے اور گھر والی ہے تو اس کا مزاج ہی نہیں ملتا۔

وہاں سے آبدیدہ ہو کر لوٹا اور اداس بیٹھا ہوا تھا کہ پنیا آگ لینے آئی۔ رسوئی کے وقت دروازے پر جا کر دیکھا تو اندھیرا پڑا ہوا تھا۔ بولی۔ ''آج روٹ نہیں بنا رہی ہو کیا بھابھی جی؟ اب تو بیرا (وقت) ہوگئی ہے۔''

جب سے گوبر بھاگا تھا، پنیا اور دھنیا میں بول چال ہوگئی۔ پنیا ہوری کا احسان بھی ماننے لگی تھی۔ ہیرا کو اب وہ گالیاں دیتی تھی۔ ''بتیارا گئو ہتیا کر کے بھاگا۔ منہ میں کالکھ لگی ہے۔ گھر کیسے آوے؟ اور آوے بھی تو گھر میں پاؤں نہ رکھنے دوں گی۔ گئو ہتیا کر کے اسے لاج بھی نہ آئی۔ بہت اچھا ہوتا کہ پولیس باندھ کر لے جاتی اور چکی پسواتی۔''

دھنیا کوئی حیلہ نہ کر سکی۔ بولی۔ ''روٹی کہاں سے بنے، گھر میں دانہ تو ہے ہی

نہیں ۔ تیرے مہتو نے برادری کا پیٹ بھر دیا، بال بچے مریں یا جئیں ۔ اب برادری جھانکتی تک نہیں ۔''

پنیا کی فصل اچھی ہوئی تھی اور وہ مانتی تھی کہ یہ ہوری کی بدولت ہے ۔ ہیرا کے ہاتھوں کبھی اتنی برکت نہ ہوتی تھی ۔ بولی ۔ ''اناج میرے گھر سے کیوں نہیں منگوا لیا ۔ وہ بھی تو مہتو کی کمائی ہے کہ کسی اور کی؟ سکھ کے دن آویں تو لڑ لینا، دکھ تو ساتھ ساتھ رونے ہی سے کٹتا ہے ۔ میں کیا ایسی اندھی ہوں کہ آدمی کا دل نہیں پہچانتی؟ مہتو نے نہ سنبھالا ہوتا تو آج مجھے کہاں ٹھکانہ تھا؟'' وہ الٹے پاؤں لوٹی اور سونا کو بھی ساتھ لیتی گئی ۔ ایک لمحے میں دو بڑے ٹوکرے اناج سے بھرے ہوئے لا کر آنگن میں رکھ دیئے ۔ دو من سے کم نہ تھا ۔ دھنیا ابھی کچھ کہنے نہ پائی کہ وہ پھر چل دی اور لمحہ بھر میں ایک بڑی سی ٹوکری ارہر کی دال سے بھری ہوئی لا کر رکھ دی اور بولی ۔ ''چلو میں چولہا جلائے دیتی ہوں ۔''

دھنیا نے دیکھا تو جو کے اوپر ایک چھوٹی سی ڈلیا میں چار پانچ سیر آٹا بھی تھا ۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ وہ مغلوب ہوئی ۔ آنکھوں میں محبت اور شکریئے کے آنسو بھر کر بولی ۔ ''سب کا سب اٹھا لائی کہ گھر میں بھی کچھ چھوڑا؟ کہیں بھاگا جاتا تھا!''

آنگن میں بچہ کھٹولے پر پڑا رو رہا تھا ۔ پنیا اسے گود میں لے کر دلار کرتی ہوئی بولی ۔ ''تمہاری دیا سے ابھی بہت ہے بھابھی جی! پندرہ من تو جو ہوا اور دس من گیہوں اور پانچ من مٹر، کیا چھپانا؟ دونوں گھروں کا کام چل جائے گا ۔ دو تین مہینے میں پھر مکا ہو جائے گا ۔ آگے بھگوان مالک ہے ۔''

دھنیا نے آکر آنچل سے چھوٹی ساس کے چرن چھوئے ۔ پنیا نے اسیس دی ۔

سونا آگ جلانے چلی اور روپا نے پانی کے لیے گھڑا اٹھایا۔ رکی ہوئی گاڑی چل پڑی۔ پانی میں رکاوٹ کے سبب جو بھنور تھا، جھاگ تھا، شور تھا، بہاؤ کی تیزی تھی، وہ رکاوٹ ہٹ جانے سے آہستہ آہستہ میٹھے راگ کے ساتھ برابر ہو کر بہہ چلا۔

پنیا بولی۔ ''مہتو کو ڈانٹ باندھ دینے کی ایسی جلدی کیا پڑی تھی؟''

دھنیا نے کہا۔ ''برادری میں اجاگر کیسے ہوتے۔''

''بھابی! برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔''

''کہہ، برا کیوں مانوں گی؟''

''نہ کہوں گی، کہیں تم بگڑنے نہ لگو۔''

''کہتی ہوں کہ کچھ نہ بولوں گی، کہہ تو۔''

''تمہیں جھنیا کو گھر میں نہ رکھنا چاہیے تھا۔''

''تب کیا کرتی؟ وہ ڈوبی مرتی تھی۔''

''میرے گھر میں رکھ دیتیں، تب تو کوئی کچھ نہ کہتا۔''

''یہ تو آج کہتی ہے۔ اس دن بھیج دیتی تو جھاڑو لے کر دوڑتی۔''

''اتنے کھرچ (خرچ) میں تو گوبر کا بیاہ ہو جاتا۔''

''ہونہار کو کون ٹال سکتا ہے، پگلی؟ ابھی اتنے ہی سے گلا نہیں چھوٹا۔ بھولا اب اپنی گائے کے دام مانگ رہا ہے۔ تب تو گائے دی تھی کہ میری سگائی کہیں کر دو، اب کہتا ہے کہ مجھے سگائی نہیں کرنی، میرے روپے دے دو۔ اس کے دونوں بیٹے لاٹھی لیے گھومتے ہیں۔ ہمارے کون بیٹھا ہے جو ان سے لڑے؟ اس ستیانا سی گائے نے تو آ کر گھر ہی چوپٹ کر دیا۔''

کچھ اور باتیں کر کے پنیا آگ لے کر چلی گئی۔ ہوری سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اندر آ کر بولا۔ ''پنیا دل کی ساپھ (صاف) ہے۔''

''ہیرا بھی تو دل کا ساپھ تھا؟''

دھنیا نے اناج تو رکھ لیا تھا مگر دل میں نادم ہو رہی تھی۔ یہ دنوں کا پھیر ہے کہ آج اسے یوں نیچا دیکھنا پڑا۔

''تو کیسی کا اپکار نہیں مانتی یہی تجھ میں برائی ہے۔''

''اپکار کیوں مانوں؟ میرا آدمی اس کے گرہستی کے پیچھے جان دے رہا ہے؟ پھر میں نے دان تھوڑے ہی لیا ہے، ایک ایک دانہ بھر دوں گی۔''

مگر پنیا اپنی جٹھانی کے خیالات سمجھ کر بھی ہوری کے احساس کا بدلا چکاتی جاتی تھی۔ جب یہاں اناج ختم ہو جاتا تو من دو من دے جاتی۔ مگر جب چوما آ گیا اور برکھا نہ ہوئی تو مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا۔ ساون کا مہینہ آ گیا اور چاروں طرف بگولے اٹھ رہے تھے۔ کنووں کا پانی بھی سوکھ گیا تھا اور ایکھ دھوپ سے جلی جاتی تھی۔ ندی میں تھوڑا تھوڑا پانی ملتا تھا مگر اس کے لیے آئے دن لاٹھیاں نکلتی تھیں۔ یہاں تک ندی نے بھی جواب دے دیا۔ جگہ جگہ چوریاں ہونے لگیں اور ڈاکے پڑنے لگے۔ علاقے بھر میں کہرام مچ گیا۔ آخر خیریت ہوئی کے بھادوں میں پانی برس پڑا اور کسانوں کے دل ہرے ہو گئے۔ کتنی خوشی تھی اس دن! پیاسی زمین گویا آسودہ ہی نہ ہوئی تھی اور پیاسے کسان اس طرح اچھل رہے تھے گویا پانی نہیں اچرفیاں برس رہی ہیں! سمیٹ لو جتنا سمیٹتے بنے! کھیتوں میں جہاں بگولے اٹھتے تھے، وہاں ہل چلنے لگے۔ لڑکے گھروں سے نکل نکل کر تالابوں اور گھڑیوں کا

معائنہ کر رہے تھے۔ اوہو! تالاب تو آدھا بھر گیا اور وہاں سے گڑھیا کی طرف دوڑے۔

مگر اب کتنا ہی پانی برسے، ایکھ تو ختم ہو گئی۔ ہاتھ ہاتھ بھر کی ہو کر رہ جائے گی۔ مکا، جوار اور کودوں سے لگان تھوڑے ہی چکے گا؟ مہاجن کا پیٹ تھوڑے ہی بھرا جائے گا؟ ہاں مویشیوں کے لیے چارہ ہو گیا اور آدمی جی گیا۔

جب ماگھ گزر گیا اور بھولا کے روپے نہ ملے تو ایک روز وہ جھلایا ہوا ہوری کے گھر آدھمکا اور بولا۔ ''یہی ہے تمہارا وعدہ؟ اسی منہ سے تم نے اوکھ پیل کر میرے روپے دینے کا بچن (قول) دیا تھا؟ اب تو اوکھ پیل چکے، لاؤ روپے میرے ہاتھ میں۔''

ہوری جب اپنی بپتا سنا کر اور منت سماجت کر کے ہار گیا اور بھولا دروازے سے نہ ہٹا تو اس نے جھلا کر کہا ''تو مہتو ابھی تو میرے پاس روپے نہیں ہیں اور نہ مجھے کہیں ادھار مل سکتے ہیں۔ میں کہاں سے لاؤں؟ دانے دانے کی تنگی ہو رہی ہے۔ بسوا اس نہ ہو تو گھر میں جا کر دیکھ لو۔ جو کچھ ملے اٹھا لے جاؤ۔''

بھولا نے بے مروتی سے کہا۔ میں تمہارے گھر کی کیوں تلاسی لینے جاؤں؟ اور نہ مجھے اس سے واسطہ ہے کہ تمہارے پاس روپے ہیں کہ نہیں۔ تم نے اوکھ پیل کر روپے دینے کو کہا تھا اور اوکھ پیل چکے تو اب میرے روپے حوالے کرو۔

''تو پھر جو کہو وہ کروں۔''

''میں کیا کہوں۔''

''میں تم ہی پر چھوڑتا ہوں۔''

''میں تمہارے دونوں بیل کھول لے جاؤں گا۔''

ہوری نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا، گویا اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر سر جھکا کر رہ گیا۔ بھولا کیا سے بھکاری بنا کر چھوڑ دینا چاہتا ہے؟ دونوں بیل چلے گئے تب تو اس کے دونوں ہاتھ ہی کٹ جائیں گے۔ عاجزی سے بولا۔ ''دونوں بیل لے لو گے تو میرا تو سب سوا ہاہو جائے گا۔ اگر تمہارے دھرم یہی کہتا ہے تو کھول لے جاؤ۔''

''تمہارے بننے بگڑنے کی پروا نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے روپے روپے چاہئیں۔''

''اور جو کہہ دوں کہ میں نے روپے دیئے ہیں؟''

بھولا سناٹے میں آ گیا۔ اسے بھی اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہوا۔ ہوری اتنی بڑی بے ایمانی کر سکتا ہے، یہ ممکن نہیں۔ تیز ہو کر بولا۔ ''اگر تم ہاتھ میں گنگا جل لے کر کہہ دو کہ میں نے روپیہ دے دیا تو صبر کر لوں گا۔''

''کہنے کا من تو چاہتا ہے مرتا کیا نہ کرتا، پر کہوں گا نہیں۔''

''کہہ ہی نہیں سکتے۔''

''ہاں بھیا میں نہیں کہہ سکتا، ہنسی کر رہا تھا۔''

ایک لمحے تک وہ دبدھے میں پڑا رہا۔ پھر بولا۔ ''تم مجھ سے اتنا بیر کیوں پال رہے ہو، بھولا بھائی؟ جھنیا میرے گھر میں آ گئی تو مجھے کون سا بیکنٹھ مل گیا؟ لڑکا الگ ہاتھ سے گیا، دو سو روپیہ ڈانڈ الگ سے بھرنا پڑا، میں تو کہیں کا نہ رہا اور اب تم میری جڑ کھود رہے ہو۔ رام جانتے ہیں، میں بالکل نہ جانتا تھا کہ لونڈا کیا کر رہا

ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ گانا سننے جاتا ہوگا۔ مجھے تو اس دن پتہ چلا جب آدھی رات کو جھنیا گھر میں آ گئی۔ اس بکھت (وقت) میں گھر میں نہ رکھتا تو سوچو، کہاں جاتی۔ کس کی ہو کر رہتی۔''

جھنیا بروٹھے۔ کے دروازے پر چھپ کر کھڑی ہوئی یہ باتیں سن رہی تھی۔ باپ کو اب وہ باپ نہیں، بیری سمجھتی تھی، ڈری کہ کہیں ہوری بیلوں کو دے دیں۔ جا کر روپا سے بولی۔ ''اماں جلدی بلا لا، کہنا کہ بڑا کام ہے۔ دیر نہ کرو۔''

دھنیا کھیت میں گوبر پھینکنے گئی تھی۔ بہو کا سندیسہ سنا تو آ کر بولی۔ ''کاہے کو بلایا ہے۔ بہو! میں تو گھبرا گئی۔''

''کاکا کو تم نے دیکھا ہے نا؟''

''ہاں دیکھا ہے، کسائی (قصائی) کی طرح باہر بیٹھا ہوا ہے۔ میں تو بولی ہی نہیں۔''

''ہمارے دونوں بیل مانگ رہے ہیں دادا سے۔''

دھنیا کے پیٹ کی آنتیں سمٹ گئیں۔ بولی۔ ''دونوں مانگ رہے ہیں۔''

''ہاں کہتے ہیں کہ یا تو ہمارا روپیہ دو یا دونوں بیل کھول لے جائیں گے۔''

''تیرے دادا نے کیا کہا؟''

''انہوں نے کہا تمہارا دھرم کہتا ہو تو کھول لے جاؤ۔''

''تو کھول لے جائے، پر اسی دوارے پر آ کر بھیک نہ مانگیں تو میرے نام پر تھوک دینا۔ ہمارے لہو سے اس کی چھاتی ٹھنڈی ہو تو ٹھنڈی کر لے۔''

وہ اسی طیش میں باہر آ کر ہوری سے بولی۔ ''مہتو دونوں بیل رہے ہیں تو دے

کیوں نہیں دیتے؟ ان کا پیٹ بھرے، ہمارے رام مالک ہیں۔ ہمارے ہاتھ تو نہیں کاٹ لیں گے؟ اب تک اپنی مجوری کرتے تھے۔ اب دوسرے کی مجوری کریں گے۔ بھگوان کی مرجی (مرضی) ہوگی تو پھر بیل بدھیا ہو جائیں گے اور مجوری ہی کرتے رہے تو کون بنرائی ہے؟ سوکھا پالا اور رلگان کا بوجھ تو نہ رہے گا۔ میں نہ جانتی تھی کہ یہ ہمارے بیری ہیں، نہیں تو گائے لے کر اپنے سر پر بلا کیوں باندھتی۔ اس نگوڑی کا تورا (قدم رکھنا) جس دن سے آیا گھر تہس نہس ہو گیا۔''

بھولا نے اب تک جس ہتھیار کو چھپا رکھا تھا، اب اسے نکالنے کا وقت آ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ بیلوں کے سوا ان سب کے پاس اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ بیلوں کو بچانے کے لیے یہ لوگ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ اچھے نشانے باز کی طرح دل کو ٹھہرا کر بولا۔ ''اگر تم چاہتے ہو کہ ہماری بے اجتی (بے عزتی) ہو اور تم چین سے بیٹھو تو یہ نہ ہوگا۔ تم اپنے سو دسو کو روتے ہو اور یہاں لاکھ روپے کی آبرو بگڑ گئی۔ تمہاری کسل اسی میں ہے کہ جیسے جھنیا کو گھر میں رکھا تھا، ویسے ہی ایس گھر سے نکال دو۔ پھر نہ تو ہم بیل مانگیں گے اور نہ گائے کہ دام لیں گے۔ اس نے ہماری ناک کٹوائی ہے تو میں بھی اسے ٹھوکریں کھاتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہاں رانی بنی بیٹھی ہے اور ہم منہ میں کالکھ پوتے اس کے نام کو روتے ہیں۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا۔ وہ میری بیٹی ہے، میں نے اسے گود میں کھلایا اور بھگوان ساکھی (گواہ) ہیں کہ میں نے اسے کبھی بیٹوں سے کم نہیں سمجھا، پر آج اسے بھیک مانگتے اور گھورے پر دانے چنتے دیکھ کر میری چھاتی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ جب باپ ہو کر میں نے اپنا دل اتنا کٹھور (سخت) بنا لیا ہے، تب سوچو کہ میرے دل پر کتنی بڑی

چوٹ پڑی ہوگی؟ اس منہ جلی نے سات پیڑھی کا نام ڈبا دیا اور تم اسے گھر میں رکھے ہوئے ہو۔ یہ میری چھاتی پر مونگ دلنا نہیں تو اور کیا ہے؟

دھنیا نے جیسے پتھر کی لکیر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''تو مہتو! میری بھی سن لو! جو بات تم چاہتے ہو وہ نہ ہوگی، سو جنم نہ ہوگی۔ جھنیا ہماری جان کے ساتھ ہے۔ تم بیل ہی تو لے جانے کو سمجھتے ہو، سو لے جاؤ۔ اگر اس سے تمہاری کٹی ہوئی ناک جڑتی ہو تو جوڑ لو، پرکھوں کی آبرو بچتی ہو تو بچا لو۔ جھنیا سے برائی جرور (ضرور) ہوئی۔ جس دن اس نے میرے گھر میں پاؤں رکھا، میں جھاڑو لے کر مارنے اٹھی تھی مگر جب اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو گرنے لگے تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ تم اب بوڑھے ہو گئے ہو تو مہتو پر آج بھی تمہیں بیاہ کی دھن سوار ہے، پھر وہ تو ابھی بچہ ہے۔''

بھولا نے اپیل بھری آنکھوں سے ہوری کو دیکھا۔ ''سنتے ہو ہوری اس کی بات! اب میرا دوش (قصور) نہیں میں بنا بیل لیے نہ جاؤں گا۔''

ہوری نے استقلال سے کہا۔ ''لے جاؤ۔''

''پھر رونا مت کہ میرے بیل کھول لیے گئے۔''

''نہیں روؤں گا۔''

بھولا بیلوں کی رسیاں کھول ہی رہا تھا کہ جھنیا پیوند دار ساڑھی پہنے اور بچے کو گود میں لیے نکل کر باہر آ گئی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کا کالو میں اس گھر سے نکل جاتی ہوں اور جیسا تم چاہتے ہو اسی طرح بھیک مانگ کر اپنا اور بچے کا پیٹ پالوں گی اور جب بھیک بھی نہ ملے گی تو کہیں ڈوب مروں گی۔''

جھنیا نے اس کی طرف تاکا تک نہیں، اس میں غصہ تھا جو خود کو نگل جانا چاہتا

ہے، جس میں اہنسا (تشدد) نہیں، بلیدان (قربانی) ہے۔ دھرتی اس وقت منہ کھول کر اسے نگل لیتی تو وہ اپنے آپ کو کتنا دھنیا مانتی، اس نے آگے قدم بڑھایا۔

مگر وہ دو قدم بھی نہ گئی تھی کہ دھنیا نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور سختی بھری محبت سے بولی۔ ''تو کہاں جاتی ہے بہو؟ چل گھر میں! یہ تیرا گھر ہے، ہمارے جیتے بھی اور ہمارے مرنے پر بھی۔ ڈوب مرے وہ جسے اپنی اولاد سے بیر ہو! اس بھلے آدمی کو منہ سے ایسی بات نکالتے لاج بھی نہیں آتی۔ مجھ پر دھونس جماتا ہے۔ نیچ! لے جا بیلوں کا رکت (خون پی.....''

جھنیا روتی ہوئی بولی۔ ''ماں جب اپنا باپ ہو کر مجھے دھتکار رہا ہے تو مجھے ڈوب ہی مرنے دو۔ مجھ ابھاگن کے کارن تو تمہیں دکھ ہی ملا۔ جب سے آئی، تمہارا گھر مٹی میں مل گیا۔ تم نے اتنے دن مجھے پریم سے رکھا، ماں بھی نہ رکھتی، بھگوان مجھے پھر جنم دیں تو تمہاری کوکھ (بطن) سے دیں۔ یہی میری اچھا ہے۔''

دھنیا اسے اپنی طرف کھینچتی ہوئی بولی۔ ''وہ تیرا باپ نہیں ہے، تیرا بیری ہے، ہتیارا۔ ماں ہوتی تو اسے درد ہوتا۔ کرسگائی مہریا جوتوں سے نہ پیٹے تو پھر کہنا!''

جھنیا ساس کے پیچھے پیچھے گھر میں چلی گئی۔ ادھر بھولا نے جا کر دونوں بیلوں کو کھونٹوں سے کھولا اور ہانپتا ہوا گھر چلا جیسے کسی نیوتے میں آ کر پوریوں کے عوض جوتے پڑے ہوں۔ ''اب کرو کھیتی اور بجاؤ بنسی، میری بے اجتی (بے عزتی) کرنا چاہتے ہیں، سب نہ جانے کب کی عداوت نکال رہے ہیں، نہیں تو ایسی لڑکی کو کون بھلا آدمی اپنے گھر میں رکھے گا؟ سب کے سب بے سرم ہو گئے ہیں، لونڈے کا کہیں بیاہ نہ ہوتا تھا اسی سے اور اس رانڈ جھنیا کی ڈھٹائی دیکھو کہ آ کر میرے آگے

کھڑی ہوگئی۔ دوسری لڑکی ہوتی تو منہ نہ دکھاتی۔ آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔ سب کے سب دشت اور مورکھ بھی ہیں۔ سمجھتے ہیں جھنیا اب ہماری ہوگئی۔ یہ نہیں جانتے کہ جو اپنے باپ کے گھر نہ رہی، وہ کسی کے گھر نہ رہے گی۔ بکھت (وقت) برا ہے، نہیں تو بیچ بجار (بازار) میں اس چڑیل دھنیا کے جھونٹے پکڑ کر گھسیٹا، مجھے کتنی گالیاں دیتی تھی۔''

پر اس نے دونوں بیلوں کو دیکھا۔ ''کتنے تیار ہیں۔ اچھی جوڑ ہے۔ جہاں چاہوں سو روپے میں بیچ سکتا ہوں۔ میرے اسی روپے کھرے ہو جائیں گے۔ ''ابھی وہ گاؤں کے باہر بھی نہ نکلا تھا پیچھے داتا دین، پٹیشوری، سوبھا اور دس بیس آدمی اور دوڑے آتے دکھائی دیئے۔ بھولا کا لہو سرد ہوگیا۔ اب فوجداری ہوئی۔ بیل بھی چھن جائیں گے، مار بھی پڑے گی۔ وہ رک گیا۔ کمر کس کر، مرنا ہے تو لڑ کر مرے گا۔

داتا دین نے پاس جا کر کہا۔ ''یہ تم نے انرتھ کیا بھولا؟ ایں، اس کے بیل کھول لائے اور وہ کچھ بولا نہیں۔ اسی سے سیر ہو گئے۔ سب لوگ اپنے اپنے کام میں لگے تھے کسی کو کھبر (خبر) بھی نہ ہوئی۔ ہوری نے تنک کرا سارہ کیا ہوتا تو تمہارا ایک ایک بال نچ جاتا۔ بھلا چاہتے ہو تو لے چلو بیل! کچھ بھی بھلمنسی نہیں ہے تم میں۔''

پٹیشوری بولے۔ ''یہ اس کے سیدھے پن کا پھل ہے۔ تمہارے روپے اس پر آتے ہیں تو جا کر دیوانی میں دعویٰ کرو اور ڈگری کراؤ۔ بیل کھول لانے کا تمہیں کیا اکھتیار (اختیار) ہے۔ ابھی پھوجداری (فوجداری) میں دعویٰ کر دے تو بندھے

بندھے پھرو۔''

بھولا نے دب کر کہا۔ ''تو لا صاحب ہم کچھ جبر دستی (زبردستی) تھوڑے ہی کھول لائے، ہوری نے آپ دیئے۔''

پٹیشوری نے سوبھا سے کہا۔ ''تم بیلوں کو لوٹا دو! کسان اپنے بیل کھسی (خوشی) سے دے دے گا تو ہل میں ان کو جوتے گا۔''

بھولا بیلوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''ہمارے روپے دلوا دو۔ ہمیں بیلوں کو لے کر کیا کرنا ہے؟''

''ہم بیل لیے جاتے ہیں۔ اپنے روپے کے لیے دعویٰ کرو اور نہیں تو مار کر گرا دیئے جاؤ گے۔ روپے دیئے تھے نگد (نقد) تم نے؟ ایک منحوس گائے بیچارے کے سر منڈھ دی اور اب اس کے بیل کھولے لیے جاتے ہو۔''

بھولا بیلوں کے سامنے سے نہ ہٹا۔ کھڑا رہا گم صم اور مضبوطی سے جما ہوا، جیسے مر کر ہی ہٹے گا۔ پٹواری سے حجت کر کے وہ کیسے پیش پاتا؟

داتا دین نے ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی جھکی کمر کو سیدھا کر کے للکارا۔ ''تم سب کھڑے تاکتے کیا ہو؟ مار کے بھگا دو اس کو! ہمارے گاؤں سے بیل کھول لے جائے گا؟''

بنسی طاقتور جوان تھا۔ اس نے بھولا کو زور سے دھکا دیا۔ بھولا سنبھل نہ سکا، گر پڑا، اٹھنا چاہتا تھا کہ بنسی نے پھر ایک گھونسہ جما دیا۔

ہوری دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ بھولا نے اس کی طرف قدم بڑھا کر پوچھا۔ ''ایمان سے کہنا ہوری مہتو! میں نے بیل جبر دستی کھول لیے؟؟ داتا دین نے اس کا مطلب

یوں نکالا یہ کہتے ہیں کہ ہوری نے اپنی کھسی (خوشی) سے بیل مجھے دیئے۔ ہمیں الو بناتے ہیں۔''

ہوری نے لجاتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھ سے کہنے لگے کہ یا تو جھنیا کو گھر سے نکال دو یا میرے روپے دے دو، نہیں میں بیل کھول لے جاؤں گا۔ میں نے کہا میں بہو کو تو نہ نکالوں گا اور میرے پاس روپے نہیں مگر تمہارا دھرم کہے تو بیل کھول لو۔ بس میں نے ان کے دھرم پر چھوڑ دیا اور انہوں نے بیل کھول لیے۔''

پٹیشوری نے اداس ہو کر کہا۔ ''جب تم نے دھرم پر چھوڑ دیا تب کاہے کی جبر دستی؟ اس کے دھرم نے کہا تو لیے جاتا ہے۔ لے جاؤ بھیا بیل تمہارے ہیں۔''

داتا دین نے تائید کی۔ ''ہاں جب دھرم کی بات آ گئی تو کوئی کیا کہے۔''

سب کے سب ہوری کو حقارے سے دیکھتے ہوئے ہار کر لوٹ پڑے اور گتھ مند بھولا شان سے گردن اٹھائے ہوئے بیلوں کو لے چلا۔

(15)

مالتی ظاہر میں تتلی ہے مگر باطن میں شہد کی مکھی۔ اس کی زندگی میں ہنسی ہی ہنسی نہیں ہے۔ صرف گڑ کھا کر کون جی سکتا ہے؟ اور جیئے بھی تو وہ کوئی سکھ کی زندگی نہ ہوگی۔ وہ ہنستی ہے اس لیے کہ اسے کی بھی قیمت ملتی ہے۔ اس کا چہکنا اور چمکنا اس لیے نہیں ہے کہ وہ چہکنے اور چمکنے ہی کو زندگی سمجھتی ہے یا اس نے اپنے آپ کو اپنی آنکھوں میں اتنا بڑا بنا لیا ہے کہ وہ جو کچھ کرے، اپنے ہی لیے کرے۔ نہیں، وہ اس

لیے چہکتی ہے اور مذاق کرتی ہے کہ اس کے فرض کا بار کسی قدر ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کے باپ ان عجیب آدمیوں میں تھے جو صرف زبان کی مدد سے لاکھوں کے وارے نیارے کرتے تھے۔ بڑے بڑے زمینداروں اور رئیسوں کی جائیدادیں فروخت کرانا، انہیں قرض دلانا یا ان کے معاملوں کو افسروں سے مل کر طے کرا دینا، یہی ان کا کاروبار تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ لال تھے۔ اس طبقے کے لوگ بڑے طباع ہوتے ہیں۔ جس کام سے کچھ ملنے کی امید ہو، اسے اٹھا لیں گے اور کسی نہ کسی طرح اسے پورا بھی کر دیں گے۔ کسی رئیسہ کی شادی کسی راجکماری سے کرا دی اور دس بیس ہزار مار لیے۔ یہی دلال جب چھوٹے چھوٹے سودے کرتے ہیں تو ''ناؤٹ'' کہے جاتے ہیں اور ہم ان سے نفرت کرتے ہیں۔ بڑے بڑے کام کر کے وہی ٹاؤٹ راجاؤں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے اور گورنروں کی میز پر چائے پیتا ہے۔ مسٹر کول ان ہی خوش نصیبوں میں تھے۔ ان کے تین لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ تینوں کو انگلستان بھیج کر تعلیم کی چوٹی تک پہنچا دیں اور بہت سے بڑے آدمیوں کی طرح ان کا بھی خیال تھا کہ وہاں تعلیم پا کر آدمی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ شاید وہاں کی آب و ہوا میں ذہن کو تیز کر دینے کی کوئی طاقت ہے مگر ان کی یہ خواہش ایک تہائی سے زیادہ پوری نہ ہوئی۔ مالتی انگلستان ہی میں تھی کہ ان پر فالج گرا جو انہیں نکما بنا گیا۔ اب بڑی مشکل سے دو آدمیوں کے سہارے اٹھتے تھے۔ زبان تو بالکل بند ہو گئی تھی اور جب زبان ہی بند ہو گئی تو آمدنی بھی بند ہوئی۔ جو کچھ تھی، زبان ہی کی کمائی تھی۔ کچھ بچا رکھنے کی عادت نہ تھی۔ غیر مقررہ آمدنی تھی اور ویسا ہی خرچ تھا۔ پس ادھر کئی سال سے بہت تنگ حال

ہو رہے تھے۔ کل ذمہ داری مالتی پر آ پڑی تھی۔ مالتی کے چار پانچ سو روپوں میں وہ ٹھاٹ باٹ تو کیا نبھتا، ہاں اتنا تھا کہ دونوں لڑکیوں کی تعلیم ہوتی جاتی تھی اور بھلے مانسوں کی طرح زندگی بسر ہو رہی تھی۔ مالتی صبح سے دوپہر تک دوڑتی رہتی تھی۔ چاہتی تھی کہ والد پرہیز سے رہیں، مگر والد صاحب کو کباب و شراب کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ کسی طرح گلا نہ چھوٹتا تھا۔ کہیں سے کچھ نہ ملتا تو ایک مہاجن سے اپنے بنگلے پر پرونوٹ لکھ کر ہزار دو ہزار لے لیتے تھے۔ مہاجن ان کا پرانا دوست تھا جس نے ان کی بدولت لین دین میں لاکھوں پیدا کیے تھے اور مروت کی وجہ سے کچھ بولتا نہ تھا۔ اس کے پچیس ہزار ہو چکے تھے اور جب چاہتا قرقی کرا سکتا تھا۔ مگر دوستی کی لاج نبھاتا جاتا تھا۔ خود پرستوں میں جو بے غیرتی آ جاتی ہے، وہ مسٹر کول میں بھی تھی۔ تقاضے ہوا کریں انہیں پروا نہ تھی۔ مالتی ان کی فضول خرچی پر جھنجلاتی رہتی تھی مگر ان کی ماں جو مجسم دیوی تھی اور اس زمانے میں بھی شوہر کی خدمت کرنا نسوانی زندگی کا خاص مقصد سمجھتی تھی، اسے سمجھا دیتی تھی۔ اس لیے خانہ جنگی کی نوبت نہ آنے پاتی تھی۔

شام ہو گئی تھی۔ ہوا میں ابھی تک گرمی تھی۔ آسمان پر دھند پر چھایا ہوا تھا۔ مالتی اور اس کی دونوں بہنیں بنگلے کے سامنے گھاس پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ پانی نے پانے کے سبب وہاں کی دوب جل گئی تھی اور اندر کی مٹی باہر نکل آئی تھی۔ مالتی نے پوچھا۔ ''مالی کیا بالکل پانی نہیں دیتا؟''

منجھلی بہن سروج نے کہا۔ ''پڑا پڑا سویا کرتا ہے سور، جب کہو تو بیس بہانے بنانے لگتا ہے۔''

سروج بی اے میں پڑھتی تھی۔ دبلی، لمبی، زرد، خشک اور تلخ مزاج، اسے کسی کی کوئی بات پسند نہ آتی تھی۔ ہمیشہ عیب نکالتی رہتی تھی۔ ڈاکٹروں کی صلاح تھی کہ وہ کوئی محنت کا کام نہ کرے اور پہاڑ پر رہے، مگر گھر کی حالت ایسی نہ تھی کہ اسے پہاڑ پر بھیجا جا سکتا۔

سب سے چھوٹی وردا کو سروج سے اس لیے مغائرت تھی کہ سارا گھر سروج کو ہاتھوں ہاتھ لیے رہتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جس بیماری میں اتنا آرام ہے، وہ اسے ہی کیوں نہیں ہو جاتی تھی۔ گوری سی مغرور، تندرست اور شوخ آنکھوں والی لڑکی تھی۔ چہرے پر فہم و فراست کی جھلک تھی۔ سروج کے سوا اسے کل دنیا سے ہمدردی تھی۔ سروج کی بات کی مخالفت کرنا اس کا جذبہ تھا۔ بولی۔ ''دن بھر دادا جی بازار بھیجتے رہتے ہیں، فرصت ہی کہاں پاتا ہے؟ مرنے کی فرصت ملتی نہیں، پڑا پڑا سوئے گا؟''

سروج نے ڈانٹا۔ ''دادا جی اسے کب بازار بھیجتے ہیں ری؟ جھوٹی کہیں کی!''

''روز بھیجتے ہیں روز۔ ابھی تو آج ہی بھیجا تھا۔ کہو تو بلوا کر پچھوا دوں؟''

''پچھوائے گی بلواؤں؟''

مالتی ڈری۔ دونوں گتھ جائیں گی تو بیٹھنا مشکل کر دیں گی۔ بات بدل کر بولی۔ ''اچھا خیر، ہوگا۔ آج ڈاکٹر مہتا کی تمہارے یہاں تقریر ہوئی تھی ہسروج۔''

سروج نے ناک سکیڑ کر کہا ''ہاں ہوئی تو تھی مگر کسی نے پسند نہیں کی۔ آپ فرمانے لگے کہ دنیا میں عورتوں کا دائرہ مردوں سے بالکل الگ ہے اور عورتوں کا مردوں کے دائرے میں آنا اس جگ کا ایک کلنک ہے۔ سب لڑکیوں نے تالیاں

اور سیٹیاں بجانی شروع کیں۔ بچارے شرمندہ ہو کر بیٹھ رہے۔ کچھ عجیب سے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ پریم صرف شاعروں کا تصور ہے، ٹھوس زندگی میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔ لیڈی ہکو نے ان کا خوب مضحکہ اڑایا۔''

مالتی نے اعتراض کیا۔ ''لیڈی ہکو نے؟ اس بارے میں وہ بھی کچھ بولنے کی ہمت رکھتی ہیں! تمہیں ڈاکٹر صاحب کا لیکچر شروع سے آخر تک سننا چاہیے تھا۔ انہوں نے دل میں لڑکیوں کو کیا سمجھا ہوگا۔''

''پورا لیکچر سننے کی برداشت کسے تھی؟ وہ تو جیسے زخم پر نمک چھڑک رہے تھے؟''

''تو پھر انہیں بلایا ہی کیوں تھا؟ آخر انہیں عورتوں سے کوئی بیر تو ہے نہیں۔ جس بات کو ہم سچ سمجھتے ہیں وہی تو وہ بھی کہتے ہیں۔ عورتوں کو خوش کرنے کے لیے وہ ان کی سی کہنے والوں میں نہیں ہیں اور پھر ابھی یہ کون جانتا ہے کہ عورتیں جس راستے پر چلنا چاہتی ہیں، وہی ٹھیک ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر اپنی رائے بدلنی پڑے۔''

اس نے فرانس اور جرمنی وائٹلی کی عورتوں کی زندگی کا معیار بتلایا اور کہا۔ ''کہ جلدی ویمن لیگ (مجلس نسواں) کی طرف سے مہتا کا لیکچر ہونے والا ہے۔''

سروج کو تعجب ہوا۔ بولی۔ ''مگر آپ بھی تو کہتی ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی ہونے چاہئیں۔''

''اب بھی کہتی ہوں لیکن مخالف پارٹی والے کیا کہتے ہیں، یہ بھی تو سننا

چاہیے۔ ممکن ہے کہ ہم ہی غلطی پر ہوں۔'' یہ لیگ اس شہر کی نئی انجمن ہے اور مالتی کی کوشش سے قائم ہوئی ہے۔ شہر کی سب ہی تعلیم یافتہ خواتین اس میں شریک ہیں۔ مہتا کی اول تقریر نے عورتوں میں بڑی ہلچل مچادی تھی اور لیگ نے طے کیا تھا کہ انہیں خوب دندان شکن جواب دیا جائے۔ مالتی ہی پر یہ بار ڈالا گیا تھا۔ مالتی کئی روز تک اپنی بات کی حمایت میں دلائل اور ثبوت کی تلاش کرتی رہی اور بھی کئی عورتیں اپنی تقریریں لکھ رہی تھیں۔ اس دن جب مہتا شام کو لیگ کے ہال میں پہنچے تو معلوم ہوتا تھا کہ ہال پھٹ جائے گا۔ انہیں فخر ہوا کہ ان کی تقریر سننے کے لیے اتنا شوق! اور وہ شوق صرف چہرے پر اور آنکھوں میں نہ تھا۔ آج سبھی عورتیں سونے اور ریشم سے لدی ہوئی تھیں، گویا کسی بارات میں آئی ہوئی ہوں۔ مہتا کو مغلوب کرنے کے لیے پوری طاقت سے کام لیا گیا تھا اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ جگمگاہٹ طاقت کا جزو نہیں ہے؟ مالتی نے تو آج کے لیے نئے فیشن کی ساڑھی نکالی تھی، نئی کاٹ کے جمپر بنوائے تھے اور رنگ روغن اور پھولوں سے خوب سجی ہوئی تھی، جیسے اس کا بیاہ ہو رہا ہو۔ لیگ میں اتنی دھوم دھام اور کبھی نہ ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مہتا تنہا تھے، پھر بھی دیویوں کے دل کانپ رہے تھے۔ سچائی کی ایک چنگاری جھوٹ کے ایک پہاڑ کو جلا کر خاک کر سکتی ہے۔

سب سے پیچھے کی صف میں مرزا، کھنا اور ایڈیٹر صاحب بھی موجود تھے۔ رائے صاحب لیکچر شروع ہونے کے بعد اور پیچھے کھڑے ہو گئے۔

مرزا نے کہا۔ ''آ جائیے آپ بھی، کھڑے کب تک رہئے گا؟''

رائے صاحب بولے۔ ''نہیں بھئی وہاں میرا دم گھٹنے لگے گا۔''

''تو میں کھڑا ہوتا ہوں، آپ بیٹھئے۔''

رائے صاحب نے ان کے کندھے دبائے۔ ''تکلف کی ضرورت نہیں، بیٹھے رہئے۔ میں تھک جاؤں گا تو آپ کو اٹھا دوں گا اور میں بیٹھ جاؤں گا۔ اچھا مس مالتی جلسے کی صدر ہوئی ہیں۔ کھنا صاحب کچھ انعام دلوایئے۔''

کھنا نے روتی صورت بنا کر کہا۔ ''اب مسٹر مہتا پر نگاہ ہے، میں تو گر گیا۔''

مہتا کی تقریر شروع ہوئی ''دیویو! جب میں اس طرف آپ کو مخاطب کرتا ہوں تو آپ کو کوئی بات کھٹکتی نہیں۔ آپ اس عزت کو اپنا حق سمجھتی ہیں، مگر کیا آپ نے کسی عورت کو مردوں کے لیے دیوتا استعمال کرتے سنا؟ اسے آپ دیوتا کہیں تو وہ سمجھے گا کہ آپ اسے بنا رہی ہیں۔ آپ کے پاس دان کے لیے کیا ہے، بھگتی اور تیاگ ہے۔ مرد کے پاس دان کے لیے کیا ہے؟ وہ دیوتا نہیں۔ لیوتا ہے۔ وہ حقوق کے لیے لڑا کرتا ہے، لڑتا ہے اور فتنہ فساد اٹھاتا رہتا ہے۔'' تالیاں بجیں، رائے صاحب نے کہا:

''عورتوں کو خوش کرنے کا اس نے کتنا اچھا ڈھنگ نکالا ہے۔''

'بجلی' کے ایڈیٹر کو برا لگا۔ ''کوئی نئی بات نہیں، میں کتنی ہی بار یہی کہہ چکا ہوں۔''

مہتا آگے بڑھے ''اس لیے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہماری ترقی یافتہ دیویاں بھگتی اور تیاگ کی زندگی سے اکتا کر لڑائی فساد اور اہنسا کی زندگی کی طرف دوڑی رہی ہیں اور سمجھ رہی ہیں کہ اسی میں سکھ ہے تو میں انہیں مبارکباد نہیں دے سکتا۔''

مسز کھنا نے مالتی کی طرف غرور سے دیکھا۔ مالتی نے گردن جھکا لی۔

خورشید بولے۔ ''اب کہیے، مہتا دلیر آدمی ہے۔ سچ بات کہتا ہے اور منہ پر۔''

'بجلی' کے ایڈیٹر نے ناک سکیڑی۔ ''اب وہ دن لد گئے جب دیویاں ان چکموں میں آجاتی تھیں۔ ان کے حقوق ہضم کرتے جاؤ اور کہتے جاؤ کہ آپ دیوی ہیں، ماتا ہیں، لچھمی ہیں۔''

مہتا آگے بڑھے۔ ''عورت کو مرد کے بھیس میں مردانہ کاموں میں مشغول دیکھ کر مجھے اسی طرح دکھ ہوتا ہے جیسے مرد کو عورت کے روپ میں زنانہ کام کرتے ہوئے دیکھ کر۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے مردوں کو آپ اپنی محبت اور عقیدت کا مستحق نہیں سمجھتیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسی عورتیں بھی مرد کی عقیدت و محبت کی مستحق نہیں بن سکتیں۔''

کھنا کے چہرے پر دل کی خوشی چمک اٹھی۔

رائے صاحب نے چٹکی لی۔ ''آپ بہت خوش ہیں کھنا جی!''

کھنا بولے۔ ''مس مالتی ملے تو پوچھوں کہ اب کہیے۔''

مہتا آگے بڑھے۔ میں انسانی ارتقاء میں عورت کے درجے کو مرد کے درجے سے بہتر سمجھتا ہوں، اسی طرح جیسے پریم، تیاگ اور بھگتی کو اہنسا اور شر و فساد سے بہتر سمجھتا ہوں اگر ہماری دیویاں پیدائش اور پرورش کے پاک مبدر کو چھوڑ کر اہنسا اور لڑائی کے خوں ریز میدان میں آنا چاہتی ہیں تو ان سے سماج کا بھلا نہ ہوگا۔ میں اس بارے میں مستقل ہوں۔ مرد نے اپنے گھمنڈ میں اپنی شیطانی شہرت کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ وہ اپنے بھائی کا حق چھین کر اور اس کا خون بہا کر سمجھنے لگا کہ اس نے بہت بڑی فتح پائی۔ جن بچوں کو دیویوں نے اپنے خون سے پیدا کیا اور پالا

نہیں بموں اور مشین گنوں اور ٹینکوں کا شکار بنا کر وہ خود کو فاتح سمجھتا ہے اور جب ہما ری ہی مائیں ان کی پیشانی پر زعفرانی ٹیکا لگا کر اور انہیں اپنی دعاؤں کی ذرہ پہنا کر خونی میدان میں بھیجتی ہیں تو کیا عجب کہ مرد نے خونریزی کو دنیوی فلاح کی چیز سمجھا اور اس کی خونی رغبت اور بروز بڑھتی گئی اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ شیطا نیت زور پکڑ کر کل دنیا کو روندتی، جانداروں کو کچلتی، ہری بھری کھیتیوں کو جلاتی اور آباد بستیوں کو اجاڑتی چلی جاتی چلی جاتی ہے۔ دیویو! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اس شیطانیت میں مدد دے کر اس میدان جنگ میں کود کر دنیا کی بھلا ئی کریں گی؟ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ تباہ کاروں کو اپنا کام کرنے دیجیے اور آپ اپنے دھرم پر نگاہ رکھیے۔

کھنا بولے۔ ''مالتی کی گردن ہی نہیں اٹھتی۔''

رائے صاحب نے ان خیالات کی تائید کی۔ ''مہتا کہتے تو ٹھیک ہی ہیں۔''

'بجلی' کے ایڈیٹر بگڑے۔ مگر کوئی نئی بات تو نہیں کہی۔ تحریک نسواں کے مخالفین ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتوں کا سہارا لیا کرتے ہیں۔ میں یہ مانتا ہی نہیں کہ تیاگ اور پریم سے دنیا نے ترقی کی۔ دنیا نے ترقی کی۔ دنیا نے ترقی کی ہے جواں مردی سے، محنت سے، عقل سے اور دبدبہ سے!

خورشید نے کہا۔ ''اچھا! سننے دیجیے گا یا اپنی ہی گائے جائیے گا؟''

مہتا کی تقریر جاری تھی۔ دیویو! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کہتے ہیں کہ عورت اور مرد میں مساوی طاقت و رغبت ہے اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس سے زیادہ بھیانک جھوٹ کا میں خیال ہی نہیں کر سکتا۔ یہ وہ جھوٹ ہے جو

پشت ہا پشت کے حاصل کیے ہوئے تجربے کو اسی طرح ڈھک لینا چاہتا ہے جیسے بادل کا ایک ٹکڑا سورج کو ڈھک لیتا ہے۔ میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ آپ اس جال میں نہ پھنسیں، عورت مرد سے اتنی ہی برتر ہے جتنی روشنی تاریکی سے۔ انسان کے لیے چھما، دیا، تیاگ اور اہنسا زندگی کے اعلیٰ ترین معیار ہیں۔ عورت اس معیار پر پہنچ چکی ہے۔ مرد دھرم اور روحانیت اور رشیوں کا سہارا لے کر اس معیار پر پہنچنے کے لیے صدیوں سے زور لگا رہا ہے مگر اب تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی ساری روحانیت ایک طرف اور عورتوں کا ایثار ایک طرف۔

تالیاں بجیں اور سارا ہال ہل اٹھا، رائے صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ ''مہتا وہی کہتے ہیں، جو ان کے دل میں ہے۔''

اونکار ناتھ نے تنقید کی۔ ''لیکن باتیں سبھی پرانی ہیں، بالکل سڑی ہوئی۔''

''پرانی بات بھی روحانی طاقت کے ساتھ کہی جاتی ہے تو نئی ہو جاتی ہے۔''

''جو ایک ہزار روپے ہر مہینے لے کر عیش و عشرت میں اڑاتا ہو، اس میں روحانیت جیسی شے رہ نہیں سکتی۔ یہ صرف پرانے خیال والی عورتوں اور ویسے ہی مردوں کے خوش کرنے کے ڈھنگ ہیں۔''

کھنا نے مالتی کی طرف دیکھا ''یہ کیوں پھولی جا رہی ہیں؟ انہیں تو شرمانا چاہیے۔''

خورشید نے کھنا کو اکسایا۔ ''اب تم بھی ایک لیکچر دے ڈالو۔ کھنا، ورنہ مہتا تمہیں اکھاڑ پھینکے گا۔ نصف میدان تو اس نے ابھی مار لیا ہے۔''

کھنا کھسیا کر بولے۔ ''میری نہ کہیے، میں نے ایسی کتنی ہی چڑیوں کو پھنسا کر

چھوڑ دیا ہے۔''

رائے صاحب نے خورشید کی طرف آنکھیں مار کر کہا ''آج کل آپ عورتوں کے سماج کی طرف بہت آتے جاتے ہیں، سچ کہنا، کتنا چندہ دیا۔''

کھنا جھینپ گئے۔ ''میں ایسے سماجوں کو چندہ نہیں دیا کرتا جو ہنر بازی کا ڈھونگ کر کے بدکاری پھیلاتے ہیں۔''

مہتا کی تقریر جاری تھی۔ ''مرد کہتا ہے کہ جتنے فلسفے اور سائنس کے موجد ہوئے، وہ سب مرد تھے۔ جتنے بڑے بڑے مہاتما ہوئے، وہ سب مرد تھے۔ سبھی سورما، سبھی سیاسی ماہر، بڑے بڑے جہازراں اور بڑے بڑے سب کچھ مرد ہی تھے، مگر ان بڑوں کی جماعت نے مل کر کیا کیا؟ مہاتماؤں اور مذہبی بانیوں نے دنیا میں خون کی ندیاں بہانے اور نفرت کی آگ بھڑکانے کے سوا اور کیا کیا؟ سورماؤں نے بھائیوں کی گردن کاٹنے کے سوا اور کیا یادگار چھوڑی؟ سیاسی ماہروں کے نشانات اب صرف مٹی ہوئی سلطنتوں کے کھنڈر رہ گئے ہیں اور موجدوں نے انسان کو مشین کا غلام بنا دینے کے سوا اور کون سا مسئلہ حل کر دیا؟ مزدوروں کے بنائے تمدن میں سکون کہاں ہے، تعاون کہاں ہے؟''

اونکار ناتھ اٹھ کر جانے کو تیار ہوئے۔ ''رئیسوں کے منہ سے بڑی بڑی باتیں سن کر بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔''

خورشید نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔ ''آپ بھی ایڈیٹر صاحب پورے پونگا ہی رہے۔ اجی یہ دنیا ہے جس کے جی میں جو آتا ہے بکتا ہے۔ کچھ لوگ سنتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ چلیے قصہ ختم، ایسے ایسے بے شمار مہتا آئیں گے اور چلے

جائیں گے اور دنیا اپنی چال چلتی رہے گی۔ یہاں بگڑنے کی کون سی بات ہے؟''

''جھوٹ سن کر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔''

رائے صاحب نے بڑھاوا دیا۔ ''فاحشہ کے منہ سے ستیوں کی سی بات سن کر کس کا جی نہ جلے گا؟''

اونکار ناتھ پھر بیٹھ گئے۔ مہتا کی تقریر جاری تھی۔ ''میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا باز کو چڑیوں کا شکار کرتے دیکھ کر ہنس کو یہ زیب دے گا کہ وہ مانسروور کی پر سکون فضا کو چھوڑ کر چڑیوں کا شکار کرنے لگے؟ اور اگر وہ شکاری بن جائے تو کیا آپ اسے مبارکباد دیں گی؟ ہنس کے پاس اتنی تیز چونچ نہیں ہے، اتنے تیز چنگل نہیں ہیں، اتنی تیز آنکھیں نہیں ہیں، اتنے تیز پر نہیں ہیں اور اتنی تیز خون کی پیاس نہیں ہے۔ ان آلات کو اکٹھا کرنے میں صدیاں لگ جائیں گی، پھر بھی وہ باز نہ بن سکے گا یا نہیں۔ اس میں شک ہے۔ مگر باز بنے یا نہ بنے، وہ ہنس نہ رہ جائے گا۔ وہ ہنس جو موتی چگتا ہے!''

خورشید نے تنقید کی ''یہ تو شاعروں کی سی دلیلیں ہیں۔ مادہ باز بھی اسی طرح شکار کرتی ہے جیسے نر باز۔''

اونکار ناتھ خوش ہو گئے۔ ''اس پر آپ فلاسفر بنتے ہیں، ایسی ہی دلیلوں کے بل بوتے پر!'' کھنا نے دل کا غبار نکالا۔ ''فلاسفر نہیں، فلاسفر کی دم ہیں۔ فلاسفر وہ جو.....''

اونکار ناتھ نے بات پوری کی۔ ''جو سچائی سے جو بھر بھی نہ ڈرے۔''

کھنا کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ''میں سچائی جھٹائی نہیں جانتا، میں تو فلاسفر اسے کہتا

ہوں جو سچا فلاسفر ہو۔''

خورشید نے داد دی۔ ''فلاسفر کی آپ نے کتنی سچی تعریف کی ہے۔ واہ! سبحان اللہ! فلاسفر وہ ہے جو سچا فلاسفر ہو! کیوں نہ ہو۔''

مہتا آگے بڑھے۔ ''میں نہیں کہتا کہ عورتوں کو علم کی ضرورت نہیں ہے اور مردوں سے زیادہ۔ میں نہیں کہتا، عورتوں کو طاقت کی ضرورت نہیں ہے اور مردوں سے زیادہ، لیکن وہ علم نہیں اور وہ طاقت نہیں جس سے مرد نے دنیا کو میدان جنگ بنا ڈالا ہے۔ اگر وہی علم اور وہی طاقت آپ بھی لے لیں تو دنیا ریگستان بن جائے گی۔ آپ کا علم اور آپ کا اقتدار تشدد اور بربادی میں نہیں، پیدائش اور پرورش میں ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ووٹوں سے انسان کی نجات ہوگی یا دفتروں اور عدالتوں میں زبان اور قلم چلانے سے ان کا ادھار ہو جائے گا؟ ان نقلی، غیر قدرتی اور تباہ کن حقوق کے لیے آپ ان حقوق کو چھوڑ دینا چاہتی ہیں جو آپ کو قدرت نے عطا کیے ہیں؟''

سروج اب تک بڑی بہن کے ادب سے ضبط کیے بیٹھی تھی۔ اب نہ رہا گیا۔ پکار اٹھی۔ ''ہمیں ووٹ چاہیے مردوں کے برابر۔''

اور کئی نوعمر عورتوں نے نعرے لگائے۔ ''ووٹ! ووٹ!''

اونکار ناتھ نے کھڑے ہو کر زور سے کہا۔ ''نسوانی طبقے میں مخالفوں کی پگڑی نیچی ہو۔''

مالتی نے میز پر ہاتھ پٹک کر کہا۔ ''چپ رہو، جو لوگ موافقت یا مخالفت میں کچھ کہنا چاہیں گے، انہیں کافی موقع دیا جائے گا۔''

مہتا بولے۔ ''ووٹ نئے جگ کا جال ہے، فریب ہے، کلنک ہے، دھوکہ ہے۔ اس کے چکر میں پڑ کر آپ نہ ادھر کی ہوں گی نہ ادھر کی۔ کون کہتا ہے کہ آپ کا دائرۂ عمل محدود ہے اور اس میں آپ کو جوہر نمائی کا موقع نہیں ملتا۔ ہم سبھی پہلے انسان ہیں، بعد کو اور کچھ۔ ہماری زندگی ہمارا گھر ہے۔ وہیں ہماری پیدائش ہوتی ہے، وہیں ہماری پرورش ہوتی ہے اور وہیں زندگی کے سارے کاروبار ہوتے ہیں۔ اگر یہ دائرہ محدود ہے تو لامحدود کون سا ہے؟ کیا وہ کشمکش کی جگہ جہاں باقاعدہ چھینا جھپٹی ہے؟ جس کارخانے میں انسان اور اس کا نصیب بنتا ہے، اسے چھوڑ کر آپ ان کارخانوں میں جانا چاہتی ہیں، جہاں انسان پیسا جاتا ہے، جہاں اس کا خون نکالا جاتا ہے۔''

مرزا نے ٹوکا۔ ''مردوں کے ظلم ہی نے تو ان میں بغاوت کی اسپرٹ پیدا کر دی ہے۔''

مہتا بولے۔ ''بیشک مردوں نے یہ ناانصافی کی ہے مگر اس کا یہ جواب نہیں ہے۔ بے انصافی کو مٹائیے لیکن خود کو مٹا کر نہیں۔''

مالتی بولی۔ ''عورتیں اس لیے حقوق چاہتی ہیں کہ ان کا استعمال کریں اور مردوں کو ان کے بے جا استعمال سے باز رکھیں۔''

مہتا نے جواب دیا۔ ''دنیا میں سب سے بڑے حقوق خدمت اور قربانی سے ملتے ہیں اور وہ آپ کو ملے ہوئے ہیں۔ ان حقوق کے سامنے ووٹ کوئی چیز نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ہماری بہنیں مغرب کی بات لے رہی ہیں، جہاں عورتوں نے اپنا مرتبہ کھو دیا ہے اور مالکہ کے درجہ سے گر کر شوق و پسند کی چیز بن گئی ہیں۔ مغرب کی

عورت آزاد ہونا چاہتی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عیش کر سکے۔ ہماری ماؤں کا یہ معیار کبھی نہیں رہا۔ انہوں نے صرف خدمت کے حقوق سے ہمیشہ گرہستی چلائی۔ مغرب میں جو چیزیں عمدہ ہیں، وہ ان سے لیجیے۔ تمدن میں ہمیشہ لین دین ہوتا آیا ہے مگر کورانہ تقلید تو دماغی کمزوری ہی کی علامت ہے۔ مغرب کی عورت آج گھر کی مالکہ نہیں رہنا چاہتی۔ عیش و عشرت کی زبردست خواہش نے اسے بالکل آزاد بنا دیا ہے۔ اس نے اپنی شرم اور بزرگی کو جو اس کی سب سے بڑی پونجی تھی، شوخی اور تفریح پسندی پر قربان کر دیا ہے۔ جب میں وہاں کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو اپنی شکل یا اپنے بھرے ہوئے گول بازوؤں کی یا اپنی عریانی کی نمائش کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ ان کی خواہشوں نے انہیں اتنا مغلوب کر دیا ہے کہ وہ اپنی لاج کا بچاؤ بھی نہیں کر سکتیں۔ عورت کی اس سے زیادہ اور کیا گراوٹ ہو سکتی ہے؟''

رائے صاحب نے تالیاں بجائیں۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جیسے پٹاخوں کی باڑھیں چھوٹ رہی ہوں۔ مرزا صاحب نے ایڈیٹر سے کہا۔ ''اس کا جواب تو آپ کے پاس بھی نہ ہوگا؟''

ایڈیٹر نے بے پروائی سے کہا۔ ''ساری تقریر میں انہوں نے یہی ایک بات سچ کہی ہے۔''

''تب تو آپ بھی مہتا کے مرید ہوئے۔''

''جی نہیں، ہم لوگ کسی کے مرید نہیں ہوتے۔ میں اس کا جواب کھوج نکالوں گا۔ 'بجلی' میں دیکھیے گا۔''

''اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ حق کی تلاشی نہیں کرتے۔صرف اپنی بات کے لیے لڑنا چاہتے ہیں۔''

رائے صاحب نے آڑے ہاتھوں لیا۔''اسی پر آپ کو اپنی پسندی کا غرہ ہے؟''

ایڈیٹر صاحب مستقل رہے۔''وکیل کا کام اپنے منوکل کا بھلا دیکھنا ہے، سچ یا جھوٹ کی جانچ نہیں۔''

''تو یوں کہیے کہ آپ عورتوں کے وکیل ہیں۔''

''میں ان سب ہی لوگوں کا وکیل ہوں جو کمزور ہیں، بے کس ہیں اور مظلوم ہیں۔''

مہتا جی کہہ رہے تھے۔''اور یہ مردوں کی سازش ہے۔عورتوں کو اونچی چوٹی سے گھسیٹ کر اپنے برابر بنانے لیے، ان مردوں کے برابر جو بزدل ہیں، جن میں ازدواجی زندگی کی ذمہ داری سنبھالنے کی قابلیت نہیں ہے، جو آزادانہ نفس پرستی کی لہر میں سانڈوں کی طرح دوسروں کے ہرے بھرے کھیتوں میں منہ مار کر اپنی کمینہ خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں! مغرب میں ان کی سازش کامیاب ہوگئی اور عورتیں تتلیاں بن گئیں۔ مجھے یہ کہتے شرم آتی ہے کہ اس تیاگ اور تپسیا کی سرزمین ہندوستان میں بھی کچھ وہی ہوا بہہ چلی ہے۔خصوصاً ہماری تعلیم یافتہ بہنوں پر وہ جادو بڑی تیزی سے چڑھ رہا ہے۔وہ گرہست عورت کے دھرم کو چھوڑ کر تتلیوں کا رنگ پکڑ رہی ہیں۔''

سروج بھڑک کر بولی۔''ہم مردوں کی صلاح نہیں مانتے۔اگر وہ اپنے

بارے میں آزاد ہیں تو عورتیں بھی اپنے لیے آزاد ہیں۔لڑکیاں اب شادی کو پیشہ نہیں بنانا چاہتیں۔اب تو وہ صرف پریم کے ناتے بیاہ کریں گی۔''

زور سے تالیاں بجیں، خاص کر اگلی قطاروں میں جہاں عورتیں تھیں۔

مہتا نے جواب دیا ''جسے تم پریم کہتی ہو وہ دھوکا ہے، بھڑکی ہوئی خواہش کا بگڑا ہوا روپ، اسی طرح جیسے سنیاس صرف بھیک مانگنے کی مہذب شکل ہے۔وہ پریم اگر ازدواجی زندگی میں کم ہے تو آزاد نہ عیش میں بالکل نہیں۔ سچی خوشی، سچا سکون، صرف خدمت میں ہے۔وہی حقوق کا منبع ہے۔وہی طاقت کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔خدمت ہی وہ سینٹ ہے جو زن وشوہر کو تمام عمر محبت اور باہمی امداد کے رشتے میں جوڑے رکھتا ہے، جس پر بڑے بڑے صدمہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جہاں خدمت نہیں ہے وہیں طلاق، ترک اور باہمی بداعتقادہ ہے اور آپ پر مردانہ زندگی کی کشتی کا ناخدا ہونے کے سبب زیادہ ذمہ داری ہے۔آپ چاہیں تو کشتی کو آندھی اور طوفان میں بھی پار لگا سکتی ہیں اور آپ نے غفلت کی تو کشتی ڈوب جائے گی اور اس کے ساتھ آپ بھی ڈوبنے سے نہ بچ سکیں گی۔''

تقریر ختم ہوگئی۔مسئلہ بحث طلب تھا اور کئی عورتوں نے اجازت مانگی مگر دیر بہت ہوگئی تھی، اس لیے مالتی نے مہتا کا شکریہ ادا کر کے جلسہ برخاست کر دیا۔ہاں یہ اطلاع دے دی گئی ہے کہ اگلے اتوار کو اس موضوع پر کئی دیویاں اپنے خیالات کا اظہار کریں گی۔

رائے صاحب نے مہتا کو مبارکباد دی۔''آپ نے میرے جی کی باتیں کہیں، مسٹر مہتا! میں آپ کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں۔''

مالتی ہنسی۔ ''آپ کیوں نہ مبارکباد دیں گے، چور چور موسیرے بھائی جو ہوتے ہیں۔ مگر سارا اپدیش غریب عورتوں ہی کے سر کیوں تھوپا جاتا ہے۔ ان ہی کے سر پر کیوں معیار اور ایثار پر عمل کرنے کی ذمہ داری لادی جاتی ہے؟''

مہتا بولے۔ ''اس لیے کہ وہ بات کو سمجھتی ہیں۔''

کھنا نے مالتی کی طرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر گویا اس کے دل کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب کے یہ خیالات بھی تو کوئی سو سال پہلے کے معلوم ہوتے ہیں۔''

مالتی نے ترش رو ہو کر پوچھا۔ ''کون سا خیالات؟''

''یہی خدمت اور فرض وغیرہ کے۔''

''تو آپ کو یہ خیالات سو سال پچھڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں تو مہربانی کر کے اپنے تازہ خیالات بتلائیے، عورت مرد کیسے سکھی رہ سکتے ہیں۔ اس کا کوئی تازہ نسخہ آپ کے پاس ہے؟''

کھنا کھسیا گئے۔ بات کہی تھی مالتی کو خوش کرنے کے لیے وہ اور بگڑ اٹھی۔ بولے۔ ''یہ نسخہ مہتا صاحب کو معلوم ہوگا۔''

ڈاکٹر صاحب نے بتلا دیا اور آپ کے خیال میں سو سال پرانا ہے تو نیا نسخہ آپ کو بتلانا چاہیے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ دنیا میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو کبھی پرانی ہو ہی نہیں سکتیں۔ سماج میں اس طرح کے مسئلے ہمیشہ اٹھتے رہتے ہیں اور ہمیشہ اٹھتے رہیں گے۔''

مسز کھنا برآمدے میں چلی گئی تھیں۔ مہتا نے ان کے پاس جا کر پرنام کرتے

ہوئے پوچھا۔ ''میری تقریر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

مسز کھنا نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ ''اچھی تھی، بہت اچھی۔ مگر ابھی آپ کنوارے ہیں، سبھی عورتیں دیویاں ہیں، برتر ہیں اور زندگی کے جہاز کی ناخدا ہیں۔ بیاہ کر لیجیے پھر پوچھوں گی کہ اب عورتیں کیا ہیں اور بیاہ آپ کو کرنا پڑے گا کیونکہ آپ بیاہ سے منہ چرانے والے مردوں کو بزدل کہہ چکے ہیں۔''

مہتا ہنسے۔ ''اسی کے لیے تو زمین تیار کر رہا ہوں۔''

''مس مالتی کا جوڑا بھی اچھا ہے۔''

''شرط یہی ہے کہ وہ کچھ دن آپ کے چرنوں میں بیٹھ کر آپ سے استریوں کا دھرم سیکھیں۔''

''وہی سوارتھی مردوں کی بات! آپ نے مردوں کے فرائض سیکھ لیے ہیں؟''

''یہی سوچ رہا ہوں کہ کس سے سیکھوں۔''

''مسٹر کھنا آپ کو بہت اچھی طرح سکھا سکتے ہیں۔''

مہتا نے قہقہہ مارا۔ ''نہیں میں وہ فرائض بھی آپ ہی سے سیکھوں گا۔''

''اچھی بات ہے، مجھی سے سیکھئے۔ پہلی بات یہی ہے کہ بھول جائیے کہ عورت برتر ہے اور ساری ذمہ داری اسی پر ہے۔ برتر مرد ہے اور اسی پر گرہستی کا سارا بار ہے۔ عورت میں خودی اور نفس کشی اور فرض کی ادائیگی کا احساس سب کچھ وہی پیدا کر سکتا ہے۔ اگر اس میں یہ باتیں نہیں ہیں تو عورت میں بھی نہ آئیں گی۔ عورتوں میں جو آج یہ بغاوت ہے، اس کا سبب مرد میں ان اوصاف کا نہ ہونا ہے۔''

مرزا صاحب نے مہتا کو گود میں اٹھا لیا اور بولے۔ ''مبارک!''

مہتا نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''آپ کو میری تقریر پسند آئی؟''

''تقریر تو خیر جیسی تھی ویسی تھی مگر کامیاب خوب رہی۔ آپ نے پری کو شیشہ میں اتار لیا۔ اپنا بھاگ سراہیے کہ جس نے آج تک کسی کو منہ نہیں لگایا، وہ آپ کا کلمہ پڑھ رہی ہے۔''

مسز کھنا نے دبی زبان سے کہا۔ ''جب نشہ ٹھہر جائے تو کہیے۔''

مہتا نے بے پروائی سے کہا۔ ''مجھ جیسے کتاب کے کیڑے کو کون عورت پسند کرے گی، دیوی جی؟ میں تو پکا معیار پرست ہوں۔''

مسز کھنا نے اپنے شوہر کو موٹر کی طرف جاتے دیکھا تو ادھر چلی گئی، مرزا بھی باہر نکل گئے۔ مہتا نے پلیٹ فارم پر سے اپنی چھڑی اٹھائی اور باہر جانا چاہتے تھے کہ مالتی نے آ کر ان کا ہاتھ] کڑ لیا اور اصرار کرتی ہوئی بولی ''آپ ابھی نہیں جا سکتے۔ چلیے پاپا سے آپ کی ملاقات کراؤں اور آج وہیں کھانا بھی کھائیے۔''

مہتا نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''نہیں مجھے معاف کیجیے۔ وہاں سروج میری جان کھا جائے گی۔ میں ان لڑکیوں سے بہت گھبراتا ہوں۔''

''نہیں نہیں، میں ذمہ لیتی ہوں جو منہ بھی کھولے۔''

''اچھا، آپ چلیے میں ذرا دیر میں آ جاؤں گا۔''

''جی نہیں یہ نہ ہوگا۔ میرا موٹر سروج کو لے کر چل دیا۔ آپ مجھ کو پہنچانے تو چلیں گے ہی۔''

دونوں مہتا کے موٹر پر بیٹھے۔ موٹر چلا، لمحہ بھر بعد مہتا نے پوچھا ''میں نے سنا ہے کہ کھنا جی اپنی بیوی کو مارا کرتے ہیں۔ جب سے مجھے ان کی صورت سے نفرت

ہوگئی ہے۔ جو آدمی اتنا بے رحم ہو، اسے میں انسان نہیں سمجھتا۔ اس پر آپ عورتوں کے بڑے خیر خواہ بنتے ہیں! تم نے کبھی انہیں سمجھایا نہیں؟''

مالتی ذرا بگڑ کر بولی۔ ''تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، یہ آپ بھول رہے ہیں۔''

''میں تو اسے کسی سبب کا خیال ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی مرد اپنی عورت کو مارے۔''

''خواہ عورت کتنی ہی بدزبان ہو۔''

''ہاں کتنی ہی۔''

''تو آپ ایک نئی قسم کے آدمی ہیں۔''

''اگر مرد بدمزاج ہو تو تمہاری رائے میں اس مرد پر ہنٹروں کی بوچھاڑ کرنی چاہیے، کیوں؟''

''عورت کی چھماہی کا یہ صلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم کھنا کو منہ لگا کر اسے اور بھی شہہ دیتی ہو۔ تمہاری وہ جتنی عزت کرتا ہے، تم سے اسے جتنی عقیدت ہے، اس کے سبب تم بڑی آسانی سے اسے سیدھا کر سکتی ہو، مگر تم اس کی صفائی دے کر خود اس قصور میں شریک ہو جاتی ہو۔''

مالتی برافروختہ ہو کر بولی۔ ''تم نے اس وقت یہ تذکرہ فضول ہی چھیڑ دیا۔ میں کسی کی برائی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر ابھی آپ نے گوبندی دیوی کو پہچانا نہیں۔ آپ نے ان کی بھولی بھالی، سیدھی سادھی صورت دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ دیوی ہیں۔ میں انہیں اتنا اونچا درجہ نہیں دینا چاہتی۔ انہوں نے مجھے بدنام کرنے کی جتنی کوشش کی

ہے، مجھ پر جیسے جیسے حملے کیے ہیں، وہ بیان کروں تو آپ دنگ رہ جائیں گے اور تب آپ کو ماننا پڑے گا کہ ایسی عورت کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔''

''آخر انہیں آپ سے جو اتنی نفرت ہے، اس کا کوئی سبب تو ہوگا۔''

''سبب ان سے پوچھئے۔ مجھے کسی کے دل کا حال کیا معلوم؟''

''ان سے بلا پوچھے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے۔ اگر کوئی مرد میرے اور میری عورت کے درمیان میں آنے کی ہمت کرے تو میں اسے گولی مار دوں گا اور اسے نہ مار سکوں گا تو اپنے سینے میں مار لوں گا۔ اسی طرح اگر میں کسی عورت کو اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان لانا چاہوں تو میری بیوی کو بھی حق ہے کہ وہ جو چاہے سو کرے۔ اس بارے میں میں کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہ غیر سائیخفک جذبہ ہے جو ہم نے اپنے وحشی آباؤ اجداد سے پایا ہے اور آج کل کچھ لوگ اسے نا مہذب اور غیر مجلسی سلوک کہیں گے، لیکن میں ابھی تک اس جذبہ پر فتح پا سکا اور نہ پانا چاہتا ہوں۔ اس بارے میں میں قانون کی پروا نہیں کرتا، میرے گھر میں مرا قانون ہے۔''

مالتی نے تند لہجے میں کہا۔ ''یہ آپ دل سے نہیں کہہ رہی ہیں۔ مس مالتی! کیا آپ ساری دنیا کو بیوقوف سمجھتی ہیں؟ جو بات سبھی سمجھ رہے ہیں، اگر وہی بات مسز کھنا بھی سمجھیں تو میں انہیں الزام نہیں دے سکتا۔''

مالتی نے بگڑ کر کہا۔ ''دنیا کو دوسروں کے بدنام کرنے میں مزا آتا ہے۔ یہ اس کا خاصہ ہے۔ میں اس کا خاصہ کیسے بدل دوں؟ لیکن یہ مفت کی بدنامی ہے۔ ہاں میں اتنی بے مروت نہیں ہوں کہ کھنا کو اپنے پاس آتا دیکھ کر دھتکار دیتی۔ میرا کام

ہی ایسا ہے کہ مجھے سبھی کی آؤ بھگت کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی اس کا کچھ اور مطلب نکالتا ہے تو وہ.....وہ.....''

مالتی کا گلا بھر آیا اور اس نے منہ پھیر کر رومال سے آنسو پونچھے۔ پھر ایک لمحہ بعد بولی۔ اوروں کے ساتھ تم بھی مجھے..... مجھے اس کا رنج ہے..... مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔''

پھر شاید اسے اپنی کمزوری پر افسوس ہوا۔ وہ تیز ہو کر بولی۔ ''آپ کو مجھ پر حملہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر آپ بھی انہی مردوں میں ہیں جو کسی عورت مرد کو ساتھ دیکھ کر ان پر انگلی اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے' تو شوق سے اٹھائیے۔ مجھے ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ اگر کوئی عورت آپ کے پاس بار بار کسی نہ کسی حیلے سے آئے، آپ کو اپنا دیوتا سمجھے، ہر ایک بات میں آپ سے صلاح لے، آپ کے پیروں تلے آنکھیں بچھائے، اپ کا اشارہ پاتے ہی آگ میں کود پڑنے کو تیار ہو جائے تو میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ اس سے بے رخی نہ کریں گے۔ اگر آپ اسے ٹھکرا سکتے ہیں تو آپ انسان نہیں ہیں۔ اس کے خلاف آپ کتنے ہی دلائل لا کر رکھ دیں مگر میں مانوں گی نہیں۔ میں تو کہتی ہوں کے بے رخی تو دور رہی، ٹھکرانے کی تو بات ہی کیا۔ آپ اس عورت کے پیر دھو دھو کر پئیں گے اور بہت دن گزرنے سے قبل ہی وہ آپ کے دل کی رانی ہو گی۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ میرے سامنے کھنا کا کبھی نام نہ لیجیے گا۔''

مہتا نے اس لپٹ میں گویا ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔ ''شرط یہی ہے کہ میں کھنا کو آپ کے ساتھ نہ دیکھوں۔''

''میں انسانیت کا خون نہیں کرسکتی ۔وہ آئیں تو میں انہیں بھگاؤں گی نہیں ۔''

''ان سے کہیے کہ اپنی اہلیہ کے ساتھ انسانیت سے پیش آئیں ۔''

''میں کسی کے نجی معاملے میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتی اور نہ مجھے اس کا کوئی حق ہے ۔''

''تو آپ کسی کی زبان نہیں بند کرسکتیں ۔''

مالتی کا بنگلہ آ گیا۔موٹر رکی۔ مالتی اتر پڑی اور بلا ہاتھ ملائے چلی گئی۔وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس نے مہتا کو کھانے کی دعوت دی ہے۔وہ تخلیہ میں جا کر خوب رونا چاہتی ہے۔گو بندی نے پہلے بھی حملے کیے ہیں،مگر آج اس نے جو حملہ کیا ہے وہ بہت سخت اور دل شکن ہے؟

(16)

رائے صاحب کو جب خبر ملی کے علاقے میں ایک واردات ہوگئی اور ہوری سے گاؤں کے پنچوں نے جرمانہ وصول کرلیا ہے تو فوراً نوکھے رام کو بلا کر جواب طلب کیا۔انہیں اس کی اطلاع نہیں دی گئی؟ ایسے نمک حرام اور دغاباز آدمی کے لیے ان کے دربار میں جگہ نہیں ۔

نوکھے رام نے اتنی گالیاں کھائیں تو ذرا گرم ہوکر بولے ۔''میں اکیلا تھوڑے ہی تھا،گاؤں کے اور پنچ بھی تو تھے ۔میں اکیلا کیا کرسکتا تھا؟''

رائے صاحب نے ان کو توند کی طرف برچھی کی سی نوک دار نگاہوں سے

دیکھا۔ ''مت بکو جی! تمہیں اسی وقت کہنا چاہیے تھا کہ جب تک سرکار کو اطلاع نہ ہو جائے، میں پنچو کو جرمانہ وصول کرنے دوں گا۔ پنچوں کو میرے اور میری رعایا کے درمیان میں دخل دینے کا حق ہی کیا ہے؟ اس ڈانڈ باندھ کے سوا علاقے میں اور کون سی آمدنی ہے؟''

وصول سرکار کے گھر گئی، بقایا اسامیوں نے دبالیا۔ اب میں کہاں جاؤں؟ کیا کھاؤں تمہارا سر؟ یہ لاکھوں روپے سال کا خرچ کہاں سے آئے؟ افسوس ہے کہ دو پشتوں سے کارندہ کا کام کرتے رہنے پر بھی مجھے آج تمہیں یہ بات بتلانی پڑتی ہے۔ کتنے روپے وصول ہوئے تھے۔ ہوری سے؟

نوکھے رام نے سٹپٹا کر کہا۔ ''اسی روپے۔''

''نقد؟''

''نکد اس کے پاس کہاں تھے سرکار؟ کچھ اناج دیا، کچھ میں اپنا گھر لکھ دیا۔''

رائے صاحب نے اپنی غرض کو چھوڑتے ہوئے ہوری کی طرفداری کی۔

''اچھا تو آپ نے اور آپ کے بگلا بھگت پنڈت نے مل کر ایک معتبر اسامی کو تباہ کر دیا! میں پوچھتا ہوں کہ تم لوگوں کو کیا حق تھا کہ میرے علاقے میں مجھے اطلاع دیئے بغیر میرے آسامی سے جرمانہ وصول کرتے؟ اگر میں چاہوں تو اسی بات پر آپ کو اور اس مکار پنڈت کو سات سات سال کے لیے جیل بھجوا سکتا ہوں۔ آپ نے سمجھ لیا کہ آپ ہی علاقے کے بادشاہ ہیں۔ میں کہے دیتا ہوں کہ آج شام تک جرمانے کی پوری رقم میرے پاس پہنچ جائے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں ایک ایک سے چکی پسوا کر چھوڑوں گا۔ جایئے، ہاں ہوری اور اس کے لڑکے کو

میرے پاس بھیج دیجیے گا۔''

نوکھے رام نے دبی زبان سے کہا ''اس کا لڑکا تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ جس رات یہ واردات ہوئی اسی رات کو بھاگا تھا۔''

رائے صاحب نے غصہ سے کہا۔ ''جھوٹ مت بکو۔ تمہیں معلوم ہے کہ جھوٹ سے میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں نے آج تک کبھی نہیں سنا کہ کوئی نوجوان اپنی چہیتی کو اس کے گھر سے لا کر پھر خود بھاگ جائے۔ اگر اسے بھاگنا ہی ہوتا تو وہ اس لڑکی کو لاتا ہی کیوں؟ تم لوگوں کی اس میں بھی ضرور کوئی شرارت ہے۔ تم گنگا میں ڈوب کر بھی اپنی صفائی دو تو میں ماننے کا نہیں۔ تم لوگوں نے اپنے سماج کی پیاری مرجادکی حفاظت کے لیے اسے دھمکایا ہوگا۔ بیچارا بھاگ نہ جاتا تو کیا کرتا؟''

نوکھے رام اس کی مخالفت نہ کر سکے۔ مالک جو کچھ کہیں سب ٹھیک ہے۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکے کہ آپ خود چل کر جھوٹ سچ کی جانچ کر لیں۔ بڑے آدمیوں کا غصہ پوری اطاعت چاہتا ہے، اپنے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔

پنچوں نے رائے صاحب کا یہ فیصلہ سنا تو نشہ ہرن ہو گیا۔ غلہ تو ابھی جیوں کا تیوں پڑا ہوا تھا، مگر روپے تو کب کے غائب ہو چکے تھے۔ ہوری کا مکان رہن لکھا گیا تھا، مگر اس مکان کو دیہات میں کون پوچھتا؟ جیسے ہندو عورت شوہر کے ساتھ ہی گھر کی مالکہ ہے اور شوہر کو چھوڑ دینے پر کہیں کی نہیں رہتی، اسی طرح یہ گھر ہوری کے لیے تو لاکھ روپے کا ہے مگر اس کی اصلی قیمت تو کچھ بھی نہیں اور ادھر رائے صاحب روپے لیے بغیر ماننے کے نہیں۔ یہی ہوری جا کر رو آیا ہوگا۔ پٹیشوری

لال سب سے زیادہ خائف تھے۔ان کی تو نوکری ہی چلی جائے گی۔چاروں آدمی اس مشکل مسئلے پر غور کر رہے تھے مگر کسی کی عقل کام نہ کرتی تھی۔ایک دوسرے کو الزام دیتا تھا۔پھر خوب جھگڑا ہوا۔

پٹیشوری نے اپنی لمبی گردن ہلا کر کہا۔''میں منع کرتا تھا کہ ہوری کے معاملے میں ہمیں چپ ہو کر رہ جانا چاہیے۔گائے کے معاملے میں سب کو تاوان دینا پڑا۔اب اس معاملے میں تاوان ہی سے گلا نہ چھوٹے گا بلکہ نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا،مگر تم لوگوں کو روپے کی پڑی تھی۔نکالو بیس بیس روپے اب بھی کسل ہے۔کہیں رائے صاحب نے رپٹ کر دی تو سب کے سب بندھ ہو جاؤ گے۔''

داتا دین نے پنا برہمنی جلال دکھا کر کہا۔''میرے پاس بیس روپے تو کیا،بیس پیسے بھی نہیں ہیں۔برہمنوں کو بھوج دیا گیا،ہوم ہوا،کیا اس میں کچھ لگا ہی نہیں؟''

''رائے صاحب کی ہمت ہے کہ مجھے جہل (جیل) لے جائیں۔برمہ بن کر گھر کا گھر مٹا دوں گا۔ابھی انہیں کسی برہمن سے پالا نہیں پڑا۔''

جھنگر سنگھ نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی۔وہ رائے صاحب کے نوکر نہیں ہیں۔انہوں نے ہوری کو مارا نہیں،پیٹا نہیں،اس پر کوئی دباؤ ڈالا نہیں۔ہوری اگر پراسچت (کفارہ) کرنا چاہتا تھا تو انہوں نے اس کا موقع دیا۔اس کے لیے انہیں کوئی دکھ نہیں دے سکتا۔مگر نوکھے رام کی گردن اتنی آسانی سے نہ چھوٹ سکتی تھی۔یہاں مزے سے بیٹھے بیٹھے راج کرتے تھے۔تنخواہ تو دس روپے سے زیادہ نہ تھی،ایک ہزار سالانہ سے زائد آمدنی تھی۔صدہا آدمیوں پر حکومت،چار چار پیادے حاضر،بیگار میں سارا کام ہو جاتا تھا،تھانیدار تک کرسی دیتے تھے۔یہ چین

انہیں اور کہاں تھا؟ اور پیشوری تو نوکری کی بدولت مہاجن بنے ہوئے تھے۔ کہاں جا سکتے تھے؟ دو تین روز اسی تردد میں پڑے رہے کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات ہو۔ آخر انہیں ایک راستہ سوجھ گیا۔ کبھی کبھی کچہری میں انہیں 'بجلی' دیکھنے کو مل جاتی تھی۔ اگر ایک گمنام خط اس کے ایڈیٹر کی خدمت میں بھیج دیا جائے کہ رائے صاحب کس طرح آسامیوں سے جرمانہ وصول کرتے ہیں تو بچہ کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ نوکھے رام بھی متفق ہو گئے۔ دونوں نے مل کر کسی طرح ایک خط لکھا اور رجسٹری سے بھیج دیا۔

ایڈیٹر اونکار ناتھ تو ایسے خطوں کی تاک میں رہتے تھے۔ خط پاتے ہی فوراً رائے صاحب کو اطلاع دی۔ انہیں ایک ایسی خبر ملی ہے جس پر اعتبار کرنے کو ان کا جی نہیں چاہتا۔ مگر نامہ نگار نے ایسے ثبوت دیئے ہیں کہ یکا یک بے اعتباری بھی نہیں کی جا سکتی۔ کیا یہ سچ ہے کہ رائے صاحب نے اپنے علاقے کی ایک آسامی سے اسی روپے تاوان اس لیے وصاول کیا کہ اس کے لڑکے نے ایک بیوہ کو اپنے گھر رکھ لیا تھا؟ ایڈیٹر کا فرض انہیں مجبور کرتا کہ وہ اس معاملے کی جانچ کریں اور عوام کی بھلائی کے لیے اسے چھاپ دیں۔ رائے صاحب اس کے متعلق جو کہنا چاہیں اسے بھی وہ چھاپ دیں گے۔ ایڈیٹر صاحب دل سے چاہتے ہیں کہ یہ خبر غلط ہو لین اگر اس میں کچھ بھی سچائی ہے تو اسے شائع کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ دوستی انہیں فرض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔

رائے صاحب کو یہ خبر ملی تو انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ پہلے تو انہیں یہ تحریک ہوئی کہ جا کر اونکار ناتھ کو پچاس ہنٹر گن کر لگائیں کہ جہاں وہ خط چھاپنا وہیں یہ

حال بھی چھاپ دینا، لیکن اس کا انجام سوچ کر دل کو ٹھنڈا کیا اور فوراً ان سے ملنے چلے۔ اگر دیر کی اور اونکار ناتھ نے وہ حال چھاپ دیا تو اس کی ساری نیک نامی پر پانی پھر جائے گا۔

اونکار ناتھ سیر کر کے لوٹے تھے اور ان کے اخبار کے لیے ایڈیٹوریل لکھنے کی فکر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر دل چڑے کی طرح اڑا اڑا پھرتا تھا۔ ان کی اہلیہ نے رات انہیں کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالی تھیں جو ابھی تک کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ انہیں کوئی مفلس کہہ لے، بدنصیب کہہ لے، وہ ذرا بھی برا نہ مانتے تھے، مگر یہ کہنا کہ ان میں مردیت نہیں ہے، ان کی برداشت سے باہر تھا اور پھر اپنی بیوی کو یہ کہنے کا کیا حق ہے؟ اس سے تو یہ امید کی جاتی ہے کہ کوئی ایسا کہے تو اس کا منہ بند کر دے۔ بیشک وہ ایسی خبریں نہیں چھاپتے، اسے نوٹ نہیں لکھتے کہ سر پر کوئی آفت آ جائے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ ان سیاہ قانونوں کے زمانے میں وہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟ مگر وہ کیوں سانپ کے بل میں ہاتھ نہیں ڈالتے، اسی لیے کہ ان کے گھر والوں کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے اور ان کی اس برداشت کا انہیں یہ صلہ مل رہا ہے۔ کیا اندھیر ہے! ان کے پاس روپیہ نہیں ہے تو بنارسی ساڑھی کیسے منگاویں؟ ڈاکٹر، سیٹھ اور پروفیسر بھاٹیا اور نہ جانے کس کس کی بیویاں بنارسی ساڑھی پہنتی ہیں تو وہ کیا کریں؟ کیوں ان کی بیوی ساڑھی والوں کو اپنی کھدر کی ساڑھی سے نادم نہیں کرتی؟ ان کی خود تو یہ عادت ہے کہ کسی بڑے آدمی سے ملنے جاتے ہیں تو موٹے سے موٹے کپڑے پہن لیتے ہیں اور کوئی کچھ رائے زنی کرے تو اس کا منہ توڑ جواب دینے کو وہ تیار رہتے ہیں۔ ان کی بیوی میں کیا وہی

خودداری نہیں ہے؟ وہ کیوں دوسروں کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے؟ اسے سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک محبِّ وطن کی بیوی ہے، جس کے پاس حب الوطنی کے سوا اور کون سی پونجی ہے؟ اسی کو آج افتتاحیہ مضمون بنانے کا خیال کرتے کرتے ان کا دھیان رائے صاحب کے معاملے پر جا پہنچا۔ رائے صاحب اس اطلاع کا کیا جواب دیتے ہیں، یہ دیکھنا ہے۔ اگر وہ اپنی صفائی دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو کوئی بات نہیں، ورنہ اگر وہ سمجھیں کہ اونکار ناتھ دباؤ، خوف یا مروت میں آ کر اپنے فرض سے منہ موڑ لیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ اس ساری تپسیا کا بدلا انہیں اس کے سوا اور کیا ملتا ہے کہ موقع ملنے پر وہ ان قانونی ڈاکوؤں کی نشاندہی کر دیں۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ رائے صاحب بڑے با اثر شخص ہیں۔ کونسل کے ممبر ہونے کے علاوہ حکام میں بھی ان کا کافی رسوخ ہے۔ وہ چاہیں تو ان پر جھوٹے مقدمے چلوا سکتے ہیں، اپنے غنڈوں سے راہ چلتے پٹوا سکتے ہیں، مگر اونکار ناتھ ان سے نہیں ڈرتا۔ جب تک اس کے جسم میں جان ہے، وہ ظالموں کی خبر لیتا ہی رہے گا۔

دفعتاً موٹر کی آواز سن کر وہ چونک پڑے۔ فوراً کاغذ لے کر اپنا مضمون شروع کر دیا۔ ایک ہی لمحہ میں رائے صاحب ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔

اونکار ناتھ نے نہ ان کا خیر مقدم کیا، نہ مزاج پرسی کی اور نہ کرسی دی۔ انہیں اس طرح دیکھا گویا کوئی ملزم ان کی عدالت میں آیا اور رعب کی آواز میں پوچھا۔ ''آپ کو میرا پرزہ مل گیا تھا؟ میں خط لکھنے کے لیے مجبور نہ تھا، میرا فرض تو یہ تھا کہ خود اس کی تحقیقات کرتا۔ مگر مروت میں اصولوں کا کچھ نہ کچھ خون کرنا ہی پڑتا

ہے۔ کیا اس خبر میں کچھ سچائی ہے؟''

رائے صاحب اس کی سچائی سے انکار نہ کر سکے، اگر چہ ابھی تک انہیں جرمانے کے روپے نہیں ملے تھے اور وہ اس کے ملنے سے صاف انکار کر سکتے تھے مگر وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ کس پہلو پر چلتے ہیں۔

اونکار ناتھ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''تب تو میرے لیے اس خبر کو چھاپ دینے کے سوا اور کوئی چارا نہیں ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ مجھے اپنے ایک بڑے خیر خواہ دوست کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں شخص کوئی چیز نہیں۔ ایڈیٹر اگر اپنا فرض پورا نہ کر سکے تو اسے اس کرسی پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

رائے صاحب کرسی پر بیٹھ گئے اور پان کے بیڑے منہ میں ڈال کر بولے۔ ''لیکن یہ آپ کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ مجھے تو جو کچھ ہونا ہے، وہ بعد کو ہوگا۔ آپ کو فوراً سزا مل جائے گی۔ اگر آپ دوستوں کی پروا نہیں کرتے تو میں بھی اسی کینڈے کا آدمی ہوں۔''

اونکار ناتھ نے شہید کی عظمت اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا تو مجھے خوف نہیں ہے۔ جس دن میں نے ایڈیٹر ہونے کی ذمہ داری لی، اسی دن جان کی پروا چھوڑ دی اور میرے نزدیک ایڈیٹر کے سب سے شاندار موت یہی ہے کہ وہ حق انصاف پر اپنے کو قربان کر دے۔''

''اچھی بات ہے۔ میں آپ کا چیلنج منظور کرتا ہوں۔ میں اب تک آپ کو اپنا دوست سمجھتا آیا تھا مگر اب آپ لڑنے پر تیار ہیں تو لڑائی ہی سہی۔ آخر میں آپ

کے اخبار کا پانچ گناہ چندہ کیوں دیتا ہوں؟ صرف اس لیے کہ وہ میرا غلام بنا رہے ۔ مجھے ایشور نے رئیس بنایا ہے۔ آپ کیبنا نے سے نہیں بنا ہوں۔ معمولی چندہ پندرہ روپے ہے اور میں پچھتر روپے دیتا ہوں تو اسی لیے کہ آپ کا منہ بند رہے۔ جب آپ گھاٹے کا رونا روتے ہیں اور امداد کے لیے اپیل کرتے ہیں اور ایسی شاید ہی کوئی سہ ماہی جاتی ہو جب آپ کی اپیل نہ نکلے، تو میں ایسے ہر موقع پر آپ کی کچھ نہ کچھ امداد کر دیتا ہوں، کس لیے؟ دیوالی، دسہرہ اور ہولی میں آپ کے یہاں سوغات بھیجتا ہوں اور سال میں پچیس مرتبہ آپ کی دعوت کرتا ہوں، کس لیے؟ آپ رشوت اور فرض دونوں کو ساتھ ساتھ نہیں نباہ سکتے۔''

اونکار ناتھ گرم ہو کر بولے۔ ''میں نے کبھی رشوت نہیں لی۔''

رائے صاحب نے پھٹکارا ''اگر یہ رشوت نہیں ہے تو رشوت کیا ہے؟ ذرا مجھے سمجھا دیجیے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے علاوہ اور سب گدھے ہیں جو بے غرضانہ آپ کا گھاٹا پورا کرتے ہیں؟ نکالیے اپنا کھاتا اور مجھے بتائیے کہ اب تک آپ کو میری ریاست سے کتنا مل چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہزاروں کی رقم نکلے گی۔ اگر آپ کو سودیشی سودیشی چلا کر بدیشی دواؤں اور چیزوں کا اشتہار چھاپتے شرم نہیں آتی تو میں کیوں اپنے اسامیوں سے تاوان اور جرمانہ لینے میں شرم کروں؟ یہ نہ سمجھئے کہ آپ ہی کسانوں کی بہبود کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں، مجھے کسانوں کے ساتھ جینا مرنا ہے، مجھ سے بڑھ کر دوسرا کا بہی خواہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میرا گزر کیسے ہو؟ افسروں کو دعوتیں کہاں سے دوں؟ سرکار چندے کہاں سے دوں؟ خاندان کے صدہا آدمیوں کی ضروریات کیسے پوری کروں؟ میرے گھر کا

کیا خرچ ہے، یہ شاید آپ جانتے ہیں۔تو کیا میرے گھر میں روپے پھلتے ہیں؟ آئیں گے تو آسامیوں ہی کے گھر سے۔آپ سمجھتے ہوں گے کہ زمیندار اور تعلقدار دنیا بھر کا سکھ لوٹ رہے ہیں۔ان کی اصلی حالت کا آپ کو پتہ نہیں۔اگر وہ دھرماتما بن کر رہیں تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔حکام کو ڈالیاں نہ دیں تو جیل گھر ہو جائے۔ہم بچھو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ سب کو ڈنک مارتے پھریں اور نہ غریبوں کا گلا دبانا کوئی بڑی خوشی کی بات ہے مگر رواجوں کو تو نبھانا پڑتا ہے۔جس طرح آپ میرے رئیس ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، اسی طرح اور سب لوگ بھی ہمیں سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھتے ہیں۔آیئے میرے بنگلے پر تو دکھا دوں کہ صبح سے شام تک کتنے نشانے مجھ پر پڑتے ہیں۔کوئی کشمیر سے شال دوشالے لیے چلا آتا ہے، کوئی عطر اور تمباکو کا ایجنٹ ہے، کوئی کتابوں اور اخباروں کا، کوئی بیمہ کمپنی کا، کوئی گراموفون لیے سر پر سوار ہے اور کوئی کچھ۔چندے والے تو بے شمار، کیا سب کے سامنے اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ جاؤں؟ کیا یہ لوگ میرے دروازے پر دکھڑا سننے آتے ہیں؟ آتے ہیں مجھے الو بنا کر مجھ سے کچھ اینٹھنے کے لیے۔آج رواج کا خیال چھوڑ دوں تو تالیاں پٹنے لگیں۔حکام کو ڈالیاں نہ دوں تو باغی سمجھا جاؤں۔تب آپ اپنے مضامین سے میری حفاظت نہ کریں گے۔کانگریس میں شریک ہوا، اس کا تاوان ابھی تک دیتا جاتا ہوں۔کالی کتاب میں نام درج ہو گیا۔میرے سر پر کتنا قرض ہے، یہ بھی کبھی آپ نے پوچھا؟ اگر سبھی مہاجن ڈگریاں کرالیں تو میرے ہاتھ کا چھلا تک بک جائے گا۔آپ کہیں گے کیوں یہ جھگڑے پالتے ہو؟ سات پشتوں سے جن حالات میں رہتا آیا ہوں، ان سے

اب نکل نہیں سکتا۔ گھاس چھیلنا اب سرے لیے ناممکن ہے۔ آپ کے پاس زمین نہیں، جائیداد نہیں، راجی بندش نہیں، آپ بے خوف ہو سکتے ہیں۔ مگر آپ بھی دم دبائے بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کو کچھ خبر ہے کہ عدالتوں میں کتنی رشوت چل رہی ہے، کتنے غریبوں کا خون ہو رہا ہے، کتنی عورتیں بدراہ ہو رہی ہیں۔ ہے بوتہ لکھنے کا؟ مثال میں دیتا ہوں مع ثبوت کے۔''

اونکا رناتھ کچھ نرم ہو کر بولے۔ ''جب کبھی ایسا موقع آیا ہے، میں نے قدم پیچھے ہٹایا۔''

رائے صاحب بھی کچھ نرم ہوئے۔ ''ہاں میں مانتا ہوں کہ دو ایک موقعوں پر آپ نے جواں مردی دکھائی مگر آپ کی نظر ہمیشہ اپنے فائدے پر رہی، عوام کے فائدے پر نہیں۔ آنکھیں نہ نکالیے اور نہ چہرا سرخ بنائیے۔ جب کبھی آپ میدان میں آئے اس کا اچھا نتیجہ یہی ہوا کہ آپ کی عزت اور آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اگر میرے ساتھ بھی آپ وہی چال چل رہے ہیں تو میں آپ کی خاطر کرنے کو تیار ہوں۔ روپے نہ دوں گا کیونکہ وہ رشوت ہے، آپ کی اہلیہ کے لیے کوئی زیور بنوا دوں گا۔ ہے منظور؟ اب میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ آپ کو جو خبر ملی ہے وہ غلط ہے، مگر یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اپنے اور سبھی بھائیوں کی طرح میں اسامیوں سے جرمانہ لیتا ہوں اور سال میں دس پانچ ہزار روپے میرے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ اگر آپ میرے منہ سے یہ لقمہ چھیننا چاہیں گے تو آپ گھاٹے میں رہیں گے۔ آپ بھی دنیا میں آرام سے رہنا چاہتے ہیں اور میں بھی رہنا چاہتا ہوں۔ اس سے کیا فائدہ کہ آپ انصاف اور فرض کا ڈھونگ کر کے مجھے زیر بار

کریں اور خود بھی زیر بار ہوں۔ دل کی بات کہیے۔ میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔ آپ کے ساتھ کتنے ہی بار ایک چوکے میں، ایک میز پر کھانا کھا چکا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ تکلیف میں ہیں۔ آپ کی حالت میری حالت سے بھی بدتر ہے۔ ہاں اگر آپ نے ستیہ ہریش چندر بننے کی قسم کھالی ہے تو آپ خوشی۔ اب میں چلتا ہوں۔''

رائے صاحب کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اونکار ناتھ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مصالحانہ انداز سے کہا۔ ''نہیں نہیں، ابھی آپ کو بیٹھنا پڑے گا۔ میں اپنی پوزیشن صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ نے میرے ساتھ جو سلوک کیے ہیں، ان کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں مگر یہاں اصول کی بات آ گئی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اصول جان سے بھی زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔''

رائے صاحب کرسی پر بیٹھ کر ذرا میٹھے لہجے میں بولے۔ ''اچھا بھائی جو چاہے لکھو۔ میں تمہارے اصولوں کو توڑنا نہیں چاہتا اور تو کیا ہو گا بدنامی ہو گی۔ ہاں کہاں تک نام کے پیچھے مروں؟ کون ایسا تعلقدار ہے جو آسامیوں کو تھوڑا بہت نہیں ستاتا؟ کتا ہڈی کی حفاظت کرے تو کھائے کیا؟ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آئندہ آپ کو اس طرح کی کوئی شکایت نہ ملے گی۔ اگر آپ کو مجھ پر کچھ یقین ہے تو اس دفعہ معاف کیجیے۔ کسی دوسرے ایڈیٹر سے میں ایسی خوشامد نہ کرتا۔ اسے سر باز ار پٹواتا لیکن مجھ سے آپ کی دوستی ہے، پس مجھے دبنا ہی پڑے گا۔ یہ اخباروں کا زمانہ ہے۔ سرکار تک ان سے دبتی ہے۔ میری ہستی کیا؟ آپ جسے چاہیں بنا دیں اور جسے چاہیں بگاڑ دیں۔ خیر یہ جھگڑا ختم کیجیے۔ کہیے آج کل اخبار کی کیا حالت

ہے؟ کچھ گاہک بڑھے؟''

اونکار ناتھ نے رضامندی سے کہا۔ ''کسی نہ کسی طرح کام چل جاتا ہے اور موجودہ حالات میں میں اس سے زیادہ امید نہیں رکھتا۔ میں اس طرف دولت اور آرام کی خواہش لے کر نہیں آیا تھا، اس لیے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں پبلک کی خدمت کرنے آیا تھا اور وہ حتی الامکان کیے جاتا ہوں۔ ملک و قوم کا بھلا ہو، یہی میری خواہش ہے۔ ایک شخص کے سکھ دکھ کی کوئی قیمت نہیں۔''

رائے صاحب نے ذرا اور ملائم ہو کر کہا۔ ''یہ سب ٹھیک ہے بھائی صاحب، لیکن خدمت کے لیے بھی جینا ضروری ہے۔ مالی افکار میں مبتلا ہوتے ہوتے آپ یکسوئی کے ساتھ خدمت بھی تو نہیں کر سکتے۔ کیا گاہکوں کی تعداد بالکل نہیں بڑھ رہی؟''

''بات یہ ہے کہ میں اپنے اخبار کا معیار کم نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں بھی آج سینما کے اشاروں کی تصاویر اور ان کی سوانح عمریاں چھاپنے لگوں تو گاہک بڑھ سکتے ہیں مگر اپنا تو یہ شعار نہیں۔ اور بھی کتنے ہی ایسے ہتھکنڈے ہیں جن سے اخبار کے ذریعہ روپیہ پیدا کیا جا سکتا ہے، لیکن میں انہیں برا سمجھتا ہوں۔''

''اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج آپ کی اتنی عزت ہے۔ میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں، معلوم نہیں آپ اسے منظور کریں گے یا نہیں۔ آپ میری جانب سے سو آدمیوں کو مفت پرچہ جاری کر دیجیے اور وقت میں دے دوں گا۔''

اونکار ناتھ نے ممنونیت سے سر جھکا کر کہا۔ ''میں شکریے کے ساتھ آپ کا دان قبول کرتا ہوں۔ افسوس یہی ہے کہ اخباروں کی جانب سے لوگوں میں بڑی بے تو

جہی ہے۔اسکولوں، کالجوں اور مندروں کے لیے پیسے کی کمی نہیں ہے، مگر آج تک ایک بھی ایسا سخی نہ نکلا جو اخباروں کی اشاعت کے لیے دان دیتا، حالانکہ تعلیمی مقصد جتنے کم خرچ میں اخباروں سے پورا ہوسکتا ہے، اتنا اور کسی طرح نہیں ہوسکتا، جیسے تعلیم گاہوں کو مختلف انجمنوں سے امداد ملتی ہے، اسی طرح اگر اخبار نویسوں کو بھی ملنے لگے تو ان غریبوں کو اپنا جتنا وقت اور جتنی جگہ اشتہاروں کی نذر کرنا پڑتی ہے، وہ کیوں کرنا پڑے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔''

رائے صاحب رخصت ہو گئے۔اونکار ناتھ کے چہرے پر خوشی کی جھلک نہ تھی۔رائے صاحب نے کسی طرح کی شرط نہ کی تھی، کوئی بندش نہ لگائی تھی اونکار ناتھ آج اتنی بڑی فضیحت پا کر بھی اس امداد کو نامنظور نہ کر سکے۔حالت ایسی بھی تھی کہ انہیں نجات کی کوئی تدبیر ہی نہ سوجھ رہی تھی۔پریس کے ملازموں کی تین مہینے کی تنخواہ باقی تھی۔کاغذ والے کو ایک ہزار سے زیادہ دینا تھا۔یہی کیا کم تھا کہ انہیں ہاتھ نہیں پھیلانا پڑا۔

ان کی اہلیہ گومتی نے آ کر خفگی سے کہا۔''کیا ابھی کھانے کا وقت نہیں آیا؟ یا یہ بھی کوئی قاعدہ ہے کہ جب تک ایک نہ بج جائے، جگہ سے نہ اٹھو۔کب تک کوئی چولھا تا کتا رہے؟''

اونکار ناتھ نے غمگین آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔گومتی کی خفگی غائب ہوگئی۔وہ ان کی مشکلات کو سمجھتی تھی۔دوسری عورتوں کے زیور کپڑے دیکھ کر کبھی کبھی اس کے دل میں مخالفت کا جذبہ جاگ اٹھتا تھا اور وہ شوہر کو دو چار کھری کھوٹی سنا جاتی تھی، مگر اصل میں یہ غصہ ان پر نہیں بلکہ خود اپنی بدقسمتی پر تھا اور تھوڑی سی

آنچ خوامخواہ اونکارنا تھ تک پہنچ ہی جاتی تھی۔ وہ ان کی ریاضت دیکھ کر دل میں کڑھتی بھی تھی اوران سے ہمدردی بھی رکھتی تھی۔ بس انہیں تھوڑا سا خبطی سمجھتی تھی۔ ان کا اداس چہرہ دیکھ کر پوچھا۔ ''کیوں اداس ہو، پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے کیا؟''

اونکارنا تھ کو مسکرانا پڑا ''کون اداس ہے؟ میں! مجھے تو آج اتنی خوشی ہے، اتنی تو اپنے بیاہ کے دن بھی نہ ہوئی تھی۔ آج صبح صبح پندرہ سو کا سودا ہوا ہے، کسی اچھے کا منہ دیکھا تھا۔''

گومتی کو یقین نہ آیا۔ بولی۔ ''جھوٹے ہو۔ تمہیں پندرہ سو کہاں ملے جاتے ہیں؟ ہاں پندرہ کہو تو مانے لیتی ہوں۔''

''نہیں نہیں، تمہارے سر کی قسم، پندرہ سو مارے۔ ابھی رائے صاحب آئے تھے، سوگاہکوں کا چندہ اپنی طرف سے دینے کا وعدہ کر گئے ہیں۔''

گومتی چہرہ اتر گیا۔ ''تو مل چکے!''

''نہیں، رائے صاحب وعدے کے پکے ہیں۔''

''میں نے کسی تعلقدار کو وعدے کا پکا دیکھا ہی نہیں۔ دادا ایک تعلقدار کے نوکر تھے۔ سال سال بھر تنخواہ نہ ملتی تھی۔ اسے چھوڑ کر دوسے کی نوکری کی۔ اس نے دوسال تک ایک پائی نہ دی۔ ایک بار دادا گرم ہو پڑے تو مار کر بھگا دیا۔ ان کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں۔''

''میں آج ہی بل بھیجتا ہوں۔''

''بھیجا کرو۔ کہہ دیں گے کہ کل آنا۔ کل اپنے علاقے پر چلے جائیں گے اور تین مہینے میں لوٹیں گے۔''

اونکارنا رتھ شک میں پڑ گئے۔ کہیں رائے صاحب بعد کو مکر گئے تو وہ کیا کر لیں گے؟ پھر بھی دل کڑا کر کے بولے۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم رائے صاحب کو میں اتنا دھوکے باز نہیں سمجھتا۔ میرا ان کے یہاں کچھ باقی نہیں ہے۔''

گومتی نے اسی مشکوک انداز سے کہا۔ ''اسی لیے تو میں تمہیں بدھو کہتی ہوں۔ ذرا کسی نے ہمدردی دکھائی اور تم پھول اٹھے۔ یہ موٹے رئیس ہیں۔ ان کے پیٹ میں ایسے کتنے ہی وعدے ہضم ہو سکتے ہیں۔ جتنے وعدے کرتے ہیں، اگر پورا کرنے لگیں تو بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے۔ میرے گاؤں کے ٹھاکر صاحب تو دو دو تین تین سال تک بنیوں کا حساب نہ کرتے تھے۔ نوکروں کی تنخواہ تو برائے نام دیتے تھے۔ سال بھر کام لیا اور جب نوکر نے تنخواہ مانگی تو مار کر نکال دیا۔ کئی بار اسی نادہندی میں ان کے لڑکوں کے نام سکول سے کٹ گئے۔ آخر انہوں نے لڑکوں کو گھر بلا لیا۔ ایک بار ریل کا ٹکٹ بھی ادھار مانگا تھا۔ یہ رائے صاحب بھی تو ان ہی کے بھائی بند ہیں۔ چلو کھانا کھاؤ اور چکی پیسو، جو تمہارے بھاگ میں لکھا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ یہ بڑے آدمی تمہیں پھٹکارتے رہیں، وہی اچھا ہے۔ یہ گر تمہیں ایک پیسہ دیں گے تو اس کا چوگنا اپنے آسامیوں سے وصول کر لیں گے۔ ابھی ان کے بارے میں جو کچھ چاہتے ہو لکھتے ہو، مگر تب تو ٹھکر سہاتی ہی کہنی پڑے گی۔''

(17)

گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ رائے صاحب نے پنچوں کو بلا کر خوب ڈانٹا اور ان

لوگوں نے جتنے روپے وصول کیے تھے، وہ سب ان کے پیٹ سے نکال لیے۔ وہ تو ان لوگوں کو جیل بھجوا رہے تھے لیکن ان لوگوں نے ہاتھ جوڑے، تھوک کر چاٹا بہت کا جر چھٹکارا ملا۔ دھنیا کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ گاؤں میں گھوم گھوم کر پنچوں کو نادم کرتی پھرتی تھی۔ آدمی نہ سنے گریبوں کی پکار، بھگوان تو سنتے ہیں۔ لوگوں نے سوچا تھا کہ ان سے ڈانڈ لے کر مجے (مزے) سے پھلوریاں کھائیں گے، پر بھگوان نے ایسا طمانچہ لگایا کہ پھلوریاں منہ سے باہر نکل پڑیں ایک ایک کے دو دو بھرنے پڑے۔ اب چاٹو میرا گھر لے کر!"

مگر بیلوں کے بغیر کھیتی کیسے ہو! گاؤں میں بوائی شروع ہو گئی۔ کاتک کے مہینے میں کسان کے بیل مر جائیں تو اس کے دونوں ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔ ہوری کے دونوں ہاتھ کٹ گئے تھے اور سب لوگوں کے کھیتوں میں ہل چل رہے تھے۔ بیج ڈالے جا رہے تھے، کہیں کہیں گیت کی تانیں سنائی دیتی تھیں مگر ہوری کے کھیت کسی بے کس عورت کے گھر کی طرح سونے پڑے تھے۔ پنیا کے پاس بھی گوئیں (بیلوں کا جوڑا) تھی، سوبھا کے پاس بھی گوئیں تھی۔ مگر انہیں اپنے کھیتوں کی بوائی سے فرصت کہاں کہ ہوری کے کھیت بوئیں؟ ہوری دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔ کہیں اس کے کھیت میں جا بیٹھا، کہیں اس کی بوائی کرا دیتا۔ اس طرح کچھ اناج مل جاتا۔ دھنیا، سونا، روپا سبھی دوسروں کی بوائی میں لگی رہتی تھیں۔ جب تک بوائی رہی، پیٹ کی روٹیاں ملتی گئیں اور کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی۔ دماغی تکلیف تو ضرور ہوتی تھی مگر کھانے بھر کو مل جاتا تھا۔ رات کو روز میاں بیوی میں تھوڑی سی لڑائی ہو جاتی تھی۔

یہاں تک کہ کاتک بیت گیا اور گاؤں میں مزدوری کا ملنا بھی مشکل ہو گیا۔ اب سارا دارومدار ایکھ پر تھا جو کھیتوں میں کھڑی تھی۔

رات کا وقت تھا، سردی خوب پڑ رہی تھی، ۔ ہوری کے گھر میں آج کچھ کھانے کو نہ تھا۔ دن کو تو تھوڑا سا بھنا ہوا مٹر مل گیا تھا اس وقت چولھا جلنے کا کوئی ڈول نہ تھا۔ روپا بھوک سے بے حال تھی اور دروازے پر الاؤ کے آگے بیٹھی رو رہی تھی۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ہے تو کیا مانگے، کیا کہے؟

جب بھوک نہ برداشت ہوئی تو آگ مانگنے کے بہانے پنیا کے گھر گئی۔ وہ باجرے کی روٹی اور بتھوے کا ساگ پکا رہی تھی۔ مہک سے روپا کے منہ میں پانی آیا۔

پنیا نے پوچھا۔ ''کیا ابھی تیرے گھر میں آگ نہیں جلی کیا ری؟''

روپا نے عاجزی سے کہا۔ ''آج تو گھر میں کچھ تھا ہی نہیں، آگ کہاں سے جلتی؟''

''تو پھر آگ کاہے کو مانگنے آئی ہے؟''

''دادا تماکھو (تمباکو) پئیں گے۔''

پنیا نے اپلے کھینک دی مگر روپا نے آگ اٹھائی نہیں اور پاس جا کر بولی۔ ''تمہاری روٹیاں مہک رہی ہیں، کاکی! مجھے باجرے کی روٹیاں بڑی اچھی لگتی ہیں۔''

پنیا نے مسکرا کر کہا۔ ''کھائے گی؟''

''اماں ڈانٹیں گی۔''

''اماں سے کون کہنے جائے گا؟''

روپا نے پیٹ بھر کر روٹیاں کھائیں اور جوٹھے منہ بھاگی ہوئی گھر چلی گئی۔

ہوری اداس بیٹھا تھا کہ پنڈت داتا دین نے آ کر پکارا۔ ہوری کا سینہ دھڑکنے لگا۔ کیا کوئی نئی مصیبت آنے والی ہے؟ آ کر ان کے پیر چھوئے اور الاؤ کے سامنے ان کے لیے ماچی رکھ دی۔

داتا دین نے بیٹھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''اب کی تو تمہارے کھیت پرتی پڑ گئے ہوری۔ تم نے گاؤں میں کسی سے کچھ کہا ہی نہیں، نہیں تو بھولا کی مجال تھی کہ تمہارے دوارے سے بیل کھول لے جاتا۔ یہیں تو تھ گر جاتی۔ میں تم سے جنیو ہاتھ میں لے کر کہتا ہوں ہوری کہ میں نے تمہارے اوپر ڈنڈ نہ لگایا تھا۔ دھنیا مجھے ناحق (ناحق) بدنام کرتی پھرتی ہے۔ یہ سب پٹیشوری لالہ اور جھنگری سنگھ کی کارستانی ہے۔ میں تو لوگوں کے کہنے سے پنچایت میں بیٹھ بھی گیا۔ وہ لوگ تو اور کڑا ڈنڈ لگا رہے تھے۔ میں نے کہہ سن کے کم کرایا۔ مگر اب سب لوگ سر پر ہاتھ دھرے رو رہے ہیں۔ سمجھتے تھے کہ یہاں ان ہی کا راج ہے۔ یہ نہ جانتے تھے کہ گاؤں کا راجہ کوئی اور ہے۔ اور اب اپنے کھیتوں کی بوائی کا کیا بندوبست کر رہے ہو؟''

ہوری نے رندھے گلے سے کہا ''کیا بتاؤں مہراج! پرتی رہیں گے۔''

''پرتی رہیں گے! یہ تو بڑا ارتھ ہوگا۔''

''بھگوان کی یہی مرجی (مرضی) ہے تو اپنا کیا بس؟''

''میرے ہوتے تمہارے کھیت کیسے پرتی رہیں گے۔ کل میں تمہاری بوائی کرا

دوں گا، ابھی کھیتوں میں کچھ تری ہے۔ اپج دس دن پیچھے ہو گی۔ اس کے سوا اور کوئی بات نہیں۔ ہمارا تمہارا آدھا ساجھا رہے گا۔ اس میں نہ تمہیں کوئی گھاٹا ہے، نہ ہمیں۔ میں نے آج بیٹھے بیٹھے سوچا تو جی بڑا دکھی ہوا کہ جتے جتائے کھیت پرتی پڑے جاتے ہیں۔''

ہوری سوچ میں پڑ گیا۔ ''چوماسا بھر ان کھیتوں میں کھاد ڈالی، جوتا اور آج صرف بوائی کے لیے آدھی فصل دینی پڑ رہی ہے۔ اس پر احسان کیسا جتا رہے ہیں، مگر اس سے تو اچھا ہی ہے کہ کھیت پرتی پڑ جائیں اور کچھ نہ ملے گا تو لگان تو نکل ہی آئے گا۔ نہیں اب کے اداننہ ہوا تو بید کھلی (بید خلی) آئی دھری ہے۔''

اس نے یہ تجویز منظور کر لی۔

داتا دین خوش ہو کر بولے۔ ''تو چلو، میں ابھی بیج تول دوں جس میں سیر ے (سویرے) کا جھٹ نہ رہے۔ روٹی تو کھالی ہے نا؟''

ہوری نے لجاتے ہوئے آج گھر میں چولھا نہ جلنے کی بات کہی۔

داتا دین نے میٹھے الہنے کے انداز سے کہا۔ ''ارے، تمہارے گھر میں چولھا نہیں جلا تو تم نے مجھ سے کہا بھی نہیں! ہم تمہارے بیری تو نہیں تھے۔ اسی بات پر تم سے میرا جی کڑھتا ہے۔ ارے بھلے آدمی، اس میں لاج سرم کی کونسی بات ہے؟ ہم سب ایک ہی تو ہیں، تم شودر ہوئے تو کیا، ہم برہمن ہوئے تو کیا، ہیں تو سب ایک ہی گھر کے۔ دن سب کے برابر نہیں جاتے۔ کون جانے کہ کل میرے ہی اوپر کوئی سنکٹ آپڑے تو میں تم سے اپنا دکھ نہ کہوں گا تو کس سے کہوں گا؟ اچھا جو ہوا سو ہوا، چلو بوائی کے اناج کے ساتھ تمہیں من دو من کھانے کو بھی تول دوں گا۔''

آدھ گھنٹے میں ہوری من بھر کو کاٹو کر اسر پر رکھے ہوئے آیا اور گھر کی چکی چلنے لگی۔ دھنیا روتی تھی اور سونا کہ ساتھ پیستی تھی۔ بھگوان اسے کس پاپ کا یہ ڈنڈ دے رہے ہیں۔

دوسرے دن بوائی شروع ہوئی۔ ہوری کا سارا کنبہ اس طرح کام میں لگا ہوا تھا جیسے سب کچھ اپنا ہی ہے۔ کئی دن کے بعد سینچائی بھی اسی طرح ہوئی۔ دادین کو مفت کے مزدور مل گئے۔ اب کبھی کبھی ان کا لڑکا ماتا دین بھی گھر میں آنے لگا۔ جوان آدمی تھا، بڑا عیاش اور بات چیت کا میٹھا۔ داتا دین جو کچھ چھین جھپٹ کر لاتے تھے، وہ اسے بھنگ بوٹی میں اڑاتا تھا۔ ایک چماری سے اس کی آشنائی ہوگئی تھی۔ اس لیے ابھی تک بیاہ نہ ہوا تھا۔ وہ رہتی الگ تھی مگر سارا گاؤں یہ بھید جانتے ہوئے بھی کچھ بول نہ سکتا تھا۔ ہمارا دھرم ہے کھانا۔ کھانا پاک رہے پھر ہمارے دھرم پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔ روٹیاں ڈھال بن کر بے دھرمی سے ہمیں بچاتی ہیں۔

اب ساجھے کی کھیتی ہونے سے ماتا دین کو جھنیا سے گفتگو کرنے کا موقع ملنے لگا۔ وہ ایسے وقت آتا جب گھر میں جھنیا کے سوا اور کوئی نہ ہوتا کبھی کسی بہانے سے، کبھی کسی بہانے سے جھنا شکیل نہ تھی لیکن جوان تھی اور اس کی چماری سے بہتر تھی۔ کچھ دن شہر میں رہ چکی تھی، پہننا اوڑھنا، بول چال وغیرہ سے واقف تھی اور حیادار بھی تھی جو عورت میں سب سے زیادہ کشش کی چیز ہے۔ ماتا دین کبھی کبھی اس کے بچے کو گود میں اٹھالیتا اور پیار کرتا۔ جھنیا خوش ہو جاتی تھی۔

ایک دن اس نے جھنیا سے کہا۔ ''تم کیا دیکھ کر گوبر کے ساتھ آئیں، جھونا؟''

جھنیا نے لجاتے ہوئے کہا۔ ''بھاگ کھینچ لایا مہراج اور کہا کہوں؟''

ماتا دین نے افسوس سے کہا۔ ''بڑے بےوفا آدمی ہے۔ تم جیسی لچھمی کو چھوڑ کر نجانے کہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔ منچلا آدمی ہے۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ کہیں اور نہ پھنس گیا ہو۔ ایسے آدمیوں کو تو گولی مار دینی چاہیے۔ آدمی کا دھرم ہے کہ جس کی باہنہ پکڑے، اسے نباہ ہے۔ یہ کیا کہ آدمی کی جندگی (زندگی) بگاڑ دی اور آپ دوسرا گھر جھانکنے لگے۔''

عورت رونے لگی۔ ماتا دین نے ادھر ادھر تاک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سمجھانے لگا۔ ''تم اس کی کیوں پروا کرتی ہو، جھونا؟ چلا گیا تو چلا جانے دو۔ تمہارے لیے کس بات کی کمی ہے؟ روپیہ پیسہ، گہنا کپڑا، جو چاہے مجھ سے لو۔''

جھنیا نے آہستہ ہاتھ چھڑا لیا اور پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''سب تمہاری دیا ہے مہراج! میں تو کہیں کی نہ رہی، گھر سے بھی گئی اور یہاں سے بھی گئی۔ نہ ماتا ملی، نہ رام ہی ملے۔ دنیا کا رنگ ڈھنگ نہ جانتی تھی۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں سن کر جال میں پھنس گئی۔''

ماتا دین نے گوبر کی برائی کرنی شروع کی۔ ''وہ تو پورا لپھنگا ہے، نہ گھ کا نہ گھاٹ کا! جب دیکھو ماں باپ سے لڑائی۔ کہیں پیسہ پا جائے تو فوراً جوا کھیل ڈالے گا۔ چرس اور گانجے میں اس کی جان بستی تھی۔ سہدوں، لچوں کے ساتھ گھومنتا، ہو بیٹیوں کو چھیڑنا، یہی اس کا کام تھا۔ تھانیدار صاحب بدمعاسی میں اس کا چالان کرنے والے تھے، ہم لوگوں نے بڑی بنتی کی، تب جا کے چھوڑا۔ دوسروں کے کھیت کھلیان سے اناج اڑا لیا کرتا تھا۔ وہ کئی بار پکڑا گیا، پر گاؤں گھر کا سمجھ کر

چھوڑ دیا گیا۔''

سونا نے باہر سے آ کر کہا۔ ''بھابھی! اماں نے کہا ہے اناج نکال کر دھوپ میں ڈال دو۔ نہیں تو چوکر بہت نکلے گا۔ پنڈت نے جیسے بکھار میں پانی ڈال دیا ہو۔''

ماتا دین نے اپنی صفائی دی۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ تیرے گھر برسات نہیں ہوئی۔ چوماسے میں لکڑی تک گیلی ہو جاتی ہے۔ اناج تو اناج ہی ہے۔''

یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔ سونا نے آ کر اس کا کھیل بگاڑ دیا تھا۔

سونا جھنیا سے پوچھا۔ ''ماتا دین کیا کرنے آئے تھے؟''

جھنیا نے ماتھا سکیڑ کر کہا۔ ''پگہی (مویشی باندھنے کی رسی) مانگ رہے تھے۔ میں نہ کہہ دیا کہ یہاں نہیں ہے۔''

''یہ سب بہانہ ہے۔ بڑا برا آدمی ہے۔''

''مجھے تو بڑا بھلا آدمی لگتا ہے۔ کیا برائی ہے اس میں؟''

''تم نہیں جانتیں۔ سلیا چمارن کو رکھے ہے۔''

''تو اسی سے برا آدمی ہو گیا؟''

''اور کاہے سے آدمی برا کہا جاتا ہے؟''

''تمہارے بھیا بھی تو مجھے لائے ہیں۔ وہ بھی برے آدمی ہیں؟''

سونا نے اس کا جواب نہ دے کر کہا۔ ''میرے گھر میں پھر کبھی آئے گا تو دھتکار دوں گی۔''

''اور جو اس سے تمہارا بیاہ ہو جائے؟''

سونا شرما گئی۔ ''تم تو بھابھی گالی دیتی ہو۔''

''کیوں اس میں گالی کی کیا بات ہے۔''

''مجھ سے بولے تو منہ جھلس دوں۔''

''تو تمہارا بیاہ کسی دیوتا سے ہوگا؟ گاؤں میں ایسا سندر سجیلا جوان دوسرا کون ہے؟''

''تو تم چلی جاؤ اس کے ساتھ، سلیا سے لاکھ درجے اچھی ہو۔''

''میں کیوں چلی جاؤں؟ میں تو ایک کے ساتھ چلی آئی، چاہے وہ اچھا یا برا۔''

''تو میں بھی جس کے ساتھ بیاہ ہوگا، اس کے ساتھ چلی جاؤں گی، اچھا ہو یا برا۔''

''اور جو کسی بوڑھے کے سوا تھ بیاہ ہو گیا؟''

سونا ہنسی۔ ''میں اس کے لیے نرم نرم روٹیا بناؤں گی، اس کی دوائیاں کوٹوں، چھانوں گی، اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤں گی اور جب مر جائے گا تو منہ ڈھانک کر روؤں گی۔''

''اور جو کسی جوان کے ساتھ ہوا؟''

''تم تمہارا سر، ہاں نہیں تو!''

''اچھا بتاؤ۔ تمہیں بوڑھا اچھا لگتا کہ جوان؟''

''جو اپنے کو چاہے وہی جوان ہے، جو نچا ہے وہی بوڑھا ہے۔''

''بھگوان کرے کہ تمہارا بیاہ کسی بوڑھے سے ہو جائے تو دیکھوں کہ تم کیسے چاہتی ہو۔ تب تو مناؤ گی کہ یہ نگوڑا کسی طرح مر جائے تو کسی جوان کو لے کر بیٹھ جاؤں۔''

''مجھے تو اس بوڑھے پر دیا آوے۔''

اس سال ادھر شکر کا ایک مل کھل گیا تھا۔ اس کے کارندے اور دلال گاؤں گاؤں گھوم کر کسانوں کی کھڑی ایکھ مول لیتے تھے۔ یہ وہی مل تھا جسے مسٹر کھنا نے کھولا تھا۔ ایک دن کارندہ اس گاؤں میں بھی آیا۔ کسانوں نے جو اس سے مول تول کیا تو معلوم ہوا کہ گڑ بنانے میں کوئی بچت نہیں ہے۔ جب گھر میں ایکھ پیل کر بھی یہی دام بکتے ہیں تو پیلنے کی زحمت کیوں اٹھائی جائے۔ سارا گاؤں کھڑی ایکھ بیچنے کو تیار ہو گیا۔ اگر کچھ کم ہی ملے تو پروا نہیں، فوراً ملے گا۔ کسی کو گیل لینا تھا، کسی کو لگان دینا تھا اور کوئی مہاجن سے گلا چھڑانا چاہتا تھا۔ ہوری کو بیل لینے تھے۔ اب کے ایکھ کی پیداوار اچھی نہ تھی، پس یہ بھی اندیشہ تھا کہ مال نہ پڑے گا اور جب گڑ کے بھاؤ مل کی چینی ملے گی تو گڑ لے ہی گا کون؟ سبھی نے بیعانے لے لیے۔ ہوری کو کم از کم ایک سو روپے کی امید تھی۔ اتنے میں ایک معمولی جوڑ آ جائے گی لیکن مہاجنوں کو کیا کرے؟ داتا دین، منگرو، دلاری، جھنگری سنگھ، سبھی تو جان کھا رہے تھے۔ اگر مہاجنوں کو دینے لگے گا تو سو روپے سود بھر کو بھی نہ ہوں گے۔ کوئی ایسی حکمت نہ سوجھتی تھی کہ ایکھ کے روپے آ جائیں اور کسی کو خبر نہ ہو۔ جب بیل گھر آ جائیں تب کوئی کیا کر لے گا؟ گاڑی تلے گی تو سارا گاؤں دیکھے ہی گا۔ تول پر جو روپے ملیں گے، وہ سب کو معلوم ہی ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ منگرو اور داتا دین ہمارے ساتھ رہیں۔ ادھر روپے ملے اور ادھر انہوں نے گردن دبائی۔

شام کو گردھر نے پوچھا۔ ''تمہاری اوکھ کب تک جائے گی، ہوری کاکا؟''

ہوری نے جھانسہ دیا۔ ''ابھی تک تو کچھ ٹھیک نہیں ہے بھائی، تم کب تک لے

جاؤ گے؟''

گودھری نے بھی جھانسہ دیا۔ ''ابھی تک تو کچھ ٹھیک نہیں ہے، کاکا!''

اور لوگ بھی اسی طرح کی باتیں کرتے تھے، کسی کو کسی پر اعتبار نہ تھا۔ جھنگری سنگھ کے سبھی قرضدار تھے اور سب یہی چاہتے تھے کہ اس کے ہاتھ روپے نہ جانے پائیں، ورنہ وہ سب کا سب ہضم کر جائے گا اور جب دوسرے دن آسامی پھر روپیہ مانگنے جائے گا تو نیا کاغذ، نیا نذرانہ اور نئی تحریر!

دوسرے دن سوبھا آ کر بولا ''دادا کوئی ایسی تدبیر کرو کہ جھنگری مری آ جائے، ایسا گرے کہ پھر نہ اٹھے۔''

ہوری نے مسکرا کر کہا۔ ''کیوں اس کے بال بچے نہیں ہیں؟''

''اس کے بال بچوں کو دیکھیں کہ اپنے بال بچوں کو؟ وہ تو دو دو عورتوں کو آرام سے رکھتا ہے اور یہاں تو ایک ہی کو روکھی روٹی نہیں ملتی۔ ساری جمع لے لے گا، ایک پیسہ بھی گھر نہ لانے دے گا۔''

''میری تو حالت اور بھی بری ہے بھائی اگر روپے ہاتھ سے نکل گئے تو مٹ جاؤں گا۔ گوئیں کے بنا تو کام نہ چلے گا۔''

''ابھی تو دو تین دن اوکھ ڈھوتے لگیں گے۔ جیوں ہی ساری اوکھ پہنچ جائے، جمعدار سے کہیں کہ بھیا کچھ لے لے مگر اوکھ جھٹ پٹ تول لے، دام پیچھے دینا۔ ادھر جھنگری سے کہہ دیں گے کہ ابھی روپے نہیں ملے۔''

ہوری نے سوچ کر کہا۔ ''جھنگری ہم سے تم سے کئی گنا چالاک ہے سوبھا۔ جا کر منیم سے ملے گا اور اسی سے روپیہ لے لے گا۔ ہم تم تاکتے ہی رہ جائیں گے۔

جن کھنابابو کامل ہے، ان ہی کی مہاجنی کوٹھی بھی ہے۔ دونوں ایک ہیں۔''

سوبھا نراش ہو کر بولا۔ ''نہ جانے ان مہاجنوں سے کبھی پنڈ چھوٹے گا کہ نہیں؟''

''ہوری بولا۔ ''اس جنم میں تو کوئی آس نہیں ہے بھائی! ہم راج پاٹ، سکھ چین نہیں چاہتے ہیں۔ وہ بھی نہیں ہوتا۔''

سوبھا نے شیطنیت سے کہا۔ ''میں تو دادا ان سبوں کو اب کی چکمہ دوں گا۔ جمعدار کو کچھ دے دلا کر اس بات پر راضی کر لوں گا کہ روپے کے لیے ہمیں خوب دوڑائیں، جھنگری کہاں تک دوڑیں گے؟''

ہوری نے ہنس کر کہا۔ ''یہ سب کچھ نہ ہوگا بھیا۔ کسل اسی میں ہے کہ جھنگری سنگھ کے ہاتھ پاؤں جوڑو۔ ہم جال میں پھنسے ہوئے ہیں، جتنا ہی پھڑ پھڑائیں گے اتنا ہی اور پھنستے جائیں گے۔''

تم تو دادا، بوڑھوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ کنگھرے میں پھنسے بیٹھے رہنا تو مردی نہیں ہے۔ پھدا اور جکڑ جائے تو جکڑ جانے پر گلا چھڑانے کے لیے بل تو لگانا ہی پڑے گا۔ یہی تو ہوگا کہ جھنگری گھر دوار نیلام کرا لیں گے، کرا لیں نیلام! میں تو چاہتا ہوں کہ ہمیں کوئی روپیہ نہ دے، ہمیں کوئی روپیہ نہ دے، ہمیں بھوکوں مرنے دے، لاتیں کھانے دے، ایک پیسہ بھی ادھار نہ دے! لیکن پیسہ والے ادھار نہ دیں تو بیان کہاں سے پاویں؟ ایک ہمارے اوپر دعویٰ کرتا ہے تو دوسرا ہمیں کچھ کم بیاج پر روپیہ دے کر اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔ میں تو اسی دن روپیہ لینے جاؤں گا جس دن جھنگری کہیں چلا گیا ہوگا۔''

ہوری کا دل بھی پھر گیا۔ بولا۔ ''ہاں یہ ٹھیک ہے۔''

''اوکھ تلوا دیں گے، پھر روپیہ اپنی گھات دیکھ کر لائیں گے۔''

''بس بس، یہی چال چلو۔''

دوسرے دن بڑے سویرے گاؤں کے کئی آدمیوں نے اکھ کاٹنا شروع کی۔ ہوری بھی اپنے کھیت میں گنڈاسہ لے کر پہنچا۔ ادھر سے سوبھا بھی اس کی مدد کو آ گیا۔ پنیا، جھنیا، دھنیا، سونا، سبھی کھیت میں پہنچ گئیں۔ کوئی اکھ کاٹتا تھا، کوئی چھیلتا تھا، کوئی گٹھے باندھتا تھا۔ مہاجنوں نے جو اکھ کٹتے دیکھا تو پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ ایک طرف سے دلاری دوڑی، دوسری طرف سے منگرو ساہ، تیسری طرف سے داتا دین اور پٹیشوری اور جھنگری کے پیادے۔ دلاری ہاتھ پیر میں موٹے موٹے چاندی کے کڑے پہنے، کانوں میں سونے کے جھمکے ڈالے، آنکھوں میں کاجل لگائے، بوڑھے شباب کو رنگے اور سنوارے ہوئے آ کر بولی۔ ''پہلے میرے روپے دے دو تب اوکھ کاٹنے دوں گی۔ میں جتنا گم (غم) کھاتی ہوں اتنا ہی تم سیر (شیر) ہوتے ہو۔ دو سال سے ایک دھیلا بیاج نہیں دیا۔ پچاس تو میرے بیاج ہی کے ہوتے ہیں۔''

ہوری نے گھگھیا کر کہا۔ ''بھابھی! اوکھ کاٹ لینے دو، اس کے روپے ملتے ہیں تو جتنا ہو سکے گا تمہیں بھی دوں گا۔ نہ گاؤں چھوڑ کر بھاگا جاتا ہوں، نہ اتنی جلدی مرا جاتا ہوں، کھیت میں کھڑا کھڑی تو اوکھ روپے نہ دے گی۔''

دلاری نے اس کے ہاتھ سے گنڈاسہ چھین کر کہا۔ ''نیت اتنی کھوٹی ہے تم لوگوں کی، تبھی تو برکت نہیں ہوتی۔''

آج پانچ سال ہوئے، ہوری نے دلاری سے تیس روپے لیے تھے۔ تین سال میں تیس کے سو ہو گئے۔ اس وقت اسٹامپ لکھا گیا۔ دو سال میں اس پر پچاس روپے سود چڑھ گیا تھا۔

ہوری بولا ''سیٹھانی نیت تو کبھی بگاڑی، اگر بھگوان چاہیں گے تو پائی پائی چکا دوں گا۔ ہاں آج کل تنگ ہو گیا ہوں، جو چاہے کہہ لو۔''

سیٹھانی کو جاتے دیر نہیں ہوئی تھی کہ منگرو ساہ آ پہنچے۔ سیاہ رنگ، تو ند کمر کے نیچے لٹکتی ہوئی، دو بڑے بڑے دانت سامنے جیسے کاٹ کھانے کو نکلے ہوں، سر پر ٹوپی، گلے میں چادر، عمر ابھی پچاس سے زیادہ نہیں مگر لاٹھی کے سہارے چلتے تھے۔ گٹھیا کا عارضہ تھا، کھانسی بھی آتی تھی۔ لاٹھی ٹیک کر کھڑے ہو گئے اور ہوری کو ڈانٹ بتائی ''پہلے ہمارے روپے دے دو ہوری، تب اوکھ کاٹو۔ ہم نے روپے ادھار دیئے تھے، دان نہیں دیا تھا۔ تین تین سال ہو گئے، نہ سود نہ بیاج مگر یہ نہپ سمجھنا کہ تم میرے روپے ہجم (ہضم) کر جاؤ گے۔ میں تمہارے مردے سے بھی وصول کر لوں گا۔''

سوبھا مسخرا تھا۔ بولا۔ ''تب کاہے کو گھبراتے ہو ساہ جی؟ اس کے مردے سے وصول کر لینا۔ نہیں ایک دو سال کے آگے پیچھے دونوں ہی سرگ میں پہنچو گے، تب وہیں بھگوان کے آگے اپنا حساب چکا لینا۔''

منگروے نے سوبھا کو بہت برا بھلا کہا۔ جمع مار، بے ایمان وغیرہ ''لینے کی باری تو دم ہلاتے ہو اور جب دینے کی باری آتی ہے تو گراتے (غراتے) ہو۔ گھر بکوا لوں گا، بیل بدھے نیلا کرا لوں گا۔''

سوبگھا نے پھر چھیڑا۔ ''اچھا ایمان سے بتا ساہ جی! کتنے روپے دیئے تھے جس کے اب تین سو ہو گئے ہیں؟''

''جب تم سال کا سال سود نہ دو گے تو آپ ہی بڑھیں گے۔''

''پہلے پہل کتنے روپے دیئے تھے تم نے؟ پچاس ہی تو!''

''کتنے دن ہوئے یہ بھی تو دیکھ۔''

''دس سال ہو گئے پورے! گیارہواں جا رہا ہے۔''

''پچاس روپے سے تینس ولیتے ہو، تمہیں تنک بھی سرم نہیں آتی؟''

''سرم کیسی؟ روپے دیئے ہیں کہ کھیرات (خیرات) مانگتے ہیں۔''

ہوری نے انہیں بھی منت سماجت کر کے رخصت کیا۔ داتا دین نے ہوری کی شرکت میں کھیتی کی تھی۔ بیج دے کر آدھی فصل لے لیں گے۔ اس وقت کچھ چھیڑ چھاڑ کرنا مصلحت کے خلاف تھا۔ جھنگری سنگھ نے مل کے منیجر سے پہلے ہی سب کچھ کہہ سن رکھا تھا۔ ان کے پیادے گاڑیوں پر اوکھ لدوا کر ناؤ پر پہچا رہے تھے۔ ندی گاؤں سے نصف میل پر تھی۔ ایک گاڑی دن بھر میں سات آٹھ چکر کر لیتی تھی اور ناؤ ایک کھیوے میں پچاس گاڑیوں کا بوجھ لاد لیتی تھی۔ اس طرح بڑی کفایت ہوتی تھی۔ اس سہولت کا بندوبست کر کے جھنگری سنگھ نے سارے علاقے کو اپنا ممنون بنا لیا تھا۔

تول شروع ہوتے ہی جھنگری نے مل کے پھاٹک پر آسن جما لیا۔ ہر ایک کی ایکھ تولاتے تھے، قیمت کا پرزہ لیتے تھے، خزانچی سے روپے وصول کرتے تھے اور اپنی یافتی کاٹ کر آسامی کو دے دیتے تھے۔ آسامی کتنا ہی روئے چیخے، مگر وہ کسی

کی نہ سنتے تھے۔ مالک کا یہی حکم تھا، ان کا کیا بس؟

ہوری کو ایک سو بیس روپے ملے۔ اس میں سے جھنگری نے اپنا کل روپے مع سود کاٹ کر کوئی پچیس روپے ہوری کے حوالے کیے۔

ہوری نے روپے کی طرف بے غرضانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ ''یہ لے کر میں کیا کروں گا ٹھاکر؟ یہ بھی تم ہی لے لو۔ میرے لیے مجوری بہت ملے گی۔''

جھنگری نے پچیس روپے زمین پر پھینک کر کہا۔ ''لو پھینک دو، تمہاری خوشی۔ تمہارے کارن مالک کی گھرکیاں کھائیں اور ابھی رائے صاحب سر پر سوار ہیں کہ ڈنڈ کے روپیا دا کرو۔ تمہاری گریبی (غریبی) پر ترس کھا کر اتنے روپے دیتا ہوں، نہیں تو ایک دھیلا بھی نہ دیتا۔ اگر رائے صاحب نے کڑائی کی تو الٹے اور گھر سے دینے پڑیں گے۔''

ہوری نے چپکے سے روپے اٹھا لیے اور باہر نکلا کے نوکھے رام نے للکارا۔ ہوری نے جا کر پچیس روپے ان کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بلا کچ کہے فوراً بھاگ گیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔

سوبھا کو بھی اتنے ہی روپے ملے تھے، وہ باہر نکلا تو پٹیشوری نے آ گھیرا۔

سوبھا بدل پڑا۔ بولا۔ ''میرے پاس روپے نہیں ہیں، تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر لو۔''

پٹیشوری نے گرم ہو کر کہا۔ ''او کھ بیچی ہے کہ نہیں؟''

''ہاں بیچی ہے۔''

''تمہارا یہی وعدہ تو تھا کہ او کھ بیچ کر روپیہ دوں گا؟''

''ہاں تھا تو۔''

''پھر کیوں نہیں دیتے؟ اور سب لوگوں کو دیئے ہیں کہ نہیں؟''

''ہاں دیئے ہیں۔''

''تو مجھے کیوں نہیں دیتے؟''

''میرے پاس اب جو کچھ بچا ہے وہ بال بچوں کے لیے ہے۔''

پٹیشوری نے دھمکا کر کہا۔ ''تم روپے دو گے سو بھا اور ہاتھ جوڑ کر اور آج ہی۔ ابھی جتنا چاہو بہک لو۔ ایک رپٹ میں جاؤ گے چھ مہینے کو، پورے چھ مہینے کو، نہ ایک دن کم نہ جیادہ (زیادہ) یہ جوروج (روز) جوا کھیلتے ہو، وہ ایک رپٹ میں نکل جائے گا۔ میں جمیندار (زمیندار) یا مہاجن کا نوکر نہیں ہوں۔ میں سرکار بہادر کا نوکر ہوں، جس کا دنیا بھر میں راج ہے اور جو تمہارے مہاجن جمیندار دونوں کا مالک ہے۔''

پٹیشوری نے لال آگے بڑھ گئے۔ سو بھا اور ہوری کچھ دور چپ چاپ چلے، گویا اس دھمکی نے انہیں بدحواس کر دیا ہو۔ پھر ہوری نے کہا۔ ''سو بھا اس کے روپے دے دو۔ سمجھ لو کہ اوکھ میں آگ لگ گئی۔ میں نے بھی یہی سوچ کر جی کو سمجھا لیا ہے۔''

سو بھا نے چوٹ کھائے ہوئے لہجہ سے کہا۔ ''ہاں دے دوں گا دادا۔ نہ دوں گا تو جاؤں گا کہاں؟''

سامنے سے گرد دھرتا ڑی پڑے ہوئے جھومتا چلا آتا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر بولا۔ ''جھنگریا نے سب کا سب لے لیا، ہوری کا کا۔ چبینا کو بھی ایک پیسہ نہ چھوڑا۔ ہتیا

را کہیں کا! رویا، گڑگڑایا مگر اس پاپی کو دیا نہ آئی۔''

سوبھا نے کہا ''تاڑی تو پیے ہوئے ہو، اس پر کہتے ہو کہ ایک پیسہ نہ چھوڑا۔''

گردھر نے پیٹ دکھا کر کہا۔ ''سانجھ ہوگئی، جو پانی کی بوند بھی گلے کے نیچے گئی ہو! ایک اکنی منہ میں دبالی تو سواسی کی تاڑی پی لی۔ سوچا کہ سال بھر پسینہ بہایا ہے تو ایک دن تاڑ تو پی لوں۔ مگر سچ کہتا ہوں کہ نسہ نہیں ہے۔ ایک آنے میں نسہ کیا ہوگا؟ ہاں جھوم رہا ہوں جس میں لوگ سمجھیں کہ بہت پیے ہوئے ہے۔ بڑا اچھا ہوا کاکا، بیبا کی (بیباقی) ہوگئی، بیس لیے تھے جس کے ایک سو ساٹھ بھرے، کچھ حد ہے۔''

ہوری گھر پہنچا تو روپا پانی لے کر دوڑی، سونا چلم بھر لائی، دھنیا نے چربن اور نمک لا کر رکھ دیا اور سبھی آس بھری آنکھوں سے اس کی طرف تاکنے لگیں۔ دھنیا بھی چوکھٹ پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ ہوری اداس بیٹھا تھا، کیسے منہ ہاتھ دھوئے؟ کیسے چربن چبائے؟ ایسا نادم اور ملول تھا گویا خون کر کے آیا ہو۔

دھنیا نے پوچھا۔ ''کتنے کی تول ہوئی؟''

''ایک سو بیس ملے، پر سب وہیں لٹ گئے، دھیلا بھی نہ بچا۔''

دھنیا سر سے پیر تک جل گئی۔ دل میں ایسا اشتعال ہوا کہ اپنا منہ نوچ ڈالے۔ بولی۔ ''تم جیسا بدھو آدمی بھگوان نے کیوں بنایا؟ کہیں ملتے تو ان سے پوچھتی۔ تمہارے ساتھ ساری جندگی (زندگی) مٹی ہوگئی۔ بھگوان موت بھی نہیں دیتے کہ اس جنجال سے جی چھوٹے۔ اٹھا کر سب روپے اپنے بہنوئیوں کو دے دیئے، اب اور کون آمدنی ہے جس سے گوئیں آوے گی؟ میں کیا مجھے جوتو گے یا آپ جتو گے؟

میں کہتی ہوں کہ تم بوڑھے ہوئے اور تمہیں اتنی اکل (عقل) بھی نہیں آئی کہ گوئیں بھر کے روپے تو نکال لیتے۔ کوئی تمہارے ہاتھ سے چھین تھوڑے ہی لیتا پوس کی یہ سردی اور کسی کے تن پر لتا نہیں ہے۔ لے جاؤ سب ندی میں ڈبا دو! رو رو کر مرنے سے تو ایک دن مر جانا اچھا ہے۔ کب تک پوال میں گھس کر رات کاٹیں گے؟ اور پوال میں گھس بھی رہیں تو پوال کھا کر رہا تو نہ جائے گا۔ تمہاری اچھا ہو گھاس ہی کھاؤ، پر ہم سے گھاس نہ کھائی جائے گی۔''

یہ کہتے کہتے وہ مسکرا پڑی۔ اتنی دیر میں اس کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی تھی کہ مہاجن جب سر پر سوار ہو جائے اور اپنے ہاتھ میں روپے ہوں اور مہاجن جانتا ہو کہ اس کے پاس روپے ہیں تو اسامی اپنی جان کیسے بچا سکتا ہے؟

ہوری سر جھکائے اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ دھنیا کا مسکرانا اسے نہ دکھائی دیا۔ بولا ''مجوری تو ملے گی۔ مجور کر کے کھائیں گے۔''

دھنیا نے پوچھا۔ ''کہاں ہے، اس گاؤں میں مجوری؟ اور کون منہ لے کر مجوری کرو گے؟ مہتو نہیں کہلاتے!''

ہوری نے حقے کے کئی کش لگا کر کہا۔ ''مجوری کرنا کوئی پاپ نہیں ہے۔ مجور بن جائے تو کسان ہو جاتا ہے اور کسان بگڑ جائے تو مجور ہو جاتا ہے۔ مجوری کرنا بدا نہ ہوتا تو یہ سب بپت کیوں آتی؟ کیوں گائے مرتی؟ کیوں لڑکا نالایک (نالائق) نکل جاتا؟''

دھنیا نے بہو بیٹیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم سب کی سب کیوں گھیرے کھڑی ہو؟ جا کر اپنا کام دیکھو۔ وہ اور ہیں جو باہر سے آتے ہیں تو بال بچوں کے

لیے دو چار پیسے کا کچھ لیے آتے ہیں۔ یہاں تو یہ لالچ لگ رہا ہو گا کہ روپیہ تڑواویں کیسے؟ ایک کم نہ ہو جائے گا! اسی سے ان کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی۔ جو کھرچ (خرچ) کرتے ہیں انہیں ملتا ہے۔ جو نہ کھا سکیں، نہ پہن سکیں انہیں روپیہ ملے ہی کیوں؟ دھرتی میں گاڑنے کے لیے؟''

ہوری نے ہنس کر پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ گڑی ہوئی جمع؟''

''جہاں رکھی ہے، وہیں ہو گی۔ رونا تو یہی ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی پیسے کے لیے مرتے ہو! چار پیسے کا کچھ لا کر بچوں کے ہاتھ پر رکھ دیتے تو پانی نہ پڑ جاتے۔ جھنگری سے تم کہہ دیتے کہ ایک روپیہ مجھے دے دو۔ نہیں تو میں تمہیں ایک پیسہ نہ دوں گا، جا کر عدالت میں لینا، تو وہ جرور (ضرور) دیتا۔''

ہوری شرمندہ ہو گیا۔ اگر وہ جھلا کر پچیسوں روپے نوکھے رام کو نہ دیتا تو وہ کیا کر لیتے؟ بہت ہوتا تو بقایا پر دو چار آنہ سود لے لیتے۔ مگر اب تو بھول ہو گئی۔

جھنیا نے اندر جا کر سونا سے کہا۔ ''مجھے دادا پر بڑی دیا آتی ہے۔ بیچارے دن بھر کے تھے ماندے گھر آئے تو اماں کو سنے لگیں۔ مہاجن گلا دبائے تھا تو کیا کرتے؟''

''تو بیل کہاں سے آویں گے؟''

''مہاجن اپنے روپے چاہتا ہے۔ اسے تمہارے گھر کے دکھڑوں سے کیا مطلب؟''

''اماں وہاں ہوتیں تو مہاجن کو مجا (مزہ) چکھا دیتیں۔ ابھاگا رو کر رہ جاتا۔''

جھنیا نے مذاق کیا۔ ''تو یہاں روپیوں کی کون کمی ہے؟ تم مہاجن سے تنک

ہنس کر بول دو پھر دیکھو وہ سارے روپے چھوڑ دیتا ہے کہ نہیں۔ سچ کہتی ہوں کہ دادا کا سب دکھ دلدر دور ہو جائے۔''

سونا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ دبا کر کہا۔ ''بس چپ ہی رہنا نہیں کہے دیتی ہوں، ابھی جا کر اماں سے ماتا دین کی ساری بات کھول دوں تو رونے لگو۔''

جھنیا نے پوچھا۔ ''کیا کہہ دو گی اماں سے؟ کہنے کی کوئی بات بھی ہو۔ جب وہ کسی بہانے سے گھر آ جاتے تو کیا کہہ دوں کہ نکل جاؤ؟ پھر مجھ سے کچھ لے تو نہیں جاتے، کچھ اپنا ہی دے جاتے ہیں۔ سوائے میٹھی میٹھی باتوں کے وہ جھنیا سے کچھ نہیں پا سکے اور اپنی میٹھی باتوں کو مہنگے داموں بیچنا بھی مجھے آتا ہے۔ میں ایسی نادان نہیں ہوں کہ کسی کے جھانسے میں آ جاؤں۔ ہاں جب جاؤں گی کہ تمہارے بھیا نے وہاں کسی کو رکھ لیا ہے تب کی نہیں چلاتی۔ تب میرے اوپر کسی کا کوئی بندھن نہ رہے گا۔ ابھی تو مجھے بسواس ہے کہ وہ میرے ہیں اور میرے ہی کارن انہیں گلی گلی ٹھوکر کھانا پڑ رہا ہے۔ ہنسنے بولنے کی بتا اور ہے، پر میں ان سے بسواس گھات نہ کروں گی۔ جو ایک سے دو کا ہوا، وہ کسی کا نہیں رہتا۔''

سوبھا نے آ کر ہوری کو پکارا اور پٹیشوری کے روپے اس کے ہاتھ میں رکھ کر بولا۔ ''بھیا! تم جا کر یہ روپے لالا کو دے دو۔ مجھے اس گھڑی نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔''

ہوری روپے لے کر اٹھا ہی تھا کہ سنکھ کی آواز کانوں میں آئی۔ گاؤں کے دوسرے سرے پر دھنیان سنگھ نامی ایک ٹھاکر رہتے تھے۔ فوج میں نوکر تھے اور کئی دن ہوئے کہ دس سال بعد رخصت لے کر آئے تھے۔ بغداد، عدن، سنگاپور، برما،

چاروں طرف گھوم چکے تھے۔ اب بیاہ کرنے کی فکر تھی۔ اسی لیے پوجا پاٹ کر کے برہمنوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔

ہوری نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ ساتوں ادھیائے پورے ہو گئے۔ آرتی ہو رہی ہے۔''

سوبھا بولا ''ہاں معلوم ہوتا ہے، چلو آرتی لے لیں۔''

ہوری نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔ ''تم جاؤ، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

دھیان سنگھ جس دن آئے تھے، سب کے گھر سیر سیر بھر مٹھائی بائن میں بھیجی تھی۔ ہوری سے جب کبھی راستے میں مل جاتے تو خیر و عافیت پوچھتے۔ ان کی کتھا میں جا کر آرتی میں کچھ نہ دینا ذلت کی بات تھی۔

آرتی کا تھال ان ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ ان کے سامنے ہوری کیسے خالی ہاتھ آرتی لے گا۔ اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ وہ کتھا میں جائے ہی نہیں۔ اتنے آدمیوں میں انہیں کیا یاد آئے گی کہ ہوری نہیں آیا۔ کوئی رجسٹر لیے تو بیٹھا نہیں کہ کون آیا۔ وہ جا کر طارپائی پر لیٹ رہا۔

مگر وہ دل مسوس مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے، تانبے کا ایک پیسہ! آرتی کے پن اور مہاتم کا اسے بالکل دھیان نہ تھا۔ بات تھی صرف بیوہار کی، ٹھاکر جی کی آرتی ہو تو وہ صرف اتنی بھگتی کی بھینٹ دے سکتا تھا مگر رواج کیسے توڑے؟ سب کی نگاہوں میں لوچ کیسے بنے؟

دفعتاً وہ اٹھ بیٹھا۔ کیوں رواج کی غلامی کرے؟ رواج کی غلامی کرے؟ رواج کے لیے آرتی کا پن کیوں چھوڑے؟ لوگ ہنسیں گے تو ہنس لیں، اسے پروا نہیں

ہے۔بھگوان اسے برے کاموں سے بچائے رکھیں اور وہ کچھ نہیں چاہتا۔

وہ ٹھاکر کے گھر کی طرف چل پڑا۔

----------اختتام----------حصہ اول-----

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کھنا اور گوبندی میں نہیں پٹتی ۔ کیوں نہیں پٹتی ، یہ بتلانا مشکل ہے۔ نجوم کے نقطۂ خیال سے ان کے ستاروں میں کوئی مخالفت ہے، حالانکہ شادی کے وقت ان سب کی پوری مطابقت کر لی گئی تھی ۔ کوک شاستر کے حساب سے اس کی ان بن کوئی اور بھید ہوسکتا ہے اور نفسیات والے کچھ اور ہی سبب کھوج سکتے ہیں، ہم ہی جانتے ہیں کہ ان میں نہیں بنتی ۔ کھنا دولتمند ہیں، حسن پرست ہیں، ملنسار ہیں، شکیل ہیں، خاصے پڑھے لکھے ہیں اور شہر کے خاذص لوگوں میں ہیں۔ گوبندی حور نہ ہو مگر خوبصورت ضرور ہے ۔ گندمی رنگ، شرمیلی آنکھیں ، جو سامنے ایک بار اٹھ کر پھر جھک جاتی ہیں، رخساروں پر سرخی نہ ہو مگر چکناہٹ ہے، نازک بدن، اعضاء کا تناسب درست، گول گول بازو، چہرہ پر ایک طرح کی بدمزگی جس میں کچھ غرور کی جھلک بھی ہے، گویا دنیا کے کاروبار کو ہیچ سمجھتی ہے۔ کھنا کے پاس عیش کے ظاہری سامانوں کی کمی نہیں ۔ اعلیٰ درجے کا بنگلہ ہے، اعلیٰ درجے کا فرنیچر، اعلیٰ درجے کا موٹر اور بے انتہا دولت، مگر گوبندی کی نظر میں گویا ان اشیاء کی کوئی وقعت نہیں ۔ اس کھارے سمندر میں وہ پیاسی پڑی رہتی ہے ۔ بچوں کی پرورش و پرداخت اور گرہستی کے چھوٹے موٹے کام ہیاس کے لیے سب کچھ ہیں۔ وہ ان میں اتنی منہمک رہتی ہے کہ عیش وعشرت کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں جاتا ۔ کشش کیا چیز ہے اور وہ کیسے پیدا ہوسکتی ہے، اس پر اس نے کبھی غور نہیں کیا۔ وہ مرد کا کھلونا نہیں،

نہ اس کی لطف آفرینی کی چیز ہے، پھر کیوں دلکش بننے کی کوشش کرے؟ اگر مرد اس کا اصلی حسن دیکھنے کے لیے آنکھیں نہیں رکھتا، حسینوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے تو یہ اس کی بدقسمتی ہے۔ وہ اسی محبت اور سی لگن سے شوہر کی خدمت کیے جاتی ہے، گویا نفرت اور رغبت کے جذبات کو مغلوب کر لیا اور یہ بے انتہا دولت تو تو جیسے اس کی روح کچلتی رہتی ہے، دباتی رہتی ہے، اس نمود و نمائش سے چھٹکارا پانے کے لیے اس کا جی ہمیشہ للچایا کرتا ہے۔ اپنی سادہ اور قدرتی زندگی میں وہ کتنا خوش رہ سکتی ہے، اس کا وہ ہمیشہ خواب دیکھتی رہتی ہے۔ تب کیوں مالتی اس کی راہ میں آ کر حائل ہو جاتی، کیوں طوائفوں کے مجرے ہوتے، کیوں یہ شک اور تصنع اور بے اطمینانی اس کی زندگی کے راستے میں کانٹا بنتے؟ بہت پہلے جب وہ بالکا و دیالیہ میں پڑھتی تھی، اسے شاعری کا روگ لگ گیا تھا جس میں درد و غم ہی زندگی کا ماحصل ہے۔ دولت اور عشرت تو صرف اس لیے ہیں کہ ان کی ہولی جلائی جائے، جو انسانی کو لغویت اور پریشانی کی طرح لے جاتی ہے، وہ اب بھی کبھی کبھی شعر کہتی تھی۔ مگر سنائے کسے؟ اس کی نظم صرف دل کی لہر اور تخیل کی اڑان نہ تھی بلکہ اس کے ایک ایک لفظ میں اس کی زندگی کا درد اور اس کے آنسوؤں کی ٹھنڈی جلن بھری ہوتی تھی۔ کسی ایسی جگہ جا بسنے کی خواہش تھی جہاں وہ ظاہر داریوں اور رغبتوں سے دور رہ کر اپنی پرسکون کٹی میں قدرتی مسرت کا لطف اٹھائے۔ کھنا اس کے اشعار دیکھتے تو مضحکہ اڑاتے اور کبھی کبھی پھاڑ کر پھینک بھی دیتے اور دولت کی یہ دیوار روز بروز بلند ہوتی جاتی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے سے دور اور جدا کرتی جاتی تھی۔ کھنا اپنے گاہکوں کے ساتھ جتنا ہی میٹھا اور نرم تھا، گھر میں اتنا ہی تلخ اور سخت۔ اکثر

غصے میں گوبندی کو بری بات کہہ بیٹھتا، خوش خلقی اس کے لیے صرف دنیا کو ٹھگنے کا ایک ذریعہ تھی، انسانی سرشت نہیں۔ ایسے موقعوں پر گوبندی اپنے سونے کے کمرے میں جا بیٹھتی اور رات کی رات رویا کرتی اور کھنا دیوان خانے میں مجرے سنتا یا کلب میں جا کر شراب کی بوتلیں خالی کرتا، لیکن یہ سب کچھ ہونے پر بھی کھنا اس کے سب کچھ تھے۔ وہ پامال اور ذلیل ہو کر بھی کھنا کی لونڈی تھی۔ اس سے لڑے گی، جلے گی، روئے گی، مگر رہے گی اسی کی۔ ان سے جدا گانہ زندگی کا وہ کوئی خیال ہی نہ کر سکتی تھی۔

آج مسٹر کھنا کسی برے کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔ سویرے ہی اخبار کھولا تو ان کے کئی اسٹاکوں کا نرخ گھٹ گیا تھا جس میں انہیں کئی ہزار کا نقصان ہوتا تھا۔ شکر مل کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی اور فساد کرنے پر آمادہ تھے۔ نفع کی امید پر چاند خریدی تھی مگر اس کا بھاؤ آج اور بھی زیدہ گر گیا تھا۔ رائے صاحب سے جو سودا ہو رہا تھا اور جس میں انہیں بڑے نفع کی امید تھی وہ کچھ دنوں کے لیے ٹلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پھر رات کو زیادہ پی جانے کے سبب اس وقت دردسر اور اعضا شکنی کا غلبہ تھا۔ ادھر شوفر نے موٹر کے انجن میں کچھ خرابی پیدا ہو جانے کی بات کہی تھی اور لاہور میں مان کے بینک پر ایک دیوانی مقدمہ دائر ہو جانے کی خبر بھی ملی تھی۔ بیٹھے ہوئے دل میں جھنجلا رہے تھے کہ اسی وقت گوبندی نے کہا۔ ''بھیشم کا بخار آج بھی نہیں اترا، کسی ڈاکٹر کو بلا لو۔''

بھیشم ان کا سب سے بڑا لڑکا تھا اور پیدائشی کمزور ہونے کے سبب اسے روز ہی ایک نہ ایک شکایت رہا کرتی تھی۔ آج کھانسی ہے تو کل بخار، کبھی پسلی چل رہی

ہے، کبھی ہرے پیلے دست آ رہے ہیں۔ دس مہینے کا ہو گیا تھا مگر لگتا تھا پانچ چھ مہینے ہی کا۔ کھنا نے سوچ لیا تھا کہ یہ لڑکا بچے گا نہیں، پس اس کی طرف سے بے پروا رہتے تھے مگر گوبندی اسی وجہ سے اس کو اور سب بچوں سے زیادہ چاہتی تھی۔

کھنا نے پدرانہ شفقت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''بچوں کو دواؤں کا عادی بنا دینا ٹھیک نہیں اور تمہیں دوا دیتے رہنے کا مرض ہے۔ ذرا کچھ ہوا اور ڈاکٹر بلاؤ۔ ایک روز اور دیکھو، آج تیسرا ہی دن تو ہے، شاید آج خود بخود اتر جائے۔''

گوبندی نے اصرار کیا۔ ''تین دن سے نہیں اترا، دائی دوا میں کر کے ہار گئی۔''

کھنا نے پوچھا ''اچھا بات ہے، بلائے دیتا ہوں کسے بلاؤں؟''

''بالو ڈاکٹر ناگ کو۔''

''اچھی بات ہے ان ہی کو بلاتا ہوں، مگر یہ سمجھ لو کہ نام ہو جانے ہی سے کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں ہو جاتا۔ ناگ فیس خواہ جتنی لے لیں مگر ان کی دوا سے کسی کو شفا پاتے نہیں دیکھا۔ وہ تو مریضوں کو جنت ہی بھیجنے کے لیے مشہور ہیں۔''

''تو جسے چاہو اسے بلا لو۔ میں نے تو ناگ کو اس لیے کہا تھا کہ وہ کئی بار آ چکے ہیں۔''

''مس مالتی کو کیوں نہ بلا لوں؟ فیس بھی کم اور بچوں کا حال لیڈی ڈاکٹر جیسا سمجھے گی، ویسا کوئی مرد ڈاکٹر نہیں سمجھ سکتا۔''

گوبندی نے جل کر کہا۔ ''میں مس مالتی کو ڈاکٹر نہیں سمجھتی۔''

کھنا نے تیز تیز دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو وہ انگلستان کا گھاس کھودنے گئی تھیں اور آج ہزاروں آدمیوں کی جان بچا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ چیز نہیں ہے؟''

''ہوگا۔ مجھے ان پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ مردوں کے دل کا علاج کرلیں اور کسی کی دوا ان کے پاس نہیں ہے۔''بس ٹھن گئی۔ کھنا گرج اٹھے بندی برس پڑی۔ ان کے درمیان مالتی کا نام آجان ہی گویا اعلان جنگ تھا۔

کھنا نے سارے کاغذات زمین پر پھینک کر کہا ''تمہارے ساتھ زندگی تلخ ہو گئی۔''

گوبندی نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تو مالتی سے بیاہ کرلو نا! ابھی کیا بگڑا ہے، اگر وہاں دال گلے؟''

''تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟''

''یہی کہ مالتی تم جیسوں کو اپنا غلام کر رکھنا چاہتی ہے، مالک بنا کر نہیں۔''

''تمہاری نگاہ میں اتنا ذلیل ہوں!''

اور انہوں نے اس کے خلاف ثبوت دینا شروع کیا۔ مالتی جتنی ان کی عزت کرتی ہے، اتنی شاید ہی کسی کی کرتی ہو۔ رائے صاحب اور راجہ صاحب کو منہ تک نہیں لگاتی، مگر ان سے ایک دن بھی ملاقات نہ ہو تو شکایت کرتی ہے.....

گوبندی نے ان ثبوتوں کو ایک پھونک میں اڑا دیا۔ ''اسی لیے کے وہ تمہیں سب سے زیادہ آنکھوں کا اندھا سمجھتی ہے، دوسروں کو اتنی آسانی سے بیوقوف نہیں بنا سکتی۔''

کھنا نے ڈینگ ماری۔ ''چاہو تو آج مالتی سے بیاہ کر سکتا ہوں۔ آج، ابھی.....''

مگر گوبندی کو بالکل یقین نہیں ہے۔ ''تم سات جنم تک ناک رگڑو تو بھی وہ تم

سے بیاہ نہ کرے گی۔تم اس کے ٹٹو ہو،گھاس کھلائے گی،کبھی کبھی تمہارا منہ سہلائے گی،تمہارے پٹھوں پر ہاتھ پھیرے تھے۔ بولے۔''تمہارے خیال میں، میں احمق اور نادان ہوں تو یہ ہزاروں کیوں میرے دروازے پر ناک رگڑتے ہیں؟ کون راجہ یا تعلقدار ہے جو مجھے سجدہ نہیں کرتا۔سیکڑوں کو الو بنا کر چھوڑ دیا۔''

''یہی تو مالتی کی خصوصیت ہے کہ جو اوروں کو سیدھے استرے سے مونڈتا ہے،اسے وہ الٹے چھرے سے مونڈتی ہے۔''

''تم مالتی کی چاہے جتنی برائی کرو،تم اس کے پاؤں کی دھول بھی نہ ہو۔''

''میری نظر میں تو وہ بیسواؤں سے گئی گزری ہے کیونکہ پردے کی آڑ سے شکار کھیلتی ہے۔''

دونوں نے اپنے اپنے آتشیں تیر سر کیے۔کھنا نے گوبندی کو کوئی دوسری سخت سے سخت بات کہی ہوتی تو اسے اتنی بری نہ لگتی،مگر مالتی سے اس کا یہ نفرت انگیز مقابلہ اس کی برداشت کے باہر تھا۔گوبندی نے بھی کھنا کو خواہ جو کچھ ہوتا وہ اتنے گرم نہ ہوتے۔لیکن مالتی کی یہ تحقیر وہ نہ سہہ سکتے تھے۔وہ ایک دوسرے کے کمزور مقامات سے واقف تھے،دونوں کے نشانے ٹھیک بیٹھے اور دونوں تڑپ اٹھے۔کھنا کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔گوبندی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔کھنا جوش میں اٹھے اور اس کے دونوں کان پکڑ کر زور سے مل دیئے اور پھر تین چار طمانچے بھی لگا دیئے گوبندی روتی ہوئی اندر چلی گئی۔

ذرا دیر میں ڈاکٹر ناگ آئے اور سول سرجن مسٹر ڈاڈ آئے اور دیدراج نیلکنٹھ شاستری آئے مگر گوبندی اپنے بچے کو لیے کمرے میں بیٹھی رہی۔کس نے کیا کہا،

کیا تشخیص کی، اسے کچھ معلوم نہیں۔ جس مصیبت کا وہ خیال کر رہی تھی، وہ آج اس پر آ گئی۔ کھنا نے گویا آج اس سے ناتا توڑ لیا، جیسے اسے گھر سے نکال کر دروازہ بند کر لیا۔ جو حسن کا بازار لگا کر بیٹھی ہے جس کا سایہ بھی وہ اپنے اوپر نہیں پڑنے دینا چاہتی، وہ.....اس پر درپردہ حکومت کرے، یہ نہ ہوگا! کھنا اس کے شوہر ہیں، ان کو اسے سمجھانے بجھانے کا حق ہے، ان کی مار بھی وہ سہہ سکتی ہے مگر مالتی کی حکومت !ناممکن بچے کا بخار جب تک اتر نہ جائے وہ ہل نہیں سکتی۔ خودداری کو بھی فرض کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔

دوسرے روز بچے کا بخار اتر گیا تھا۔ گوبندی نے ایک تانگہ منگوایا اور گھر سے نکلی۔ جہاں اس کی اتنی بےعزتی ہو، وہاں وہ اب نہیں رہ سکتی۔ صدمہ اتنا سخت تھا کہ بچوں کی محبت بھی دور ہو گئی تھی۔ ان کے متعلق اس کا جو فرض تھا، اسے وہ پورا کر چکی ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ کھنا کا فرض ہے، ہاں۔ گود کے بچے کو وہ کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ اس کی جان کے ساتھ ہے اور وہ اس گھر سے صرف اپنی جان لے کر نکلے گی اور کوئی چیز اس کی نہیں ہے۔ انہیں یہ دعویٰ ہے کہ اس کی پرورش کرتے ہیں، گوبندی دکھا دے گی کہ ان کے آسرے سے الگ ہو کر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ تینوں بچے اس وقت کھیلنے گئے تھے۔ گوبندی کا جی چاہا کہ ایک مرتبہ انہیں پیار کر لے، مگر وہ کہیں بھاگی تو نہیں جاتی۔ بچوں کو اس سے محبت ہوگی تو اس کے پاس جائیں گے، اس کے گھر میں کھیلیں گے۔ جب وہ ضرورت سمجھے گی تو خود بچوں کو دیکھ جایا کرے گی۔ صرف کھنا کا سہارا نہیں لینا چاہتی۔

شام ہو گئی تھی۔ پارک میں خوب چہل پہل تھی۔ لوگ ہری گھاس پر لیٹے

ہوئے ہوا خوری کا لطف اٹھا رہے تھے۔ گوبندی حضرت گنج ہوتی ہوئی چڑیا گھر کی طرف مڑی تھی کہ موڑ پر مالتی اور کھنا سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اسے معلوم ہوا کہ کھنا نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا اور مالتی مسکرائی۔ نہیں، شاید یہ اس کا وہم ہو۔ کھنا مالتی سے اس کی ہجو نہ کریں گے، مگر کتنی بیشرم ہے۔ سنا ہے کہ اس کی اچھی پریکٹس ہے، گھر کی بھی مالدار ہے، پھر بھی یوں خود کو فروخت کرتی پھرتی ہے۔ نہ جانے کیوں بیاہ نہیں کر لیتی؟ مگر اس سے بیاہ کرے ہی گا کون؟ نہیں، یہ بات نہیں۔ مردوں میں ایسے بہت گدھے ہیں جو اسے پا کر خود کو خوش نصیب سمجھیں گے، لیکن مالتی خود تو کسی کو پسند کرے۔

اور بیاہ میں کون سا سکھ رکھا ہوا ہے؟ بہت اچھا کرتی ہے جو بیاہ نہیں کرتی۔ ابھی سب اس کے غلام ہیں، تب وہ ایک کی لونڈی ہو کر رہ جائے گی۔ بہت اچھا کر رہی ہے۔ ابھی تو یہ حضرت بھی اس کے تلوے چاٹتے ہیں، اگر کہیں اسے بیاہ کر لے تو اس پر حکومت کرنے لگیں۔ مگر ان سے وہ بیاہ کرے گی! اور سوسائٹی میں دو چار ایسی عورتیں رہیں تو اچھا۔ مردوں کے کان تو گرم کرتی رہیں گی۔

آج گوبندی کے دل میں مالتی سے بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ وہ مالتی پر حملہ کر کے اس کے ساتھ بے انصافی کر رہی ہے۔ کیا میری حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں نہ کھلتی ہوں گی؟ ازدواجی زندگی کی درگت اپنی آنکھوں دیکھ کر اگر وہ اس جال میں نہیں پھنسی تو کیا برا کرتی ہے؟

چڑیا گھر میں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گوبندی نے ٹانگہ روک دیا اور بچے کو لیے ہوئے ہری دوب کی طرف چلی۔ مگر دو تین ہی قدم چلی تھی کہ چپل پانی

میں تر ہو گئے۔ ابھی ذرا ہی دیر پہلیلان سینچا گیا تھا اور گھاس کے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ عجلت میں اس نے پیچھے نہ مڑ کر ایک قدم اور آگے رکھا تو پیر کیچڑ میں سن ہو گئے۔ اس نے پیر کی طرف دیکھا۔ اب یہاں دھونے کو پانی کہاں ملے گا؟ اس کی ساری پریشانی کافور ہو گئی اور پیر دھو کر صاف کرنے کی نئی فکر پیدا ہوئی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ رک گیا۔ جب تک پیر نہ صاف ہو جائیں، وہ کچھ سوچ نہیں سکتی۔

دفعتاً اسے ایک لمبا پائپ گھاس میں چھپا نظر آیا جس میں سے پانی نکل رہا تھا۔ اس نے جا کر پیر دھوئے، چپل دھوئے، ہاتھ منہ دھویا، تھوڑا سا پانی چلو میں لے کر پیا اور پائپ کے اس پار خشک زمین پر جا بیٹھی۔ اداسی میں موت کی یاد فوراً آ جاتی ہے۔ کہیں وہ یہیں بیٹھے مر جائے تو کیا ہو؟ تانگہ والا فوراً جا کر کھنا کو خبر دے گا۔ کھنا سنتے ہی خوش ہو جائیں گے مگر دنیا کو دکھانے کے لیے آنکھوں پر رومال رکھ لیں گے۔ بچوں کے کھلونے اور تماشے ماں سے زیادہ عزیز ہیں ض۔ یہ ہے اس کی زندگی، جس کے لیے کوئی دو بوند آنسو بہانے والا بھی نہیں! پھر اسے وہ دن یاد آیا جب اس کی ساس زندہ تھی اور کھنا بدراہ نہ ہوئے تھے۔ اس وقت اسے ساس کا بات بات پر بگڑنا برا لگتا تھا۔ آج اسے ساس کی اس خفگی میں محبت کی مٹھاس گھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت وہ ساس سے روٹھ جاتی تھی اور ساس اسے دلار سے مناتی تھی۔ آج وہ مہینوں روٹھی پڑی رہے تو کسے پروا؟ یکا یک اس کا من اڑ کر ماں کے چرنوں میں جا پہنچا۔ ہائے، آج اماں ہوتیں تو کیوں اس کی یہ درگت ہوتی؟ ان کے پاس اور کچھ نہ تھا تو محبت بھری گود تو تھی، پیار بھرا آنچل تو تھا، جس

میں وہ منہ ڈال کر رو لیتی، لیکن نہیں، وہ روئے گی نہیں۔ اس دیوی کو سرگ (بہشت) میں دکھی نہ بنائے گی۔ میرے لیے وہ کچھ زیادہ سے زیادہ کر سکتی تھیں، وہ کر گئیں۔ میرے نصیبے کا ساتھی ہونا تو ان کے بس کی بات نہ تھی اور وہ کیوں روئے؟ وہ اب کسی کی ماتحت نہیں ہے، وہ اپنے گزر بسر کے لیے کما سکتی ہے۔ وہ کل ہی گاندھی آشرم سے چیزیں لے کر بیچنا شروع کر دے گی۔ شرم کس بات کی؟ یہی تو ہوگا لکہ لوگ انگلی اٹھا کر کہیں گے کہ وہ جا رہی ہے کھنا کی بیوی! لیکن اس شہر میں رہوں کیوں؟ کسی دوسرے شہر میں کیوں نہ چلی جاؤں، جہاں مجھے کوئی جانتا ہی نہ ہو؟ دس بیس روپے کما لینا ایسا کیا مشکل ہے۔ اپنے پسینے کی کمائی کھاؤں گی، پھر تو کوئی مجھ پر رعب نہ جمائے گا۔ یہ حضرت تو اسی لیے اتنا مزاج کرتے ہیں کہ وہ میری پرورش کرتے ہیں۔ میں خود اب اپنی پرورش کروں گی۔

دفعتاً اس نے مہتا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اسے الجھن ہوئی۔ اس وقت تو بالکل تنہا رہنا چاہتی تھی۔ کسی سے بولنے کی طبیعت نہ تھی۔ مگر یہاں بھی ایک صاحب آ ہی گئے، اس پر بچہ بھی رونے لگا تھا۔

مہتا نے پاس جا کر تعجب سے پوچھا۔ ''آپ اس وقت یہاں سے آ گئیں؟''

گوبندی نے بچے کو چپ کراتے ہوئے کہا۔ ''اسی طرح جیسے آپ آ گئے۔''

مہتا نے مسکرا کر کہا۔ ''میری بات نہ چلائیے، دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ لائیے میں بچے کو چپ کرا دوں۔''

''آپ نے یہ ہنر کب سیکھا؟''

''مشق کرنا چاہتا ہوں، اس کا امتحان جو ہوگا۔''

''اچھا امتحان کے دن قریب آ گئے؟''

''یہ تو میری تیاری پر ہے۔ جب تیار ہوں گا، بیٹھ جاؤں گا۔ چھوٹی چھوٹی سندوں کے لیے ہم پڑھ پڑھ کر آنکھیں پھوڑ لیا کرتے ہیں، پھر یہ تو زندگی کے کاروبار کا امتحان ہے۔''

''اچھی بات ہے، میں بھی دیکھوں گی کہ آپ کس ڈویژن میں پاس ہوتے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے بچے کو ان کی گود میں دے دیا۔ انہوں نے اسے کئی بار اچھالا تو وہ چپ ہو گیا۔ بچوں کی طرح ڈینگ مارتے ہوئے بولے۔ ''دیکھا آپ نے کیسا منتر کے زور سے چپ کرا دیا! اب میں بھی کہیں سے ایک بچہ لاؤں گا۔''

گوبندی نے مذاق کیا۔ ''بچہ لائیے گا یا اس کی ماں بھی؟''

مہتا نے مذاقیہ مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔ ''ایسی عورت تو کہیں ملتی ہی نہیں۔''

''کیوں، مس مالتی نہیں ہیں؟ خوب صورت، تعلیم یافتہ، ہنرمند، دلفریب! اور آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''مس مالتی میں وہ ایک بات بھی نہیں ہے جو میں اپنی اہلیہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

گوبندی نے اس بات کا مزا لیتے ہوئے کہا۔ ''ان میں کیا برائی ہیم، سنوں تو۔ بھونرے ہمیشہ منڈلاتے رہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آج کل مردوں کو ایسی ہی عورتیں پسند آتی ہیں۔''

مہتا نے بچے کے ہاتھوں سے اپنی مونچھیں بچاتے ہوئے کہا۔ ''میری بیوی کچھ

اور ہی قماش کی ہوگی۔ وہ ایسی ہوگی جس کی پوجا کر سکوں۔''

گوبندی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ ''تو آپ عورت نہیں کوئی مورت چاہتے ہیں۔ عورت تو ایسی آپ کو شاید ہی کہیں ملے۔''

''جی نہیں، ایسی ایک دیوی تو اسی شہر میں ہے۔''

''سچ! ذرا میں بھی اس کے درشن کرتی اور اسی طرح بننے کی کوشش کرتی۔''

''آپ اسے خوب جانتی ہیں۔ وہ ایک لکھ پتی کی بیوی ہے۔ مگر عیش و عشرت کو ہیچ سمجھتی ہے، جو بے رخی اور بے عزتی سہہ کر بھی اپنے فرض سے منحرف نہیں ہوتی، جو مادریت کی قربان گاہ پر خود کو بھینٹ چڑھا دیتی ہے، جس کے لیے ایثار ہی سب سے بڑا حق ہے اور جو اس قابل ہے کہ اس کی مورت بنا کر پوجی جائے۔''

گوبندی کے دل میں خوشی کی لہر اٹھی۔ سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کا بہانہ کرتی ہوئی بولی۔ ''ایسی عورت کی آپ تعریف کرتے ہیں مگر میری سمجھ میں تو وہ رحم کے قابل ہے۔''

مہتا نے تعجب سے کہا۔ ''رحم کے قابل! آپ اس کی توہین کرتی ہیں۔ وہ مکمل عورت ہے اور جو مکمل عورت ہو سکتی ہے وہی مکمل بیوی بھی ہو سکتی ہے۔''

''لیکن وہ معیار موجودہ زمانے کے لیے نہیں ہے۔''

''وہ معیار ابدی ہے اور لافانی ہے۔ انسان اسے مٹا کر خود کو مٹا رہا ہے۔''

گوبندی کا دل شگفتہ ہوا جا رہا تھا۔ ایسی لرزشیں وہاں کبھی نہ ہوئی تھیں۔ جن لوگوں سے اس کا تعارف تھا، ان میں مہتا کا درجہ سب سے اونچا تھا۔ ان کی زبان سے یہ حوصلہ افزائی پا کر وہ متوالی ہوئی جا رہی تھی۔ اسی نشہ میں بولی۔ ''تو چلیے مجھے

ان کے درشن کرا دیجیے۔''

مہتا نے بچے کے رخساروں میں منہ چھپا کر کہا۔ ''وہ تو یہیں بیٹھی ہوئی ہیں۔''

''کہاں؟ میں تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔''

''میں اسی دیوی سے بول رہا ہوں۔''

گوبندی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ''آپ نے آج مجھے بنانے کی ٹھان لی ہے، کیوں؟''

مہتا نے عقیدت سے کہا۔ ''دیوی جی! آپ میرے ساتھ ناانصافی کر رہی ہیں اور مجھ سے زیادہ خود اپنے ساتھ۔ دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جن سے میری دلی عقیدت ہو۔ ان ہی میں ایک آپ ہیں۔ آپ کا تحمل، ایثار، اخلاق، سب بے نظیر ہیں۔ میں اپنی زندگی میں سب سے بڑے سکھ کا جو تصور کرتا ہوں وہ آپ جیسی دیوی کے چرنوں کی سیوا ہے۔ جس نسائیت کو میں مکمل مانتا ہوں، آپ اس کی زندہ مثال ہیں۔''

گوبند کی آنکھوں سے خوشی کے آنکل پڑے۔ اس عقیدت کی زرہ کو پہن کر وہ کسی آفت کا مقابلہ نہ کر سکے گی؟ اس کی روئیں روئیں سے جیسے ایک میٹھے گیت کا راگ جاری ہو گیا۔

اس نے اپنی نسوانی خوشی کو ضبط کر کے کہا ''آپ فلسفی کیوں ہوئے مہتا جی؟ آپ کو تو شاعر ہونا چاہیے تھا۔''

مہتا سادگی سے ہنس کر بولے۔ ''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ فلسفی ہوئے بغیر ہی کوئی شاعر ہو سکتا ہے؟ فلسفہ تو محض ایک درمیانی منزل ہے۔''

''تو ابھی آپ شاعری کی راہ میں ہیں، مگر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ شاعر کو دنیا میں کبھی آرام نہیں ملتا؟''

''جسے دنیا رنج کہتی ہے، وہی شاعر کے لیے راحت ہے۔ دولت اور شہرت، محسن اور طاقت، علم اور عقل، یہ برکتیں دنیا کو خواہ کتنا ہی فریفتہ کرتیں مگر شاعر کے لیے ان میں ذرا بھی کشش وموت کی چیز تو میری ہوئی امیدیں، مٹی ہوئی یادگاریں اور ٹوٹے ہوئے دلوں کے آنسو ہیں۔ جس دن ان چیزوں سے اسے محبت نہ رہے گی، اس دن وہ شاعر نہ رہ جائے گا۔ فلسفہ زندگی کے ان بھیدوں سے صرف کھیلتا ہے، مگر شاعر ان میں جذب ہو جاتا ہے۔ میں نے آپ کی دو چار نظمیں پڑھی ہیں اور ان میں جتنا سرور، جتنی لرزش، جتنا میٹھا درد اور جتنی رلانے والی دیوانگی ملی ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ قدرت نے ہمارے ساتھ کتنی بڑی بے انصافی کی ہے کہ اس نے آپ جیسی کوئی دوسری دیوی نہیں بنائی۔''

گوبندی نے حسرت سے بھرے لہجے میں کہا۔ ''نہیں مہتا جی! یہ آپ کا خیال ہے۔ ایسی عورتیں یہاں آپ کو جگہ جگہ ملیں گی اور میں تو ان سب سے گئی گزری ہوں۔ جو عورت اپنے مرد کو خوش نہ رکھ سکے، خود کو اس کی طبیعت کے موافق نہ بنا سکے، وہ بھی کوئی عورت ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ مالتی سے یہ ہنر سیکھوں۔ جہاں میں ناکامیاب ہوں، وہاں وہ کامیاب ہے۔ میں اپنے کو بھی اپنا نہیں بنا سکتی، وہ دوسروں کو بھی اپنا بنا لیتی ہے۔ کیا یہ اس کے لیے فخر کی بات نہیں ہے؟''

مہتا نے منہ بنا کر کہا۔ ''شراب اگر لوگوں کو پاگل کر دیتی ہے تو اسی لیے۔ کیا اسے پانی سے بہتر سمجھا جائے، جو پیاس بجھاتا ہے، جلاتا ہے اور تسکین دیتا ہے؟''

گوبندی نے مذاق سے کہا ''کچھ بھی ہو، میں تو دیکھتی ہوں کہ پانی مارا مارا پھرتا ہے اور شراب کے لیے گھر بار بک جاتا اور پھر شراب جتنی ہی تیز اور نشیلی ہوا تنی ہی اچھی! میں تو سنتی ہوں کہ آپ کو بھی شراب کا شوق ہے۔''

گوبندی مایوسی کی اس حالت میں پہنچ گئی تھی، جب انسان کو سچائی اور دھرم میں بھی شبہ ہونے لگتا ہے، مگر مہتا کا دھیان ادھر نہ گیا۔ ان کا دھیان تو آخری فقرے سے جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ اپنی شراب نوشی پر انہیں جتنی ندامت و پشیمانی آج ہوئی، اتنی بڑی بڑی نصیحتوں سے بھی نہ ہوئی تھی۔ دلائل کا ان کے پاس جواب تھا اور دندان شکن، مگر اس میٹھی چٹکی کا انہیں کوئی جواب نہ سوجھا۔ وہ پچھتائے کہ کہاں سے کہاں انہیں شراب کی بات سوجھی بھی۔ انہوں نے خود مالتی کی مشا بہت شراب سے کی تھی مگر ان کا وار الٹ کر کے سر پر پڑا۔ نادم ہو کر بولے۔ ''ہاں دیوی جی! میں مانتا ہوں کہ مجھ میں وہ شوق ہے۔ میں اپنے لیے اس کی ضرورت بتا کر اور اس کے تخیل افزا اور صاف کا ثبوت دے کر عذر گناہ نہ کروں گا، جو گناہ سے بھی بدتر ہے۔ البتہ آج آپ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ اب شراب کا ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے نہ جانے دوں گا۔''

گوبندی نے سناٹے میں آ کر کہا۔ ''یہ آپ نے کیا کیا، مہتا جی؟ ایشور گواہ ہے کہ میرا یہ مطلب نہ تھا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔''

''نہیں، آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ نے ایک شخص کو ادھار کر دیا۔''

''مجھ سے؟ زہے نصیب!''

گوبندی نے رقت سے کہا۔ ''ہاں آپ کے سوا مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جسے

میں اپنی کہانی سناؤں ۔ دیکھیے یہ بات اپنے ہی تک رکھیے گا، حالانکہ آپ سے ایسا کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اب اپنی زندگی ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ مجھ سے اب تک جتنی تپسیا ہوسکی وہ میں نے کی، لیکن اب نہیں سہا جاتا۔ مالتی مجھے ہر طرح مٹائے ڈالتی ہے۔ میں اپنے کسی ہتھیار سے اس پر فتح نہیں پاسکتی۔ آپ کا اس پر بہت کچھ اثر ہے۔ وہ جتنی آپ کی عزت کرتی ہے، شاید اور کسی مرد کی نہیں کرتی۔ اگر آپ کسی طرح مجھے اس کے پنجے سے چھڑا دیں تو عمر بھر آپ کا احسان مانوں گی۔ اس کے ہاتھوں میں میرا سہاگ لٹا جا رہا ہے۔ آپ اگر مجھے بچا سکتے ہیں تو بچائیے۔ میں آج گھر سے یہ سوچ کر چلی تھی کہ پھر واپس نہ جاؤں گی۔ میں نے بڑا زور مارا کہ موت کی ساری بندشوں کو توڑ کر پھینک دوں، لیکن عورت کا دل بڑا کمزور ہے مہتا جی! عصمت اس کی جان ہے۔ زندہ رہتے ہوئے محبت کو توڑنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ میں نے آج تک اپنا دکھ اپنے ہی دل میں رکھا، مگر میں آج آپ سے آنچل پھیلا کر بھیک مانگی ہوں۔ مالتی سے مجھے چھٹکارا دلائیے۔ میں اس جادوگرنی کے ہاتھوں مٹی جا رہی ہوں.....''

اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ زاروقطار رونے لگی۔

مہتا اپنی نظروں میں کبھی اتنا اونچے نہ اٹھتے تھے۔ اس وقت بھی نہیں، جب ان کی تصنیف کو فرانس کی اکیڈمی نے موجودہ صدی کی بہترین تصنیف قرار دیا تھا اور انہیں مبارکباد دی تھی۔ جس مورت کی وہ سچے دل سے پوجا کرتے تھے، جسے دل میں وہ اپنی عبادت کی دیوی سمجھے ہوئے تھے اور زندگی کے ناقابل فہم معاملات میں جس سے ہدایت پانے کی امید رکھتے تھے، وہ آج سے بھیک مانگ رہی تھی! انہیں

اپنے میں ایسی طاقت کا احساس ہوا کہ وہ پہاڑ کو بھی چکنا چور کر سکتے ہیں اور سمندر کو بھی تیر کر پار کر سکتے ہیں۔ ان پر نشہ سا چھا گیا، جیسے بچہ کسی چوبی گھوڑے پر چڑھ کر یہ سمجھ رہا ہوں کہ وہ ہوا میں اڑا جا رہا ہے۔ کام کتنا مشکل ہے، اس کی خبر نہ رہی۔ اپنے اصولوں کا کتنا خون کرنا پڑے گا۔ اس کا بالکل خیال نہ رہا۔ تسکین کے لہجے میں بولے۔ ''آپ مالتی کی طرف سے بےفکر رہیں۔ وہ آپ کی راہ سے ہٹ جائے گی۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ آپ اس کے سبب سے اتنی دکھی ہیں۔ میری عقل کا قصور، آنکھوں کا قصور، خیال کا قصور اور کیا کہوں؟ ورنہ آپ کو اتنی تکلیف کیوں سہنی پڑتی۔''

گوبندی کو شک ہوا۔ بولی۔ ''مگر شیرنی سے اس کا شکار چھیننا سہل نہیں ہے، یہ سمجھ لیجیے۔''

مہتا نے استقلال سے کہا۔ ''عورت کا دل زمین کی طرح ہے جس سے شیرینی بھی مل سکتی ہے اور تلخی بھی، اس کے اندر پڑے والے تخم میں جیسی تاثیر ہو۔''

''آپ پچھتا رہے ہوں گے، کہاں سے کہاں آج اس سے بھینٹ ہو گئی؟'

''میں اگر کہوں کہ مجھے آج ہی زندگی کا حقیقی لطف ملا ہے، تو شاید آپ کو یقین نہ آئے۔''

''میں نے آپ کے سر پر اتنا بڑا بار رکھ دیا۔''

مہتا نے عقیدت کے لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں دیوی جی! میں کہہ چکا ہوں کہ آپ کا خادم ہوں۔ آپ کے فائدے کے لیے میری جان بھی چلی جائے تو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ اسے شاعرانہ جذبہ نہ سمجھئے۔ یہ میری

زندگی کی سچائی ہے۔میری زندگی کا کیا معیار ہے،آپ سے یہ بتا دینے کی خواہش میں ضبط نہیں کرسکتا۔ میں قدرت کا پجاری ہوں اور انسان کو اس قدرتی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں جو خوش ہوکر ہنستا ہے،غمگین ہوکر روتا ہے اور غصے میں آکر مار ڈالتا ہے۔ جو دکھ اور سکھ دونوں کو دباتے ہیں، جو رونے کو کمزوری اور ہنسنے کو سبکی سمجھتے ہیں، ان سے میرا کوئی لگاؤ نہیں۔ زندگی میرے لیے خوشی بھرا کھیل ہے، سادہ اور کھلا ہوا، جہاں برائی، حسد اور جلن کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ میں ماضی کی فکر نہیں کرتا اور نہ مستقبل کی پروا کرتا ہوں۔میرے لیے حال ہی سب کچھ ہے۔ مستقبل کی فکر ہمیں بزدل بنا دیتی ہے، ماضی کا بوجھ ہماری کمر توڑ دیتا ہے۔ ہم میں زندگی کی طاقت اتنی کم ہے کہ ماضی اور مستقبل میں پھیلا نے دینے سے وہ اور بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ہم مفت کا بوجھ اپنے اوپر لاد کر رواجوں اور عقیدوں اور تاریخوں کے ملبے کے نیچے دبے پڑے ہیں، اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ وہ طاقت ہی نہیں رہی۔ جو طاقت، جو عقل، انسانی فرائض کے پورا کرنے میں لگنی چاہیے تھی، باہمی امداد میں اور بھائی چاریمیں، وہ پرانی عداوتوں کا بدلہ لینے اور آباؤ اجداد کا قرض ادا کرنے میں تمام ہو جاتی ہے۔اور یہ جو ایشور اور مکتی کا چکر ہے، اس پر تو مجھے ہنسی ہیتی ہے۔ یہ مکتی بھگتی تو انتہائی خودی ہے جو ہماری انسانیت کو تباہ کیے ڈالتی ہے۔ جہاں زندگی ہے، کھیل ہے، چہک ہے، پریم ہے، وہیں ایشور ہے اور زندگی کو سکھی بنانا ہی عبادت ہے اور نجات ہے! گیان والا کہتا ہے کہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ آئے، آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ میں کہتا ہوں اگر تم ہنس نہیں سکتے اور رو نہیں سکتے تو انسان نہیں ہو، پتھر ہو۔ وہ گیان جو انسانیت کو پیس ڈالے گیان نہیں ہے، کولہو

ہے۔ مگر معاف کیجیے میں نے تو ایک پورا لیکچر ہی دے دیا۔ اب دیر ہو رہی ہے، چلیے میں آپ کو پہنچا دوں۔ بچہ بھی میری گود میں سو گیا۔''

گوبندی نے کہا۔ ''میں تو تانگہ لائی ہوں۔''

''تانگے کو یہیں سے رخصت کیے دیتا ہوں۔''

مہتا تانگے کے پیسے دے کر لوٹے تو گوبندی نے کہا۔ ''لیکن آپ مجھے کہاں لے جائیں گے؟''

مہتا نے چونک کر پوچھا۔ ''کیوں، آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔''

''وہ میرا گھر نہیں ہے، مہتا جی!''

''اور کیا مسٹر کھنا کا گھر ہے؟''

''یہ بھی کیا پوچھنے کی بات ہے۔ اب وہ گھر میرا نہیں رہا۔ جہاں بے عزتی اور فضیحت ہو، اسے میں اپنا گھر نہیں سمجھتی اور نہ سمجھ سکتی ہوں۔''

مہتا نے درد بھری آواز میں جس کا ایک ایک حرف ان کے دل سے نکل رہا تھا، کہا۔ ''نہیں دیوی جی! وہ گھر آپ کا ہے اور سدا رہے گا۔ اس گھر کو آپ نے بنایا ہے، اس کے رہنے والوں کو آپ نے رچایا ہے اور جس طرح جان جسم کو چلاتی ہے، ویسے ہی آپ نے اسے چلایا ہے۔ جان نکل جائے تو جسم کی کیا حالت ہو گی؟ ماں کا درجہ بہت بڑی عظمت کا ہے دیوی جی! اور ایسے درجے کی بے عزتی اور فضیحت کہاں نہیں ہوتی؟ ماں کا کام حیات افزائی ہے، جس کے ہاتھوں میں ایسی بے مثل طاقت ہے، اسے اس کی کیا پروا کہ اس سے کون روٹھتا ہے یا کون بگڑتا ہے؟ جان کے بغیر جیسے جسم نہیں رہ سکتا، ویسے ہی جان کے لیے جسم ہی موزوں

ترین مسکن ہے۔ میں آپ کا دھرم اور تیاگ کا اپدیش دوں؟ آپ تو اس کی جیتی جاگتی مورت ی ہیں! میں تو یہی کہوں گا.....''

گوبندی نے بےصبری سے کہا۔ ''لیکن میں صرف ماں تو ہوں نہیں، بلکہ عورت بھی ہوں۔''

مہتا نے ایک منٹ تک چپ رہنے کے بعد کہا۔ ''ہاں! لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عورت صرف ماں ہے اور اس کے علاوہ وہ جو کچھ ہے، وہ سب اسی کا محض ابتدائی ظہور ہے۔ ماں ہونا دنیا کی سب سے بڑی فتح ہے۔ میں ایک لفظ میں اسے زندگی کا، شخصیت کا اور انسانیت کا جذب ہو جانا کہوں گا۔ آپ مسٹر کھنا کے بارے میں اتنا ہی سمجھ لیں کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ وہ کچھ جو کہتے یا کرتے ہیں، وہ جنون کی حالت میں۔ مگر اس جنون کے رفع ہونے میں بہت دن نہ لگیں گے اور وہ وقت بہت جلد آئے گا جب وہ آپ کو اپنی پرستش کی شئے سمجھیں گے۔''

گوبندی جو اپنے دروازے پر پہنچ کر گاڑی سے اتری تو مہتا نے برقی روشنی میں دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔

بچے گھر سے نکل آئے اور ''اماں، اماں'' کہتے ہوئے ماں سے لپٹ گئے۔ گوبندی کے چہرہ پر مادرانہ عظمت کا نور چمک اٹھا۔

اس نے مہتا سے کہا۔ ''اس تکلیف کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ'' اور سر نیچا کرلیا۔ آنسو کا ایک قطرہ اس کے رخسار پر ڈھلک آیا تھا۔

مہتا کی آنکھیں بھی اشک آلود ہو گئیں۔ اس شان و شوکت اور عیش و عشرت کے سامانوں کے درمیان بھی اس عورت کا دل کتنا مغموم ہے!

مرزا خورشید کا احاطہ کلب بھی ہے، کچہری بھی ہے اور اکھاڑا بھی۔ دن بھر بھیڑ لگی رہتی ہے۔ محلے میں اکھاڑے کے لیے کہیں جگہ نہ ملتی تھی۔ مرزا نے ایک چھپر ڈلوا کر اکھاڑا بنوا دیا ہے۔ وہاں روز سو پچاس کشتی باز جمع ہو جاتے ہیں۔ مرزا بھی ان کے ساتھ روز آزمائی کرتے ہیں۔ محلے کی پنچائتیں بھی یہیں ہوتی ہیں۔ یہاں بیوی، ساس بہو اور بھائی بھائی کے جھگڑوں کے بکھیڑوں کا یہیں نپٹارا ہوتا ہے۔ محلے کی سوشل زندگی کا یہی مرکز ہے اور سیاسی تحریک کا بھی۔ آئے دن سبھائیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہیں والنٹیر ٹھہرتے ہیں۔ یہیں ان کا پروگرام بنتا ہے۔ یہیں سے شہر کی سیاسی تحریک چلائی جاتی ہے۔ پچھلے جلسے میں مالتی شہر کانگریس کمیٹی کی صدر چن لی گئی ہے، جب سے اس مقام کی رونق بڑھ گئی ہے۔ گوبر کو یہاں رہتے سال بھر ہو گیا ہے۔ اب وہ سیدھا سادا دیہاتی نوجوان نہیں ہے۔ اس نے بہت کچھ دنیا دیکھ لی ہے۔ اس کے رنگ ڈھنگ بھی کچھ کچھ سمجھنے لگا ہے۔ اصل میں تو وہ اب بھی دیہاتی ہے، پیسے کو دانت سے پکڑتا ہے، مطلب کو کبھی نہیں چھوڑتا اور محنت سے جی نہیں چراتا، نہ کبھی ہمت ہارتا ہے مگر شہر کی ہوا بھی اسے لگ گئی ہے۔ اس نے پہلے مہینے میں تو صرف مزدوری کی اور آدھے پیٹ کھا کر تھوڑے روپے بچا لیے، پھر وہ کچالو اور دہی بڑے کے خوانچے لگانے لگا۔ ادھر زیادہ منافع دیکھا تو نوکری چھوڑ دی۔ گرمیوں میں شربت اور برف کی دکان بھی کھول دی۔ لین دین میں کھرا تھا۔ پس اس کا ساکھ جم گئی۔ جاڑا آیا تو اس نے شربت کی دکان بند کر دی اور گرم چائے پلانے لگا۔ اب اس کی روزانہ آمدنی ڈھائی تین روپے سے کم نہیں

ہے۔اس نے انگریزی فیشن کے بال کٹا لیے ہیں، بھاری دھوتی اور پمپ شو پہنتا ہے، ایک سرخ اونی چادر خرید لی ہے اور پان سگریٹ کا بھی شوق ہو گیا ہے۔ جلسوں میں آنے جانے سے اسے کچھ سیاسی واقفیت بھی ہو چلی ہے۔قوم اور فرقہ کا مطلب سمجھنے لگا ہے۔سوشل رواجوں کا خیال اور دنیوی ملامت کا خوف اسے بہت کم رہ گیا ہے۔آئے دن کی پنچایتوں نے اسے نڈر بنا دیا ہے۔جس بات کے پیچھے وہ یہاں گھر سے دور منہ چھپائے پڑا ہوا ہے، اسی طرح کی بلکہ اس سے بھی زیادہ بری باتیں یہاں روز ہوا کرتی ہیں اور کوئی کہیں نہیں بھاگتا۔پھر وہی کیوں اتنا ڈرے اور منہ چرائے؟

اتنے دنوں میں اس نے ایک پیسہ بھی گھر نہیں بھیجا۔والدین کو روپے پیسے کے معاملے میں اتنا ہوشیار نہیں سمجھتا۔وہ لوگ تو روپیہ پاتے ہی آسمانوں میں اڑنے لگیں گے۔دادا کو فوراً آ گیا کرنے کی اور اماں کو گہنے بنوانے کی دھن سوار ہو جائے گی۔ایسے فضول کاموں کے لیے اس کے پاس روپے نہیں ہیں۔اب وہ چھوٹا موٹا مہاجن ہے۔پڑوس کے یکہ اور گاڑی والوں اور دھوبیوں کو سود پر روپیہ قرض دیتا ہے۔ان دس گیارہ مہینوں ہی میں اس نے اپنی محنت اور کفایت سے اپنی جگہ بنالی اور اب جھنیا کو یہیں لا کر رکھنے کی بات سوچ رہا ہے۔

تیسرے پہر کا وقت ہے، وہ سڑک کے نل پر نہا کر آیا ہے اور شام کے لیے آلو بال رہا ہے کہ مرزا خورشید آ کر دروازے پر کھڑے ہو گئے۔گوبر اب ان کا نوکر نہیں ہے مگر ادب اسی طرح کرتا ہے اور ان کے لیے جان دینے کو تیار رہتا ہے۔ دروازے پر آ کر پوچھا ''کیا حکم ہے سرکار؟''

مرزا نے کھڑے کھڑے کہا۔ ''تمہارے پاس کچھ روپے ہوں تو دے دو۔ آج تین دن سے بوتل خالی پڑی ہوئی ہے، طبیعت بہت بے چین ہو رہی ہے۔''

گوبر نے اس سے پہلے بھی دو تین بار مرزا کو پیسے دیئے تھے مگر اب تک وصول نہ کر سکا تھا۔ تقاضا کرتے ڈرتا تھا، مگر مرزا صاحب روپیہ لے کر دینا نہ جانتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں روپیہ رکتا ہی نہ تھا۔ ادھر آیا اور ادھر غائب۔ یہ تو نہ کہہ سکا کہ میں روپے نہ دوں گا یا میرے پاس روپے نہیں ہیں، شراب کی برائی کرنے لگا۔ ''آپ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے سرکار؟ کیا اس کے پینے سے کچھ پھائدہ (فائدہ) ہوتا ہے؟''

مرزا نے کوٹھری کے اندر آ کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ میں چھوڑنا نہیں چاہتا اور شوق سے پیتا ہوں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم اپنے روپیوں کے لیے نہ ڈرو، میں ایک ایک کوڑی ادا کر دوں گا۔''

گوبر مستقل رہا۔ ''میں سچ کہتا ہوں مالک، میرے پاس اس سمے روپے نہیں ہیں۔ روپیہ ہوتا تو آپ سے انکار نہ کرتا۔''

''دو روپے بھی نہیں دے سکتے؟''

''اس سمے تو نہیں ہیں۔''

''میری انگوٹھی گروی رکھ لو۔''

گوبر کا جی للچا اٹھا مگر بات کیسے بدلے؟ بولا۔ ''یہ آپ کیا کہتے ہیں مالک، روپے ہوتے تو آپ کو دیت، انگوٹھی کی کون بات تھی؟''

مرزا نے عاجزانہ اصرار سے کہا۔ ''میں پھر تم سے کبھی نہ مانگوں گا گوبر۔ مجھ

سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ اس شراب کی بدولت میں نے لاکھوں کی حیثیت بگاڑ دی اور بھکاری بن گیا۔ اب مجھے بھی ضد پڑ گئی ہے کہ خواہ بھیک ہی مانگنی پڑے مگر اسے چھوڑوں گا نہیں۔''

جب گوبر نے اب کے بھی انکار کیا تو مرزا صاحب مایوس ہو کر چلے گئے۔ شہر میں ان کے ہزاروں ملنے والے تھے۔ کتنے ہی ان کی بدولت بن گئے تھے۔ کتنوں ہی کی آڑے وقت پر انہوں نے مدد کی تھی ایسوں سے وہ ملنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ انہیں ہزاروں لٹکے معلوم تھے جن سے وہ وقتاً فوقتاً روپیوں کا ڈھیر لگا سکتے تھے، مگر روپے کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ ان کے ہاتھ میں روپے جیسے کاٹتے تھے۔ کسی نہ کسی بہانے اڑا کر ہی دل سکون پاتا تھا۔

گوبر آلو چھیلنے لگا۔ سال ہی بھر کے اندر وہ اتنا چالاک ہو گیا تھا اور پیسے جوڑنے میں اتنا ہوشیار کے تعجب ہوتا تھا۔ جس کوٹھری میں وہ رہتا تھا، وہ مرزا صاحب نے یہ دی ہے۔ اس کوٹھری اور برآمدے کا کرائی بڑی آسانی سے پانچ روپیہ مل سکتا ہے۔ گوبر تقریباً سال بھر سے اسی میں رہتا ہے، لیکن نہ کبھی مرزا نے کرایہ مانگا نہ اس نے دیا۔ انہیں شاید یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس کوٹھری کا کچھ کرایہ بھی مل سکتا ہے۔

ذرا دیر میں ایک یکہ والا روپیہ مانگنے آیا۔ الہ دین نام تھا، سر منڈا ہوا، داڑھی کھچڑی اور کانا۔ اس کی لڑکی رخصت ہو رہی تھی اور پانچ روپے کی اسے بڑی ضرورت تھی۔ گوبر نے ایک آنہ روپیہ سود پر روپے دے دیئے۔

الہ دین نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ''بھیا اب بال بچوں کو بلا لو۔ کب تک

ہاتھ سے ٹھونکتے رہو گے؟''

گوبر نے شہر کے خرچ کا رونا رو دیا۔ ''تھوڑی آمدنی میں گرہستی کیسے چلے گی؟''

الہ دین بیڑی جلاتے ہوئے بولا۔ ''آمدنی اللہ دے گا بھیا سوچو، کتنا آرام ملے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ جتنا تم اکیلے خرچ کرتے ہو، اسی میں گرہستی چل جائے گی۔ عورت کے ہاتھ میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ خدا قسم، جب میں اکیلا یہاں رہتا تھا، چاہے جتنا ہی کماؤں مگر سب کھا پی کر برابر ہو جاتا تھا۔ بیڑی تمباکو بھی پیسہ نہ رہتا۔ اس پر حیرانی الگ۔ تھکے ماندے آؤ تو گھوڑے کو ٹہلاؤ اور کھلاؤ پھر نانبائی کی دکان پر دوڑو۔ ناک میں دم آ گیا۔ جب سے بیوی آ گئی ہے، اسی کمائی میں اس کی روٹیاں بھی نکل آتی ہیں اور آرام بھی ملتا ہے۔ آخری آدمی آرام ہی کے لیے تو کماتا ہے۔ جب جان کھپا کر بھی آرام نہ ملا تو زندگی ہی برباد ہو گئی۔ میں تو کہتا ہوں کہ تمہاری کمائی بڑھ جائے گی بھیا جتنی دیر میں آلو مٹر ابالتے ہو، اتنی دیر میں دو چار پیالے چائے بیچ لوگے۔ اب چائے بارہوں مہینے چلتی ہے۔ رات کو لیٹو گے تو عورت پاؤں دبائے گی۔ ساری تھکاوٹ مٹ جائے گی۔''

یہ بات گوبر کے دلنشین ہو گئی۔ جی اچاٹ ہو گیا۔ اب تو وہ جھنیا کو لا کر ہی رہے گا۔ آلو چولھے پر چڑھے رہ گئے اور اس نے گھر جانے کی تیاری کر دی۔ مگر یاد آیا کہ ہولی آ رہی ہے، اس لیے ہولی کا سامان بھی لیتا چلے۔ بخیلوں میں خوشی کے موقعوں پر دل کھول کر خرچ کرنے کی جو عادت ہوتی ہے، اس نے گوبر کو بھی اکسایا۔ آخر اسی دن کے لیے ایک دھوتی اور ایک چادر، سونا کے لیے ایک شیشی تیل

لے جائے گا اور ایک جوڑا چپل، روپا کے لیے جاپانی گڑیا اور جھنیا کے لیے پٹاری جس میں تیل، سیندور اور آئینہ ہوگا۔ بچے کے لیے ٹوپ اور فراک جو بازار میں تیار ملتا ہے۔ اس نے روپے نکالے اور بازار چلا۔ دوپہر تک سب چیزیں آ گئیں۔ بستر بھی باندھ لیا گیا۔ محلے والوں کو خبر ہوگئی کہ گوبر گھر جا رہا ہے۔ کئی مرد عورت اسے رخصت کرنے آئے۔ گوبر نے انہیں اپنا گھر سپرد کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہی لوگوں پر گھر چھوڑے جاتا ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو ہولی کے دوسرے دن آ جاؤں گا۔''

ایک نوجوان عورت نے مسکرا کر کہا۔ ''مہریا کو لیے بنا نہ آنا نہیں تو گھر میں نہ گھسنے پاؤ گے۔''

دوسری زیادہ عمر والی نے نصیحت کی۔ ''ہاں اور کیا، بہت دنوں تو چولھا پھونک چکے، ٹھکانے سے روٹی تو ملے گی۔''

گوبر نے سب کو ''رام رام'' کیا۔ ہندو بھی تھے، مسلمان بھی۔ سبھی میں دوستانہ تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک تھے۔ روزہ رکھنے والے روزہ رکھتے تھے، ایکادشی رکھنے والے ایکادشی۔ کبھی کبھی مذاق میں ایک چھوٹے بڑی شیو کی مورتوں کو ''دھلکھرے'' بتاتا، مگر فرقہ وارانہ تعصب کا نام بھی نہ تھا۔

گوبر گھر جا رہا ہے اور سب ہنسی خوشی سے رخصت کرنا چاہتے ہیں۔

اتنے میں بھورے یکہ لے کر آ گیا۔ ابھی دن بھر کا گشت لگا کر آیا تھا۔ خبر ملی کہ گوبر گھر جا رہا ہے، ویسے ہی یکہ دھر پھیر دیا۔ گھوڑے نے احتجاج کیا۔ اسے کئی چابک لگائے۔ گوبر نے یکہ پر سامان رکھا۔ یکہ بڑھا۔ بھیجنے والے گلی کے موڑ تک

پہنچانے گئے، تب گوبر نے سب کو ''رام رام'' کیا اور یکے پر بیٹھ گیا۔ بھورے اسے گھر پہنچانے کی خوشی میں مست تھا اور گھوڑا تھا پانی دار، اڑا چلا جا رہا تھا۔ بات کی بات میں اسٹیشن آ گیا۔

گوبر نے خوش ہو کر ایک روپیہ کمر سے نکال کر بھورے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو، گھر والی کے لیے مٹھائی لیتے جانا۔''

بھورے نے تشکرانہ حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم مجھے گیر (غیر) سمجھتے ہو بھیا؟ ایک دن یکے پر بیٹھ گئے تو میں تم سے انعام لوں گا! جہاں تمہارا پسینہ گرے وہاں اپنا لہو گرانے کو تیار ہوں۔ اتنا چھوٹا دل نہیں پایا ہے اور لے بھی لوں تو گھر والی مجھے جیتا چھوڑے گی؟''

گوبر نے پھر کچھ نہ کہا۔ شرمندہ ہو کر اپنا اسباب اتارا اور ٹکٹ لینے چلا۔

(20)

پھاگن اپنی جھولی میں نئی زندگی کی پونجی لے کر آ پہنچا تھا۔ آم کے پیڑ دونوں ہاتھوں سے بوری کی مہک بکھیر رہے تھے اور کوئل آم کی ڈالیوں میں چھپی ہوئی اپنے راگوں کی خفیہ خیرات تقسیم کر رہی تھی۔

گاؤں میں ایکھ کی بوائی شروع ہو گئی تھی۔ ابھی دھوپ نہیں نکلی مگر ہوری کھیت میں پہنچ گیا ہے۔ دھنیا، سونا، روپا، تینوں تلیا سے ایکھ کے بھیگے ہوئے گٹھے نکال نکال کر کھیت میں لا رہی ہیں اور ہوری گنڈاسے سے ایکھ کے ٹکڑے کر رہا ہے۔ اب وہ رات دن کی مزدوری کرنے لگا ہے۔ کسان نہیں، مزدور ہے۔ داتا دین سے اب اس کا پروہت اور ججمان کا ناتا نہیں، بلکہ مالک اور مزدور کا رشتہ ہے۔

داتا دین نے آ کر ڈانٹا۔ ''ہاتھ اور پھرتی سے چلاؤ ہوری! اس طرح تم دن بھر میں نہ کاٹ سکو گے۔''

ہوری نے زخم کھائے ہوئے تکبر کے ساتھ کہا۔ ''چلا ہی تو رہا ہوں مہراج، بیٹھا تو نہیں ہوں۔''

داتا دین مزدوروں سے کس کر کام لیتے تھے۔ اسی لیے کوئی مزدور ان کے یہاں ٹھہرتا نہ تھا۔ ہوری ان کے مزاج سے واقف تھا مگر جاتا کہاں؟

پنڈت اس کے سامنے کھڑا ہو کر بولے۔ ''چلانے چلانے میں پھرک (فرق) ہے۔ ایک چلانا وہ ہے کہ گھڑی بھر میں کام تمام، دوسرا چلانا وہ ہے کہ دن بھر میں ایک بوجھ نہ کٹے۔''

ہوری نے زہر کا گھونٹ پی کر زیادہ تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کیا۔ ادھر مہینوں بھرے سے اسے پیٹ بھر کھانا نہ ملتا تھا۔ عموماً ایک وقت تو چربن ہی کٹتا تھا اور دوسرے وقت بھی کبھی آدھے پیٹ کھانا ملا، کبھی فاقہ ہو گیا۔ کتنا ہی چاہتا تھا کہ ہاتھ اور جلد جلد اٹھے، مگر ہاتھ جواب دے رہا تھا۔ اس پر داتا دین سر پر سوار تھے۔ لمحہ بھر دم نہ لینے پاتا تو تازہ ہو جاتا۔ مگر دم کیسے لے؟ جھڑکیاں پڑنے کا ڈر تھا۔

دھنیا اور دونوں لڑکیاں ایکھ کے گٹھے لیے بھیگی ساڑیوں سے لت پت کیچڑ سنی ہوئی آئیں اور گٹھے پٹک کر ذرا سستانے لگیں کہ داتا دین نے ڈانٹ بتائی۔ ''یہاں تماسا (تماشہ) کیا دیکھتی ہے دھنیا، جا اور اپنا کام کر۔ پیسے سینت میں نہیں آتے۔ پہر بھر میں تو ایک گٹھا لائی ہے، اس حساب سے تو دن بھر میں اوکھ نہ ڈھل پائے گی۔''

دھنیا نے تیوری بدل کر کہا۔ ''کیا تنک دم بھی نہ لینے دو گے مہراج؟ ہم بھی تو آدمی ہیں۔ تمہاری مجوری (مزدوری) کرنے سے بیل تو نہیں ہو گئے۔ جرا (ذرا) کھوپڑی پر ایک گٹھالا دکرلاؤ تو پتہ چلے۔''

داتا دین بگڑ اٹھے۔ ''پیسے دیتے ہیں کام کرنے کے لیے، دم لینے کے لیے نہیں، دم لینا ہے تو گھر میں جا کر دم لو۔''

دھنیا کچھ کہنے ہی جا رہی تھی کہ ہوری نے ڈانٹا۔ ''تو جاتی کیوں نہیں دھنیا، کیوں حجت کر رہی ہے؟''

دھنیا نے بندھنے کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''جا تو رہی ہوں، پر چلتے ہوئے بیل کو اوگی (چابک) نہ لگانا چاہیے۔''

داتا دین نے سرخ آنکھیں نکال کر کہا ''معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مجاج (مزاج) ٹھنڈا نہیں ہوا، تبھی دانے دانے کو ترستے ہو۔''

دھنیا بھلا کیوں چپ رہنے لگی، بولی ''تمہارے دوارے پر بھیک مانگنے تو نہیں جاتی؟''

داتا دین نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اگر یہی حال ہے تو بھیک بھی مانگو گی۔''

دھینا کے پاس جواب تیار تھا مگر سونا اسے کھینچ کر تلیا کی طرف لے گئی ورنہ بات بڑھ جاتی، لیکن آواز کی پہنچ کے باہر جا کر اس نے دل کی بھڑاس نکالی۔ ''بھیک مانگو تم جو بھک منگوں کی جات (ذات) ہو، ہم تو مجور (مزدور) ٹھہرے، جہاں کام کریں، وہیں چار پیسے پائیں گے۔''

سونا نے حقارت سے کہا۔ ''اماں، جانے بھی دو۔ تم تو بکھت (وقت) نہیں

دیکھتیں، بات بات پر لڑنے لگ جاتی ہو۔''

ہوری پاگلوں کی طرح سر سے اوپر گنڈاسہ اٹھا اٹھا کر ایک کے ٹکڑے ڈھیر کرتا جاتا تھا۔ اس کے اندر جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ اس میں غیر قدرتی طاقت آ گئی تھی۔ اس میں جو پشت ہا پشت سے بہتا ہوا پانی تھا، وہ اس وقت گویا بھاپ بن کر اس کو مشین کی سی کورانہ طاقت دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ سر چکرانے لگا۔ پھر اس کے ہاتھ مشین کی رفتار سے بلا تھکے اور بلا رکھے اٹھ رہے تھے۔ اس کے بدن سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور سر میں دھماکے کی آواز ہو رہی تھی، مگر اس پر جیسے کوئی بھوت سوار ہو گیا ہو۔

دفعتاً اس کی آنکھوں میں بالکل اندھیرا چھا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ زمین میں دھنسا جا رہا ہے۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش میں خالی ہاتھ پھیلا دیئے اور بیہوش ہو گیا۔ گنڈاسہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اسی وقت دھنیا لکھے کا گٹھا لیے آئی تو دیکھا کہ کئی آدمی ہوری کو گھیرے کھڑے ہیں۔ ایک بلوا ہا داتا دین سے کہہ رہا تھا ''مالک! تمہیں ایسی بات نہ کہنی چاہیے جو آدمی کو لگ جائے۔ پانی مرتے ہی مرتے تو مرے گا۔''

دھنیا لکھے کا گٹھا پٹک کر پاگلوں کی طرح دوڑی ہوئی ہوری کے پاس گئی اور اس کا سر اپنی جانگھ پر رکھ کر زور زور سے رونے چلانے لگی۔ ''تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو؟ اری سونا دوڑ کر پانی لا اور جا کر سوبھا سے کہہ دے کہ دادا بے حال ہیں۔ ہائے رام! اب میں کہاں جاؤں۔ اب کس کی ہو کر رہوں گی؟ کون مجھے دھنیا کہہ کر پکارے گا.....؟''

لالہ پٹیشوری بھاگے ہوئے آئے اور محبت بھری سختی سے بولے ''کیا کرتی ہے دھنیا ہوش سنبھال! ہوری کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ گرمی سے بہوش ہو گئے ہیں۔ ابھی ہوش آیا جاتا ہے۔ دل اتنا کچا کرے گی تو کیسے کام چلے گا؟''

دھنیا نے پٹیشوری کے پیر پکڑ لیے اور روتی ہوئی بولی۔ ''کیا کروں لالہ جی نہیں مانتا۔ بھگوان نے سب کچھ ہر لیا۔ میں صبر کر گئی۔ اب دھیرج نہیں ہوتا۔ ہائے میرا ہیرا!''

سونا پانی لائی۔ پٹیشوری نے ہوری کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے، کئی آدمی اپنے اپنے انگوچھوں سے ہوا دے رہے تھے۔ ہوری کا بدن سرد پڑ گیا تھا۔ پٹیشوری کو بھی تشویش ہوئی، مگر دھنیا کو وہ برابر دلاسا دیئے جاتے تھے۔

دھنیا نے بے صبری سے کہا۔ ''ایسا کبھی نہیں ہوا تھا لالہ، کبھی نہیں!''

پٹیشوری نے پوچھا۔ ''رات کچھ کھایا تھا؟''

دھنیا بولی۔ ''ہاں روٹیاں بنائی تھیں، پر آج کل ہمارے اوپر جو بیت رہی ہے وہ کیا تم سے چھپا ہے؟ مہینوں سے پیٹ بھر روٹی نہیں نصیب ہوئی۔ کتنا سمجھاتی ہوں کہ جان رکھ کر کام کرو لیکن آرام تو ہمارے بھاگ میں لکھا ہی نہیں ہے۔''

دفعتاً ہوری نے آنکھیں کھول دیں اور اڑتی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ دھنیا جیسے جی اٹھی۔ بے قرار ہو کر اس کے گلے سے لپٹ کر بولی۔ ''اب کیسا جی ہے تمہارا؟ میری تو جان نہوں (ناخونوں) میں آ گئی تھی۔''

ہوری نے کمزور آواز میں کہا۔ ''اچھا ہوں۔ نہ جانے کیسا جی ہو گیا تھا۔''

دھنیا نے محبت بھرے شکوے سے کہا۔ ''دیہہ (بدن) میں دم تو ہے نہیں اور

کام کرتے ہو جان ہوم کر! لڑکوں کا تھا کہ بچ گئے، نہیں تو تم لے ہی ڈوبے تھے۔''

پٹیشوری نے ہنس کر کہا۔ ''دھنیا تو رو پیٹ رہی تھی۔''

ہوری نے بے صبری سے پوچھا۔ ''سچ مچ تو روتی تھی دھنیا؟''

دھنیا نے پٹیشوری کو پیشھے دھکیل کر کہا۔ ''انہیں بکنے دو تم۔ پوچھو کہ یہ کیوں کا گد (کاغذ) چھوڑ کر گھر سے دوڑے آئے تھے۔''

ہوری نے دھنیا کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ ''پگلی ہے اور کیا! اب نہ جانے کون سا سکھ دیکھنے کے لیے مجھے جلائے رکھنا چاہتی ہے۔''

دو آدمی ہوری کو سہارا دے کر گھر لے گئے اور چارپائی پر لٹا دیا۔ داتا دین تو کڑھ رہے تھے کہ بوائی میں دیر ہوئی جاتی ہے۔ مگر داتا دین اتنا بے رحم نہیں تھا۔ وہ دوڑ کر گھر سے گرم دودھ لایا اور ایک شیشی میں گلاب کا عرق بھی۔ دودھ پی کر ہوری میں جان سی آ گئی۔

اسی وقت گوبر ایک مزدور کے سر پر اپنا سامان لادے ہوئے آتا دکھائی دیا۔

گاؤں کے کتے پہلے تو بھونکتے ہوئے اس کی طرف دوڑے، پھر دم ہلانے لگے۔ روپا نے کہا۔ ''بھیا آئے، بھیا آئے'' اور تالیاں بجاتی ہوئی دوڑی۔ سونا بھی دو تین قدم آگے بڑھی مگر اپنی خوشی کو ضبط کر گئی۔ ایک سال میں اس کا شباب کچھ اور شرمیلا ہو گیا تھا۔ جھنیا بھی گھونگھٹ نکالے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔

گوبر نے والدین کے پیر چھوئے اور روپا کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ دھنیا نے اسے اسیس دی اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر گویا اپنے ماں ہونے کا صلہ پا گئی۔ اس کا دل غرور سے اُمڈا پڑتا تھا۔ آج تو وہ رانی ہے۔ اس پھٹے حال میں بھی رانی

ہے! کوئی اس کا منہ دیکھے، اس کی آنکھیں دیکھے، اس کا دل دیکھے، اس کی رفتار دیکھے! رانی بھی لجا جائے گی۔ گوبر کتنا بڑا ہو گیا ہے اور پہن اوڑھ کر کیسا بھلا آدمی سا لگتا ہے۔ دھنیا کے دل میں کبھی بدشگونی کا اندیشہ نہ ہوا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ گوبر خیریت سے ہے اور خوش ہے۔ آج اسے آنکھوں دیکھ کر گویا اس کی زندگی کی خاک میں گمشدہ جواہر مل گیا، مگر ہوری نے منہ پھیر لیا۔

گوبر نے پوچھا۔ ''دادا کو کیا ہوا ہے، اماں!''

دھنیا گھر کا حال سنا کر اسے رنجیدہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ ''کچھ نہیں ہے بیٹا، ذرا سر میں درد ہے۔ چلو، کپڑے اتارو، ہاتھ منہ دھوؤ۔ کہاں تھے تم اتنے دن؟ بھلا اسی طرح کوئی گھر سے بھاگتا ہے؟ اور کبھی ایک چٹھی تک نہ بھیجی۔ آج سال بھر کے پیچھے جا کے سدھ لی ہے۔ تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پھوٹ گئیں..... یہی آسرا لگا رتا تھا کہ کب وہ دن آوے گا اور کب تمہیں دیکھوں گی۔ کوئی کہتا تھا کہ مرچ بھاگ گیا اور کوئی ڈمزاتا پوبتاتا تھا۔ میری تو سن سن کر جان سوکھی جاتی تھی۔ کہاں رہے اتنے دن؟

گوبر نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''کہیں دور نہیں گیا تھا اماں، یہیں لکھنو میں تو تھا۔''

''اور اتنے پاس رہ کر بھی کبھی چٹھی تک نہ لکھی!''

ادھر سونا اور روپا اندر گوبر کا سامان کھول کر چیزوں کو آپس میں بانٹنے لگی تھیں۔ مگر جھنیا دور کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر آج رکھائی کا شوخ رنگ جھلک رہا ہے۔ گوبر نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے، آج وہ اس کا بدلہ لے گی۔ آسامی کو دیکھ

کرمہاجن اس سے وہ روپے وصول کرنے کو بھی بے چین ہو رہا ہے جو اس نے بٹے کھاتے میں ڈال دیئے تھے۔ بچہ ان چیزوں کی طرف لپک رہا تھا اور چاہتا تھا کہ سب کی سب ایک ساتھ منہ بھر لے۔ مگر جھنیا اسے گود سے نہ اتارتی تھی۔

سونا بولی۔ ''تمہارے لیے آئینہ اور کنگھی لائے ہیں، بھابھی۔''

جھنیا نے رکھائی سے کہا۔ ''مجھے آئینہ کنگھی نہ چاہیے، اپنے پاس رکھے رہیں۔''

روپا نے بچے کی چمکدار ٹوپی نکالی۔ ''اوہو! یہ تو چنو کی ٹوپی ہے!'' اور اسے بچے کے سر پر رکھ دیا۔

جھنیا نے ٹوپی اتار کر پھینک دی اور یکایک گوبر کو اندر آتے دیکھ کر وہ بچے کو لیے ہوئے کوٹھری میں چلی گئی۔

گوبر نے دیکھا کہ سارا سامان کھلا پڑا ہے۔ اس کا جی تو چاہتا ہے کہ پہلے جھنیا سے مل کر اپنا قصور معاف کرائے مگر اندر جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ وہیں بیٹھ گیا اور چیزیں نکال کر دینے لگا، مگر روپا اس لیے پھول گئی کہ اس کے لیے چپل کیوں نہیں آئے اور سونا اسے چڑانے لگی۔ ''تو کیا کرے گی چپل لے کر؟ اپنی گڑیا کھیل۔ ہم تو تیری گڑیا دیکھ کر نہیں روتے، پھر تو میرا چپل دیکھ کر کیوں روتی ہے؟''

مٹھائی بانٹنے کی ذمہ داری دھنیا نے اپنے اوپر لی۔ اتنے دن کے بعد لڑکا کسل سے گھر آیا ہے۔ وہ گاؤں بھر میں بائن بنٹائے گی۔ ایک گلاب جامن روپا کے لیے اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہانڈی اس کے سامنے رکھ دی جائے اور وہ کود کود کر کھائے۔

اب صندوق کھلا اور اس میں سے ساڑھیاں نکلنے لگیں۔ سبھی کنارے دار تھیں، جیسی پٹیشوری لالہ کے گھر میں پنی جا سکتی ہیں، مگر ہیں بڑی ہلکی۔ ایسی باریک ساڑھیاں بھلا کتنے دن چلیں گی؟ بڑے آدمی چاہے جتنی باریک ساڑھیاں پہنیں، ان کی عورتوں کو بیٹھنے اور سونے کے سوا اور کون کام ہے؟ یہاں تو کھیت کھلیان سبھی کچھ ہے! اچھا، ہوری کے لیے دھوتی کے سوا ایک دوپٹہ بھی ہے!

دھنیا خوش ہو کر بولی۔ ''یہ تم نے بڑا اچھا کیا بیٹا۔ ان کا دوپٹہ بالکل تار تار ہو گیا تھا۔''

گوبر کو اتنی دیر میں گھر کی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ دھنیا کی ساڑھی میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ سونا کی ساڑھی سر پر پھٹی ہوئی تھی اور اس میں سے بال دکھائی دے رہے تھے۔ روپا کی دھوتی میں چاروں طرف جھالر سی لٹک رہی تھی۔ سبھی کے چہرے روکھے سوکھے تھے۔ چکناہٹ کا بدن پر کہیں نام نہ تھا۔ جدھر دیکھو افلاس کا دور دورہ تھا۔

لڑکیاں تو ساڑھیوں میں مگن تھیں، دھنیا کو لڑکے کے لیے کھانے کی فکر ہوئی۔ گھر میں تھوڑا سا جو کا آٹا شام کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس وقت تو چربن پر گزر ہوتا تھا مگر گوبر اب وہ گوبر تھوڑی ہی ہے۔ اس سے جو کا آٹا کھایا بھی جائے گا؟ پردیس میں نہ جانے کی کیا کھاتا پیتا رہا ہوگا۔ جا کر دلاری کی دکان سے گیہوں کا آٹا، چاول اور گھی ادھار لائی۔ ادھر مہینوں سے دلاری ایک پیسے کی چیز بھی ادھار نہ دیتی تھی مگر آج اس نے ایک بار بھی نہ پوچھا کہ پیسے کب دو گی۔

اس نے پوچھا۔ ''گوبر تو کھوب (خوب) کما کر آیا ہے نا؟''

دھنیا بولی۔ ''ابھی تو کچھ نہیں کھلا دیدی۔ ابھی میں نے بھی کچھ کہنا ٹھیک نہیں سمجھا۔ ہاں سب کے لیے کنارے دار ساڑھیاں لایا ہے۔ تمہاری اسیس سے اچھی طرح لوٹ آیا میرے لیے تو یہی بہت ہے۔''

دلاری نے دعا دی۔ ''بھگوان کریں وہ جہاں رہے کسل سے رہے۔ ماں باپ کو اور کیا چاہیے؟ لڑکا سمجھدار اور لڑکوں کی طرح اڑاؤ نہیں ہے۔ ہمارے روپے ابھی نہ ملیں تو بیاج تو دے دو۔ دن بہ دن بوجھ بڑھ ہی تو رہا ہے۔''

ادھر سونا چنو کو اس کی فراک اور ٹوپ اور جوتا پہنا کر ''راجہ'' بنا رہی تھی۔ بچہ ان چیزوں کو پہننے سے زیادہ ہاتھ میں لے کر کھیلنا اور کھانا پسند کرتا تھا۔ اندر گوبر اور جھنیا میں روٹھنے اور منانے کا ناٹک ہو رہا تھا۔

جھنیا نے حقارت سے دیکھ کر کہا۔ ''مجھے لا کر یہاں بٹھا دیا۔ آپ پردیس کی راہ لی، پھر نہ کھوج نہ کھبر (خبر) کہ مرتی ہے یا جیتی ہے۔ سال بھر بعد اب جا کر تمہاری نیند ٹوٹی ہے، کتنے بڑے کپٹی ہو تم۔ میں سوچتی ہوں کہ تم میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہو گے اور آپ اڑے تو سال بھر کے پیچھے لوٹے۔ مردوں کا بسواس ہی کیا؟ کہیں کوئی اور تاک لی ہو گی۔ سوچا ہو گا کہ ایک گھر کے لیے ہے، ایک باہر کے لیے بھی ہو جائے۔''

گوبر نے صفائی دی۔ ''جھنیا! میں بھگوان کی ساکھی دے کر کہتا ہوں کہ جو میں نے کبھی کسی کی طرف تاکا بھی ہو۔ لاج اور ڈر کے مارے گھر سے بھاگا تو مگر تیری یاد ایک منٹ کے لیے بھی من سے نہ اترتی تھی۔ اب تو میں نے طے کر لیا ہے کہ تجھے بھی لیتا جاؤں گا۔ اسی لیے آیا ہوں۔ تیرے گھر والے تو بہت بگڑے ہوں

گے۔''

''دادا تو میری جان ہی لینے پر اتارو تھے۔''

''سچ!''

''تینوں آدمی یہاں چڑھ آئے تھے۔ پر اماں نے ایسی پھٹکاری بتائی کے منہ لے کر رہ گئے۔ ہاں ہمارے دونوں بیل کھول لے گئے۔''

اتنی بڑی جبر دستی (زبردستی) اور دادا کچھ بولے نہیں؟''

''دادا اکیلے کس کس سے لڑتے؟ گاؤں کے لوگ تو نہیں لے جانے دیتے تھے، پر دادا ہی اپنی بھلمنسی میں آ گئے تو اور لوگ کیا کرتے؟''

''تو آج کل کھیتی باڑی کیسے ہو رہی ہے؟''

''کھیتی باڑ سب ٹوٹ گئی۔ تھوڑی سی پنڈت مہراج کے ساجھے میں ہے اوکھ بوئی نہیں گئی۔''

گوبر کی کمر میں اس وقت دو سو روپیہ تھے۔ اس کی گرمی یوں ہی ہم نہ تھی۔ یہ حال سن کر تو اس کے بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ بولا۔ ''تو پھر پہلے میں ان ہی سے جا کر سمجھتا ہوں۔ ان کی یہ مجال کہ میرے دوارے پر سے بیل کھول لے جائیں! یہ ڈاکہ ہے، کھلا ہوا ڈاکہ! تین تین سال کو چلے جائیں تینوں۔ یوں نہ دیں گے تو عدالت سے لوں گا۔ سارا گھمنڈ توڑ دوں گا۔''

وہ اسی جوش میں چل پڑا تھا کہ جھنیا نے پکڑ لیا اور بولی۔ ''تو چلے جانا، ابھی ایسی جلدی کا ہے کی ہے؟ کچھ آرام کر لو، کچھ کھا پی لو۔ سارا دن تو پڑا ہے، یہاں بڑی بڑی پنچایت نے اسی روپے تاوان لگایا اور تیس من اناج اوپر سے۔ اسی میں تو

اور تباہی آ گئی۔''

سونا بچے کو کپڑے اور جوتے پہنا کر لائی۔ کپڑے پہن کر وہ جیسے سچ مچ راجہ ہو گیا تھا۔ گوبر نے اسے گود میں لیا، مگر اس وقت بچے کے پیار میں اسے خوشی ہوئی۔ اس کا خون ابل اٹھا اور کمر کے روپے آنچ کو زیادہ تیز کر رہے تھے۔ وہ ایک ایک سے سمجھے گا۔ پنچوں کو اس پر تاوان لگانے کا حک (حق) ہی کیا ہے؟ کون ہوتا ہے کوئی اس کے بیچ میں بولنے والا؟ اس نے ایک عورت رکھ لی تو پنچوں کے باپ کا کیا بگڑا؟ اگر اسی بات پر وہ پھوجداری (فوجداری) میں دعویٰ کر دے تو لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔ ساری گرہستی تہس نہس ہو گئی۔ کیا سمجھ لیا ہے اسے، ان لوگوں نے؟

بچہ اس کی گود میں ذرا سا مسکرایا، پھر زور سے چیخ اٹھا جیسے کوئی ڈراؤنی چیز دیکھ لی ہو۔

جھنیا نے بچے کو اس کی گود سے لے لیا اور بولی۔ ''اب جا کر نہا دھولو۔ کس سوچ میں پڑ گئے؟ یہاں سب سے لڑنے لگو تو ایک دن نباہ نہ ہو، جس کے پاس پیسہ ہے وہی بڑا آدمی ہے، وہی بھلا آدمی ہے۔ پیسہ نہ ہو، تو اس پر سبھی رعب جماتے ہیں۔''

''میرا گدھا پن تھا کہ گھر سے بھاگا، نہیں تو دیکھتا کہ کیسے کوئی ایک دھیلا ڈنڈ لیتا ہے۔''

''شہر کی ہوا کھا آئے ہو تب یہ باتیں سوجھنے لگی ہیں، نہیں گھر سے بھاگتے ہی کیوں؟''

''یہی جی چاہتا ہے کہ لاٹھی اٹھاؤں اور پٹیشوری، داتا دین، جھنگری سنگھ سب سالوں کو مار کر گرا دوں اور ان کے پیٹ سے روپے نکال لوں۔''

''روپے کی بہت گرمی چڑھی ہوئی ہے۔ سایت (شاید) لاؤ نکالو، دیکھوں تو کہ اتنے دن میں کیا کما لائے ہو۔''

اس نے گوبر کی کمر میں ہاتھ لگایا۔ گوبر کھڑا ہو کر بولا ''ابھی کیا کمایا؟ ہاں اب تم چلو گی تو کماؤں گا۔ سال بھر تو سہر کے رنگ ڈھنگ پچانتے ہی لگ گیا۔''

''اماں جانے دیں گی تب تو۔''

''اماں کیوں نہ جانے دیں گی، ان سے مطلب؟''

''واہ، میں ان کی راجی (راضی) بنا کہیں نہ جاؤں گی۔ تم تو چھوڑ کر چلتے بنے اور میرا کون تھا یہاں؟ وہ اگر گھر میں نہ گھسنے دیتیں تو میں کہاں جاتی؟ جب تک جیوں گی، ان کا جس گاؤں گی اور تم بھی کیا پردیس ہی کرتے رہو گے؟''

''اور یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا؟ کماؤ اور بھرو، اس کے سوائے یہاں اور کیا دھرا ہے؟ تھوڑی سی سمجھ ہو اور آدمی کام کرنے سے نہ ڈرے تو وہاں بھوکوں نہیں مر سکتا۔ یہاں تو سمجھ کچھ کام ہی نہیں کر سکتی۔ دادا کیوں مجھ سے منہ پھلائے ہوئے ہیں؟''

''اپنا بھاگ سراہو کہ منہ پھلا کر رہے جاتے ہیں۔ تم نے اپر ادھ تو اتنا بڑا کیا تھا کہ اسی رس میں پا جاتے تو منہ لال کر دیتے۔''

''تو تمہیں بھی بہت گالیاں دیتے ہوں گے؟''

''کبھی نہیں بھول کے بھی نہیں! اماں تو پہلے بگڑی تھیں، پر دادا نے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ جب بلاتے ہیں تو بڑے پیار سے۔ میرا سر بھی دکھتا ہے تو بے چین ہو

جاتے ہیں۔ اپنے باپ کو دیکھتے تو میں انہیں دیوتا سمجھتی ہوں۔ اماں کو سمجھایا کرتے ہیں کہ بہو کو کچھ نہ کہنا۔ تمہارے اوپر سینکڑوں بار بگڑ چکے ہیں اور اسے گھر میں بٹھا کر آپ نہ جانے کہاں بھاگ گیا۔ آج کل پیسے پیسے کی تنگی ہے۔ اوکھرو پیہ باہر اڑ گئے۔ اب تو مجوری (مزدوری) کرنی پڑتی ہے۔ آج بیچارے کھیت میں کام کرتے کرتے بیہوش ہو گئے۔ رونا پیٹنا مش گیا۔ تب سے پڑے ہیں۔''

گوبر منہ ہاتھ دھو کر اور بالوں کو سنوار کر گاؤں فتح کرنے نکلا۔ دونوں چچاؤں کے گھر جا کر ''رام رام'' کر آیا۔ پھر اور دوستوں سے ملا۔ گاؤں میں کوئی خاص تبدیلی نہ تھی۔ ہاں پٹیشوری کی نئی بیٹھک بن گئی تھی اور جھنگری سنگھ نے دروازے پر نیا کنواں کھدوالیا تھا۔ گوبر کے دل میں مخالفت اور بھی خم ٹھونکنے لگی۔ جس سے ملا، اس نے اس کی خاطر کی اور نوجوانوں نے تو اسے اپنا ہیرو بنالیا اور اس کے ساتھ لکھنو جانے کو تیار ہو گئے۔ سال ہی بھر میں وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

دفعتاً جھنگری سنگھ اپنے کنویں میں نہاتے ہوئے ملگ ئے۔ گوبر نکلا مگر نہ سلام کیا نہ بولا۔ وہ ٹھاکر کو دکھانا چاہتا تھا کہ میں تمہیں کچھ نہیں سمجھتا۔

جھنگری سنگھ نے خود ہی پوچھا۔ ''کب آئے گوبر؟ مجے (مزے) میں تو رہے؟ کہیں نوکر تھے لکھنو میں؟''

گوبر نے رعونت سے کہا۔ ''لکھنو گالامی (غلامی) کرنے نہیں گیا تھا۔ نوکری ہے گلامی۔ میں بیوپار کرتا تھا۔''

ٹھاکر نے تعجب سے اس کو سر سے پیر تک دیکھا۔ ''کتنی روج کمائی تھی؟''

گوبر نے چھری کو بھالا بنا کر ان کے اوپر چلایا۔ ''یہی کوئی ڈھائی تین روپے

مل جاتے تھے۔ کبھی چمک گئی تو چار بھی مل گئے۔ اس سے بیسی نہیں۔''

جھنگری بہت نوچ کھسوٹ کر کے بھی پچیس تیس سے زیادہ کما پاتے تھے اور یہ گنوار لونڈا سو روپیہ کمانے لگا۔ ان کا سر جھک گیا۔ اب وہ کس دعویٰ سے اس پر رعب جما سکتے تھے؟ ذات میں وہ ضرور اونچے ہیں مگر ذات کون دیکھتا ہے؟ اس سے مقابلہ کرنے کا وقت نہیں، اب تو اس کی منت ہی کر کے کچھ کام نکالا جا سکتا ہے بولے۔ ''اتنی کمائی کم نہیں ہے بیٹا، جو کھرچ (خرچ) کرتے بنے۔ گاؤں میں تو تین آنے بھی نہیں ملتے۔ بھوانی (ان کے بڑے لڑکے کا نام تھا) کو بھی کہیں کوئی کام دلا دو تو بھیج دوں۔ نہ پڑھے، نہ لکھے، ایک نہ ایک جھگڑا کھڑا کیے رہتا ہے۔ کہیں منیمی خالی ہو تو کہنا، نہیں تو ساتھ ہی لیتے جانا۔ تمہارا تو ساتھی ہے۔ طلب تھوڑی ہو، کچھ بات نہیں، ہاں چار پیسے کی اوپر گنجائش ہو۔''

گوبر نے گھمنڈ بھری ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''یہی اوپری آمدنی کی چاٹ تو آدمی کو بگاڑ دیتی ہے، ٹھاکر! پر ہم لوگوں کی عادت کچھ ایسی بگڑ گئی ہے کہ جب تک بے ایمانی نہ کریں، پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ لکھنو میں منیمی مل سکتی ہے مگر ہر ایک مہاجن ایماندار اور چوکس آدمی چاہتا ہے۔ میں بھوانی کو کسی کے گلے باندھ تو دوں، پر پیچھے انہوں نے کہیں ہاتھ لپکایا تو وہ میری گردن پکڑے گا۔ دنیا میں علم کو پوچھ نہیں ہے، ایمان کی پوچھ ہے!''

یہ طمانچہ لگا کر گوبر آگے بڑھ گیا۔ جھنگری دل مسوس کر رہ گئے۔ لونڈا کتنے گھمنڈ کی باتیں کرتا ہے جیسے دھرم کا اوتار ہی ہو۔

اسی طرح گوبر نے داتا دین کو بھی رگڑا۔ وہ کھانا کھانے جا رہے تھے کہ گوبر کو

دیکھ کر خوش ہو کر بولے ''مجے (مزے) میں رہے گوبر؟ سنا کہ وہاں کوئی اچھی جگہ پا گئے ہو۔ ماتا دین کو بھی کہیں حیلے سے لگا دو نا؟ بھنگ پی کر پڑے رہنے کے سوائے یہاں اور کون کام ہے؟''

گوبر نے بتایا۔ ''تمہارے گھر میں کس بات کی کمی ہے مہراج؟ ججمان کے یہاں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ کچھ نہ کچھ مار ہی لاؤ گے۔ پیدا ہونے میں لو، مرنے میں لو، شادی میں لو، غم میں لو، کھیتی کرتے ہو، لیکن دین کرتے ہو، دلالی کرتے ہو، کسی سے کچھ بھول چوک ہو جائے تو ڈانڈا باندھ لگا کر اس کا گھر لوٹ لیتے ہو، اتنی کمائی میں پیٹ نہیں بھرتا؟ کیا کرو گے بہت سا دھن بٹور کر؟ کہ ساتھ لے جانے کی کوئی جگت (تدبیر) نکالی ہے۔''

داتا دین نے دیکھا کہ گوبر کتنی ڈھٹائی سے بول رہا ہے، اب لحاظ جیسے بالکل بھول سا گیا ہو۔ ابھی شاید نہیں جانتا کہ باپ میری مجوری کر رہا ہے۔ سچ ہے، چھوٹی ندی کو امنڈتے دیر نہیں لگتے، مگر چہرے پر کدورت نہ آنے دی۔ جیسے بڑے بوڑھے بچوں سے مونچھیں اکھڑوا کر بھی ہنستے ہیں، انہوں نے بھی اس طعنے کو ہنسی میں لیا اور ہنستے ہوئے کہا۔ ''لکھنو کی ہوا کھا کے تو بڑا چنٹ ہو گیا ہے گوبر! لا، کیا کما کے لایا ہے؟ کچھ نکال! سچ کہتا ہوں گوبر، تمہاری یاد بہت آتی تھی۔ اب تو رو گے کچھ دن؟''

''ہاں ابھی رہوں گا کچھ دن، ان پنچوں پر دعویٰ کرنا ہے جنہوں نے ڈنڈ کے بہانے میرے ڈیڑھ سو روپے پڑپ لیے ہیں۔ دیکھوں، کون میرا حقہ پانی بند کرتا ہے اور کون برادری مجھے جات (ذات) باہر کرتی ہے۔''

یہ دھمکی دے کر وہ آگے بڑھا۔ اس کی تمکنت نے اس کے نوجوان عقیدت مندوں کو مرعوب کر دیا تھا۔

ایک نے کہا۔ ''کر دو دعویٰ گوبر بھیا! بڈھا کالا سانپ ہے، جس کے کاٹے کا منتر نہیں تم نے اچھی ڈانٹ بتائی۔ پٹواری کے کان بھی جرا (ذرا) گرم کر دو۔ بڑا پاجی ہے۔ باپ بیٹے میں آگ لگا دے، بھائی بھائی میں آگ لگا دے۔ کارندے سے مل کر آسامیوں کا گلا کاٹتا ہے۔ اپنے کھیت پیچھے جوتو، پہلے اس کے کھیت جوت دو۔ اپنی سینچائی پیچھے کرو، پہلے اس کی سینچائی کر دو۔''

گوبر نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے کیا کہتے ہو بھائی۔ سال بھر میں بھول تھوڑی گیا ہوں۔ یہاں مجھے رہنا ہی نہیں ہے۔ نہیں تو ایک ایک کو نیچا کر کے چھوڑتا۔ اب کے ہولی دھوم دھام سے مناؤ اور ہولی کا سوانگ بنا کر ان سبوں کے خوب بھگو بھگو کر لگاؤ۔''

ہولی کا پروگرام بننے لگا۔ خوب بھنگ گھٹے، دودھیا بھی اور نمکین بھی اور رنگوں کے ساتھ کالکھ بھی بنے اور مکھیوں کے منہ پر کالکھ ہوتی جائے۔ ہولی میں کوئی بول ہی کیا سکتا ہے؟ پھر سوانگ نکلے اور پنچوں کی خوب بھد کی جائے۔ روپے پیسے کی کوئی پروا نہیں، گوبر بھائی کما کر آئے ہیں۔

گوبر کھانا کھا کر بھولا سے ملنے طلا۔ جب تک اپنی جوڑی لا کر اپنے دروازے پر نہ باندھ دے، اسے چین نہیں۔ وہ لڑنے مرنے پر آمادہ تھا۔

ہوری نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''جھگڑا مت بڑھاؤ بیٹا! بھولا گوئیں لے گئے، بھگوان ان کا بھلا کرے! پر روپے تو آتے ہی تھے۔''

گوبر نے بھڑک کر کہا۔ ''دادا تم بیچ میں نہ بولو، ان کی گائے پچاس کی تھی، ہماری جوڑی ڈیڑھ سو میں آئی تھی۔ تین سال ہم نے جوتی، پھر بھی سو کی تو تھی ہی۔ وہ اپنے روپے کے لیے دعویٰ کرتے، ڈگری کراتے یا جو چاہتے کرتے، ہمارے دروازے سے جوڑی کیوں کھول لے گئے؟ اور تمہیں کیا کہوں؟ ادھر گوئیں کھو بیٹھے اور ادھر ڈیڑھ سو روپے تاوان کے بھرے۔''

یہ ہے سدھائی کا پھل! میرے سامنے جوڑی لے جاتے تو دیکھتا۔ تینوں کو یہیں دھرتی پر سلا دیتا اور پنچوں سے بات تک نہ کرتا۔ دیکھتا کہ کون مجھے برادری سے الگ کیے دیتا ہے۔ مگر تم بیٹھے تاکتے رہے۔''

ہوری نے خطاوار کی طرح سر جھکا لیا مگر دھنیا یہ زیادتی کیسے دیکھ سکتی تھی۔ بولی ''بیٹا تم بھی تو اندھیر کرتے ہو، حکہ (حقہ) پانی بند ہو جاتا تو گاؤں میں نباہ ہوتا؟ جوان لڑکی بیٹھی ہے، اس کا بھی کہیں ٹھکانہ لگانا ہے کہ نہیں؟ مرنے جینے میں تو آدمی برادری.....''

گوبر نے بات کاٹی۔ ''حکہ پانی سب تو تھا، برادری میں اور بھی تھا، پھر میرا بیاہ کیوں نہیں ہوا؟ بولو۔ اس لیے کہ گھر میں روٹی نہ تھی۔ روپے ہوں تو نہ حکہ پانی کا کام ہے، نہ بھائی برادری کا۔ دنیا پیسے کی ہے اور کوئی کچھ نہیں پوچھتا۔''

دھنیا تو بچے کا رونا سن کر اندر چلی گئی اور گوبر بھی گھر سے نکلا۔ ہوری بیٹھا سوچ رہا تھا کہ لڑکے کی سمجھ جیسے کھل گئی ہے۔ کیسی بے لاگ بات کہتا ہے۔ اس کی اتنی سمجھ نے ہوری کے ایمان و اخلاق کو مغلوب کر دیا۔

دفعتاً ہوری نے اس سے پوچھا۔ ''میں بھی چلوں؟''

''میں لڑائی کرنے نہیں جاتا، دادا ڈرو نہیں۔ میری طرف تو قانون ہے، میں کیوں لڑائی کرنے لگا؟''

''میں بھی چلوں تو کوئی ہرج ہے؟''

''ہاں بڑا ہرج ہے، تم بنی بات بگاڑ دو گے۔''

''ہوری چپ ہو گیا اور گوبر چل دیا۔''

پانچ منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کے دھنیا بچے کو لیے ہوئے باہر نکلیہ اور بولی۔ ''کیا گوبر چلا گیا، اکیلے؟ میں کہتی ہوں کہ تمہیں بھگوان کبھی سمجھ دیں گے یا نہیں۔ بھولا کیا یوں گوئیں میں سا دے گا؟ تینوں اس پر ٹوٹ پڑیں گے، باز کی طرح۔ بھگوان ہی کسل کریں۔ اب کسی سے کہوں کہ دوڑ کر گوبر کو پکڑے؟ تم سے تو میں ہار گئی۔''

ہوری نے کونے سے ڈنڈا اٹھایا اور گوبر کے پیچھے دوڑ۔ گاؤں کے باہر آ کر نظر دوڑائی، ایک ہلکی سی لکیر افق سے ملی ہوئی دکھائی دی۔ اتنی ہی دیر میں گوبر دور کیسے چلا گیا۔ ہوری کا دل اسے ملامت کرنے لگا۔ اس نے کیوں گوبر کو روکا نہیں؟ اگر وہ ڈانٹ کر کہہ دیتا کہ بھولا کے گھر مت جاؤ تو گوبر کبھی نہ جاتا اور اب اس سے دوڑا بھی تو نہیں جاتا۔ وہ ہار کر وہیں بیٹھ گیا اور بولا۔ ''اس کی رکشا کرو مہراج سوامی!''

گوبر اس گاؤں میں پہنچا تو کچھ لوگ برگد کے نیچے بیٹھے ہوئے جوا کھیل رہے تھے۔ اسے دیکھ کر لوگوں نے سمجھایا کہ پولیس کا سپاہی ہے۔ گوڑیاں سمیت کر بھاگے کے دفعتا جنگی نے پہچان کر کہا۔ ''ارے یہ تو گوبر دھن ہے۔''

گوبر نے دیکھا کہ جنگی پیڑ کی آڑ میں کھڑا جھانک رہا ہے۔ بولا۔ ''ڈرو مت جنگی بھیا میں ہوں۔ رام رام! آج ہی آیا ہوں۔ سوچا کہ چل کر سب سے ملتا آؤں، پھر نہ جانے کب آنا ہو۔ میں تو بھیا تمہارے آشیر باد سے بڑے مزے سے نکل گیا۔ جس راجا کی نوکری میں ہوں، اس نے مجھ سے کہا ہے کہ ایک دو آدمی مل جائیں تو لیتے آنا۔ چوکیداری کے لیے چاہیے۔ میں نے کہا سرکار! ایسے آدمی دوں گا کہ چاہے جان چلی جائے، پر وہ میدان سے ہٹنے والے نہیں۔ چاہو تو میرے ساتھ چلو۔''

گوبر نے بڑے یقین سے کہا۔ ''اس کی کچھ چنتا مت کرو۔ سب کچھ اپنے ہی ہاتھ میں ہے، جو چاہو گے ہو جائے گا۔ ہم نے سوچا کہ جب گھر ہی میں آدمی ہے تو باہر کیوں جائیں؟''

''کام چاہے چوکیداری کرو چاہے تگادے (تقاضے) پر جاؤ۔ تگادے کا کام سب سے اچھا۔ اسامی سے گنٹھ گئے اور ادھر مالک سے آکر کہہ دیا کہ گھر پر ملا ہی نہیں۔ چاہو تو روپے آٹھ آنے روج بنا سکتے ہو۔''

''رہنے کو جگہ بھی ملتی ہے؟''

''جگہ کی کون کمی؟ پورا محل پڑا ہے، پانی کا نل، بجلی کی بتی۔ کسی بات کی کمی نہیں۔ کامتا ہیں کہ کہیں گئے ہیں؟''

''دودھ لے کر گئے ہیں۔ مجھے کوئی ہاٹ نہیں جانے دیتا۔ کہتے ہیں کہ تم تو گانجہ پی جاتے ہو۔ میں اب بہت کم پیتا ہوں بھیا، پر دو پیسے روج (روز) تو چاہیے، تم کامتا سے کچھ نہ کہنا، میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''ہاں ہاں، بے کھٹکے چلو۔ ہولی کے بعد۔''

''تو پکی رہی۔''

دونوں باتیں کرتے ہوئے بھولا کے دروازے جا پہنچے۔ بھولا بیٹھے ہوئے ستلی کات رہے تھے۔ گوبر نے لپک کر ان کے پیر چھوئے اور اس وقت اس کا گلا واقعی بھر آیا۔ بولا۔ ''کاکا مجھ سے جو کچھ بھول چوک ہوئی ہو وہ چھما کرو۔''

بھولا نے ستلی کا تنا بند کر دیا اور پتھریلی آواز میں بولا۔ ''کام تو تم نے ایسا ہی کیا تھا گوبر کہ تمہارا سر کاٹ لوں تو بھی پاپ نہ لگے، مگر اپنے دوارے پر آئے ہو تو اب کیا کہوں۔ جاؤ جیسا میرے ساتھ کیا اس کا ڈنڈ بھگوان دیں گے۔ کب آئے؟''

گوبر نے خوب نمک مرچ لگا کر اپنی تقدیر کے چمکنے کا حال سنایا اور جنگی کو اپنے ساتھ لے جانے کی منظوری چاہی۔ بھولا کو جیسے بے مانگے بردان مل گیا۔ جنگی گھر پر ایک نہ ایک فساد کرتا رہتا تھا۔ باہر چلا جائے گا تو چار پیسے پیدا کر لے گا۔ نہ کسی کو کچھ دے، اپنا بوجھ اٹھا لے گا۔

گوبر نے کہا ''نہیں کاکا، بھگوان نے چاہا اور ان سے رہتے بنا تو سال دو سال میں آدمی ہو جائیں گے۔''

''ہاں جب ان سے رہتے بنے۔''

''سر پر آ پڑتی ہے تو آدمی آپ سنبھل جاتا ہے۔''

''لو کب تک جانے کا ارادہ ہے؟''

''ہولی کر کے چلا جاؤں گا۔ یہاں کھیتی باڑی کا سلسلہ پھر جما دوں تو بے پھکر (بے فکر) ہو جاؤں گا۔''

''ہوری سے کہو کہ اب بیٹھ کر رام رام جپیں۔''

''کہتا تو ہوں لیکن ان سے بیٹھے رہا جائے۔''

''وہاں کسی بید سے تو تمہاری جان پہچان ہو گی۔ کھانسی بہت آ رہی ہے، ہو سکے تو کوئی دوائی بھیج دینا۔''

''ایک نامی بید تو میرے پڑوس ہی میں رہتے ہیں، ان سے حال کہہ کے اور دوا بنوا کے بھیج دوں گا۔ کھانسی رات کو تنگ کرتی ہے کہ دن کو؟''

''نہیں بیٹا، رات کو۔ آنکھ نہیں لگتی۔ نہیں، وہاں کوئی ڈول ہو تو میں بھی وہیں چل کر رہوں۔ یہاں تو کچھ پرتہ نہیں پڑتا۔''

''روزگار کا تو مزہ وہاں ہے کاکا، یہاں کیا ہو گا؟ یہاں روپے کا دس سیر دودھ بھی کوئی نہیں پوچھتا، حلوائی کو گلے لگانا پڑتا ہے، وہاں پانچ چھ سیر کے بھاؤ سے چاہو تو ایک گھڑی میں منوں دودھ بیچ لوں۔''

جنگی گوبر کے لیے دودھیا شربت بنانے چلا گیا تھا۔ بھولا نے تخلیہ دیکھ کر کہا۔ ''اور بھیا! اب اس جنجال سے جی اوب گیا ہے۔ جنگی کا حال دیکھتے ہو۔ کامتا دودھ لے کر جاتا ہے۔ چارا پانی، کھولنا باندھنا سب مجھے کرنا پڑتا ہے۔ اب تو یہی چاہتا ہوں کہ سکھ سے کہیں ایک روٹی کھاؤں اور پڑا رہوں۔ کہاں تک ہائے ہائے کروں۔ روز لڑائی جھگڑا کس کس کے پاؤں سہلاؤں؟ کھانسی آتی ہے، رات کو اٹھا نہیں جاتا، پر کوئی ایک لوٹا پانی کو بھی نہیں پوچھتا۔ پگہی ٹوٹ گئی ہے پر کسی کو اس کی سدھ نہیں ہے۔ جب میں بناؤں گا تبھی بنے گی۔''

گوبر نے یگانگت کے ساتھ کہا۔ ''تم چلو لکھنو کاکا! پانچ سیر کا دودھ بیچو نقد۔

کتنے ہی بڑے بڑے آدمیوں سے میری جان پہچان ہے۔ من بھر دودھ کی نکاسی کا جمہ تو میں لیتا ہوں۔ میری چائے کی دکان بھی ہے۔ دس سیر دودھ تو میں ہی روز لیتا ہوں۔ تمہیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔''

نگی شربت لے آیا۔ گوبر نے ایک گلاس پی کر کہا۔ ''تم تو سانجھ سویرے چائے کی دکان ہی پر بیٹھ جاؤ کا کا! تو ایک روپیہ کہیں نہیں گیا۔''

بھولا نے ایک منٹ بعد ذرا شرماتے ہوئے کہا۔ ''غصے میں بیٹا آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ میں تمہاری گوئیں کھول لایا تھا، سو لیتے جانا۔ یہاں کون کھیتی باڑی ہوتی ہے۔''

''میں نے تو ایک نئی گوئیں ٹھیک کر لی، کا کا!''

''نہیں نہیں، نئی گوئیں لے کر کیا کرو گے؟ یہی لیتے جاؤ۔''

''تو میں تمہارے روپیہ بھجوا دوں گا۔''

''روپے کہیں باہر تھوڑے ہی ہیں بیٹا، گھر ہی میں تو ہیں۔ برادری کا ڈھکوسالا ہے، نہیں تم میں اور ہم میں کون پھرک (فرق) ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے سکھی ہونا چاہیے تھا کہ جھنیا بھلے گھر میں ہے اور سکھ سے ہے اور میں اس کے کھون (خون) کا پیاسا بن گیا تھا۔''

شام کو گوبر یہاں سے چلا تو گوئیں اس کے ساتھ تھی اور جنگی دہی کی دو ہانڈیاں لیے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

(21)

دیہاتوں میں سال کے چھ مہینے کسی نہ کسی جشن میں ڈھول مجیرے بجتے ہی

رہتے ہیں۔ ہولی کے ایک ماہ قبل سے ایک ماہ بعد تک پھاگ ہوتا رہتا ہے، اساڑھ لگتے ہی آلھا شروع ہو جاتا ہے اور ساون بھادوں میں کجلیاں ہوتی ہیں۔ کجلیوں کے بعد رامائن شروع ہو جاتی ہے۔ سمیر بھی ان مشاغل سے مستثنیٰ نہیں۔ مہاجن کی دھمکیاں اور کارندوں کی گالیاں اس جشن میں خلل نہیں ڈال سکتیں۔ گھر میں غلہ نہیں ہے، بدن پر کپڑا ہے، گانٹھ میں پیسہ نہیں تو کوئی پروا نہیں، زندگی کی تفریحی رغبتیں تو دبائی نہیں جا سکتیں، بلا ہنسے ہوئے تو رہا نہیں جا سکتا۔

یوں تو ہولی میں گانے بجانے کا خاص مقام نوکھے رام کی چاپال تھی۔ وہیں بھنگ چھنتی تھی، وہیں رنگ اڑتا تھا، وہیں ناچ ہوتا تھا۔ اس جشن میں کارندے صاحب کے دس پانچ روپے خرچ ہو جاتے تھے اور کس میں یہ سکت تھی کہ اپنے دروازے پر جلسہ کراتا؟

مگر اب کے گوبر نے گاؤں کے سارے نوجوانوں کو اپنے یہاں کھینچ لیا اور نوکھے رام کی چوپال خالی پڑی ہے۔ گوبر کے دروازے پر بھنگ رکھی ہوئی ہے گمگر ہیں کون؟ ڈھول مجیرا سب موجود ہے مگر گائے بجائے کون؟ جسے دیکھو گوبر کے دروازے کی طرف دوڑا چلا جا رہا ہے۔ یہاں بھنگ میں گلاب، زعفران اور بادام کی بہار ہے۔ ہاں سیر بھر بادام گوبر خود لایا ہے۔ پیتے ہی کلیجہ تر ہو جاتا ہے اور آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ خمیرہ تمباکو بھی لایا ہے، خاص بسواں کی۔ رنگ میں بھی کیوڑہ ڈالا گیا ہے۔ وہ روپیہ کمانا بھی جانتا ہے اور خرچ کرنا بھی گاڑ کر رکھ لو تو کوئی دیکھتا ہے؟ دولت کی یہی تو زیبائش ہے اور صرف بھنگ ہی نہیں ہے بلکہ جتنے گویئے ہیں ان سب کا نیوتہ بھی ہے اور گاؤں والوں میں نہ ناچنے والوں کی کمی

ہے، نہ گانے والوں کی اور نہ سوانگ بھرنے والوں کی۔ سو بھاہی لنگڑوں کی ایسی نقل کرتا ہے کہ کوئی کیا کرے گا اور آواز کی نقل میں تو اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ جس کی بولی کہو اس کی بولی، انسان کی بھی اور حیوان کی بھی! گردھر بھی نقل کرنے میں بے نظیر ہے۔ وکیل کی نقل وہ کرے، پٹواری کی نقل وہ کرے، تھانیدار، چپراسی، سیٹھ سبھی کی نقل وہ کرسکتا ہے، ہاں غریب کے پاس ویسا ساز و سامان نہیں ہے مگر اب کے گوبر نے اس کے لیے سو بھی سامان منگا دیا ہے اور اس کی نقلیں دیکھنے کے قابل ہوں گی۔

یہ چرچا اتنا پھیلا کہ شام ہی سے تماشائیوں کا ہجوم ہونے لگا۔ قرب و جوار کے گاؤں سے دیکھنے والوں کی ٹولیاں آنے لگیں اور دس بجتے بجتے تین چار ہزار آدمیوں کا مجمع ہوگیا اور جب گردھر جھنگری سنگھ کا روپ بھرے ہوئے اپنی منڈلی کے ساتھ آ کھڑا ہوا تو لوگوں کو کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ وہی بالوں کا سرم، وہی بڑی بڑی مونچھیں اور بڑھا اور لٹکتا ہوا پیٹ۔ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور پہلی ٹھکرائن بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے۔

ٹھاکر ٹھکرائن کو عاشقانہ انداز سے کچھ کہتے ہیں۔ ''اب بھی تمہارے اوپر وہ جوبن ہے کہ کوئی جوان بھی دیکھ لے تو تڑپ جائے'' ''اور ٹھکرائن پھوکر جواب دیتی ہے کہ ''جبھی تو نئی نویلی لائے۔''

''اسے تو لایا ہوں تمہاری سیوا کرنے کے لیے، وہ تمہاری کیا برابری کرے گی؟''

دوسری بیوی یہ بات سن لیتی ہے اور منہ پھلا کر چلی جاتی ہے۔

دوسرے منظر میں ٹھاکر چارپائی پر لیٹے ہیں، چھوٹی بیوی منہ پھیرے ہوئے زین پر بیٹھی ہے۔ ٹھاکر بار بار اس کا منہ اپنی طرف کرنے کی بیکار کوشش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''مجھ سے کیوں روٹھی ہو، میری لاڈلی؟''

''تمہاری لاڈلی جہاں ہو وہاں جاؤ۔ میں تو لونڈی ہوں، دوسروں کی سیوا ٹہل کرنے کے لیے آئی ہوں۔''

''تم میری رانی ہو، تمہاری سیوا ٹہل کرنے کے لیے وہ بڑھیا ہے۔''

پہلی ٹھکرائن سن لیتی ہے اور جھاڑو لے کر گھر میں گھستی ہے اور کئی جھاڑو انہیں رسید کرتی ہے۔ ٹھاکر جان بچا کر بھاگتے ہیں۔

پھر دوسری نقل ہوئی، جس میں ٹھاکر نے دس روپے کا تمسک لکھا کر پانچ روپے دیئے، بقیہ نذرانہ، تحریر دستوری اور سود میں کاٹ لیے۔

کسان آ کر اور ٹھاکر کے پیروں پر گر کر رونے لگتا ہے۔ بڑی مشکل سے ٹھاکر روپے دینے پر راضی ہوئے ہیں۔ جب کاغذ لکھا جاتا ہے اور اسامی کے ہاتھ میں پانچ روپے رکھ دیئے جاتے ہیں تو وہ چکرا کر پوچھتا ہے۔ ''یہ تو پانچ ہی ہیں، مالک!''

''پانچ نہیں دس ہیں، گھر جا کر گننا۔''

''نہیں سرکار پانچ ہیں۔''

''ایک روپیہ نذرانہ کا ہوا کہ نہیں؟''

''ہاں سرکار!''

''ایک لکھائی کا؟''

''ہاں سرکار!''

''ایک کاغذ کا؟''

''ہاں سرکار!''

''ایک دستوری کا؟''

''ہاں سرکار''

''ایک سو دکا؟''

''ہاں سرکار''

''پانچ نقد، دس ہوئے کہ نہیں؟''

''ہاں سرکار! اب یہ پانچوں بھی میری طرف سے رکھ لیجیے۔''

''کیسا پاگل ہے؟''

نہیں سرکار۔ ایک روپیہ چھوٹ ٹھکرائن کا نجرانہ ہے اور ایک روپیہ بڑی ٹھکرائن کا۔ ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کے پاس کھانے کو اور ایک روپیہ بڑی ٹھکرائن کے پان کھانے کو۔ رہا ایک روپیہ، سو وہ آپ کے کریا کرم کے لیے!''

اسی طرح نوکھے رام، پیشوری، داتا دین، سب کی باری باری سے خبر لی گئی۔ پھبتیوں میں خواہ کوئی جدت نہ ہو اور نقلیں چاہے پرانی ہوں، مگر گردھر کا ڈھنگ ایسا ہنسانے والا تھا اور دیکھنے والے اتنے سادہ دل تھے کہ بے بات کی بات میں بھی ہنس پڑتے تھے۔ ساری رات یہ نقلیں ہوتی رہیں اور ستائے ہوئے دل اس خیالی بدلہ سے خوش ہوتے رہے۔ آخری نقل ختم ہوئی تو کوء بول رہے تھے۔

سویرا ہوتے ہی جسے دیکھو، اس کی زبان پر رات کے گانے، وہی نقل، وہی

فقرے۔ گاؤں کے مکھیے تماشا بن گئے۔ جدھر نکلتے ہیں ادھر ہی دو چار لڑکے پیچھے لگ جاتے ہیں اور وہی فقرے کستے ہیں۔ جھنگری سنگھ تو دل لگی باز آدمی تھے، اسے محض مذاق سمجھے۔ مگر پٹیشوری میں چڑنے کی عادت تھی اور پنڈت داتا دین تو اتنے تنگ مزاج تھے کہ ذرا سی بات میں فوراً لڑنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ وہ سب سے اور پانے کے عادی تھے۔ کارندے کی تو بات ہی کا، رائے صاحب تک انہیں دیکھتے ہی سر جھکا دیتے تھے۔ ان کی ایسی ہنسی اڑائی جائے اور اسی گاؤں میں جوان کے لیے نا قابل برداشت تھی۔ گر ان میں ''برہمہ تیج'' ہوتا تو ان دشٹوں کو بھسم کر دیتے، ایسا شراپ دیتے کہ سب کے سب وہیں بھسم ہو جاتے، مگر اس کلجگ میں تو شراب کا اثر ہی جاتا رہا، بس انہوں نے بھی کلجگ ہی والا ہتھیار نکالا۔ ہوری کے دروازے پر گئے۔ میرا کتنا نکسان (نقصان) ہو گیا، یہ تم نہیں سوچتے۔

گوبر دیر میں سویا تھا۔ ابھی بھی اٹھا تھا اور آنکھیں ملتا ہوا باہر آ رہا تھا کہ داتا دین کی آواز کان میں پڑی۔ پالاگن کرنا تو دور رہا، الٹے اور ہیکڑی دکھا کر بولا۔ ''اب وہ تمہاری مجوری نہ کریں گے۔ ہمیں اپنی اوکھ بھی بونا ہے۔''

داتا دین نے تمباکو پھانکتے ہوئے کہا ''کام کیسے نہیں کریں گے؟ سال کے بیچ میں کام نہیں چھوڑ سکتے۔ جیٹھ میں چھوڑنا ہو تو چھوڑ دیں۔ کرنا ہو تو کریں۔ اس سے پہلے نہیں چھوڑ سکتے۔''

گوبر نے جمائی لیتے ہوئے کہا ''انہوں نے تمہاری گلامی نہیں لکھی ہے۔ جب تک من تھا کام کیا، اب من نہیں ہے، نہیں کریں گے۔ اس میں کوئی جبردستی نہیں کر سکتا۔''

''تو ہوری کام نہیں کریں گے؟''

''نا!''

''تو ہمارے روپیہ سود سمیت دے دو۔ تین سال کا سود ہوتا ہے سو روپیہ۔ اصل ملا کر دو سو ہوتے ہیں۔ ہم نے سمجھا تھا کہ تین روپیہ مہینہ سود میں کٹتے جائیں گے، پر تمہارا من نہیں ہے تو مت کرو۔ میرے روپے دے دو۔ دھنا سیٹھ بنتے ہو تو دھنا سیٹھ کا کام کرو۔''

ہوری نے عاجزی سے کہا۔ ''تمہاری چاکری سے میں کب انکار کرتا ہوں مہاراج؟ پر ہماری اوکھ بھی تو بونے کو پڑی ہے۔''

گوبر نے باپ کو ڈانٹا۔ ''کیسی چاکری اور کسی کی چاکری؟ یہاں کوئی کسی کا چاکر نہیں، سبھی برابر ہیں۔ اچھی دل لگی ہے! کسی کو سو روپے ادھار دیئے اور سود میں عمر بھر کام لیتے رہے! اصل جیوں کا تیوں! یہ مہاجنی نہیں ہے، خون چوسنا ہے!''

''تو روپے دے دو بھیا لڑائی کاہے کی ہے؟ میں آنہ روپیہ بیاج لیتا ہوں۔ تمہیں گاؤں گھر کا سمجھ کر آدھ آنے تو پیسے کر دیا تھا۔''

''ہم تو روپیہ سینکڑہ دیں گے، ایک کوڑی بیسی نہیں۔ تمہیں لینا ہو تو لو، نہیں عدالت سے لینا۔ ایک روپیہ سینکڑہ بیاج کم نہیں ہوتا۔''

''معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ کی گرمی ہوگئی ہے۔''

''گرمی نہیں ہوتی ہے جو ایک کے دس لیتے ہیں۔ ہم تو مجور ہیں، ہماری گرمی پسینے کی راہ جاتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے بیل کے لیے تیس روپے دیئے تھے۔ اس کے سو ہوئے اور اب سو کے دوسو ہو گئے۔ اس طرح تم لوگوں نے لوٹ لوٹ کر مجور بنا دیا اور آپ زمین کے مالک بن بیٹھے۔ تیس کے دوسو! کچھ ٹھکانا ہے! کتنے ہوئے ہوں گے دادا؟''

ہوری نے غمگین لہجے میں کہا ''یہی آٹھ نو سال ہوئے ہوں گے۔''

گوبر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''نو سال میں تیس روپیہ کے دوسو۔ ایک روپے کے حساب سے کتنا ہوتا ہے؟'' اس نے زمین پر ایک ٹھیکرے سے حساب لگا کر کہا۔ ''دس سال میں چھتیس روپے ہوتے ہیں۔ اصل ملا کر چھیاسٹھ۔ اس کے ستر روپے لے لو۔ اس سے بیسی میں کوئی نہ دوں گا۔''

داتا دین نے ہوری کو بیچ میں ڈال کر کہا۔ ''سنتے ہو ہوری! گوری نیائے؟ میں اپنے دوسو روپے چھوڑ کر ستر لے لوں، نہیں عدالت کرو، اس طرح کا برتاؤ ہوا تو

سنسار کے دن چلے گا؟ اور تم میرے دوارے پر جاؤ گے اور ہاتھ جوڑ کر دے آؤ گے۔''

داتا دین جھلائے ہوئے لوٹ پڑے۔ گوبر اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مگر ہوری کے پیٹ میں دھرم کی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اگر ٹھاکر یا بنئے کے روپے ہوتے تو اسے زیادہ فکر نہ ہوتی۔ مگر برہمن کے روپے! اس کی ایک پائی بھی دب گئی تو ہڈی توڑ کر نکلے گی۔ ایشور نہ کرے کہ برہمن غصہ کسی پر گرے۔ گھرانے میں کوئی چلو بھر پانی دینے والا، گھر میں دیا جلانے والا بھی نہیں رہ جاتا، اس کا مذہب پرست دل دہل اٹھا۔ اس نے دوڑ کر پنڈت جی کے پیر پکڑ لیے اور درد بھری آواز میں بولا۔ ''مہاراج! جب تک جیتا ہوں میں تمہاری ایک ایک پائی چکاؤں گا۔ لڑکوں کی بات پر مت جاؤ۔ معاملہ تو ہمارے تمہارے بیچ ہوا ہے، وہ کون ہوتا ہے؟''

داتا دین ذرا نرم پڑے۔ ''ذرا اس کی زبردچست دیکھو، کہتا ہے کہ دو سو روپے کے ستر روپے لو یا عدالت جاؤ۔ ابھی عدالت کی ہوا نہیں کھائی، تبھی ایک بار کسی کے پالے پڑ جائیں گے تو پھر یہ تاؤ نہ رہے گا۔ چار دن سہر میں کیا رہے، تانہ ساہ ہو گئے۔''

''میں تو کہتا ہوں مہاراج کہ میں تمہاری ایک ایک پائی چکا دوں گا۔''

''تو کل سے ہمارے یہاں کام کرنے آنا پڑے گا۔''

''اپنی اوکھ بونا ہے مہاراج، نہیں تو تمہارا ہی کام کرتا۔''

داتا دین چلے گئے تو گوبر نے حقارت سے دیکھ کر کہا۔ ''گئے تھے دیوتا کو منانے! تمہیں لوگوں نے تو ان سب کا سبھاؤ بگاڑ دیا ہے۔ تیس روپے دیئے۔ اب

دوسو لے گا اور ڈانٹ اوپر سے بتا دے گا اور تم سے مجوری کرائے گا اور کام کراتے کراتے مار ڈالے گا؟''

ہوری نے اپنے خیال سے سچائی کا پہلو لے کر کہا۔ ''دھرم نہ چھوڑنا چاہیے بیٹا، اپنی اپنی کرنی اپنے اپنے ساتھ ہے۔ ہم نے جس بیاج پر روپے لیے، وہ دینے ہی پڑیں گے۔ پھر برہمن ٹھہرے، ان کا پیسہ ہمیں پچے گا؟ ایسا مال تو ان ہی لوگوں کو پچتا ہے۔''

گوبر نے تیوریاں چڑھائیں۔ ''دھرم چھوڑنے کون کون کہہ رہا ہے اور کون کہہ رہا ہے اور کون کہہ رہا ہے کہ برہمن کے پیسہ دبا لو؟ میں تو یہی کہتا ہوں کہ اتنا بیاج ہم نہیں دیں گے۔ بینک والے بارہ آنے بیاج لیتے ہیں۔ تم ایک روپیہ لے لو اور کیا کسی کو لٹ لوگے؟''

''ان کا رویاں جو دکھی ہوگا۔''

''ہوا کرے۔''

''بیٹا! جب تک میں جیتا ہوں، مجھے اپنے رستے چلنے دو۔ جب میں مر جاؤں تو جو تمہارے جی میں آئے وہ کرنا۔''

''تو پھر تمہی دینا۔ تو اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں کلہاڑ نہ ماروں گا۔ میرا گدھا پن تھا کہ تمہارے بیچ میں بولا۔ تم نے کھایا ہے تو بھرو، میں کیوں اپنی جان دوں؟''

یہ کہتا ہوا گوبر اندر چلا گیا۔ جھنیا نے پوچھا۔ ''آج سبیرے سبیرے دادا سے کیوں الجھ پڑے؟''

گوبر نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور آخر میں بولا۔ ''ان کے اوپر رن (قرض) کا

بوجھ اسی طرح بڑھتا جائے گا۔ میں کہاں تک بھروں گا؟ انہوں نے کما کما کر دوسروں کا گھر بھرا ہے۔ میں کیوں ان کی کھودی ہوئی کھائی میں پڑوں؟ انہوں نے مجھ سے تو پوچھ کر نہیں ہوں۔'' ادھر مکھیوں میں گوبر کو نیچا دکھانے کے لیے سازش ہو رہی تھی۔ یہ لونڈا شکنجے میں نہ کسا گیا تو گاؤں میں اودھم مچا دے گا۔ پیادے سے فرزیں ہو گیا ہے نا، ٹیڑھے تو چلے ہی گا۔ نہ جانے کہاں سے اتنا قانون سیکھ آیا ہے۔ کہتا ہے کہ روپیہ سینکڑہ سود سے بیسی نہ دوں گا۔ لینا ہو تو لو نہیں عدالت جاؤ۔ رات اس نے سارے گاؤں کے لونڈوں کو اکٹھا کر کے اتنا نرتھ کیا، مگر مکھیوں میں بھی حسد کی کمی نہ تھی۔ سبھی اپنے برادری والوں کے مضحکے پر خوش تھے۔ پٹیشوری اور نوکھے رام میں باتیں ہو رہی تھیں۔ پٹیشوری نے کہا ''مگر سبھی کو گھر گھر کارتی رتی حال معلوم ہے۔ جھنگری سنگھ کو تو سبوں نے ایسا رگڑا کہ کچھ نہ پوچھو۔ دونوں ٹھکرائنوں کی باتیں سن سن کر لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔''

نوکھے رام نے قہقہہ لگا کر کہا ''مگر نکل (نقل) سچی تھی۔ میں نے کئی بار ان کی چھوٹی بیگم کو دروازے پر کھڑے ہوئے لونڈوں سے ہنسی کرتے دیکھا ہے۔''

''اور بڑی رانی کا جل اور سندور اور مہاور لگا کر جوان بنی رہتی ہے۔''

''دونوں میں رات دن چھڑی رہتی ہے۔ جھنگری پکا بے حیا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو پاگل ہو جاتا۔''

''سنا ہے کہ تمہاری بڑی بھدی نقل کی۔ چماری کے گھر میں بند کر کے پٹوایا۔''

''میں تو بچہ پر لگان کا دعویٰ کر کے ٹھیک کر دوں گا۔ وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔''

''لگان تو اس نے چکا دیا ہے نا؟''

''پر رسید تو میں نے نہیں دی۔ ثبوت کیا ہے کہ لگان چکا دیا؟ اور یہاں کون حساب کتاب دیکھتا ہے؟ آج ہی پیادہ بھیج کر بلاتا ہوں۔''

ہوری اور گوبر دونوں اکھ بونے کے لیے کھیت سینچ رہے تھے۔ اب کے اکھ کی کھیتی ہونے کی امید تو تھی نہیں، اس لیے کھیت پرتی پڑا ہوا تھا۔ اب بیل آ گئے ہیں تو اکھ کیوں نہ بوئی جائے۔

مگر دونوں گویا چھتیس ہندی عدد بنے ہوئے تھے۔ نہ بولتے تھے نہ تاکتے تھے۔ ہوری بیلوں کو ہانک رہا تھا اور گوبر پرلے رہا تھا۔ سونا اور روپا کھیت میں پانی دوڑا رہی تھیں کہ ان میں جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑا یہ تھا کہ جھنگری سنگھ کی چھوٹی ٹھکرائن پہلے خود کھا کر تب ٹھاکر کو کھلاتی ہیں یا ٹھاکر کو کھلا کر تب خود کھاتی ہیں۔ سونا کہتی تھی کہ پہلے وہ آپ کھاتی ہیں۔ روپا کی رائے اس کے خلاف تھی۔

روپا نے جرح کی۔ ''اگر وہ آپ پہلے کھاتی ہیں تو کیوں موٹی نہیں ہیں؟ ٹھاکر کیوں موٹے ہیں؟ اگر ٹھاکر بلوان ہوتے ہیں۔ موٹے نہیں ہوتے۔ موٹے ہوتے ہیں، ساگ پات کھانے سے۔''

''تو ٹھکرائن ٹھاکر سے بلوان ہیں؟''

''اور کیا؟ ابھی اس دن دونوں میں لڑائی ہوئی تو ٹھکرائن نے ٹھاکر کو ایسا دھکیلا کہ گھٹنے پھوٹ گئے۔''

''تو تو پہلے آپ کھا کر تب جیجا کو کھلائے گی؟''

''اور کیا؟''

''اماں تو پہلے دادا کو کھلاتی ہے۔''

''تبھی تو جب دیکھو تب دادا ڈانٹ دیتے ہیں۔ میں بلوان ہو کر اپنے آدمی کو بس میں رکھوں گی۔ تیرا آدمی تجھے پیٹے گا۔ تیری ہڈی توڑ کر رکھ دے گا۔''

روپا رونی صورت بنا کر بولی ''کیوں پیٹے گا؟ میں مار کھانے کا کام ہی نہ کروں گی۔''

''وہ کچھ نہ سے گا۔ تو نے تنک بھی کچھ کہا اور وہ مارتے چلے گا۔ مارتے مارتے تیری کھال ادھیڑ دے گا۔''

روپا نے بگڑ کر سونا کی ساڑھی دانتوں سے پھاڑنے کی کوشش کی اور ایسا نہ کر سکنے پر چٹکیاں کاٹنے لگی۔ سونا نے اور چڑایا ''وہ تیری ناک بھی کاٹ لے گا۔''

اس پر روپا نے بہن کو دانت سے کاٹ لیا۔ سونا کا بازو لہولہان ہو گیا۔ اس نے روپا کو زور سے ڈھکیل دیا۔ وہ گر پڑی اور اٹھ کر رونے لگی۔ سونا بھی دانتوں کے نشان دیکھ کر رو پڑی۔

ان دونوں کا چلانا سن کر گوبر غصے میں بھرا ہوا آیا اور دونوں کو دو دو گھونسے لگا دیئے۔ دونوں روتی ہوئیں کھیت سے نکل کر گھر چل دیں۔ سینچائی کا کام رک گیا۔ اس پر باپ بیٹے میں ایک جھڑپ ہو گئی۔ ہوری نے کہا۔ ''پانی کون چلائے گا؟ دوڑے دوڑے گئے اور دونوں کو بھگا آئے۔ اب جا کر منا کیوں نہیں لاتے؟''

''تم ہی نے ان سب کو بگاڑ رکھا ہے۔''

''اس طرح مارنے سے اور بھی بے شرم ہو جائیں گی۔''

''میں ان کا باپ ہوں، کسائی (قصائی) نہیں ہوں۔''

پیر میں ایک بار ٹھکر لگ جانے کے بعد کسی سبب سے بار بار ٹھوکر لگتی ہے اور کبھی کبھی انگوٹھا پک جاتا ہے اور مہینوں تکلیف دیتا ہے۔ باپ بیٹے کے باہمی خلوص کو آج اسی طرح کی چوٹ لگ گئی تھی اور اب اس پر یہ تیسری چوٹ پڑی۔

گوبر نے گھر جا کر کھیت میں پانی دینے کے لیے جھنیا کو ساتھ لیا۔ جھنیا بچے کو لے کر کھیت میں گئی۔ دھنیا اور اس کے دونوں لڑکیاں بیٹھی تاکتی رہیں۔ ماں کو بھی گوبر کی یہ حرکت بری لگی تھی۔ روپا کو مارنا، یہ اس کی برداشت کے باہر تھا۔

آج ہی رات کو گوبر نے لکھنو لوٹ جانے کا تہیہ کر لیا۔ یہاں اب وہ نہیں رہ سکتا۔ جب گھر میں اس کی کوئی پوچھ نہیں، تو وہ کیوں رہے۔ وہ لین دین کے معاملے میں بول نہیں سکتا، لڑکیوں کو تنک مار دیا تو لوگ ایسے جامے سے باہر ہو گئے جیسے وہ باہر کا آدمی ہے۔ تب وہ اس گھر میں نہ رہے گا۔

دونوں کھانا کھا کر باہر آئے تھے کہ نوکھے رام کے پیادے نے آ کر کہا۔ ''چلو، کارندے صاحب نے بلایا ہے۔''

ہوری نے گھمنڈ سے کہا۔ ''رات کو کیوں بلاتے ہیں، میں تو لگان دے چکا ہوں۔''

پیادہ بولا۔ ''مجھے تو تمہیں بلانے کا حکم ملا ہے اور جو کچھ کہنا ہو، وہیں چل کر کہنا۔''

ہوری کا جی نہ چاہتا تھا مگر جانا پڑا۔ گوبر بے تعلقی سے بیٹھا رہا۔ آدھ گھنٹے میں ہوری لوٹا اور چلم بھر کر پینے لگا۔ اب گوبر سے نہ رہا گیا، پوچھا۔ ''کس مطلب سے

بلایا تھا؟''

ہوری نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''میں نے پائی پائی لگان چکا دیا اور وہ کہتے ہیں کہ تمہارے اوپر دو سال کا باقی ہے۔ ابھی جس دن میں نے اوکھ بیچی تو پچیس روپے انہیں وہیں دے دیئے اور آج وہ دو سال کی باکی نکالتے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں ایک دھیلا نہ دوں گا۔''

گوبر نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس رسید تو ہو گی؟''

''رسید کہاں دیتے ہیں۔''

''تو تم بنا رسید لیے روپے کیوں دیتے ہو۔''

''میں کیا جانتا تھا کہ یہ لوگ بے ایمانی کریں گے۔ یہ سب تمہاری کرنی کا پھل ہے۔ تم نے رات کو ان کی ہنسی کی، یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں کیا جاتا۔ سود لگا کر ستر روپے باکی نکال دیئے۔ یہ کس کے گھر آویں؟''

گوبر نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے رسید لے لی ہوتی تو میں لاکھ ان کی ہنسی اڑاتا، پر وہ تمہارا بال بیکا نہ کر سکتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لین دین میں تم چوکسی سے کیوں کام نہیں لیتے؟ یوں رسید نہیں دیتے تو روپیہ ڈاک سے بھیجو۔ یہی تو ہو گا کہ ایک آدھ روپیہ محصول پڑ جائے گا۔ پر اس طرح کی دھاندلی تو نہ ہو گی۔''

تم نے یہ آگ نہ لگائی ہوتی تو کچھ نہ ہوتا۔ اب تو سب ہی مکھیا بگڑے ہوئے ہیں۔ بید خلی کی دھمکی دے رہے ہیں۔ رام جانے کیسے بیڑا پار لگے گا۔

''میں جا کر ان سے پوچھتا ہوں۔''

''تم جا کر اور آگ لگا دو گے۔''

''اگر لگانی پڑے گی تو آگ بھی لگا دوں گا۔ وہ بید کھلی کرتے ہیں تو کریں، میں ان کے ہاتھ میں گنگا جل رکھ کر عدالت میں قسم کھلاؤں گا۔ تم دم دبا کر بیٹھے رہو۔ میں اس کے پیچھے جان لڑا دوں گا۔ میں کسی کا ایک پیسہ دبانا نہیں چاہتا، نہ اپنا ایک پیسہ کھونا چاہتا ہوں۔''

وہ اسی وقت اٹھا اور نوکھے رام کی چوپال میں پہنچا۔ دیکھا تو سبھی لیڈروں کی مجلس لگی ہوئی ہے۔ گوبر کو دیکھ کر سب کے سب ہوشیار ہو گئے۔ فضا میں سازش کی سی بو بھری ہوئی تھی۔

گوبر نے کڑک کر پوچھا۔ ''یہ کیا بات ہے کارندہ صاحب کہ آپ کو دادا نے حال تک کا لگان چکا دیا اور آپ دو سال کی باکی (باقی) نکال رہے ہیں۔ یہ کیسا گول مال ہے؟''

نوکھے رام نے مسند پر لیٹ کر رعب دکھاتے ہوئے کہا۔ ''جب تک ہوری ہے، میں تم سے لین دین کی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔''

گوبر نے چوٹ کھائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تو میں گھر میں کچھ نہیں ہوں؟''

''تم اپنے گھر میں سب کچھ ہو گے، مگر یہاں تم کچھ بھی نہیں ہو۔''

''اچھی بات ہے، آپ بید کھل کیجیے، اب میں عدالت میں تم سے گنگا جل اٹھوا کر روپے دوں گا۔ اسی گاؤں سے ایک سو گواہی دلا کر ثابت کر دوں گا کہ تم رسید نہیں دیتے۔ سیدھے سادے کسان ہیں، کچھ بولتے نہیں، تو تم نے سمجھ لیا کہ کاٹھ کے الو ہیں۔ رائے صاحب وہیں رہتے ہیں جہاں میں رہتا ہوں۔ گاؤں کے

سب لوگ انہیں ہوا سمجھتے ہوں گے، میں نہیں سمجھتا۔ رتی رتی حال کہوں گا اور دیکھوں گا کہ تم کیسے مجھ سے دوبارہ روپے وصول کیے لیتے ہو۔''

اس کی بات میں سچائی کا بل تھا۔ بزدل لوگوں میں سچائی بھی گونگی ہو جاتی ہے۔ وہی سیمنٹ جو اینٹ پر چڑھ کر پتھر بن جاتا ہے اگر مٹی پر چڑھا دیا جائے تو مٹی ہو جائے گا۔ گوبر کی بیبا کانہ صاف گوئی نے وہ بدنیتی کی زرہ توڑ ڈالی جسے پہن کر نوکھے رام کا کمزور دل خود کو طاقتور سمجھ رہا تھا۔

نوکھے رام نے جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر کے کہا۔ ''تم اتنا گرم کیوں ہو رہے ہو؟ اس میں گرم ہونے کی کون بات ہے؟ اگر ہوری نے روپے دیئے ہیں تو کہیں نہ کہیں تو لکھ لیے ہوں گے۔ میں کل کاغذ نکال کر دیکھوں گا۔ اب مجھے کچھ یاد آ رہا ہے کہ شاید ہوری نے روپے دیئے تھے۔ تم خاطر جمع رکھو۔ اگر روپے یہاں آ گئے ہیں تو کہیں جا نہیں سکتے۔ تم تھوڑے سے روپیوں کے لیے جھوٹ تھوڑے ہی بولو گے اور نہ میں ہی اتنے روپیوں سے امیر ہو جاؤں گا۔''

گوبر نے چوپال سے آ کر ہوری کو ایسا لتاڑا کہ بیچارہ بوڑھا آبدیدہ ہو گیا۔ ''تم تو بچوں سے بھی گئے بیتے ہو جو بلی کی میاؤں سن کر رو پڑتے ہیں۔ میں کہاں کہاں تمہیں بچاتا پھروں گا؟ میں تمہیں ستر روپے دے جاتا ہوں، داتا دین لین تو دے کر پورے کی رسید لکھ لینا۔ اس پر تم نے ایک پیسہ بھی دیا تو مجھ سے ایک پیسہ بھی نہ پاؤ گے۔ میں پردیس میں اس لیے نہیں پڑا ہوں کہ تم کو لٹواتا رہوں اور میں کما کما کر بھرتا رہوں۔ میں کل چلا جاؤں گا۔ پر اتنا کہے دیتا ہوں کہ اب کسی سے ایک پیسہ ادھار نہ لینا اور نہ کسی کو کچھ دینا۔ منگو، دلاری، داتا دین سبھی سے ایک

روپیہ سینکڑہ سود کرانا ہوگا۔''

دھنیا بھی کھانا کھا کر باہر نکلی آئی تھی، بولی۔ ''ابھی کیوں جاتے ہو بیٹا؟ دو چار دن اور رہ کر اوکھ کی بونی کرالو اور کچھ لین دین کا حساب بھی ٹھیک کرلو، تب جانا۔''

گوبر نے شان جماتے ہوئے کہا۔ ''میرا دو تین روپے روز کا گھاٹا ہو رہا ہے۔ یہ بھی سمجھتی ہو؟ یہاں میں بہت کر کے چار آنے کی مجوری ہی کرتا ہوں اور اب کی میں جھنیا کو بھی لیتا جاؤں گا۔ وہاں مجھے کھانے پینے کی بڑی تکلیف ہوتی ہے۔''

دھنیا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''جیسی تمہاری اچھا، مگر وہاں وہ کیسے اکیلے گھر سنبھالے گی۔ کیسے بچے کو دیکھ بھال کرے گی؟''

''اب بچے کو دیکھوں کہ اپنا سمیتا دیکھوں۔ مجھ سے چولہا نہیں پھونکا جاتا۔''

''لے جانے کو میں نہیں روکتی، مگر پردیس میں بال بچوں کو لے کر، نہ کوئی آگے نہ پیچھے، سوچو کتنا جھنجھٹ ہے۔''

پردیس میں بھی ساتھی نکل آتے ہیں اماں! اور یہ تو مطلب کی دنیا ہے۔ جس کے ساتھ چار پیسے گم کھاؤ وہی اپنا خالی ہاتھ تو ماں باپ بھی نہیں پوچھتے۔

دھنیا اس جملے کو سمجھ گئی۔ وہ سر سے پاؤں تک جل اٹھی۔ بولی ماں باپ کو بھی تم نے انہیں پیسے کے یاروں میں سمجھ لیا۔

''آنکھوں دیکھ رہا ہوں۔''

''نہیں دیکھ رہے ہو۔ ماں باپ کا دل اتنا کڑا نہیں ہوتا، ہاں لڑکے البتہ جہاں چار پیسے کمانے لگے کہ ماں باپ سے آنکھیں پھیر لیں۔ اسی گاؤں میں ایک دو

نہیں۔ دس بیس دکھا دوں۔ ماں باپ ادھار لیتے ہیں تو کس کے لیے؟ لڑکوں، لڑکیوں ہی کے لیے، کہ اپنے آرام میں اڑنے کے لیے۔''

''کیا جانے تم نے کس کے لیے ادھار لیا۔ میں نے تو ایک پیسہ بھی نہیں جانا۔''

''بنا پالے ہی اتنے بڑے ہو گئے؟''

''پالنے میں تمہارا لگا ہی کیا؟ جب تک بچہ تھا، دودھ پلا دیا۔ پھر لاوارث کی طرح چھوڑ دیا۔ جو سب نے کھایا وہی میں نے کھایا۔ میرے لیے دودھ نہیں آتا تھا۔ اور اب تم بھی چاہتی ہو اور دادا بھی چاہتے ہیں کہ میں سارا دن قرض چکاؤں، لگان دوں اور لڑکیوں کا بیاہ کروں۔ جیسے میری زندگی تمہارا دینا بھرنے کے لیے ہے۔ میرے بھی تو بال بچے ہیں۔''

دھنیا سناٹے میں آ گئی ایک ہی لمحے میں اس کی زندگی کا میٹھا سپنا ٹوٹ سا گیا۔ اب تک وہ دل میں خوش تھی کہ اب اس کا دکھ دلدر سب دور ہو گیا۔ جب سے گوبر گھر آیا، اس کے چہرے پر ہنسی کچھ کھلتی سی رہتی تھی۔ اس کے کلام میں مٹھاس اور برتاؤ میں فراخ دلی آ گئی تھی۔ بھگوان نے اس پر دیا کی تھی تو اسے سر جھکا کر چلنا چاہیے۔ اندر کا سکون باہر کی شرافت بن گیا تھا۔ یہ الفاظ جلتے ہوئے بالو کی طرح دل پر پڑے اور چنے کی طرح سارے ارمان جھلس گئے۔ اس کا سارا گھمنڈ چور چور ہو گیا۔ اتنا سن لینے کے بعد اب زندگی میں کیا لطف رہ گیا۔ جس کشتی پر بیٹھ کر زندگی کے سمندر کو پار کرنا چاہتی تھی، جب وہی ٹوٹ گئی تو کس سکھ کے لیے جیے؟

لیکن نہیں، اس کا گوبر اتنا مطلبی نہیں ہے۔ اس نے کبھی ماں کی بات کا جواب نہیں دیا، کبھی کسی بات کے لیے ہٹ نہیں کی، جو کچھ روکھا سوکھا مل گیا، وہی کھالیتا تھا۔ وہی بھولا بھالا پریم کا پتلا آج کیوں ایسی دل توڑنے والی باتیں کہہ رہا ہے؟ اس کی طبیعت کے خلاف تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ماں باپ دونوں ہی اس کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ اس نے آپ ہی لین دین کی بات چلائی، ورنہ اس سے کون کہتا ہے کہ ماں باپ کا قرض ادا کر؟ ماں باپ کے لیے یہی کیا کم سکھ ہے کہ وہ عزت آبرو کے ساتھ بھلے لوگوں کی طرح ماتا کھاتا ہے۔ اس سے کچھ ہو سکے تو ماں باپ کی مدد کرے، نہیں ہو سکتا تو ماں باپ اس کا گلا نہ دبائیں گے۔ جھنیا کو لے جانا چاہتا ہے تو خوشی سے لے جائے۔ دھنیا نے تو صرف اس کی بھلائی کے خیال سے کہا تھا کہ جھنیا کو وہاں لے جانے میں اسے جتنا آرام ملے گا، اس سے کہیں زیادہ جھنجھٹ بڑھ جائے گا۔ اس میں ایسی کون سی لگنے والی بات تھی کہ وہ اتنا بگڑ اٹھا۔ ہو نہ ہو، یہ آگ جھنیا نے لگائی ہے۔ وہی بیٹھے بیٹھے اسے یہ منتر پڑھا رہی ہے۔ یہاں بناؤ سنگھار کرنے کو نہیں ملتا، گھر کا کچھ نہ کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے، وہاں روپے پیسے ہاتھ میں آئیں گے رو آرام سے اچھا کھائے گی، اچھا پہنے گی اور پاؤں پھیلا کر سوئے گی۔ دو آدمیوں کی روٹی پکانے میں کیا لگتا ہے۔ وہاں تو پیسہ چاہیے۔ سنا ہے کہ ہاٹ میں پکی پکائی روٹیاں مل جاتی ہیں۔ یہ سارا بکھیڑا اسی نے کھڑا کیا ہے۔ سہر میں کچھ دنوں تو رہ بھی چکی ہے، وہاں کا دانہ پانی منہ لگا ہوا ہے۔ یہاں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ یہ بھوندو مل گیا تو اسے پھنسا لیا۔ جب یہاں پانچ مہینے کا پیٹ لے کر آئی تھی، تب کیسا میاؤں میاؤں کرتی تھی۔ تب یہاں ٹھکانہ نہ ملا

ہوتا تو آج کہیں بھیک مانگتی پھرتی۔ یہ اسی نیکی کا بدلا ہے! اسی چڑیل کے پیچھے ڈنڈ دینا پڑا۔ برادری میں بدنامی ہوئی، کھیتی ٹوٹی، ساری درگت ہوگئی اور آج یہ چڑیل جس پتل میں کھاتی ہے، اسی میں چھید کر رہی ہے پیسے دیکھے تو آنکھ ہوگئی۔ تبھی اینٹھی اینٹھی پھرتی ہے، مجاج نہیں ملتا۔ آج لڑکا چار پیسے کمانے لگا ہے نا۔ اتنے دنوں بات نہیں پوچھی تو ساس کے پاؤں دبان کے لیے تیل لیے دوڑتی تھی۔ ڈائن اس کی جندگی کی پونجی کو اس کے ہاتھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔

دکھ بھری آواز میں بولی۔ ''یہ منتر تمہیں کون دے رہا ہے بیٹا؟ تم تو ایسے نہ تھے۔ ماں باپ تمہارے ہی ہیں، بہنیں تمہاری ہی ہیں، گھر تمہارا ہی ہے۔ یہاں باہر کا کون ہے؟ اور ہم کیا ہمیشہ دن بیٹھے رہیں گے؟ گھر کی آبرو بنائے رہو گے تو تم کو سکھ ہوگا۔ آدمی گھر والوں ہی کے لیے پیسہ کماتا ہے کہ اور کس کے لیے اپنا پیٹ تو سور بھی پال لیتا ہے۔ میں نہ جانتی تھی کہ جھنیا ناگن بن کر ہم کو ڈسے گی۔''

گوبر نے بگڑ کر کہا۔ ''اماں! میں نادان ہوں کہ جھنیا مجھے منتر پڑھائے۔ تم اسے ناحق کوس رہی ہو۔ تمہاری گرستی کا میں سارا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا، تمہاری مدد کروں گا۔ پر اپنے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈال سکتا۔''

جھنیا بھی کوٹھری سے نکل کر بولی۔ ''اماں! جلا ہے کا غصہ داڑھی پر نہ اتارو۔ کوئی بچہ نہیں ہے کہ میں پھوڑ لوں گی۔ اپنا برا بھلا سب سمجھے ہیں۔ آدمی اس لیے جنم نہیں لیتا کہ عمر بھر تپسیا کرتا رہے اور ایک دن چھوچھے ہاتھ مر جائے۔ سب جینے کا سکھ چاہتے ہیں۔ سب کا جی چاہتا ہے کہ ہاتھ میں چار پیسے ہوں۔''

دھنیا نے دانت پیس کر کہا۔ ''بہت گیان نہ بگھار! آج تو بھی اپنا بھلا برا

سوچنے لایق ہوگی ہے۔ یہاں آکر میرے پاؤں پر سر رکھ کر رو رہی تھی، تب اپنا بھلا برا انہیں سوجھا تھا؟ اس گھڑی ہم بھی اپنا بھلا برا سوچنے لگتے تو آج تیرا کہیں پتہ نہ ہوتا۔''

اس کے بعد جنگ چھڑ گئی۔ طعنے، گالی گلوچ، تکا فضیحت، کوئی بات نہ بچی۔ گوبر بھی بیچ بیچ میں ڈنک مارتا جاتا تھا۔ ہوری بروٹھے میں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ سونا اور روپا آنگن میں سر کھکائے کھڑی تھیں۔ دلاری، پنیا اور کئی عورتیں بیچ بچاؤ کرنے آ پہنچی گرج کے درمیان میں کبھی کبھی بوندیں بھی پڑ جاتی تھیں، دونوں ہی اپنے اپنے بھاگ کو رو رہی تھیں۔ دونوں ہی ایشور کو کوس رہی تھیں اور دونوں ہی اپنا اپنا بے قصورت ہونا ثابت کر رہی تھیں۔ جھنیا گڑے مردا کھاڑ رہی تھیں۔ آج اسے ہیرا اور سوبھا سے خاص ہمدردی ہوگئی تھی۔ جنہیں دھنیا نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ دھنیا کی آج تک کسی سے نہ پٹی تھی تو جھنیا سے کیسے پٹ سکتی ہے؟ دھنیا اپنی صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ لوگوں کی رائے جھنیا کی طرف تھی۔ شاید اس لیے کہ جھنیا ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی اور دھنیا آپے سے باہر تھی، شاید اس لیے کبھی کہ جھنیا اب کمانے والے مرد کی بیوی تھی اور اسے خوش رکھنا زیادہ قرین مصلحت تھا۔

تب ہوری نے آنگن میں آکر کہا۔ ''میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں دھنیا، چپ رہ! میرے منہ میں کالکھ نہ لگا۔ ہاں ابھی جی نہ بھرا ہو تو اور سن۔''

دھنیا پھنکارتی ہوئی ادھر دوڑی۔ ''تم بھی موٹی ڈال پکڑنے چلے۔ میں ہی دکھی ہوں، وہ تو میرے اوپر پھول برسا رہی ہے۔''

جنگ کا میدان بدل گیا۔

''جو چھوٹوں کے منہ لگے وہ چھوٹا۔''

دھنیا کس دلیل سے جھنیا کو چھوٹا مان لے۔

ہوری نے رنجیدگی سے کہا۔ ''اچھا وہ چھوٹی نہیں، بڑی سہی۔ جو آدمی نہیں رہنا چاہتا تو کیا اسے باندھ کر رکھے گی؟ ماں باپ کا دھرم ہے لڑکے کو پال پوس کر بڑا کر دینا، وہ ہم کر چکے۔ ان کے ہاتھ پاؤں ہو گئے۔ اب تو کیا چاہتی ہے کہ وہ دانہ چارہ لا کر تجھے کھلا دیں؟ ماں باپ کا دھرم سولہوں آنے لڑکوں کے ساتھ ہے، لڑکوں کا ماں باپ کے ساتھ ایک آنہ بھی دھرم نہیں ہے۔ جو جاتا ہے اسے اسیس دے کر رخصت کر دے۔ ہمارے بھگوان مالک ہے۔ جو کچھ بھوگنا بدا ہے، بھوگیں گے۔ چالیس سات، سینتالیس اسی طرح روتے دھوتے کٹ گئے، دس پانچ سال ہیں، سو وہ بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔''

ادھر گوبر جانے کی تیار کر رہا تھا۔ اب اس گھر کا پانی بھی اس کے لیے حرام ہے۔ ماں ہو کر جب اسے ایسی ایسی باتیں کہے تو اب وہ اس کا منہ بھی نہ دیکھے گا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بستر بندھ گیا۔ جھنیا نے بھی چوندری پہن لی، منو بھی ٹوپ اور فراک پہن کر ''راجہ'' بن گیا۔

ہوری نے بڑے گلے سے کہا۔ ''بیٹا! تم سے کچھ کہنے کا منہ تو نہیں ہے، پر جی نہیں مانتا۔ کیا ذرا جا کر اپنی ابھاگی ماتا کے پاؤں چھو لوگے تو کچھ برا نہ ہوگا۔ جس ماتا کی کوکھ سے جنم لیا اور جس کا لہو پی کر پلے ہو، کیا اس کے ساتھ اتنا بھی نہیں کر سکتے؟''

گوبر نے منہ پھیر کر کہا۔ ''میں اسے اپنی ماتا نہیں سمجھتا۔''

ہوری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''جیسی تمہاری اچھا۔ جہاں رہو، سکھی رہو۔''

جھنیا نے ساس کے پاس جا کر اس کے پیروں کو آنچھ سے چھوا۔ دھنیا کے منہ سے دعا کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں گوبر بچے کو گود میں لیے آگے آگے تھا اور جھنیا بستر بغل میں دبائے پیچھے پیچھے۔ ایک چمار کا لڑکا صندوق لیے ہوئے تھا۔ گاؤں کے کئی عورت مرد گوبر کو پہنچانے گاؤں کے باہر تک گئے۔

اور دھنیا بیٹھی رو رہی تھی، جیسے کوئی اس کے دل کو آرے سے چیر رہا ہو۔ اس کی مامتا اس کے گھر کی مانند ہوری ہی تھی جس میں آگ لگ گئی ہو اور سب کچھ جل کر خاک ہو گیا ہو۔ بیٹھ کر رونے کے لیے بھی جگہ نہ بچی ہو۔

(22)

ادھر کچھ دنوں سے رائے صاحب کی لڑکی کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی تھی۔ چناؤ بھی سر پر آ پہنچا تھا مگر ان سب سے ضروری انہیں دیوانی کا ایک مقدمہ دائر کرنا تھا جس کی کورٹ فیس ہی پچاس ہزار ہوتی تھی اور اوپر سے خرچ الگ۔ رائے صاحب کے سالے جو اپنی ریاست کے واحد مالک تھے، عین شباب میں موٹر کے لڑ جانے سے فوت ہو گئے تھے اور رائے صاحب اپنے کنوارے لڑکے کی طرف سے اس ریاست پر قبضہ پانے کے لیے قانون کی پناہ لینا چاہتے تھے۔ ان کے چچا زاد سالوں نے ریاست پر قبضہ کر رکھا تھا اور رائے صاحب کو اس میں سے کوئی

حصہ دینے پر تیار نہ تھا۔ رائے صاحب نے بہت چاہا کہ باہمی مفاہمت و مصالحت ہو جائے اور ان کے چچازاد سالے معقول گزارہ لے کر ہٹ جائیں، حتیٰ کہ وہ ریاست کی نصف آمدنی چھوڑنے پر راضی تھے مگر ان کے سالوں نے کسی طرح کا سمجھوتا منظور نہ کیا۔ صرف طاقت کے زور سے ریاست میں تحصیل وصولی شروع کر دی۔ رائے صاحب کو عدالت جانے کے سوا کوئی چارا نہ رہا۔ مقدمے میں لاکھوں کا خرچ تھا مگر ریاست بھی بیس لاکھ سے کم مالیت کی نہ تھی۔ وکلاء نے یقینی طور سے کہہ دیا تھا کہ آپ کی شرطیہ ڈگری ہو گی۔ ایسا موقع کون چھوڑ سکتا تھا؟ مشکل یہی تھی کہ یہ تینوں کام ایک ساتھ آپڑے تھے اور انہیں کسی طرح ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ برس کی ہو گئی تھی اور صرف ہاتھ میں روپیہ نہ رہنے کے سبب اس کا بیاہ ٹلتا جاتا تھا۔ خرچ کا اندازہ ایک لاکھ تھا۔ جس کے پاس جاتے۔ وہی بڑا سا منہ کھولتا، مگر حال میں ایک بڑا اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ کنور دگ وجے سنگھ کی بیوی تپ دق کی نذر ہو چکی تھی اور کنور صاحب اپنے اجڑے گھر کو جلد سے جلد آباد کر لینا چاہتے تھے۔ سودا بھی کفایت سے طے ہو گیا، اور کہیں شکار ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اسی لیے اسی لگن میں بیاہ ہونا نہایت ضروری تھا۔ کنور صاحب نفس پرستیوں کے غلام تھے۔ شراب، گانجا، افیون، مدک، چرس ایسا کوئی نشہ نہ تھا جس کے عادی نہ ہوں اور عیاشی تو رئیس کی زینت ہی ہے۔ وہ رئیس ہی کیا جو عیاش نہ ہو؟ روپیہ اور خرچ ہی کیسے کیا جائے؟ مگر ان سب بری عادتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان میں وہ قابلیت تھی کہ بڑے بڑے علماء ان کا لوہا مانتے تھے۔ موسیقی، ناٹک، ہاتھ دیکھنا، جوتش، لاٹھی، کشتی، نشانہ بازی وغیرہ فنون میں اپنا ثانی نہ رکھتے

تھے۔ اس کے ساتھ ہی بڑے دبدبے والے اور بے خوف تھے۔ قومی تحریکوں میں دل کھول کر مدد دیتے تھے مگر پوشیدہ طریقے پر۔ حکام سے یہ بات چھپی نہ تھی، پھر بھی ان کی بڑی عزت تھی اور سال میں دو ایک بار گورنر صاحب بھی ان کے مہمان ہوتے تھے۔ عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی اور صحت تو ایسی تھی کہ تنہا ایک بکرا کھا کر ہضم کر ڈالتے تھے۔ رائے صاحب نے سمجھا کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ابھی کنور صاحب اپنا اثر اور زور بڑھانے کا ذریعہ تھا۔ رائے صاحب کونسل کے ممبر تھے ہی، یوں بھی با اثر تھے۔ قومی جنگ میں اپنا تیاگ دکھا کر عقیدت عامہ کے مستحق بھی بن چکے تھے۔ بیاہ طے ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو سکتی تھی اور وہ طے بھی ہو گیا۔

رہا چناؤ، وہ سونے کی کٹا تھی جسے نہ اگلتا بنتا تھا، نہ نگلتے۔ اب تک وہ دو مرتبہ چنے جا چکے تھے اور دونوں ہی مرتبہ ان پر ایک ایک لاکھ کی چیت پڑ چکی تھی، مگر اب کے ایک راجہ صاحب اسی علاقے سے کھڑے ہو گئے تھے اور ڈنکے کی چوٹ پہ اعلان کر دیا تھا کہ چاہے ایک ایک ووٹر کو ایک ایک ہزار ہی کیوں نہ دینا پڑے اور چاہے پچاس لاکھ کی ریاست برد ہو جائے مگر رائے صاحب امر پال سنگھ کو کونسل میں نہ جانے دوں گا اور ان سے حکام نے اپنی امداد کا وعدہ بھی کر رکھا تھا۔ رائے صاحب فہیم تھے، چالاک تھے اور اپنا نفع نقصان سمجھتے تھے مگر راجپوت تھے اور رئیس تھے، یہ چیلنج پا کر میدان سے کیسے ہٹ جاتے؟ یوں ان سے سورج پرتاپ سنگھ نے آ کر کہا کہ بھائی صاحب آپ تو دوبارہ کونسل میں آ چکے، اب کے مجھے جانے دیجیے تو شاید رائے صاحب نے خیر مقدم کیا ہوتا۔ کونسل کا لالچ اب انہیں نہ تھا مگر

اس چیلنج کے سامنے خم ٹھوکنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ایک مصلحت اور تھی مسٹر ٹنخا نے انہیں یقین دلایا تھا کہ آپ کھڑے ہو جائیں پھر بعد کو راجہ صاحب سے ایک لاکھ کی تھیلی لے کر بیٹھ جایئے گا۔ انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ راجہ صاحب بڑی خوشی سے ایک لاکھ دے دیں گے۔ میری ان سے بات چیت ہو چکی ہے، مگر اب معلوم ہوا کہ راجہ صاحب، رائے صاحب کو ہرانے کا افتخار نہیں چھوڑنا چاہتے اور اس کا خاص سبب تھا۔ رائے صاحب کی لڑکی کی شادی کانکور صاحب سے طے ہونا، دوبا اثر گھرانوں کا میل، وہ اپنی شان کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ ادھر رائے صاحب کو سسرالی جائیداد ملنے کی قوی امید تھی، راجہ صاحب کے پہلو میں یہ کانٹا بھی بری طرح کھٹک رہا تھا۔ کہیں وہ جائیداد انہیں مل گئی اور قانون رائے صاحب کے موافق تھا ہی تب تو راجہ صاحب کا ایک مدمقابل کھڑا ہو جائے گا۔ بس ان کا یہ فرض تھا کہ وہ رائے صاحب کو کچل ڈالیں اور ان کی عزت خاک میں ملا دیں۔

بیچارے رائے صاحب بڑے سنک میں پڑ گئے تھے۔ انہیں یہ شک ہونے لگا تھا کہ مسٹر ٹنخا نے صرف اپنا مطلب نکالنے کے لیے انہیں دھوکا دیا۔ یہ خبر بھی ملی تھی کہ اب وہ راجہ صاحب کے پیروکار ہو گئے ہیں۔ یہ رائے صاحب کے زخم پر نمک تھا۔ انہوں نے کئی بار ٹنخا کو بلایا تھا مگر وہ یا تو گھر پر ملتے ہی نہ تھے یا آنے کا وعدہ کر کے بھول جاتے تھے۔ آخر آج وہ خود ان سے ملنے کا ارادہ کر کے ان کے یہاں جا پہنچے۔ اتفاق سے ٹنخا گھر ہر مل گئے مگر رائے صاحب کو پورے گھنٹہ بھر تک ان کا انتظار کرنا پڑا۔ یہ وہی ٹنخا ہیں جو رائے صاحب کے دروازے پر روزانہ ایک بار حاضری دیا کرتے تھے۔ جلے بیٹھے تھے۔ جیوں ہی مسٹر ٹنخا آراستہ پیراستہ ہو کر منہ

میں سگار دبائے ہوئے کمرے میں آئے اور ہاتھ بڑھایا کہ رائے صاحب نے بم چھوڑ دیا۔ ''میں گھنٹہ بھر سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں اور آپ نکلتے نکلتے اب نکلے ہیں! میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔''

ٹنخا نے ایک صوفے پر بے پروائی سے دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں ایک ضروری کام میں لگا ہوا تھا۔ آپ کو فون کر کے مجھ سے وقت لینا چاہیے تھا۔''

آگ میں گھی پڑ گیا، مگر رائے صاحب نے غصہ ضبط کیا۔ وہ لڑنے نہ آئے تھے۔ اس توہین کو پی جانے ہی کا موقع تھا۔ بولے۔ ''ہاں یہ غلطی ہوئی۔ آج کل آپ کو بہت کم فرصت رہتی ہے شاید؟''

''جی ہاں بہت کم، ورنہ میں ضرور آتا۔''

''میں اسی معاملے کے بارے میں آپ سے پوچھنے آیا تھا۔ سمجھوتے کی تو کوئی امید نہیں معلوم ہوتی۔ ادھر تو لڑائی کی تیاریاں بہت زوروں سے ہو رہی ہیں۔''

''راجہ صاحب کو تو آپ جانتے ہیں، جھکڑ آدمی ہیں، پورے سنکی! کوئی نہ کوئی دھن سوار رہتی ہے۔ آج کل یہی دھن سوار ہو جاتی ہے تو کسی کی نہیں سنتے، خواہ کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ کوئی چالیس لاکھ کا بار سر پر ہے پھر بھی وہی دم ہے، وہی اناپ شناپ خرچ ہے۔ پیسے کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ نوکروں کی تنخواہ چھ چھ مہینے سے پڑی ہوئی ہے، مگر ہر محل بن رہا ہے، سنگ مرمر کا تو فرش ہے، پچی کاری ایسی ہوئی ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ افسروں کے پاس روز ڈالیاں جاتی رہتی ہیں۔ سنا ہے کہ کوئی انگریز منیجر رکھنے والے ہیں۔''

''مجھ سے جو کچھ ہوسکتا تھا وہ میں نے کیا۔ اس کے سوا میں اور کیا کرسکتا تھا؟ اگر کوئی شخص اپنے دو چار لاکھ روپے پھونکنے ہی پر تلا ہے، تو میرا کیا بس؟''

رائے صاحب اب غصے کو ضبط کر سکے۔ بولے۔ ''خصوصاً جب اس دو چار لاکھ میں سے دس بیس ہزار آپ کے ہتھے چڑھنے کی بھی امید ہو۔''

ٹخا اب کیوں دیتے۔ بولے۔ ''رائے صاحب! اب صاف صاف نہ کہلائیے۔ یہاں نہ میں سنیاسی ہوں نہ آپ۔ ہم سبھی کچھ نہ کچھ کمانے نکلے ہیں۔ آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش آپ کو بھی اتنی ہی ہے جتنی مجھے۔ آپ سے میں نے کھڑے ہونے کو کہا۔ آپ ایک لاکھ کے لالچ سے کھڑے ہو گئے۔ اگر گوٹی لال ہو جاتی تو آج آپ ایک لاکھ کے مالک ہوتے اور بلا ایک پائی قرض لیے کنور صاحب سے رشتہ بھی قائم ہو جاتا اور مقدمہ بھی دائر ہو جاتا۔ مگر آپ کی بد قسمتی سے وہ چال پٹ پڑ گئی۔ جب وہی یوں رہ گئے تو مجھے کیا ملتا؟ آخر میں نے جھک مار کر ان کی دم پکڑی۔ کسی طرح اس بیتر نی کو تو پار کرنا ہی ہے۔''

رائے صاحب کو ایسا غصہ آ رہا تھا کہ اس بدمعاش کو گولی مار دیں۔ اسی نے سبز باغ دکھا کر کھڑا کیا اور اب اپنی صفائی دے رہا ہے۔ پیٹھ میں دھول بھی نہیں لگنے دیتا! مگر اب موقع و محل دیکھ کر زبان بند کیے ہوئے تھے۔

''تو اب آپ کے لیے کچھ نہیں ہوسکتا۔''

''ایسا ہی سمجھیے۔''

''میں پچاس ہزار پر بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں۔''

''راجہ صاحب کسی طرح نہ مانیں گے۔''

''پچیس ہزار پر تو مان جائیں گے۔''

''کوئی امید نہیں۔ وہ صاف کہہ چکے ہیں۔''

''وہ کہہ رہے ہیں یا آپ کہہ رہے ہیں۔''

''آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں۔''

رائے صاحب نے انکسار سے کہا۔ ''میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا مگر اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ آپ چاہتے تو معاملہ ہو جاتا۔''

''تو آپ کا خیال ہے کہ میں نے معاملہ نہیں ہونے دیا۔''

''نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ چاہتے تو کام ہو جاتا اور میں اس پریشانی میں نہ پڑتا۔''

ٹنخا نے گھڑی کی طرف دیکھتی ہوئے کہا۔ ''تو رائے صاحب اگر آپ صاف کہلانا چاہتے ہیں تو سنیے۔ اگر آپ نے دس ہزار کا چیک میرے ہاتھ میں رکھ دیا ہوتا تو آج یقیناً ایک لاکھ کے مالک ہوتے۔ آپ شاید چاہتے ہوں گے کہ جب آپ کو راجہ صاحب سے روپے مل جاتے تو آپ مجھے ہزار دو ہزار دے دیتے۔ تو میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ آپ راجہ صاحب سے روپے لے کر سیف (آہنی صندوق) میں رکھتے اور مجھے انگوٹھا دکھا دیتے۔ پھر میں آپ کا کیا بنا لیتا، بتلائیے؟ کہیں نالش فریاد بھی تو نہ کر سکتا تھا۔''

رائے صاحب نے جیسے چوٹ کھائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ ''آپ مجھے اتنا بے ایمان سمجھتے ہیں؟''

ٹنخا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اسے بے ایمانی کون سمجھتا ہے، آج کل

یہی چالاکی ہے کہ کیسے دوسروں کو الو بنایا جائے۔ یہی کامیاب طریقہ ہے اور آپ اس کے استاد کامل ہیں۔''

''رائے صاحب نے مٹھی باندھ کر کہا۔ ''میں؟''

''جی ہاں، آپ! پہلے چناؤ میں میں نے دل و جان سے آپ کی پیروی کی تو آپ نے بڑی مشکل سے رو دھو کر پانچ سو روپے دیئے۔ پھر دوسرے چناؤ میں آپ نے ایک سڑا گلا، ٹوٹا پھوٹا موٹر دے کر اپنا گلا چھڑایا۔ دودھ کا جلا چاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔''

وہ کمرے سے نکل گئے اور موٹر لانے کا حکم دیا۔

رائے صاحب کا خون کھول رہا تھا۔ اس بدتہذیبی کی بھی کوئی حد ہے۔ ایک تو گھنٹہ بھر انتظار کرایا اور اب اتنی بے مروتی سے پیش آ کر انہیں جبراً گھر سے نکال رہا ہے۔ اگر انہیں یقین ہوتا کہ وہ مسٹر ٹنخا کو پٹک سکتے ہیں تو کبھی نہ چوکتے مگر ٹنخا تو قامت میں ان سے سوا گنا تھے۔ جب ٹنخا نے ہارن بجایا تو یہ بھی آ کر اپنی موٹر میں بیٹھے اور سیدھے مسٹر کھنا کے پاس پہنچے۔

نو بج رہے تھے مگر کھنا صاحب خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے۔ وہ دو بجے رات کے پہلے کبھی نہیں سوتے تھے اور پھر قدرتاً نو بجے دن تک سوتے رہتے تھے۔ یہاں بھی رائے صاحب کو آدھ گھنٹہ بیٹھنا پڑا۔ اس لیے جب کوئی ساڑھے نو بجے مسٹر کھنا مسکراتے ہوئے نکلے تو رائے صاحب نے ڈانٹ بتائی۔ ''اچھا، اب سرکار کی آنکھ کھلی ہے، ساڑھے نو بجے! روپے جمع کر لیے ہیں نا، تبھی یہ بےفکری ہے۔ میری طرح تعلقدار ہوتے تو اب تک آپ بھی کسی کے دروازے پر کھڑے

ہوتے۔ بیٹھے بیٹھے سر میں چکر آ جاتا۔''

کھنا نے سگریٹ کیس ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''رات سونے میں بڑی دیر ہوگئی۔ اس وقت کدھر سے آ رہے ہو؟''

رائے صاحب نے تھوڑے سے لفظوں میں اپنی ساری مشکلیں بیان کر دیں۔ دل میں کھنا کو گالیاں دیتے تھے، جو ان کا ہم سبق ہو کر بھی ہمیشہ انہیں ٹھگنے کی فکر میں رہا کرتا تھا، مگر سامنے اس کی خوشامد کرتے تھے۔

کھنا نے ایسی شکل بنائی گویا انہیں بڑی تشویش ہوگئی۔ بولے۔ ''میری تو صلاح ہے کہ آپ چناؤ کو گولی ماریں اور اپنے سالوں پر مقدمہ دائر کریں، رہا بیاہ وہ تو تین دن کا تماشا ہے، جس کے لیے زیر بار ہونا مناسب نہیں۔ کنور صاحب میرے دوستوں میں ہیں۔ بس لینے دینے کا کوئی سوال نہ اٹھنے پائے گا۔''

رائے صاحب نے طنز سے کہا۔ ''آپ یہ بھولے جاتے ہیں، مسٹر کھنا بینکر نہیں تعلقہ دار ہیں۔ کنور صاحب جہیز نہیں مانگتے۔ انہیں ایشور نے سب کچھ دیا ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ میری اکیلی لڑکی ہے اور اس کی ماں مر چکی ہے۔ وہ زندہ ہوتی تو شاید سارا گھر لٹا کر بھی اس کا جی نہ بھرتا، اس وقت میں شاید اسے ہاتھ روک کر خرچ کرنے کا حکم دیتا، لیکن اب تو ماں بھی ہوں، باپ بھی ہوں اور اگر مجھے اپنے دل کا خون بھی نکال کر دینا پڑے تو میں خوشی سے دے دوں گا۔ اس مجرد زندگی میں نے اولاد کی محبت ہی میں اپنے دل کی پیاس بجھائی ہے۔ دونوں بچوں کے پیار ہی میں میں نے متوفیہ کے متعلق اپنی وفا شعاری کو نبھایا ہے۔ میرے لیے ناممکن ہے کہ اس مبارک موقع پر یہ اپنے دل کے ارمان نہ نکالوں۔ میں اپنے دل

کو سمجھا سکتا ہوں مگر جسے میں متوفیہ کا حکم سمجھتا ہوں، اسے نہیں ٹال سکتا اور چناؤ کے میدان سے بھاگنا بھی میرے لیے ناممکن ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہارون گا، راجہ صاحب سے میرا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ پھر راجہ صاحب کو اتنا ضرور دکھا دینا چاہتا ہوں کہ امر پال سنگھ کوئی ملائم چارہ نہیں ہے۔''

''اور مقدمہ دائر کرنا تو ضروری ہے۔''

''اسی پر سارا دارومدار ہے۔ اب آپ بتائیے کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

میرے ڈائریکٹروں کا اس بارے میں جو حکم ہے، آپ جانتے ہی ہیں اور راجہ صاحب بھی ہمارے ڈائریکٹر ہیں، یہ بھی آپ کو معلوم ہی ہے، یہ بھی آپ کو معلوم ہی ہے، پچھلا روپیہ وصول کرنے کے لیے بار بار تاکید ہوری ہے، کوئی نیا معاملہ تو شاید ہی ہو سکے۔

رائے صاحب نے اداس ہو کر کہا۔ ''آپ تو میری ناؤ ہی ڈبائے دیتے ہیں مسٹر کھنا۔''

''میرے پاس جو کچھ اپنا ہے وہ آپ کا ہے، مگر بینک کے معاملے میں تو مجھے مالکوں کا حکم ہی ماننا پڑے گا۔''

''اگر یہ جائیداد ہاتھ آ گئی جس کی مجھے پوری امید ہے تو میں پائی پائی ادا کروں گا۔''

''آپ بتلا سکتے ہیں، اس وقت آپ پر کتنا قرض ہے؟''

رائے صاحب نے ہچکتے ہوئے کہا۔ ''پانچ لاکھ سمجھیے، کچھ کم ہی ہوگا۔''

کھنا نے بے اعتباری سے کہا۔ ''یا تو آپ کو یاد نہیں یا آپ چھپا رہے ہیں۔''

رائے صاحب نے زور دے کر کہا۔ ''جی نہیں، میں نہ بھولا ہوں اور نہ چھپا رہا ہوں، میری جائیداد اس وقت کم از کم پچاس لاکھ کی ہے اور سسرال کی جائیداد بھی اس سے کم نہیں ہے۔ اتنی جائیداد پر دس پانچ لاکھ کا بار نہ ہونے کے برابر ہے۔''

''مگر یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سسرال والی جائیداد پر قرض نہیں ہے؟''

''جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ بالکل بے داغ ہے۔''

''اور مجھے یہ خبر ملی ہے کہ اس پر دس لاکھ سے کم کا روبار نہیں ہے، اس جائیداد پر تو اب کچھ ملنے سے رہا اور آپ کی جائیداد پر بھی میرے خیال میں دس لاکھ سے کم قرض نہیں ہے اور وہ جائیداد اب پچاس لاکھ کی نہیں بلکہ مشکل سے پچیس لاکھ کی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی بینک آپ کو قرض نہیں دے سکتا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ آپ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ ایک ہلکی سی ٹھوکر آپ کو تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی ہے۔ آپ کو اس وقت بہت سنبھل کر چلنا چاہیے۔''

رائے صاحب نے ان کا ہاتھ اپنی طرف کھینچ کر کہا۔ ''میرے دوست! یہ سب میں خوب سمجھتا ہوں، مگر زندگی کی ٹریجڈی اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ کا دل جو کام نہیں کرنا چاہتا، وہ آپ کو کرنا پڑے۔ آپ کو اس موقع پر میرے لیے کم سے کم دو لاکھ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

کھنا نے لمبا سانس لے کر کہا۔ ''مائی گاڈ! دو لاکھ، غیر ممکن، بالکل غیر ممکن۔''

''میں تمہارے دروازے پر سر پٹک کر جان دے دوں گا کھنا اتنا سمجھ لو میں نے تمہارے بھروسے پر یہ منصوبے باندھے ہیں، اگر تم نے مایوس کر دیا تو شاید

مجھے زہر کھالینا پڑے۔ میں سورج پرتاب سنگھ کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیک سکتا۔ لڑکی کا بیاہ ابھی دو چار مہینے ٹک سکتا ہے، مقدمہ دائر کرنے کے لیے بھی ابھی کافی وقت ہے، مگر چناؤ سر پر آ گیا ہے اور مجھے سب سے بڑی فکر یہی ہے۔''

کھنا نے حیرت سے کہا

''تو آپ چناؤ میں دولا کھ لگا دیں گے؟''

''چناؤ کا سوال نہیں ہے بھئی، یہ عزت کا سوال ہے، کیا آپ کی رائے میں میری عزت دولا کھ کی بھی نہیں؟ میری ساری ریاست بک جائے اس کا غم نہیں، مگر سورج پرتاپ سنگھ میں آسانی سے جیتنے نہ دوں گا۔''

کھنا نے ایک منٹ تک دھواں اڑانے کے بعد کہا۔ ''بینک کی جو حالت ہے، وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔ بینک نے ایک طرح سے لین دین کا کام بند کر دیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ساتھ خاص رعایت کی جائے، مگر کاروبار تو کاروبار ہی ہے، یہ آپ کو معلوم ہے۔ میرا کمیشن کیا رہے گا؟ مجھے آپ کے لیے خاص طور پر سفارش کرنی پڑے گی۔ راجہ صاحب کا دوسرے ڈائریکٹروں پر کتنا اثر ہے، یہ بھی آپ جانتے ہیں۔ مجھے ان کے خلاف پارٹی بندی کرنا پڑے گی، یوں سمجھ لیجیے کہ میری ذمہ داری ہی پر معاملہ ہوگا۔''

رائے صاحب کا چہرہ اتر گیا۔ کھنا ان کے خاص دوستوں میں تھے۔ ساتھ کے پڑھے ہوئے، ساتھ کے بیٹھنے والے اور وہ ان سے کمیشن کی امید رکھتے ہیں۔ اتنی بے مروتی، آخر وہ جو اتنے دنوں سے کھنا کی خوشامد کرتے آتے ہیں کس دن کے لیے؟ باغ میں پھل ہوں، ترکاریاں ہوں، سب سے پہلے کھنا کے یہاں بھیجتے

ہیں۔کوئی جشن ہو، کوئی جلسہ ہو، سب سے پہلے کھنا کو مدعو کرتے ہیں۔اس کا یہ جواب ہے۔

اداس ہوکر بولے۔''آپ کی جو مرضی ہو، مگر آپ کو اپنا بھائی سمجھتا تھا۔''

کھنا نے ممنونیت کے لہجے سے کہا۔''یہ آپ کی مہربانی ہے۔ میں نے بھی ہمیشہ آپ کو اپنا بڑا بھائی سمجھا ہے اور اب بھی سمجھتا ہوں۔کبھی آپ سے کوئی پردہ نہیں رکھا، مگر کاروباری فضا ایک اور ہی فضا ہے۔ جہاں کوئی دوست نہیں، کوئی کسی کا بھائی نہیں، جس طرح میں بھائی کے ناتے آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے دوسروں سے زیادہ کمیشن دیجیے، اسی طرح آپ کو بھی میرے کمیشن میں رعایت کے لیے اصرار نہ کرنا چاہیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں جتنی رعایت آپ کے ساتھ کرسکتا ہوں، اتنی کروں گا۔ آپ دفتر کے وقت آئیں اور لحا پڑھی کردیں۔بس معاملہ ختم! آپ نے کچھ اور سنا؟ مہتا صاحب آج کل مالتی پر بے طرح ریجھے ہوئے ہیں۔ ساری فلاسفری نکل گئی۔ دن میں ایک دوبار ضرور حاضری دے آتے ہیں اور شام کو اکثر دونوں ساتھ گھومنے نکلتے ہیں۔ یہ تو میری ہی شان تھی کہ کبھی مالتی کے دروازے پر سلام کرنے نہ گیا۔شاید اب اسی کی کسر نکال رہی ہے۔کہاں تو یہ حال تھا کہ جو کچھ ہیں مسٹر کھنا ہیں، کوئی کام ہوتا تو کھنا کے دوڑی آتیں۔ جب روپیوں کی ضرورت پڑتی تو کھنا کے نام رقعہ آتا اور کہاں اب مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہیں۔ میں نے خاص ان ہی کے لیے فرانس سے ایک گھڑی منگوائی تھی۔ بڑے شوق سے لے کر گیا مگر نہیں لی۔ابھی کل میووں کی ڈالی بھیجی تھی، کشمیر سے منگوائے تھے، واپس کردی۔ مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ آدمی اتنی

جلدی کیسے بدل جاتا ہے۔''

رائے صاحب دل منت وان کے بے قدری پر خوش ہوئے مگر ہمدردی دکھا کر بولے۔ ''اگر یہ بھی مان لیں کہ مہتا سے انہیں محبت ہوگئی ہے، تو قطع مراسم کی تو کوئی وجہ نہیں ہے۔''

کھنا نے افسوس سے کہا۔ ''یہی تو رنج ہے۔ بھائی صاحب! یہ تو میں شروع ہی سے جانتا ہوں کہ وہ میرے ہاتھ نہیں آسکتیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں کبھی اس کے دھوکے میں نہیں پڑا کہ مالتی کو مجھ سے محبت ہے۔ محبت جیسی چیز ان سے مل سکتی ہے، اس کی میں نے کبھی امید ہی نہیں کی۔ میں تو صرف ان کے روپ کا پجاری ہوں۔ سانپ میں زہر ہے، یہ جانتے ہوئے بھی ہم دودھ پلاتے ہیں۔ طوطے سے زیادہ بے مروت جانور اور کون ہوگا؟ لیکن صرف اس شکل اور آواز پر گرویدہ ہوکر لوگ اسے پالتے ہیں اور سونے کے پنجرے میں رکھتے ہیں میرے لیے بھی مالتی اسی طوطے کی طرح تھی۔ افسوس یہی ہے کہ میں پہلے کیوں نہ ہوشیار ہوگیا۔ اس کے لیے میں نے ہزاروں روپے برباد کر دیئے، بھائی صاحب جب اس کا پرزہ پہنچا، میں نے فوراً روپے بھیجے۔ میرا موٹر آج بھی اس کی سواری میں ہے۔ س کے پیچھے میں نے اپنا گھر چوپٹ کر دیا بھائی صاحب دل میں جتنا رس تھا، وہ ادھر کی طرف اتنی زور سے بہا کہ دوسری طرف باغ بالکل خشک ہی رہ گیا۔ برسوں ہو گئے کہ میں نے گو بندی سے دل کھول کر بات بھی نہیں کی۔ اس کی خدمت اور محبت اور قربانی سے مجھے اسی طرح بدمزگی ہوگئی تھی جیسے بدہضمی کے مریض کو حلوے سے ہو جاتی ہے۔ مالتی مجھے اسی طرح نچاتی تھی جیسے مداری بندر کو

نچاتا ہے اور میں خوشی سے ناچتا تھا۔ وہ میری توہین کرتی تھی اور میں خوشی سے ہنستا تھا۔ وہ مجھ پر حکومت کرتی تھی اور میں سر جھکاتا تھا۔ اس نے کبھی مجھے منہ نہیں لگایا، یہ میں مانتا ہوں۔ اس نے کبھی میرا حوصلہ افزائی نہیں کی، یہ بھی سچ ہے۔ پھر بھی میں پتنگے کی طرح اس کے چہرے کی چمک پر جان دیتا تھا اور اب وہ مجھ سے اخلاق کا برتاؤ بھی نہیں کر سکتی! لیکن صاحب، میں کہے دیتا ہوں کہ کھنا چپ بیٹھنے والا نہیں ہے۔ اس کے رقعے میرے پاس محفوظ ہیں۔ میں اس سے ایک ایک پائی وصول کر لوں گا اور ڈاکٹر مہتا کو تو میں لکھنو سے نکال کر دم لوں گا۔ ان کا یہاں رہنا ناممکن کر دوں گا۔"

اسی وقت ہارون کی آواز آئی اور ایک لمحے میں مسٹر کھنا آ کر کھڑے ہو گئے۔ گورا چٹا رنگ، صحت کی سرخی گالوں پر چمکتی ہوئی لمبی اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور سنہری عینک، شرافت کے اوتار سے معلوم ہوتے تھے۔ کھنا نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ آیئے مسٹر مہتا! آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔

مہتا نے دونوں صاحبوں سے ہاتھ ملا کر کہا "بڑی اچھی ساعت گھر سے چلا تھا کہ آپ دونوں صاحبوں سے ایک ہی جگہ پر ملاقات ہو گئی۔ آپ نے اخباروں میں دیکھا ہو گا کہ یہاں عورتوں کے لیے ایک ورزش گاہ بنانے کی تجویز ہو رہی ہے۔ مس مالتی اس کمیٹی کی صدر ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کی تعمیر میں دو لاکھ روپے لگیں گے۔ شہر میں اب اس کی کتنی ضرورت ہے، یہ آپ لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ چندہ دینے والوں میں آپ دونوں صاحبوں کا نام سب سے اوپر ہو۔ مس مالتی خود آنے والی تھیں مگر آج ان کے والد کی طبیعت اچھی

نہیں ہے، اس لیے نہیں آسکیں۔''

انہوں نے چندے کی فہرست رائے صاحب کے ہاتھ میں رکھ دی۔ پہلا نام راجہ سورج تاب سنگھ تھا۔ سامنے]انچ ہزار روپے کی رقم درج تھی۔ اس کے بعد کنور وگ وجے سنبگھر کے تین ہزار روپے تھے۔ اس کے بعد اور کئی رقمیں اتنی ہی یا کچھ کم تھیں۔ مالتی نے پانچ سو روپے دیئے تھے ڈاکٹر مہتا نے ایک ہزار۔

رائے صاحب نے شرما کر کہا۔ ''کوئی چالیس ہزار تو آپ لوگوں نے کر ہی لیے۔''

مہتا فخر سے بولے۔ ''یہ سب آپ لوگوں کی مہربانی سے اور یہ صرف تین گھنٹے کی محنت کا نتیجہ ہے، مگر آج تو انہوں نے بلا کہے سنے چیک لکھ دیا۔ ملک میں بیداری ہے۔ پبلک کسی بھی نیک کام میں مدد دینے کو تیار ہے۔ صرف اسے یقین ہونا چاہیے کہ اس کی خیرات کا جائز استعمال ہوگا۔ اس سے مجھے بڑی امید ہے، مسٹر کھنا۔''

کھنا نے بے پروائی سے کہا۔ ''میں ایسے فضول کاموں میں نہیں پڑتا۔ نہ جانے آپ لوگ مغرب کی غلامی میں کہاں تک بڑھتے جائیں گے۔ یوں ہی عورتوں کو خانہ داری سے نفرت ہو رہی ہے، ورزش کی دھن سوار ہوئی تو وہ اور بھی کہیں کی نہ رہیں گی۔ جو عورت گھر کا کام کرتی ہے، اس کے لیے ورزش کی ضرورت نہیں اور جو گھر کا کوئی کام نہیں کرتی ہے صرف عیش و آرام میں محو ہے، اس کی ورزش کے لیے چندہ دینا بھی ادھر سمجھتا ہوں۔''

مہتا ذرا بھی بے دل نہ ہوئے اس حالت میں آپ سے کچھ مانگوں گا بھی

نہیں۔جس تجویز میں ہمارا یقین نہ ہو،اس میں کسی طرح کی امداد دینا واقعی دھرم ہے۔آپ تو مسٹر کھنا سے متفق نہیں ہیں رائے صاحب؟

رائے صاحب بڑی سوچ میں پڑے ہوئے تھے۔سورج پرتاب کے پانچ ہزار ان کا حوصلہ پست کیے ڈالتے تھے۔چونک کر بولے۔''آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔''

''میں نے کہا کہ آپ تو اس کام میں امداد دینا ادھرم نہیں سمجھتے۔''

''جس کام میں آپ شریک ہیں وہ دھرم ہے یا ادھرم،اس کی میں پروا نہیں کرتا۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ کو دغور کریں اور اگر آپ اس تجویز کو سماج کے لیے مفید سمجھیں تو اس میں مدد دیں۔''

''مسٹر کھنا کا طرز عمل مجھے بہت پسند آیا۔''

کھنا بولے۔''میں تو صاف کہتا ہوں اسی لیے بدنام ہوں۔''

رائے صاحب نے کمزور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔''مجھ میں تو سوچنے کی سکت نہیں ہے۔شرفاء کی تقلید کرنا ہی میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔''

''تو لکھیے کوئی اچھی رقم۔''

''جو کہیے وہ لکھ دوں۔''

''جو آپ کی خوشی۔''

''جو آپ کہیے وہ لکھ دوں۔''

''تو دو ہزار سے کم کیا لکھیے گا۔''

رائے صاحب نے مجروح لہجے میں کہا۔ ''تو آپ کی نظر میں میری یہی حیثیت ہے؟''

انہوں نے قلم اٹھایا اور اپنا نام لکھ کر اس کے آگے پانچ ہزار لکھ دیئے۔

مہتا نے فہرست ان کے ہاتھ سے لے لی۔ مگر انہیں اتنا رنج ہوا کہ رائے صاحب کا شکریہ بھی ادا کرنا بھول گئے۔ رائے صاحب کو چندے کی فہرست دکھا کر انہوں نے بے جا کیا، یہ سوچ کر انہیں افسوس ہوا۔

مسٹر کھنا نے رائے صاحب کو ترحمانہ نظر سے دیکھا، گویا کہہ رہے ہوں۔ ''کتنے بڑے گدھے ہو تم!''

دفعتاً مہتا، رائے صاحب کے گلے سے لپٹ گئے اور زور سے بولے۔ ''رائے صاحب کے لیے تالیاں! ہپ ہپ ہرا!''

کھنا نے کھسیا کر کہا۔ ''یہ لوگ راجے مہاراجے ٹھہرے، یہی ان کاموں میں دان نہ دیں تو کون دے؟''

مہتا بولے۔ ''میں تو آپ کو راجاؤں کا راجہ سمجھتا ہوں۔ آپ ان پر حکومت کرتے ہیں۔ ان کی چوٹی آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

رائے صاحب خوش ہو گئے۔ ''یہ آپ نے بڑے معرکے کی بات کی، مہتا جی! اصل راجہ تو ہمارے بینکر لوگ ہیں۔''

مہتا نے کھنا کی خوشامد کا پہلو اختیار کیا۔ ''مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے کھنا جی۔ آپ ابھی اس کام میں نہیں شریک ہونا چاہتے تو نہ سہی، لیکن کبھی نہ کبھی آپ ضرور شرکت کریں گے۔ امیروں کی بدولت ہی ہماری بڑی بڑی تحریکیں چل

رہی ہیں۔قومی تحریک کو دو تین سال تک اس دھوم دھام سے کس نے چلایا؟ اتنے دھرم شالے اور پاٹھ شالے کون بنوا رہا ہے؟ آج دنیا کی حکومت کی باگ ڈور بینکروں کے ہاتھ ہے۔سرکاریں ان کے ہاتھ کا کھلونا ہیں۔میں ابھی آپ سے نا امید نہیں ہوں۔ جو شخص قوم کے لیے جیل جا سکتا ہے، اس کے لیے دو چار ہزار خرچ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ہم نے طے کیا ہے کہ اس عمارت کا بنیادی پتھر گوبندی دیوی کے ہاتھوں رکھا جائے۔ہم دونوں جلد ہی گورنر صاحب سے بھی ملیں گے اور مجھے یقین ہے کہ ہمیں ان کی مدد مل جائے گی۔لیڈی ولسن کو نسوانی تحریکوں سے کتنی ہمدردی ہے، یہ آپ جانتے ہیں۔راجہ صاحب اور دیگر اصحاب کی بھی رائے تھی کہ لیڈی ولسن ہی سے سنگ بنیاد رکھایا جائے، مگر بالآخر یہی طے ہوا کہ یہ شبھ کام کسی اپنی ہی بہن کے ہاتھوں ہونا چاہیے۔آپ کم از کم اس موقع پر تشریف لائیں ضرور؟''

کھنا نے مضحکہ اڑایا۔''ہاں جب لارڈ ولسن آئیں گے تو میرا پہنچنا لازمی ہی ہے۔اس طرح آپ بہت سے رئیسوں کو پھنسالیں گے۔آپ لوگوں کے لٹکے بھی خوب سوجھتے ہیں اور ہمارے رئیس بھی ہیں اسی لائق۔انہیں الو بنا کر مونڈا جا سکتا ہے۔''

''جب روپیہ ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے، تو اپنے لیے نکلنے کا راستہ تلاش کرتا ہے۔یوں نہ نکل پائے گا تو قمار بازی میں جائے گا۔گھڑ دوڑ میں جائے گا۔اینٹ پتھر میں جائے گا یا عیاشی میں جائے گا۔''

گیارہ بجنے کو تھے۔کھنا صاحب کے دفتر کا وقت آ گیا۔مہتا چلے گئے۔رائے

صاحب بھی اٹھے کہ کھنا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ ''نہیں آپ ذرا بیٹھیے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مہتا نے مجھے اس بری طرح پھانسا ہے کہ نکلنے کی کوئی سبیل ہی نہیں رہی۔ گوبندی سے سنگ بنیا درکھائیں گے۔ ایسی حالت میں میرا الگ رہنا مضحکہ خیز ہے یا نہیں؟ گوبندی نے کیسے برداشت کرلیا، یہ سمجھنا اور بھی مشکل ہے۔ آپ کا خیال ہے، اس میں کوئی راز ہے یا نہیں؟''

رائے صاحب نے اپنا وہ جتاتا۔ ''ایسے معمالوں میں عورت کو ہمیشہ خاوند سے صلاح لے لینی چاہیے۔''

کھنا نے رائے صاحب کو تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ان ہی باتوں پر گوبندی سے میرا جی جلتا ہے اور اس پر لوگ مجھی کو برا کہتے ہیں۔ آپ ہی سوچیے کہ مجھے ان جھگڑوں سے کیا واسطہ؟؟ ان میں تو وہ پڑے جس کے پاس فالتو روپیہ ہو، فالتو وقت ہو اور نام ونمود کی ہوس ہو۔ ہونا یہی ہے کہ دو چار لوگ سیکرٹری اور انڈر سیکرٹری اور پریذیڈنٹ اور وائس پریذیڈنٹ بن کر افسروں کی دعوتیں دیں گے، ان کے منظور نظر بنیں گے اور یونیورسٹی کی چھوکریوں کو جمع کر کے گل چھرے اڑائیں گے۔ ورزش تو صرف دکھانے کے دانت ہیں۔ ایسی تحریکوں میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے اور الو بنیں گے ہم اور ہمارے بھائی جو دولتمند کہلاتے ہیں اور یہ سب گوبندی کے سبب!''

وہ ایک بار کرسی سے اٹھے، پھر بیٹھ گئے۔ گوبندی پر ان کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

رائے صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی۔۔ ''کچھ نہیں، آپ گوبندی دیوی سے صاف کہہ دیں کہ تم مہتا کو انکار کا خط لکھ دو، چلو چھٹی ہوئی۔ میں تو لاگ ڈانٹ میں پھنس گیا۔ آپ کیوں پھنسیں؟''

کھنا نے لمحہ بھر اس تجویز پر غور کر کے کہا۔ ''لیکن سوچیے کہ کتنا مشکل کام ہے، لیڈی ولسن سے اس کا ذکر آ چکا ہے۔ سارے شہر میں خبر پھیل گئی ہو گی اور شاید آج اخباروں میں بھی نکل جائے۔ یہ سب مالتی کی شرارت ہے۔ اسی نے مجھے زچ کرنے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے۔''

''ہاں معمول تو یہی ہوتا ہے۔''

''وہ مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہے۔''

''آپ بنیا در کھنے کے ایک روز قبل باہر چلے جائیے گا۔''

''مشکل ہے رائے صاحب۔ کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔ اس دن تو مجھے ہیضہ بھی ہو جائے تو وہاں جانا پڑے گا۔''

رائے صاحب آس باندھے کل آنے کا وعدہ کر کے جیوں ہی باہر نکلے کہ کھنا نے اندر جا کر گوبندی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ''تم نے اس ورزش گاہ کی بنیاد رکھنا منظور کیا؟''

گوبندی کیسے کہے کہ یہ وقار پا کر وہ دل میں کتنا خوش ہو رہی تھی۔ اس موقع کے لیے کتنی توجہ سے اپنی تقریر لکھ رہی تھی اور ایک جوشیلی نظم بھی تیار کی تھی۔ اس نے دل میں سمجھا تھا کہ یہ تجویز منظور کر کے وہ کھنا کو خوش کر دے گی۔ اس کی توقیر تو اس کے شوہر کی توقیر ہے۔ کھنا کو اس میں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے، اس کا اسے

سان گمان بھی نہ تھا۔ ادھر کئی دنوں سے شوہر کو کچھ مہربان دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھنے لگا تھا۔ وہ اپنی تقریر سے اور اپنی نظم سے لوگوں کو محو بنا دینے کا خواب دیکھ رہی تھی۔

یہ سوال سنا اور کھنا کی صورت دیکھی تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔ خطاوار کی طرح بولی۔ ''ڈاکٹر مہتا نے اصرار کیا۔ تو میں نے منظور کر لیا۔''

''ڈاکٹر مہتا تمہیں کنویں میں گرنے کو کہیں، تو شاید اتنی خوشی سے نہ تیار ہو گی۔''

گوبندی کی زبان بند!

''تمہیں جب ایشور نے عقل نہیں دی تو کیوں مجھ سے نہیں پوچھ لیا؟ مہتا اور مالتی دونوں یہ چال چل کر مجھ سے چار ہزار اینٹھنے کی فکر میں ہیں اور میں نے ٹھان لی ہے کہ ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔ تم آج ہی مہتا کو انکار کا خط لکھ دو۔''

گوبندی نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ ''تمہی لکھ لو نا۔''

''میں کیوں لکھوں؟ بات کی تم نے اور لکھوں میں۔''

''ڈاکٹر صاحب سبب پوچھیں گے تو کیا بتاؤں گی؟''

''بتانا اپنا سر اور کیا! میں اس عشرت گاہ کو ایک کوڑی بھی نہیں دینا چاہتا۔''

''تو تمہیں کچھ دینے کو کون کہتا ہے؟''

کھنا نے ہونٹ چبا کر کہا۔ ''کیسی بیوقوفوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ تم وہاں بنیاد رکھو گی اور کچھ دو گی نہیں تو دنیا کیا کہے گی؟''

گوبندی نے جیسے سنگین کی نوک پر کہا۔ ''اچھی بات ہے، لکھ دوں گی۔''

''آج ہی لکھنا ہوگا۔''

''کہہ تو دیا کلھ دوں گی۔''

کھنا باہر آئے اور ڈاک دیکھنے لگے۔ انہیں دفتر جانے میں دیر ہو جاتی تھی تو چپراسی گھر ہی ڈاک دے جاتا تھا۔ شکر گراں ہوگئی ہے۔ کھنہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ دوسرا خط کھولا، ایکھ کا نرخ مقرر کرنے کے لیے جو کمیٹی بنی تھی، اس نے طے کر دیا کہ ایسی بندش نہیں کی جا سکتی۔ دھت تیری کی! وہ پہلے ہی یہی بات کہہ رہے تھے۔ مگر اس اگنہوتری نے خل مچا کر جبراً کمیٹی بنائی آخر بچہ کے منہ پر تھپڑ لگا۔ یہ مل والوں اور کسانوں کے درمیان کا معاملہ ہے۔ سرکار اس میں دخل دینے والی کون؟

دفعتاً مالتی موٹر سے اتری، کنول کی طرح شگفتہ، شرغ کی طرح روشن، زندہ دلی اور خوشی کی مورت سی، بے خوف، بے فکر، گویا اسے یقین ہے کہ دنیا میں اس کے لیے عزت و راحت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کھنا نے برآمدے میں آ کر خیر مقدم کیا۔

مالتی نے پوچھا۔ ''کیا یہاں مہتا آئے تھے؟''

''ہاں آئے تو تھے۔''

''کچھ کہا، کہاں جا رہے ہیں؟''.

''یہ تو کچھ نہیں کہا۔''

''جانے کہاں غوطہ لگا گئے۔ میں چاروں طرف گھوم آئی۔ آپ نے ورزش گاہ کے لیے کتنا دیا؟''

کھنا نے خطاوارانہ کہا۔ ''میں نے ابھی اس معاملے کو سمجھا ہی نہیں۔''

مالتی نے بڑی بڑی آنکھوں سے ان کی طرف تیز تیز دیکھا، گویا سوچ رہی تھی

کہ ان پر رحم کرے یا غصہ۔ بولی۔ ''اس میں سمجھنے کی کیا بات تھی؟ اور سمجھ لیتے تو آگے پیچھے اس وقت تو کچھ دینے کی بات تھی۔ میں نے مہتا کو جبراً بھیجا، بیچارے ڈر رہے تھے کہ آپ نہ جانے کیا جواب دیں۔ آپ کے اس بخل کا کیا نتیجہ ہوگا، آپ جانتے ہیں؟ یہاں کی تجارت پیشہ جماعت سے کچھ نہ لے گا۔ آپ نے شاید مجھے ذلیل کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ سب کی رائے تھی کی لیڈی ولسن بنیادی پتھر رکھیں۔ میں نے گوبندی دیوی کی جانبداری کی اور لڑ کر سب کو راضی کیا۔ اب آپ فرماتے ہیں کہ آپ نے اس معاملے کو سمجھا ہی نہیں! آپ بینک کی پیچیدہ گیاں سمجھتے ہیں مگر اتنی موٹی بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آپ مجھے شرمندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اچھی بات ہے، یہی سہی۔''

مالتی کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ کھنا گھبرائے۔ ساری اکڑ جاتی رہی، مگر اس کے ساتھ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر وہ کانٹوں میں الجھ گئے ہیں تو مالتی دلدل میں پھنس گئی، اگر ان کی تھیلیوں پر سنکٹ آپڑا ہے تو مالتی کی عزت پر، جو تھیلیوں سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ تب ان کا دل مالتی کی اس درگت پر کیوں نہ خوش ہو؟ انہوں نے مالتی کو اردب میں ڈال دیا تھا، اور اگرچہ وہ اسے ناراض کردینے کی ہمت کھو چکے تھے مگر دو چار کھری کھری باتیں کہہ سنانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتے تھے کہ میں بالکل احمق نہیں ہوں۔ اس کا راستہ روک کر بولے۔ ''تم مجھ پر اتنی مہربان ہوگی ہو، اس پر مجھے حیرت ہورہی ہے مالتی!''

مالتی نے ابروؤں کو سکیڑ کر کہا۔ ''میں اس کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''کیا اب میرے ساتھ تمہارا وہی برتاؤ ہے جو کچھ دنوں پہلے تھا۔''

''میں تو اس میں کوئی فرق نہیں دیکھتی۔''

''لیکن میں ت وزمین آسمان کا فرق دیکھ رہا ہوں۔''

''اچھا مان لو کہ تمہارا اقیاس ٹھیک ہے تو پھر؟ میں تم سے ایک نیک کام میں مدد مانگنے آئی ہوں۔ اپنے سلوک کی آزمائش کے لیے نہیں اور اگر تم سمجھتے ہو کہ کچھ چندہ دے کر تم نیک نامی اور شکریہ کے سوا کچھ اور پا سکتے ہو تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔''

کھنا ہار گئے۔ وہ ایسے تنگ گوشے میں پھنس گئے تھے، جہاں ادھر ادھر ہلنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ کیا وہ اس سے یہ کہنے کی جرأت رکھتے ہیں کہ مُن نے اب تک تمہارے اوپر روپے لٹا دیئے تو کیا اس کا یہی صلہ ہے؟ شرم سے ان کا منہ ذرا سا نکل آیا جیسے سکڑ گیا ہو۔ جھینپتے ہوئے بولے۔ ''میرا مطلب یہ نہ تھا مالتی! تم بالکل غلط سمجھیں۔''

مالتی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''خدا کرے آپ نے غلط سمجھا ہو۔ کیونکہ اگر میں اسے سچ سمجھوں گی تو تمہارے سایہ سے بھی بھاگوں گی۔ میں خوبصورت ہوں۔ تم بھی میرے بہت چاہنے والوں میں ایک ہو۔ یہ میری مہربانی تھی کہ جہاں میں اوروں کو تحفے لوٹا دیتی تھی، وہاں تمہاری معمولی سے معمولی چیزیں بھی شکریے کے ساتھ قبول کر لیتی تھی اور ضرورت پڑنے پر تم سے روپے بھی مانگ لیتی تھی۔ اگر تم نے اپنے روپے کے نشے میں اس کا کوئی دوسرا مطلب نکال لیا تو میں تمہیں معاف کر دوں گی۔ یہ مردوں کی سرشت ہے، اور تم اس سے مستثنیٰ نہیں ہو۔ مگر یہ سمجھ لو کہ روپے نے آج تک کسی عورت کے دل پر فتح نہیں پائی اور نہ کبھی پائے

گا۔''

کھنا ایک لفظ پر گویا گز گز بھر نیچے دھنستے جا رہے تھے۔ اب اور زیادہ چوٹ سہنے کی ان میں سکت نہ تھی۔ شرمندہ ہو کر بولے ''مالتی! میں تمہارے پیروں پڑتا ہوں، اب اور ذلیل نہ کرو۔ اور نہ سہی تو دوستانہ برتاؤ تو قائم رہنے دو۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے دراز سے چیکوں کی کتاب نکالی اور ایک ہزار کا چیک لکھ کر ڈرتے ڈرتے مالتی کی طرف بڑھا دیا۔

مالتی نے چیک لے کر بے دردانہ طنز سے کہا۔ ''یہ میرے سلوک کی قیمت ہے یا ورزش کا گاہ کا چندہ ہے؟''

کھنا آبدیدہ ہو کر بولے۔ ''اب میری جان بخشو، مالتی! کیوں میرے منہ میں کالکھ لگا رہی ہو۔''

مالتی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ''دیکھا، ڈانٹ بھی'' دیکھا، ڈانٹ بھی بتائی اور ایک ہزار روپے بھی وصول کیے۔ اب تم کبھی شرارت نہ کرو گے؟''

''کبھی نہیں، جیستے جی کبھی نہیں!''

''کان پکڑو۔''

''کان پکڑتا ہوں۔ مگر اب تم مجھ پر رحم کر کے چلی جاؤ اور مجھے تخلیے میں بیٹھ کر سوچنے اور رونے دو۔ تم نے آج میری زندگی کی ساری خوشی.....''

مالتی اور زور سے ہنسی۔ ''دیکھو کھنا! تم میری بڑی توہین کر رہے ہو اور تم جانتے ہو کہ حسن توہین نہیں سہہ سکتا۔ میں نے تو تمہارے ساتھ نیکی کی اور تم اسے بدی سمجھ رہے ہو۔''

کھنا احتجاج کی نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ ''تم نے میرے ساتھ نیکی کی ہے یا الٹی چھری سے میرا گلا کاٹا ہے؟''

''کیوں؟ میں تمہیں لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھر رہی تھی۔ تم اس لوٹ سے بچ گئے۔''

''کیوں زخم پر نمک چھڑک رہی ہو مالتی؟ میں بھی آدمی ہوں۔''

مالتی نے اس طرح کھنا کی طرف دیکھا، گویا یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ آدمی ہیں یا نہیں؟ بولی۔ ''ابھی تو مجھے اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔''

''تم بالکل معما ہو، آج یہ ثابت ہو گیا۔''

''ہاں تمہارے لیے معما ہوں اور معما ہی رہوں گی۔''

یہ کہتی ہوئی وہ چڑیا کی طرح ایک دم اڑ گئی اور کھنا سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگے کہ یہ صرف دکھاوا ہے یا اس کا سچا روپ!

(23)

گوبر اور جھنیا کے چلے جانے پر گھر سنسان رہنے لگا۔ دھنیا کو بار بار منو کی یاد آتی رہتی ہے۔ بچے کی ماں تو جھنیا تھی مگر اس کی پرورش دھنیا ہی کرتی تھی۔ وہی اسے ابٹن ملتی، کاجل لگاتی، سلاتی اور جب کام کاج سے فرصت ملتی تو پیار کرتی۔ محبت کا یہ نشہ ہی اس کی تکلیفوں کو بھلاتا رہتا تھا۔ اسی کا بھولا بھالا ملکھن سا چہرہ دیکھ کر وہ اپنی ساری فکر بھول جاتی اور محبت بھرے گھمنڈ سے اس کا دل پھول اٹھتا۔ وہ زندگی کا سہارا اب نہ تھا۔

اس کا سونا کھٹولا دیکھ کر وہ رو اٹھتی۔ وہ تعویذ جو تمام پریشانیوں اور ناامیدیوں

سے اسے بچاتا تھا، اس سے چھن گیا تھا۔ وہ بار بار سوچتی کہ اس نے جھنیا کے ساتھ ایسی کون سی برائی کی تھی، جس کی اس نے یہ سزا دی۔ ڈائن نے آ کر اس کا سونے کا سا گھر مٹی میں ملا دیا۔

گوبر نے تو کبھی اس کی بات کا جواب بھی نہ دیا تھا۔ اس رانڈ نے اسے پھوڑا اور اب وہاں لے جا کر نہ جانے کون کون سا ناچ نچائے گی۔ یہیں وہ بچے کی کون بہت پروا کرتی تھی۔ اسے تو اپنے مسی، کاجل اور مانگ چوٹی ہی سے چھٹی نہ ملتی تھی۔ بچے کی دیکھ بھال کیا کرے گی؟ بیچارا اکیلا دھرتی پر پڑا روتا ہوگا۔ بیچارا ایک دن بھی تو سکھ سے نہیں رہنے پاتا۔

کبھی کھانسی، کبھی دست، کبھی کچھ۔ یہ سوچ سوچ کر اسے جھینا پر غصہ آتا۔ گوبر کے لیے اب بھی اس کے دل میں وہی ماما تھی، اسی چڑیل نے اسے کچھ کھلا پلا کر اپنے بس میں کر لیا۔ ایسی جادو ٹونا والی نہ ہوتی تو یہ ٹونا ہی کیسے کرتی؟ کوئی بات نہ پوچھتا تھا، بھرجائیوں کی لاتیں کھاتی تھی، یہ بدھو مل گیا تو آج رانی ہوگی۔

ہوری نے چڑ کر کہا۔ ''جب دیکھو تب جھنیا ہی کو دوکھ دیتی رہتی ہے، یہ نہیں سمجھتی کہ اپنا سونا کھوٹا تو سنار کا کیا دوش؟ گوبر اسے نے لے جاتا تو کیا آپ سے چلی جاتی؟ سہر کا دانہ پانی لگنے سے لونڈے کی آنکھ بدل گئی، ایسا کیوں نہیں سمجھ لیتی۔''

دھنیا گرج اٹھی۔ ''اچھا چپ رہو، تم نے رانڈ کو سر پر چڑھا رکھا تھا، نہیں میں پہلے ہی دن جھاڑو مار کر نکال دیتی۔''

کھلیان میں کٹا ہوا اناج جمع ہو گیا تھا۔ ہوری بیلوں کو لیے اسے مانڈ نے جا رہا

تھا۔ منہ پھیر کر بولا۔ ''مان لے کہ بہو نے گوبر کو پھوڑ ہی لیا تو تو اتنا کڑھتی کیوں ہے؟ جو ساری دنیا کرتی ہے، وہی گوبر نے بھی کیا۔ اب اس کے بال بچے ہوئے تو میرے بال بچوں کے لیے کیوں اپنی جان آپھت (آفت) میں ڈالے؟ کیوں ہمارے سر کا بوجھ اپنے سر اٹھائے؟''

''تمہی سارے بکھیڑ کی جڑ ہو۔''

''تو مجھے نکال دے، لے جا بیلوں کو، اناج مانڈ میں حکہ (حقہ) پیتا ہوں۔''

''تم چل کر چکی پیسو، میں اناج مانڈوں۔''

مذاق میں غم دور ہو گیا۔ یہی اس کی دوا ہے۔ دھنیا خوش ہو کر روپا کے بال گوندھنے بیٹھ گئی جو بالکل الجھ کر رہ گئے تھے اور ہوری کھلیان چلا گیا۔ کیف آفریں بسنت نکہت، فرحت اور جاں بخشی کا سرمایہ لٹا رہی تھی، دونوں ہاتھوں سے دل کھول کر۔ کوئل آم کی ڈالیوں پر مینوں کی برات سی سجی بیٹھی تھی۔ نیم اور سرسا اور کروندے اپنی خوشبو میں نشہ گھول رہے تھے۔ ہوری آموں کے باغ میں پہنچا تو پیڑوں کے نیچے تارے کھلے تھے۔ اس کا رنج و مایوسی سے بھرا ہوا دل بھی اس عالمگیر رونق اور رنگینی میں جیسے ڈوب سا گیا۔ وہ ترنگ میں آ کر گانے لگا:

جیا جرت رہت دن رین

آم کی ڈریا کویل بولے تنک نہ آوت چین

سامنے سے دلاری گلابی ساڑھی پہنے چلی آ رہی تھی۔ پاؤں میں موٹے نقرئی کڑے، گلے میں موٹی طلائی ہنسلی، چہرہ خشک مگر دل میں تازگی، ایک وقت تھا جب ہوری کھیت کھلیان میں اسے چھیڑا کرتا تھا۔ وہ بھابھی تھی اور ہوری دیور تھا۔

اس ناتے سے دونوں میں مذاق ہوتا رہتا تھا۔ جب سے سیٹھ جی مر گئے، دلاری نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ سارا دن دکان پر بیٹھی رہتی اور وہیں سارے گاؤں کی خبر لیتی رہتی تھی۔ کہیں آپس میں جھگڑا ہو جائے تو سیٹھانی وہاں بیچ بچاؤ کرنے کے لیے ضرور پہنچے گی۔ ایک آنہ روپیہ سود سے کم پر قرض نہ دیتی تھی اور اگرچہ سود کے لالچ میں اصل بھی ہاتھ آتا تھا مگر اس کے سود کی شرح جیوں کی تیوں بنی ہوئی تھی۔ بیچاری کیسے وصول کرے؟ نالش فریاد کرنے سے رہی، تھانہ پولیس کرنے سے رہی، صرف زنان کا زور تھا مگر جیوں جیوں عمر کے ساتھ زبان کی تیزی بڑھتی جاتی تھی، تیوں تیوں اس کی کاٹ گھٹتی جاتی تھی۔ اب اس کی گالی پر لوگ ہنس دیتے تھے اور مذاق کہتے۔ ''کیا کرے گی، روپے لے کر کالی؟ ساتھ تو ایک کوڑی بھی نہ لے جا سکے گی۔ غریبوں کو کھلا پلا کر جتنی اسیس مل سکے، لے لے، یہی پرلوک میں کام آئے گا۔''

اور دلاری پرلوک کے نام سے جلتی تھی۔

ہوری نے چھیڑا۔ ''آج تو بھابھی تم سچ مچ جوان لگتی ہو۔''

سیٹھانی مگن ہو کر بولی ''آج منگل کا دن ہے، وسٹھ نہ لگا دینا۔ اسی سے میں کچھ پہنتی اوڑھتی نہیں۔ گھر سے نکلو تو سبھی گھورنے لگتے ہیں، جیسے کبھی کوئی مہریہ دیکھی ہی نہ ہو۔ پٹیشوری لالہ کی پرانی بان ابھی تک نہیں چھوٹی۔''

ہوری رک گیا۔ بڑی دلکش بحث چھڑ گئی تھی۔ بیل آگے نکل گئے تھے۔ بولا

''وہ تو آج کل بڑے بھگت ہو گئے ہیں۔''

''دیکھتی نہیں ہو کہ ہر پورنما کو ست نرائن کی کتھا سنتے ہیں اور دونوں جون مندر

میں درسن کرنے جاتے ہیں۔''

''ایسے بدچلن جتنے ہوتے ہیں، وہ سبھی بوڑھے ہو کر بھگت بن جاتے ہیں۔ ککرم (بداعمال) کا پرائسچت (کنارہ) تو کرنا ہی پڑتا ہے، پوچھو اس میں اب بڑھیا ہوئی مجھ سے ہنسی کیسی؟''

''تم ابھی بڑھیا کیسے ہوگئیں بھابھی؟ مجھے تو اب بھی.....!''

''اچھا چپ ہی رہنا، نہیں تو ڈیڑھ سو گالی دوں گی۔ لڑکا پردیس کمانے لگا اور ایک دن نیوتا بھی نہ کھلایا۔ سینت میت میں بھابھی بنانے کو تیار!''

''مجھ سے سوگند لے لو بھابھی، جو میں نے اس کی کمائی کا ایک پیسہ بھی چھوا ہو۔ نہ جانے کیا لایا، کہاں اٹھایا، مجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔ بس ایک جوڑا دھوتی اور ایک منڈاسہ (صافہ) میرے ہاتھ لگا۔''

''اچھا کمانے تو لگا، آج نہیں تو کل گھر سنبھالے ہی گا۔ بھگوان اسے سکھی رکھیں، ہمارے روپے بھی تھوڑا تھوڑا دیتے چلو، سود ہی تو بڑھ رہا ہے۔''

''تمہاری ایک ایک پائی دوں گا بھابھی، ہاتھ میں پیسے آنے دو اور کھا ہی جائیں گے تو کوئی باہر کے تو نہیں ہیں، ہیں تو تمہارے ہی!''

سیٹھانی ایسے مذاقیہ خوشامد سے نہتی سی ہو جاتی تھی۔ مسکراتی ہوئی اپنی راہ چلی گئی۔ ہوری لپک کر بیلوں کے ساتھ پہنچ گیا اور اناج مانڈنے لگا۔ سارے گاؤں کا یہی کھلیان تھا۔ کہیں اناج مانڈا جا رہا تھا، کہیں اسایا جا رہا تھا اور کوئی تول رہا تھا۔ نائی باری، بڑھئی، لوہارم، پروہت، بھاٹ، بھکاری سبھی اپنے اپنے ''جیورے'' لینے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ایک پیڑ کے نیچے جھنگری سنگھ کھاٹ پر

بیٹھے اپنی ''سوائی'' وصول کر رہے تھے۔ کئی نیچے کھڑے ہوئے اناج کا مول تول کر رہے تھے۔ سارے کھلیان میں منڈی کی سی رونق تھی۔ ایک کھٹکن بیر اور مکوے بیچ رہی تھی اور ایک خوانچہ والا تیل کے سیو اور جلیبیاں لیے گھوم رہا تھا۔ پنڈت داتا دین بھی ہوری سے اناج بٹوانے کے لیے آ پہنچے تھے اور جھنگڑی سنگھ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

داتا دین نے تمبا کو کو ملتے ہوئے کہا۔ ''کچھ سنا، سرکار بھی مہاجنوں سے کہہ رہی ہے کہ بیاج کی درگھٹا دو، نہیں ڈگری نہیں ملے گی۔''

جھنگری تمبا کو پھانک کر بولے۔ ''پنڈت، میں تو ایک بات جانتا ہوں تمہیں گرج (غرض) پڑے گی تو سو بار ہم سے روپے ادھار لینے آؤ گے اور ہم جو بیاج چاہیں گے، لیں گے۔ سرکار اگر اسامیوں کو روپیہ ادھار دینے کا کوئی بندوبست کرے گی تو ہمیں اس کانون (قانون) سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم درکم لکھا دیں گے، مگر سیکڑے میں پچیس پہلے ہی کاٹ لیں گے۔ اس میں سرکار کیا کر سکتی ہے؟''

''یہ تو ٹھیک ہے، پھر سرکار بھی ان باتوں کو کھوب (خوب) سمجھتی ہے۔ وہ اس کی بھی کوئی روک نکالے گی، دیکھ لینا۔''

''اس کی روک ہو ہی نہیں سکتی۔''

''اچھا، اگر وہ کر دے کہ جب تک اسٹام پر گاؤں کے مکھیا یا کارندے کی گواہی نہ ہو، وہ پکا نہ ہوگا۔ تب کیا کرو گے؟''

''اسامی کو سو بار گرج ہوگی تو مکھیا کو ہاتھ پاؤں جوڑ کر لاوے گا اور گواہی کرا دے گا۔ ہم تو ایک چوتھائی کاٹ ہی لیں گے۔''

''اور جو پھنس جاؤ؟ جعلی حساب لکھا اور گئے چودہ سال کو۔''

جھنگری سنگھ زور سے ہنسے ''تم کیا ہو پنڈت؟ کیا تب سنسار بدل جائے گا؟ کانون اور بناؤ اس کا ہے جس کے پاس پیسہ ہے کانون تو ہے کہ مہاجن کسی اسامی سے لڑائی نہ کرے، کوئی جمیندار (زمیندار) کسی کاسکار (کاشتکار) کے ساتھ لڑائی نہ کرے۔ پر ہوتا کیا ہے، یہ تو نت ہی دیکھتے ہو۔ جمیندار مسک باندھوا کے پٹواتا ہے اور مہاجن لات جوتے سے بات کرتا ہے۔ ہاں جو کسان پوڑھا (مضبوط) ہے اس سے نہ جمیندار بولتا ہے، نہ مہاجن۔ کسانوں سے ہم مل جاتے ہیں اور ان کی مدد سے دوسروں کی گردن دباتے ہیں۔ تمہارے ہی اوپر رائے صاحب کے پانچ سو روپے نکلے ہیں، پر نوکھے رام میں ہے اتنی ہمت کہ تم سے کچھ بولیں؟ وہ جانتے ہیں کہ تم سے میل ہی کرنے میں ان کی بھلائی ہے۔ کس اسامی میں اتنا بوتا ہے کہ نت (روز) عدالت دوڑے؟ سب کاروبار اسی طرح چلا جائے گا، جیسے چل رہا ہے۔ کچہری، عدالت اسی کے ساتھ ہے جس کے پاس پیسہ ہے۔ ہم لوگوں کے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے کھلیان کا ایک چکر لگایا اور پھر آ کر کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے بولے ''ہاں، متئی کے بیاہ کا کیا ہوا؟ ہماری صلاح تو یہ ہے کہ کہ اس کا بیاہ کر ڈالو۔ اب تو بڑا بدنامی ہو رہی ہے۔''

داتا دین کو جیسے بھڑ نے کاٹ لیا۔ اس کے کہنے کا کیا مطلب تھا، وہ خوب سمجھتے تھے۔ گرم ہو کر بولے۔ ''پیٹھ پیچھے آدمی جو چاہے بکے، منہ پر کوئی کچھ کہے تو اس کی مونچھیں اکھاڑ لوں۔ کوئی ہماری طرح نیمی (مذہب کا پابند) بن تو لے۔ کتنوں کو

جانتا ہوں جو کبھی سندھیا پوجا نہیں کرتے، نہ انہیں دھرم سے مطلب نہ کرم سے۔ نہ کتھا سے مطلب، نہ پروان سے۔ وہ بھی اپنے کو برہمن کہتے ہیں۔ ہمارے اوپر کیا ہنسے گا کوئی۔ جس نے اپنی عمر میں ایک ایکادسی کبھی نہیں چھوڑی، کبھی بنا اسنان دھیان کیے منہ میں پانی نہیں ڈالا۔ نیم کا نبا ہنا کٹھن ہے۔ کوئی بتاوے کہ ہم نے ہاٹ کی کوئی چیج (چیز) کھائی ہو یا کسی دوسرے کے ہاتھ کا پانی پیا ہو، تو اس کی ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ سلیا ہماری چوکھٹ نہیں ناگھنے پاتی، برتن بھانڈے چھونا تو بڑی بات ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ متنی کوئی بہت اچھا کام کر رہا ہے، پر جب ایک بار ایک بات ہوگئی تو یہ ادھر کا کام ہے کہ عورت کو ٹھوڑ دے۔ میں تو کھلا کھلا کہتا ہوں، اس میں چھپانے کی کوئی بات نہیں۔ استری جات پوتر ہے۔''

داتا دین خود اپنی جوانی میں بڑے عیاش رہ چکے تھے مگر اپنے ''نیم دھرم'' سے کبھی نہیں چوکے۔ ماتا دین بھی لائق لڑکے کی طرح ان ہی کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ دھرم کا اصلی جزو ہے پوجا پاٹ، کتھا برت اور چوکا چولھا، جب باپ بیٹے دونوں ہی اصلیت کو پکڑے ہوئے ہیں تو کس کی مجال ہے کہ انہیں ادھری کہہ سکے ؟

جھنگری سنگھ نے قائل ہوکر کہا ''میں نے تو بھائی جو سنا تھا، وہ تم سے کہہ دیا۔''

داتا دین نے مہابھارت اور پرانوں سے ان برہمنوں کی ایک لمبی فہرست پیش کر دی جنہوں نے دوسری ذات کی لڑکیوں سے تعلق پیدا کر لیا تھا اور ساتھ ہی یہ ثابت کر دیا کہ ان سے جو اولاد ہوئی وہ برہمن کہلائی اور آج کل کے جو برہمن ہیں، وہ اسی اولاد کی اولاد ہیں۔ یہ رواج شروع ہی چلا آرہا ہے اور اس میں کوئی

شرم کی بات نہیں۔

جھنگری سنگھ نے ان کی قابلیت پر خوش ہو کر کہا۔ ''تب کیوں آج کل لوگ با جپئی اور رشکل بنے پھرتے ہیں۔''

''سمے سمے کا رواج ہے اور کیا؟ کسی میں انت بیج تو ہو۔ بس کھا کر اسے بچانا تو چاہیے۔ وہ ست جگ کی بات تھی، ست جگہ کے ساتھ گئی۔ اب تو اپنا نباہ برادری کے ساتھ مل کر رہنے میں ہے، مگر کروں کیا کوئی لڑکی والا آتا ہی نہیں۔ تم سے بھی کہا اوروں سے بھی کہا، پر جب کوئی نہیں سنتا تو کیا میں لڑکی بناؤں؟''

جھنگری سنگھ نے ڈانٹا۔ ''جھوٹ مت بولو پنڈت! میں دو آدمیوں کو پھانسی کر لایا، پر تم منہ پھیلانے لگے تو دونوں کان کھڑے کر کے نکل بھاگے۔ آخر کس برتے پر ہجار (ہزار) پانچ سو مانگتے ہو تم؟ دس بیگھے اور بھیک کے سوا تمہارے پاس اور کیا ہے؟''

داتا دین کے گھمنڈ کو چوٹ لگی۔ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ ''میرے پاس کچھ نہ سہی، میں ہی بھیک مانگتا ہوں، پر میں نے اپنی لڑکیوں کے بیاہ میں پانچ پانچ سو دیئے ہیں۔ پھر لڑکے کے لیے سو کیوں نہ مانگتا؟ کسی نے سینت میں میری لڑکی بیاہ لی ہوتی تو میں بھی سینت میں اپنا لڑکا بیاہ لیتا۔ رہی حیثیت کی بات، تو تم ججمانی کو بھیک سمجھو، پر میں تو اسے جمیندا ری سمجھتا ہوں، بینک گھر! جمیندا ری مٹ جائے، بینک گھر ٹوٹ جائے، پر ججمانی تو انت (آخر) تک ہی رہے گی۔ جب تک ہندو جات رہے گی، تب تک باہمن بھی رہیں گے اور ججمانیہ بھی رہے گی۔ سہا لگ میں آرام سے گھر بیٹھے سو دو سو پھٹکا رلیتے ہیں۔ کبھی بھاگ لڑ گیا تو چار

پانچ سو مار لیے۔ کپڑے برتن، کھنا اوپر سے۔ کہیں نہ کہیں سے نت ہی کام بنا رہتا ہے۔ کچھ نہ ملے تب بھی ایک دو تھال اور دو چار آنے دکھنا کے مل جاتے ہیں۔ ایسا چین نہ جمینداری میں ہے، نہ ساہوکاری میں اور پھر میرا تو سلیا سے جتنا کام نکلتا ہے، اتنا باہمن کی کنیا سے کیا ہوگا۔ وہ تو بہو بنی بیٹھی رہے گی، بہت ہوگا تو روٹی بنا دے گی۔ یہاں سلیا اکیلی تین آدمیوں کا کام کرتی ہے اور میں اسے روٹی کے سوا اور کیا دیتا ہوں؟ بہت ہوا تو سال میں ایک دھوتی دے دی۔''

دوسرے پیڑ کے نیچے داتا دین کانجی ''پیرا'' (اناج مانڈنے کی جگہ) تھا۔ چار بیلوں سے منڈائی ہو رہی تھی۔ دھنا چمار بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ سلیا پیرے سے اناج نکال کر اسا رہی تھی اور ماتا دین دوسری طرف بیٹھا ہوا اپنی لاٹھی پر تیل مل رہا تھا۔

سلیا سانولی، سلونی اور چھریری لڑکی تھی جو شکیل نہ ہونے پر بھی دلکش تھی۔ اس کی ہنسی میں، چتون میں، اس کی حرکتوں میں مسرت کا جنون تھا، جس سے اس کا عضو عضو ناچتا رہتا تھا۔ سر سے پیر تک بھس کے ذروں سے آلودہ، پسینے سے تر، سر کے بال آدھے کھلے، دوڑ دوڑ کر اناج اسا رہی تھی، گویا دل و جان سے کسی کھیل میں مصروف تھی۔

ماتا دین نے کہا۔ ''آج سانجھ تک اناج باکی (باقی) نہ رہے، سلیا تو تھک گئی ہو تو میں آؤں۔''

سلیا خوش ہو کر بولی۔ ''تم کاہے کو آؤ گے پنڈت، میں سانجھ تک سب اسا ڈالوں گی۔''

''اچھا تو میں اناج ڈھوڈھو کر رکھ آؤں تو اکیلی کیا کیا کرلے گی؟'

''تو تم گھبراتے کیوں ہو؟ میں اسا بھی دوں گی اور ڈھو کر رکھ بھی آؤں گی، پہر رات تک یہاں ایک دانہ بھی نہ رہے گا۔'

دلاری آج اپنی یافتنی وصول کر رہی تھی۔ سلیا اس کی دکان سے ہولی کے دن دو پیسے کا گلابی رنگ لائی تھی اور ابھی تک پیسے نہ دیئے تھے۔ وہ سلیا کے پاس جا کر بولی۔ ''کیوں ری سلیا! مہینہ بھر رنگ لائے ہو گیا اور ابھی تک پیسے نہیں دیئے۔ مانگتی ہوں تو مٹک کر چلی جاتی ہے۔ آج میں بنا پیسے لیے نہ جاؤں گی۔''

ماتا دین چپکے سے کھسک گیا۔ سلیا کا سب کچھ لے کر بھی وہ بدلے میں کچھ نہ دینا چاہتا تھا۔ سلیا اب اس نگاہ میں صرف کام کرنے کی مشین تھی اور انہیں اس کی محبت کو وہ بڑی چالاکی سے نچاتا رہتا تھا۔

سلیا نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ ماتا دین وہاں نہ تھا۔ بولی ''چلاؤ مت سیٹھانی! یہ لے لو دو کی جگہ چار پیسے کا اناج۔ اب کیا جان لو گی؟ میں مری تھوڑے ہی جاتی تھی۔''

اس نے انداز سے کوئی سیر بھر اناج ڈھیر سے نکال کر سیٹھانی کے پھیلے ہوئے آنچل میں ڈال دیا۔ اسی وقت ماتا دین پیڑ کی آڑ سے جھلایا ہوا نکلا اور دلاری کا آنچل پکڑ کر بولا۔ ''اناج سیدھے سے رکھ دو سیٹھانی، لوٹ نہیں ہے۔''

پھر اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے سلیا کو دیکھ کر ڈانٹا۔ ''تو نے اناج کیوں دیا؟ کس سے پوچھ کر دیا؟ تو کون ہوتی ہے میرا اناج دینے والی؟''

سیٹھانی نے اناج ڈھیر میں ڈال دیا اور سلیا متحیر ہو کر ماتا دین کا منہ تاکنے لگی۔

ایسا معلوم ہوا کہ جس ڈال پر وہ بے فکری سے بیٹھی ہوئی تھی، وہ ٹوٹ گئی ہے اور اب وہ بلا سہارے کے نیچے گری جا رہی ہے۔ کھسیائے ہوئے منہ سے آنسو بھر کر دلاری سے بولی۔ ''تمہارے پیسے میں پھر دے دوں گی سیٹھانی جی۔ آج مجھ پر دیا کرو۔''

سیٹھانی نے اسے رحم کی نگاہوں سے دیکھا اور ماتا دین کو ملامت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ تب سلیا نے اناج اساتے ہوئے چوٹ کھائے ہوئے گھمنڈ سے پوچھا۔ ''تمہارے چیج (چیز) پر میرا کچھ اکھتیار (اختیار) نہیں ہے؟''

ماتا دین آنکھیں نکال کر بولا۔ ''نہیں م تیرا کوئی اکھتیار نہیں ہے، کام کرتی ہے کھاتی ہے، جو تو چاہے کھا بھی اور لٹا بھی، تو یہ نہ ہوگا۔ اگر تجھے یہاں پرتہ نہ پڑتا ہو تو کہیں اور جا کے کام کر۔ مجوری کی کمی نہیں ہے۔ سینت میں کام نہیں لیتے، کھانا کپڑا دیتے ہیں۔''

سلیا نے اس چڑیا کی طرح جسے مالکن نے پر کاٹ کر پنجرے سے نکال دیا ہو، ماتا دین کی طرف دیکھا۔ اس کی چتون میں درد زیادہ تھا یا شکوہ، یہ کہنا مشکل ہے۔ مگر اسی چڑیا کی طرح اس کا دل پھڑ پھڑا رہا تھا اور اونچی ڈال پر اس آزاد فضا میں اڑنے کی سکت نہ پا کر اسی پنجرے میں جا بیٹھنا چاہتا تھا، خواہ اسے بے آب و دانہ رہ کر پنجرے کی تیلیوں سے سر ٹکراتے ہوئے مرہی کیوں نہ جانا پڑے۔ سلیا سوچ رہی تھی کہ اب اس کے لیے دوسری کونسی جگہ ہے۔ وہ بیاہتا (منکوحہ) نہ ہو کر بھی فطرتاً اور عملاً بیاہتا تھی اور اب ماتا دین چاہے اسے مارے یا کاٹے، اسے دوسرا سہارا نہیں ہے۔ اسے وہ دن یاد آئے اور ابھی دو سال بھی تو نہیں ہوئے جب یہی

ماتا دین اس کے تلوے چاٹتا تھا۔ جب اس نے جنیئو ہاتھ میں لے کر کہا تھا۔ ''سلیا جب تک دم میں دم ہے، تجھے بیاہتا کی طرح رکھوں گا۔'' جب وہ بے قرار ہو کر جنگل اور باغ میں اور ندی کے کنارے اس کے پیچھے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرا کرتا تھا، اور آج اس کا یہ بے دردانہ سلوک! مٹھی بھر اناج کے لیے اس کا پانی اتار لیا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ حلق میں نمک کی ایک ڈلی سی محسوس ہوئی، زخمی دل اور سست ہاتھوں سے پھر کام کرنے لگی۔

اسی وقت اس کے ماں باپ، دونوں بھائی اور کئی چماروں نے نہ جانے کدھر سے آ کر ماتا دین کو گھیر لیا۔ سلیا کی ماں نے آتے ہی اس کے ہاتھ سے اناج کی ٹوکری چھین کر پھینک دی اور گالی دے کر بولی۔ ''رانڈ جب تجھے مجوری یہ کرنی تھی تو گھر کی مجوری چھوڑ کر یہاں کیوں مرنے آئی؟ جب باہمن کے ساتھ رہتی ہے تو باہمن کی طرح رہ۔ ساری برادری کی ناک کتوا کر بھی چمارن بننا تھا تو یہاں کیا گھی کا لونڈا لینے آئی تھی؟ چلو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرتی۔''

جھنگری سنگھ اور ماتا دین دونوں دوڑے اور چماروں کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جھنگری نے سلیا کے باپ سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے چودھری؟ کس بات کا جھگڑا ہے۔''

سلیا کا باپ ہرکھو ساٹھ سال کا بوڑھا تھا۔ کالا، دبلا اور سوکھی مرچ کی طرح پچکا ہوا، مگر اتنا تلخ و تیز! بولا ''جھگڑا کچھ نہیں ہے ٹھاکر، ہم آج یا تو ماتا دین کو چمار بنا کر چھوڑیں گے یا ان کا اور اپنا رکت (خون) ایک کر دیں گے۔ سلیا کنیا جات ہے،

کسی نہ کسی کے گھر تو جائے گی ہی، اس پر ہمیں کچھ نہیں کہنا۔ پر اسے جو کوئی بھی رکھے وہ ہمارا ہو کر رہے تم ہمیں باہمن نہیں بنا سکتے مدا (مگر) ہم تمہیں چمار بنا سکتے ہیں۔ ہمیں باہمن بنا دو، ہماری برادری بننے کو تیار ہے۔ جب یہ سامرتھ (سکت) نہیں تو تم بھی چمار بنو، ہمارے ساتھ کھاؤ پیو، ہمارے ساتھ اٹھو بیٹھو، ہماری اجت (عزت) لیتے ہو تو اپنا دھرم ہمیں دو۔''

داتا دین نے لاٹھی گھما کر کہا۔ ''منہ سنبھال کر باتیں کر ہرکھوا! تیری لڑکی وہ کھڑی ہے، لے جا، جہاں چاہے۔ ہم نے اسے باندھ کر نہیں رکھا ہے۔ کام کرتی تھی۔ مجوری لیتی تھی۔ یہاں مجوروں کی کمی نہیں ہے۔''

سلیا کی ماں انگلی مٹکا کر بولی۔ ''واہ واہ پنڈت! اچھا نیاؤ کرتے ہو۔ تمہاری لڑکی کسی چمار کے ساتھ نکل گئی ہوتی اور تم اس طرح کی کرتے تو دیکھتی۔ ہم چمار ہیں، اس لیے ہماری کوئی اجت نہیں۔ ہم سلیا کو اکیلی نہ لے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ماتا دین کو بھی لے جائیں گے جس نے اس کی اجت بگاڑی ہے۔ تم بڑے نیم دھرمی ہو۔ اس کے ساتھ سوؤ گے، پر اس کے ہاتھ کا پانی نہ پیو گے۔ وہی چڑیل ہے کہ یہ سب سہتی ہے۔ میں تو ایسے آدمی کو سنکھیا دے دیتی۔''

ہرکھو نے اپنے ساتھیوں کو للکارا۔ ''سن لی ان لوگوں کی بات کہ نہیں؟ اب کھڑے منہ تا کتے ہو۔''

اتنا سننا تھا کہ دو چماروں نے لپک کر ماتا دین کے ہاتھ پکڑے اور تیسرے نے جھپٹ کر اس کا جنیو توڑ ڈالا اور اس سے قبل کہ داتا دین کچھ کرتا، اس کے منہ میں ایک بڑی ہڈی کا ٹکڑا ڈال دیا۔ ماتا دین نے دانت جکڑ لیے پھر بھی وہ گھن کی

چیز اس کے ہونٹوں میں تو لگ ہی گئی۔ انہیں متلی ہوئی اور منہ خود بخود کھل گیا اور ہڈل حلق تک جا پہنچی۔ اتنے میں کھلیان کے سب آدمی جمع ہو گئے مگر تعجب تو یہ ہے کہ کوئی ان دھرم کے لٹیروں سے مزاحم نہ ہوا۔ ماتا دین کا برتاؤ سبھی کو ناپسند تھا۔ وہ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو تاکا کرتا تھا۔ پس دل میں سبھی اس کی درگت پر خوش تھے۔ ہاں ظاہراً لوگ چماروں پر رعب جما رہے تھے۔

ہوری نے کہا۔ ''اچھا اب بہت ہوا ہرکھوا! بھلا چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔''

ہرکھو نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ''تمہارے گھر میں بھی لڑکیاں ہیں ہوری مہتو! اتنا سمجھ لو۔ اس طرح گاؤں کی مریادہ بگڑنے لگی تو کسی کی آبرو نہ بچے گی۔''

ایک لمحے میں دشمن پر پوری فتح پا کر حملہ آوروں نے وہاں سے ٹل جانا یہ مناسب سمجھا۔ لوگوں کی رائے بدلتے دیر نہیں لگتی، اس سے بچے رہنا ہی اچھا ہے۔ ماتا دین قے کر رہا تھا۔ داتا دین نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا ''ایک ایک کو پانچ پانچ سال کے لیے بڑے گھر نہ بھجوایا تو کہنا۔ پانچ پانچ سال تک چکی پسواؤں گا۔''

ہرکھو نے نے ہیکڑی سے جواب دیا۔ ''اس کا یہاں کوئی گم (غم) نہیں ہے۔ کون تمہاری طرح بیٹھے موج کرتے ہیں؟ جہاں کام کریں گے، وہیں آدھا پیٹ دانہ مل جائے گا۔''

ماتا دین قے کر چکنے کے بعد مردہ سا زمین پر پڑ رہا، گویا کمر ٹوٹ گئی ہو، گویا ڈوب مرنے کے لیے چلو بھر پانی کی تلاش میں ہو۔ جس عزت کے بل بوتے پر

اس کی رنگین مزاجی اور رعونت اور مردیت اکڑتی پھرتی تھی، وہ مٹ چکی تھی۔

اس ہڈی کے ٹکڑے نے صرف اس کے منہ کو نہیں، بلکہ اس کی روح کو بھی ناپاک کر دیا تھا۔ اس کا دھرم اسی کھانے پینے اور چھوت اچھوت کے سمجھنے پر قائم تھا۔ آج اس دھرم کی جڑ کٹ گئی۔ اب وہ لاکھ پرائسچت (کفارہ) کرے، لاکھ گوبر کھائے اور گنگا جل پیے، لاکھ دان پن اور تیرتھ برت کرے، اس کا مرا ہوا دھرم جی نہیں سکتا۔ اگر تنہائی کی بات ہوتی تو چھپالی جاتی مگر یہاں تو سب کے سامنے اس کا دھرم لٹا۔ اب اس کا سر ہمیشہ کے لیے نیچا ہو گیا۔ کیا آج سے وہ اپنے ہی گھر میں اچھوت سمجھا جائے گا۔ اس کی ماتا بھری ماں بھی اس سے گھن کرے گی اور سنسار سے دھرم ایسا اٹھ گیا کہ اتنے آدمی کھڑے سبھی تماشا دیکھتے رہے، کسی نے چوں تک نہ کی۔ ایک لمحہ پہلے جو لوگ اسے دیکھتے ہی پالاگن کرتے تھے، اب اسے دیکھ کر منہ پھیر لیں گے۔ وہ کسی مندر میں بھی نہ جا سکے گا، نہ کسی کے برتن چھو سکے گا اور یہ سب اس ابھاگی سلیا کے کارن۔

سلیا جہاں اناج اسار رہی تھی، وہیں سر جھکائے کھڑی تھی، جیسے یہ اسی کی درگت ہو رہی ہو۔ یکایک اس کی ماں نے آ کر ڈانٹا۔ ''کھڑی تاکتی کیا ہے؟ چل سیدھے گھر، نہیں تو بوٹی بوٹی کاٹ ڈالوں گی۔ باپ دادا کا نام تو کھوب (خوب) اجاگر کر چکی، اب اور کیا کرنے پر لگی ہے؟''

سلیا بت بنیہ کھڑی رہی۔ ماں باپ اور بھائیوں پر اسے غصہ آ رہا تھا۔ یہ لوگ کیوں اس کے بیچ میں بولتے ہیں؟ وہ جیسے چاہتی ہے رہتی ہے، دوسروں سے کیا مطلب؟ کہتے ہیں کہ تیری یہاں ہتک ہوتی ہے، تب کیا کوئی باہمن اس کا پکایا

کھائے گا یا اس کے ہاتھ کا پانی پی لے گا؟ ابھی ذرا دیر پہلے اس کا دل ماتا دین کے برتاؤ سے بے زار ہو رہا تھا، مگر اپنے گھر والوں اور برادری کی اس زیادتی نے اس نفرت کو گہری رغبت میں تبدیل کر دیا۔ احتجاج کے لہجے میں بولی۔ ''میں کہیں نہ جاؤں گی۔ تو کیا یہاں بھی مجھے جینے نہ دے گی؟''

بڑھیا نے کڑی آواز میں کہا۔ ''تو نہ چلے گی؟''

''نہیں۔''

''چل سیدھے سے۔''

''نہیں جاتی۔''

فوراً دونوں بھائیوں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور اسے گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ سلیا زمین پر بیٹھ گئی۔ بھائیوں نے اس پر بھی نہ چھوڑا، گھسیٹتے ہی رہے۔ اس کی ساڑھی پھٹ گئی۔ پیٹھ اور کمر کی کھال چھل گئی، پھر بھی وہ جانے پر راضی نہ ہوئی۔

تب ہرکھو نے لڑکوں سے کہا۔ ''اچھا اب اسے چھوڑ دو، سمجھ لیں گے کہ مر گئی۔ مگر اب جو کبھی میرے دوارے پر آئی تو لوہو (لہو) پی جاؤں گا۔''

سلیا جان پر کھیل کر بولی۔ ''ہاں جب تمہارے دوارے پر جاؤں تو پی لینا۔''

بڑھیا نے غصے کے جنون میں سلیا کو کئی لاتیں جمائیں اور ہرکھو نے اسے ہٹا نہ دیا ہوتا تو شاید جان ہی لے کر چھوڑتی۔

بڑھیا پھر جھپٹی تو ہرکھو نے اسے دھکے دے کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تو بڑی ہتیارنی ہے کلیا! کیا اسے مار ہی ڈالے گی؟''

سلیا باپ کے پیروں سے لپٹ کر بولی۔ ''مار ڈالو دادا! سب لوگ مل کر مار ڈالو۔ ہائے اماں، تم اتنی بے درد ہو، اسی لیے دودھ پلا کر پالا تھا؟ پیدا ہوتے ہی کیوں نہ گلا گھونٹ دیا؟ ہاں میرے پیچھے پنڈت کو بھی تم نے بھرشٹ کر دیا۔ اس کا دھرم لے کر تمہیں کیا ملا؟ اب تو وہ نہ پوچھے یا نہ پوچھے، رہوں گی تو اسی کے ساتھ۔ وہ مجھے چاہے بھوکوں رکھے، چاہے مار ڈالے، پر اس کا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ ان کی اتنی درگت کرا کے کیسے چھوڑوں؟ مر جاؤں گی، پر ہرجائی نہ بنوں گی۔ ایک بار جس نے بانہہ پکڑ لی، اسی کی رہوں گی۔''

کلیا نے ہونٹ طبا کر کہا۔ ''جانے دو رانڈ کو۔ سمجھتی ہے کہ وہ اس کا نباہ کرے گا مگر آج ہی مار کر بھگا نہ دے تو منہ نہ دکھاؤں۔''

بھائیوں کو بھی رحم آ گیا۔ سلیا کو وہیں چھوڑ کر سب کے سب چلے گئے۔ تب وہ آہستہ سے اٹھ کر لنگڑاتی اور کراہتی ہوئی کھلیان میں جا کر بیٹھ گئی اور آنچل سے منہ ڈھانک کر رونے لگی۔

داتا دین نے جلا ہے کا غصہ داڑھی پر اتارا۔ ''ان کے ساتھ چلی کیوں میں گئی سلیا؟ اب کیا کرنے رکی ہوئی ہے؟ میرا ستیاناس کرا کے بھی پیٹ نہیں بھرا؟''

سلیا نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں، ان میں نور کی جھلک تھی، بولی۔ ''ان کے ساتھ کیوں جاؤں؟ جس نے بانہہ پکڑی ہے، اسی کے ساتھ رہوں گی۔''

پنڈت جی نے دھمکایا۔ ''میرے گھر میں پاؤں رکھا تو لاتوں سے بات کروں گا۔''

سلیا نے بھی گستاخانہ کہا۔ ''مجھے جہاں وہ رکھیں گے، رہوں گی۔ پیڑ تلے رکھیں، چاہے محل میں رکھیں۔''

ماتا دین بدحواس سا بیٹھا رہا۔ دوپہر ہونے کو تھی۔ دھوپ پتیوں سے چھن چھن کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ماتھے سے پسینہ ٹپک رہا تھا، مگر وہ خاموش بلا حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

دفعتاً جیسے اس نے ہوش میں آ کر کہا۔ ''میرے لیے اب کیا کہتے ہو دادا؟''

داتا دین نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے لیے ابھی میں کیا کہوں بیٹا؟'' چل کر نہاؤ، کھاؤ پھر پنڈتوں کی جیسی رائے ہوگی کیا جائے گا۔ ہاں ایک بات ہے، سلیا کو اب چھوڑنا پڑے گا۔

ماتا دین نے سلیا کی خون بھری آنکھوں کو دیکھا۔ ''میں اب کبھی اس کا منہ نہ دیکھوں گا مگر پرائشچت ہو جانے پر پھر تو کوئی دوکھ نہ رہے گا؟''

''پرائشچت ہو جانے پر کوئی دوکھ پاپ نہیں رہتا۔''

''تو آج ہی پنڈتوں کے پاس جاؤ۔''

''آج ہی جاؤں گا بیٹا!''

''مگر پنڈت کہیں کہ اس کا پرائشچت نہیں ہو سکتا تب؟''

''وہ جو کچھ کہیں۔''

''تو تم مجھے گھر سے نکال دو گے؟''

داتا دین نے پدرانہ محبت سے بے قرار ہو کر کہا۔ ''ایسا کہیں ہو سکتا ہے بیٹا؟ دھن جائے، دھرم جائے مریادا جائے، پر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔''

ماتا دین نے لاٹھی اٹھائی اور باپ کے پیچھے پیچھے گھر چلا۔ سلیا بھی اٹھی اور لنگڑاتی ہوئی اس کے پیچھے ہولی۔

ماتا دین نے پیچھے پھر کر بے دردی سے کہا ''میرے ساتھ مت آ۔ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ اتنی درگت کروا کے بھی تیرا پیٹ نہیں بھرا؟''

سلیا نے گستاخانہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''واسطہ کیسے نہیں ہے؟ اس گاؤں میں تم سے سندر، تم سے اجت دار لوگ ہیں، میں ان کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑتی؟ تمہاری یہ درگت ہی آج کیوں ہوئی؟ جو رسی تمہارے گلے میں پڑ گئی ہے اسے تم لاکھ چاہو، پر توڑ نہیں سکتے اور نہ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں جاؤں گی۔ مجوری کروں گی، بھیک مانگوں گی، پر تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے ماتا دین کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر کھلیان میں جا کر اناج اسانے لگی۔ ہوری ابھی تک وہاں غلہ مانڈ رہا تھا۔ دھنیا اسے کھانا کھلانے کو بلانے آئی تھی۔ ہوری نے بیلوں کو پیرے سے باہر نکالا کر ایک درخت سے باندھ دیا اور سلیا سے بولا ''تو بھی جا، کھا پی آ سلیا۔ دھنیا یہاں بیٹھی ہے۔ تیری پیٹھ پر کی ساڑھی تو لہو سے رنگ گئی ہے رے! کہیں گھاؤ پک نہ جائے۔ تیرے گھر والے بڑے کسائی (قصائی) ہیں۔''

سلیا نے ان کی طرف غمگین آنکھوں سے دیکھا۔ ''یہاں کسائی کون نہیں ہے دادا؟ میں نے تو کسی کو دیا وان نہیں پایا۔''

''کیا کہا پنڈت نے؟''

''کہتے ہیں کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔''

''اچھا ایسا کہتے ہیں۔''

''سمجھتے ہوں گے کہ اس طرح اپنے منہ کی لالی رکھ لیں گے، پر جس بات کو دنیا جانتی ہے، اسے کیسے چھپا لیں گے؟''

''میری روٹیاں بھاری ہیں تو نہ دیں میرے لیے کیا؟ مجوری اب بھی کرتی ہوں، تب بھی کروں گی۔ سونے کو ہاتھ بھر جگہ تم ہی سے مانگوں گی، تو کیا تم نہ دو گے؟''

دھنیا ترس کھا کر بولی۔ ''جگہ کی کیا کمی ہے بیٹی؟ تو چلی میرے گھر رہ!''

ہوری نے آزردگی سے کہا۔ ''بلاتی تو ہے مگر پنڈت کو جانتی نہیں؟''

دھنیا نے بے خوفی سے کہا۔ ''بگڑیں گے تو ایک روٹی بیسی کھا لیں گے اور کیا کریں گے؟ کوئی ان کی دبیل ہوں؟ اس کی آبرو لی، برادری سے نکلوایا اور اب کہتے ہیں کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ آدمی ہے کہ کسائی؟ یہ اسی نیت کا آج پھل ملا ہے۔ پہلے نہیں سوچ لیا تھا۔ تب تو موج اڑاتے رہے۔ اب کہتے ہیں کہ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔''

ہوری کے خیال سے دھنیا غلطی کر رہی تھی۔ ''سلیا کے گھر والوں نے متئی کو کتنا بے دھرم کر دیا۔ یہ کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ سلیا کو چاہے مار کے لے جاتے، چاہے دلار کر کے لے جاتے، وہ ان کی لڑکی ہے۔ متئی کو کیوں بے دھرم کیا؟''

دھنیا نے ڈانٹ بتائی۔ ''اچھا رہنے دو، بڑے نیائی بنے ہو! مرد سب ایک ہوتے ہیں۔ اس کو متئی نے بھرشٹ کیا، تب تو کسی کو برا نہ لگا اور اب جو متئی بے دھرم ہو گئے تو کیوں برا لگتا ہے؟ کیا سلیا کا دھرم دھرم نہیں؟ رکھنے کو تو چمارن، اس

پر بڑے نیم دھرم والے بنتے ہیں! بڑا اچھا کیا ہرکھو چودھری نے ایسے گنڈوں کی یہی دوا ہے۔ تو چل سلیا میرے گھر، نہ جانے کیسے بے درد ماں باپ ہیں کہ بے چاری کی ساری پیٹھ لہولہان کر دی۔ تم جا کے سونا کو بھیج دو، میں اسے لے کر آتی ہوں۔''

ہوری گھر چلا اور سلیا دھنیا کے پیروں پر گر کر رونے لگی۔

(24)

سونا سترھویں سال میں تھی اور اس سال اس کا بیاہ کرنا ضروری تھا۔ ہوری تو دو سال سے اسی فکر میں تھا، مگر ہاتھ خالی ہونے سے کوئی قابو نہ چلتا تھا مگر اس سال جیسے بھی ہو، اس کا بیاہ کر ہی دینا چاہیے چاہے قرض لینا پڑے، چاہے کھیت رہن رکھنے پڑیں۔ اور تنہا ہوری کی بات چلتی تو دو سال پہلے ہی بیاہ ہو گیا ہوتا۔ وہ کفایت سے کام کرنا چاہتا تھا دھنیا کہتی تھی کہ چاہے کتنا ہی ہاتھ باندھ کر کھرچ کرو، دو ڈھائی سو تو لگ ہی جائیں گے۔ جھنیا کے آجانے سے برادری میں ان لوگوں کا درجہ کچھ گر گیا تھا اور سو دو سو دیئے بغیر کوئی اچھا لڑکا نہ مل سکتا تھا۔ پچھلے سال چیت کی فصل میں کچھ نہ ملا تھا، تو پنڈت داتا دین سے آدھے کا ساجھا، مگر پنڈت جی نے بیج اور مزدوری کی کچھ ایسی تفصیل بتائی کہ ہوری کے ہاتھ ایک چوتھائی سے زیادہ اناج نہ لگا اور لگان دینا پڑ گیا پورا۔ اکھ اور سن کی فصل برباد ہو گئی۔ سن تو بارش زیادہ ہونے اور اکھ دیمک لگ جانے سے۔ ہاں اس سال کی وہی فصل اچھی تھی اور اکھ بھی خوب لگی ہوئی تھی۔ بیاہ کے لیے اناج تو موجود تھا، دو سو روپے بھی ہاتھ آجائیں تو وہ لڑکی کے فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ اگر گوبر

سو روپے کی مدد کرے تو بقیہ سو روپے ہوری کو آسانی سے مل جائیں گے۔ جھنگری اور منگرو ساہ دونوں ہی اب کچھ نرم پڑ گئے تھے۔ جب گوبر پردیس کما رہا ہے تو ان کے روپے مارے نہ پڑ سکتے تھے۔

ایک دن ہوری نے گوبر کے پاس دو تین دن کے لیے جانے کی تجویز کی مگر دھنیا ابھی تک گوبر کے وہ سخت الفاظ نہ بھولی تھی۔ وہ گوبر سے ایک پیسہ بھی نہ لینا چاہتی تھی، کسی طرح نہیں! ہوری نے جھنجلا کر کہا۔ ''پر کام کیسے چلے گا۔''

دھنیا سر ہلا کر بولی۔ ''مان لو کہ گوبر پردیس نہ گیا ہوتا تب تم کیا کرتے، وہی اب کرو۔''

ہوری کی زبان بند ہو گئی، لمحہ بھر بعد بولا۔ ''میں تو تجھ سے پوچھتا ہوں۔''

دھنیا نے جان بچائی۔ ''یہ سوچنا مردوں کا کام ہے۔''

ہوری کے پاس جواب تیار تھا۔ ''مان لے کہ میں نہ ہوتا اور تو ہی اکیلی ہوتی، تب تو کیا کرتی؟ وہی کر۔''

دھنیا نے حقارت سے دیکھا۔ ''تب میں کسا کنیا بھی دے دیتی تو کوئی ہنسنے والا نہ تھا۔''

ایسا تو ہوری بھی کر سکتا تھا۔ اسی میں اس کی خیر بھی تھی، مگر گھر کی مریادا کیسے چھوڑ دے؟ اس کی بہنوں کے بیاہ میں تین تین سو براتی دروازے پر آئے تھے۔ جہیز بھی اچھا دیا گیا تھا۔ ناچ، تماشا، باجے گاجے، ہاتھی گھوڑے، سبھی تھے۔ آج بھی برادری میں اس کا نام ہے۔ دس گاؤں کے لوگوں سے اس کا میل جول ہے۔ کسا کنیا دے کر وہ کسے منہ دکھائے گا؟ اس سے تو مرنا اچھا ہے اور وہ کیسے کسا کنیا

دے؟ درخت ہیں، زمین زمین ہے اور کچھ ساکھ بھی ہے، اگر وہ ایک بیگھا میں بیچ دے تو دو سو مل جائیں، مگر کسان کے لیے زمین جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، خاندانی وقار سے بھی زیادہ عزیز ہے! اور کل تین ہی بیگھے اس کے پاس ہیں اگر ایک بیگھا بیچ دے تو کھیتی کیسے کرے گا؟

اسی حیص بیص میں کئی دن گزر گئے اور ہوری کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

دسہرہ کی چھٹیوں کے دن تھے۔ جھنگری، پٹیشوری اور نوکھے رام تینوں کے لڑکے تعطیل میں گھر آئے تھے۔ تینوں انگریزی پڑھتے تھے اور اگرچہ تینوں بیس بیس برس کے ہو گئے تھے مگر ابھی تک یونیورسٹی میں جانے کا نام نہ لیتے تھے۔ ایک ایک درجے میں دو دو تین سال پڑے رہتے۔ تینوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

پٹیشوری کے سپوت بندیشوری تو ایک لڑکے کے باپ بھی ہو چکے تھے۔ تینوں دن بھر تاش کھیلتے، بھنگ پیتے اور چھیلا بنے گھومتے پھرتے تھے اور دن میں کئی کئی بار ہوری کے دروازے کی طرف تاکتے ہوئے نکلتے اور کچھ ایسا اتفاق تھا جس وقت وہ نکلتے، اس وقت سونا بھی کسی نہ کسی کام سے دروازے پر آ کھڑی ہوتی۔ ان دنوں وہ وہی ساڑھی پہنتی تھی جو گوبر اس کے لیے لایا۔ یہ سب تماشا دیکھ دیکھ کر ہوری کا خون خشک ہوا جاتا تھا گویا اس کی کھیتی چوپٹ کرنے کے لیے آسمان پر اولے اولے زرد بادل اٹھے چلے آتے ہوں۔

ایک دن تینوں اسی کنویں پر نہانے جا پہنچے، جہاں ہوری اکھ سینچنے کے لیے پر چلا رہا تھا۔ سونا پر لے رہی تھی۔ ہوری کا خون آج کھول اٹھا۔

اسی شام کو دلاری کے پاس گیا۔ سوچا کہ عورتوں میں رحم ہوتا ہے، شاید اس کا

دل پسیج جائے اور کم سود پر روپیہ دے دے مگر دلاری اپنا رونا لے بیٹھی۔ گاؤں میں ایسا کوئی مرد نہ تھا جس پر اس کے کچھ روپے نہ آتے ہوں، حتیٰ کہ جھنگری سنگھ پر اس کے بیس روپے آتے تھے، لیکن کوئی دینے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بے چارا کہاں سے روپے لائے؟

ہوری نے گڑگڑا کر کہا۔ ''بھابھی، بڑا پاپ ہوگا۔ تم روپے نہ دوگی، یہ میرے گلے کی پھانسی کھول دوگی۔ جھنگی اور پٹیشوری میرے کھیتوں پر دانت لگائے ہوئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ باپ دادوں کی یہی نشانی ہے، یہ نکل گئی تو جاؤں گا کہاں؟ ایک سپوت وہ ہوتا ہے کہ گھر کی سمت (دولت) بڑھاتا ہے، میں ایسا کپوت ہو جاؤں کہ باپ دادوں کی کمائی پر جھاڑو پھیر دوں۔''

دلاری نے قسم کھائی ''ہوری! میں ٹھاکر جی کے چرن چھو کر کہتی ہوں کہ اس سمے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جس نے لیا وہ دیتا نہیں تو میں کیا کروں؟ تم اپنے ہی تو ہو، سونا بھی اپنی ہی لڑکی ہے، ہر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ تمہارا بھائی ہیرا ہے۔ بیل کے لیے پچاس روپے لیے، اس کا تو کہیں پتا ٹھکانا نہیں، اس کی گھر والی سے مانگو تو لڑنے کو تیار ہے۔ سوبھابھی دیکھنے میں بڑا سیدھا مگر پیسہ دینا نہیں جانتا اور اصل بات تو یہ ہے کہ کسی کے پاس ہے ہی نہیں، دے کہاں سے؟ سب کی دساد یکھتی ہوں، اسی مارے صبر کر جاتی ہوں۔ لوگ کس طرح پیٹ پال رہے ہیں اور کیا کھیتی باڑی بیچنے کی میں صلاح نہ دوں گی۔ کچھ نہیں ہے، مریادتو ہے۔''

پھر سرگوشی کرتی ہوئی بولی۔ ''پٹیشوری لالا کا لونڈا تمہارے کی طرپھ (طرف) بہت چکر لگایا کرتا ہے۔ تینوں کا وہی حال ہے۔ ان سے چوکنا رہنا۔ یہ شہر کہ

ہو گئے، گاؤں کا بھائی چارہ کیا سمجھیں؟ لڑکے گاؤں میں بھی ہیں مگر ان میں کچھ سرم ہے، کچھ ادب ہے اور کچھ ڈر ہے۔ یہ سب تو جھوٹے سانڈ ہیں۔ میری سلیا سسرال سے آئی تھی مگر میں نے ان سبوں کے ڈھنگ دیکھ کر اس کے سسر کو بلا کر بدا کر دیا۔ کوئی کہاں تک پہرا دے؟''

ہوری کو مسکراتا دیکھ کر اس نے میٹھے شکوے کے لہجے میں کہا۔ ''ہنسو گے ہوری، تو میں بھی کچھ کہہ دوں گی۔ تم کسی سے کم نٹ کھٹ تھے؟ دن میں پچاسوں بار کسی نہ کسی بہانے سے میری دکان پر آیا کرتے تھے، پر میں نے کبھی تا کا تک نہیں۔''

ہوری نے نرم احتجاج کے ساتھ کہا۔ ''یہ تو تم جھوٹ بولتی ہو بھابھی! میں بنا کچھ رس پائے تھوڑا ہی آتا تھا۔ چڑیا ایک بار پرچ جاتی ہے۔ تبھی دوسری بار آنگن میں آتی ہے۔''

''چل جھوٹے!''

''آنکھوں سے نہ تاکتی رہی ہو، پر تمہارا من تو تاکتا ہی تھا، بلکہ بلاتا تھا۔''

''اچھا رہنے دو، بڑے آئے تسی بن کے! تمہیں بار بار منڈرات دیکھ کے مجھے دیا آجاتی تھی، نہیں تم ایسے کوئی بانکے جوان نہ تھے۔''

حسینی ایک پیسے کا نمک لینے آ گیا اور یہ مذاق بند ہو گیا۔ حسینی نمک لے کر چلا گیا تو دلاری نے پھر کہا ''گوبر کے پاس کیوں نہیں جاتے؟ دیکھتے بھی آؤ گے اور سایت (شاید) کچھ مل بھی جائے۔''

ہوری مایوسی سے بولا۔ ''وہ کچھ نہ دے گا۔ لڑکے چار پیسے کمانے لگ جاتے ہیں تو آنکھ بدل جاتی ہے۔ میں تو بے حیائی کرنے کو تیار تھا، پر دھنیا نہیں مانتی۔

اس کے بنا کہے چلا جاؤں تو گھر میں رہنا دوبھر کر دے۔ اس کی سبھاؤ تو جانتی ہو۔''

دلاری نے طنزیہ کہا۔ ''تم تو مہریا کے جیسے گلام (غلام) ہو گئے۔''

''تم نے پوچھا ہی نہیں تو کیا کرتا؟''

''میری گلامی کرنے کہتے تو میں نے لکھ لیا ہوتا، سچ۔''

''تو اب سے کیا بگڑا ہے؟ لکھا لو نا! دوسو میں لکھتا ہوں، ان داموں مہنگا نہیں ہوں۔''

''تب دھنیا سے تو نہ بولو گے۔''

''نہیں، کہو کسم کھاؤ۔''

''اور جو بولے۔''

''تو میری جیبھ کاٹ لینا۔''

''اچھا تو جاؤ، لڑکا ٹھیک ٹھاک کرو، میں روپے دے دوں گی۔''

ہوری نے آنسو بہاتے ہوئے دلاری کے پیر پکڑ لیے۔ رقت سے زبان بند ہو گئی۔

سیٹھانی نے پاؤں کھینچ کر کہا۔ ''اب یہی شرارت تو مجھے اچھی نہیں لگی۔ میں سال بھر کے اندر اپنے روپے سود سمیت کان پکڑ کے لے لوں گی۔ تم تو بیوہار کے ایسے سچے نہیں ہو، دھنیا پر مجھے بسواس ہے۔ سنا کہ پنڈت تم سے بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسے گاؤن سے نکال کر نہ چھوڑا تو باہمن نہیں۔ تم سلیا کو نکال باہر کیوں نہیں کرتے؟ بیٹھے بٹھائے جھگڑا مول لے لیا۔''

''دھنیا اسے رکھے ہوئے ہے، میں کیا کروں؟''

''سنا ہے پنڈت کاسی گئے تھے۔وہاں ایک بڑا پنڈت ہے۔وہ پانچ سو مانگتا ہے۔تب پرائسچت کرے گا۔بھلا پوچھو ایسا اندھیر کہیں ہوا ہے۔جب دھرم چلا گیا تو ایک نہیں ہجار (ہزار) پرائسچت کرو تو کیا ہوتا ہے۔تمہارے ہاتھ کا چھوا پانی کوئی نہ پیئے گا، چاہے جتنا پرائسچت کرو۔''

ہوری یہاں سے گھر چلا تو اس کا دل اچھل رہا تھا۔زندگی میں ایسا سکھ دینے والا تجربہ اسے کبھی نہ تھا۔راستے میں سوبھا کے گھر گیا اور سگائی لے کر نیوتہ دے آیا۔پھر دونوں داتا دین کے پاس سگائی کی ساعت پوچھنے گئے۔وہاں آکر دروازے پر سگائی کی تیاریوں کا مشورہ کرنے لگے۔

دھنیا نے باہر نکل کر کہا ''پہر رات گئی، ابھی روٹی کھانے کی بیر انہیں آئی؟ کھا کر بیٹھو۔باتیں کرنے کو تو ساری رات پڑی ہے۔''

ہوری نے اس سے بھی مشورے میں شریک ہونے کا اصرار کرتے ہوئے کہا ''اسی سہا لگ میں لگن ٹھیک ہوئی ہے۔بتا کیا کیا سامان لانا چاہیے، مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔''

''جب کچھ معلوم ہی نہیں تو صلاح کرنے کیا بیٹھے ہو؟ کچھ روپے پیسے کا ٹھیک بھی ہوا ہے کہ من مٹھائی کھا رہے ہو؟''

ہوری نے شان سے کہا۔''تجھے اس سے کیا مطلب؟ تو اتنا بتا دے کہ کیا سامان لانا ہوگا؟''

''تو میں ایسی من کی مٹھائی نہیں کھاتی۔''

''تو اتنا بتا دے کہ ہماری بہنوں کے بیاہ میں کیا سامان آیا تھا۔''

''پہلے یہ بتا دو روپے مل گئے۔''

''ہاں مل گئے اور نہیں تو کیا بھنگ کھائی ہے۔''

''تو پہلے چل کر کھالو، پھر صلاح کریں گے۔''

مگر جب اس نے سنا کہ دلاری سے بات چیت ہوئی ہے تو ناک سکیڑ کر بولی۔ ''اس سے روپے لے کر آج تک کوئی ارن ہوا ہے؟ چڑیل کتنا کس کر سود لیتی ہے۔''

''لیکن کرتا کیا، دوسرا دیتا کون؟''

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ اسی بہانے دو گال ہنسنے بولنے گیا تھا؟ بوڑھے ہو گئے پر وہ بان نہ گئی۔''

''تو تو دھنیا بچوں کی سی باتیں کرنے لگتی ہے۔ میرے جیسے پھٹے حالوں سے وہ ہنسے بولے گی؟ سیدھے منہ بات تو کرتی نہیں۔''

''تم جیسوں کو چھوڑ کر اس کے پاس اور جائے ہی گا کون؟''

''اس کے دوارے پر اچھے اچھے ناک رگڑتے ہیں دھنیا! تو کیا جائے؟ اس کے پاس لچھمی ہے۔''

''اس نے تنک سی حامی بھر دی تو تم سب جگہ گاتے پھرنے لگے۔''

''حامی نہیں بھر دی، پکا وعدہ کیا ہے۔''

ہوری روٹی کھانے گیا اور سوبھا اپنے گھر چلا گیا تو سونا سلیا کے ساتھ باہر نکلی۔ وہ دروازے پر کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس کی سگائی کے لیے دو سو روپے دلاری سے ادھار لیے جا رہے ہیں، یہ بات اس کے پیٹ میں کھلبلی مچا رہی تھی

جیسے تازہ چونا پانی میں پڑ گیا ہے۔ دروازے پر ایک کپی جل رہی تھی جس سے طاق کے اوپر کی دیوار سیاہ ہوگئی تھی۔ دونوں بیل ناند میں سانی کھا رہے تھے اور ایک کتا زمین پر ٹکڑے کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ دونوں بیلوں کی چری کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

سونا بولی ''تو نے کچھ سنا؟ دادا سیٹھانی سے میری سگائی کے لیے دوسو روپے ادھار لے رہے ہیں۔''

سلیا گھر کا ذرا ذرا حال جانتی تھی۔ بولی۔ ''گھر میں پیسہ نہیں ہے تو کیا کریں۔''

سونا نے سامنے کے سیاہ درختوں کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسا بیاہ نہیں کرنا چاہتی جس میں ماں باپ کو ادھار لینا پڑے۔ کہاں سے دیں گے بے چارے؟ بتا! پہلے ہی رن کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، دوسو اور لیں گے تو بوجھ اور بھاری ہو جائے گا کہ نہیں؟''

''بنا دیئے لیے بڑے آدمیوں کا کہیں بیاہ ہوتا ہے پگلی؟ دیج (جہیز) کے بنا تو کوئی بوڑھا باڑھا ہی ملے گا۔ جائے گی بوڑھے کے ساتھ؟''

''بوڑھے کے ساتھ کیوں جاؤں؟ بھیا بوڑھے تھے جو جھنیا کو لے آئے؟ انہیں کس نے دیج میں کے پیسے دیئے تھے؟''

''اس میں باپ دادا کا نام ڈوبتا ہے۔''

''میں تو سناری والوں سے کہہ دوں گی کہ اگر تم نے ایک پیسہ بھی دیج لیا تو میں تم سے بیاہ نہ کروں گی۔''

سونا کا بیاہ سناری کے ایک مالدار کسان کے لڑکے سے طے ہوا تھا۔

''اور جو وہ کہہ دے کہ میں کیا کروں، تمہارے باپ دیتے ہیں اور میرے باپ لیتے ہیں، تو اس میں میرا کیا بس؟''

سونا نے جس ہتھیار کو بہت کارگر سمجھا تھا، اب معلوم ہوا کہ وہ بالکل نکما ہے۔ مایوس ہو کر بولی۔ ''میں ایک بار اس سے کہہ کر دیکھ لینا چاہتی ہوں۔ اگر اس نے کہہ دیا کہ میرا کوئی بس نہیں تو کیا گومتی یہاں سے بہت دور ہے؟ جا کر ڈوب مروں گی۔ ماں باپ نے مر مر کر پالا پوسا تو اس کا بدلہ کیا یہی ہے کہ ان کے گھر سے جانے لگوں تو انہیں کرجے (قرضے) سے اور لاد تی جاؤں؟ ماں باپ کو بھگوان نے دیا ہو تو پھر جتنا جی آوے لڑکی کو دیں، میں منع نہیں کرتی، لیکن جب وہ پیسے پیسے کو تنگ ہو رہے ہیں تو کنیا کا دھرم یہی ہے کہ ڈوب مرے۔ گھر کی جمین (زمین) جائے جات (جائیداد) تو بچ جائے گی، روٹی کا سہارا تو رہ جائے گا۔ ماں باپ چار دن میرے نام کو رو کر صبر کر لیں گے۔ یہ تو ہونا ہوگا کہ میرا بیاہ کر کے انہیں بجم بھر رونا پڑے۔ تین چار سال میں دو سو کے دو نے ہو جائیں گے۔ دادا کہاں سے لا کر دیں گے؟''

سلیا کو معلوم ہوا کہ جیسے اس کی آنکھوں میں نئی چمک آ گئی ہے۔ جوش میں سونا کو سینے سے لگا کر بولی۔ ''تو نے اتنا گیان کہاں سے سیکھ لیا سونا؟ دیکھنے میں تو بڑی بھولی بھالی ہے۔''

''اس میں گیان کی کون بات ہے؟ کیا میرے آنکھ نہیں ہے؟ کہ میں پاگل ہوں؟ دو سو میرے بیاہ میں لیں۔ تین سال میں دونا ہو جائے۔ تب روپا کی سگائی

میں دوسو اور لیں۔ جو کچھ کھیتی باڑی ہے سب لیلام (نیلام) ہو جائے اور دوارے دوارے بھیک مانگتے پھریں، یہی نا؟ اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ میں اپنی ہی جان دے دوں۔ تو منہ اندھیرے سناری چلی جانا اور اسے بلا لانا۔ مگر نہیں، بلانے کا کام نہیں ہے۔ مجھے اس سے بولتے لاج آئے گی۔ تو ہی میرا یہ سندیسہ کہہ دینا۔ دیکھیں کیا جواب ملتا ہے۔ کون دور ہے؟ ندی کے اس پار ہی تو ہے! کبھی کبھی ڈھور لے کر ادھر آجاتا ہے۔ ایک بار اس کی بھنس میرے کھیت میں گھس گئی تھی تو میں نے اسے بہت گالیاں دی تھیں۔ ہاتھ جوڑنے لگا۔ ہاں یہ تو بتا کہ ادھر متئی سے تیری بھینٹ ہوئی؟ سنا کہ باہمن انہیں برادری میں نہیں لے رہے ہیں۔''

سلیا نے حقارت سے کہا۔ ''برادری میں کیوں نہ لیں گے، تو بوڑھا روپیہ نہیں کھرچ (خرچ) کرنا چاہتا۔ اس کو پیسہ مل جائے تو جھوٹی گنگا اٹھا لے۔ لڑکا آج کل باہر کی دالان میں ٹکر لگاتا ہے۔''

''تو سے چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟ اپنی برادری میں کسی کے یہاں بیٹھ جا اور آرام سے رہ۔ وہ تیری ہتک تو نہ کرے گا۔''

''ہارے، کیوں نہیں۔ میرے پیچھے اس کی اتنی درگت ہوئی تو اب میں اسے چھوڑ دوں؟ اب وہ چاہے پنڈت بن جائے، چاہے دیوتا بن جائے، میرے لیے تو وہ متئی ہے جو میرے پیروں پر ماتھا رگڑا کرتا تھا اور باہمن بھی ہو جائے اور باہمنی سے بیاہ بھی کر لے تو بھی جتنی اس کی سیوا میں نے کی ہے، وہ کوئی باہمنی کیا کرے گی۔ ابھی مریاد کے موہ میں وہ چاہے مجھے چھوڑ دے، پر دیکھ لینا کہ پھر دوڑا آئے گا۔''

''آچکا اب! تجھے پائے تو کچا ہی کھا جائے۔''

''تو اسے بلانے ہی کون جاتا ہے؟ اپنا اپنا دھرم اپنے اپنے ساتھ ہے، وہ اپنا دھرم توڑ رہا ہے تو میں اپنا دھرم کیوں تڑوں؟''

بڑے سویرے سلیا ساری کی طرف چلی مگر ہوری نے روک لیا۔ دھنیا کے سر میں درد تھا۔ اس کی جگہ کیاریوں کو برنا تھا (کیاریوں میں پانی تقسیم کرنا) سلیا انکار نہ کر سکی۔ یہاں سے جب دوپہر کو چھٹی ملی تو وہ ساری جانے کدھر چل دیتی ہے۔ جیسے کسی کام میں من ہی نہیں لگتا۔ تو جانتی ہے سونا، کہاں گئی ہے؟

سونا حیلہ کیا ''مجھ تو کچھ معلوم نہیں۔ کہتی تھی کہ دھوبن کے گھر کپڑے لینے جانا ہے، وہیں چلی گئی ہوگی۔''

دھنیا نے چارپائی سے اٹھ کر کہا۔ ''چلو میں کیاری برائے دیتی ہوں۔ کون اسے مجوری دیتے ہو جو بگڑ رہے ہو۔''

''ہمارے گھر میں رہتی نہیں ہے؟ اس کے پیچھے سارے گاؤں میں بدنامی ہو رہی ہے؟''

''اچھا رہنے دو۔ ایک کون میں پڑی ہوئی ہے تو اس سے کرایہ لوگے؟''

''ایک کونے میں نہیں پڑی ہوئی ہے، ایک پوری کوٹھڑی لیے ہوئے ہے۔''

''تو اس کوٹھری کا کرایہ ہوگا کوئی پانچ روپیہ مہینہ؟''

''اس کا کرایہ ایک پیسہ سہی! ہمارے گھر میں رہتی ہے، تو جہاں جائے پوچھ کر جائے۔ آج آتے ہے تو کھبر (خبر) لیتا ہوں۔''

پر چلنے لگا۔ دھنیا کو ہوری نے نہ آنے دیا۔ روپا کیاری براتی تھی اور سونا پر رکھ

رہی تھی۔ روپا گیلی مٹی کے چولہے اور برتن بنا رہی تھی اور سونا یاس و امید بھیر آنکھوں سے سناری کی طرف تاک رہی تھی۔ امید کم تھی، یاں زیادہ۔ سوچتی تھی کہ ان لوگوں کو روپے مل رہے ہیں تو کیوں چھوڑنے لگے؟ متھرا میں دیا ہے، دھرم ہے۔ میرے باپ کی اچھا جو ہوگی، وہی اسے ماننی پڑے گی مگر سونا بھی بچہ کو ایسا پھٹکارے گی کہ یاد کریں گے۔ کھلم کھلا کہہ دے گی کہ جا کر کسی امیر کی لڑکی سے بیاہ، تجھ جیسے مرد کے ساتھ میرا نباہ ہوگا۔ کہیں گوری مہتو مان گئے تو وہ ان کے چرن دھو دھو کر پیے گی۔ ان کی ایسی سیوا کرے گی جیسی اپنے باپ کی بھی نہ کی ہوگی اور سلیا کو بھر پیٹ مٹھائی کھلا دے گی۔ گوبر نے جو روپیہ اسے دیا تھا، اسے وہ ابھی تک رکھے ہوئے تھی۔ اس شیریں تصور سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور رخسار پر ہلکی سرخی دوڑ گئی۔

مگر سلیا ابھی تک آئی کیوں نہیں؟ کون بڑی دور ہے؟ نہ آنے دیا ہوگا، ان لوگوں نے آہا، وہ آ رہی ہے! لیکن بہت دھیرے دھیرے آتی۔ تو سونا سے ہو چکا بیاہ، منہ دھو رکھو۔

سلیا آئی ضرور مگر کنویں پر نہ جا کر کھیت میں کیاری برانے لگی۔ ڈر رہی تھی کہ اگر ہوری پوچھیں گے کہ کہاں تھی اب تک، تو کیا جواب دے گی۔ سونا کے یہ دو گھنٹے بڑی مشکل سے گزرے۔ پر بند ہوتے ہی ڈری ہوئی سلیا کے پاس گئی۔

''وہاں جا کر تو مر گئی تھی کیا؟ تاکتے تاکتے آنکھیں پھو گئیں۔''

سلیا کو برا لگا ''تو کیا میں وہاں سوتی تھی؟ اس طرح کی بات چیت راہ چلتے تھوڑے ہی ہو جاتی ہے۔ موکا آموقع) دیکھنا پڑتا ہے۔ متھر ندی پر ڈھور چرانے

گیا تھا۔ کھوجتی کھوجتی اس کے پاس گئی اور تیرا سندیسہ کہا۔''

لیا کھس (خوش) ہوا کہ تجھ سے کیا کہوں۔ میرے پاؤں پر گر پڑا اور بولا۔ ''میں تو جب سے سنا ہے کہ سونا میرے گھر میں آ رہی ہے، تب سے آنکھوں کی نیند ہر گئی ہے۔ اس کی وہ گالیاں مجھے پھل گئیں۔ پر کا کا کو کیا کروں، وہ کسی کی نہیں سنتے۔''

سونا نے ٹوکا ''تو نہ سنیں۔ سونا بھی ہٹیلی ہے۔ جو کہا ہے وہ کر دکھائے گی۔ پھر ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔''

''بس اسی چھن ڈھوروں کو وہیں چھوڑ کر مجھے لیے ہوئے گوری مہتو کے پاس گیا۔ مہتو کے چار پر چلتے ہیں۔ کنواں بھی ان کا ہے۔ دس بیگھے اوکھ ہے۔ مہتو کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی، جیسے کوئی گھسیارا ہو۔ ہاں بھاگ اچھے ہیں۔ باپ بیٹے میں بڑی کہا سنی ہوئی۔ گوری مہتو کہتے تھے کہ تجھ سے کیا مطلب، میں چاہے کچھ لوں یا نہ لوں، تو کون ہوتا ہے بولنے والا؟ متھرا کہتا تھا کہ تم کو لینا دینا ہے تو میرا بیاہ مت کرو، میں اپنا بیاہ جیسے چاہوں گا کر لوں گا۔ بات بڑھ گئی اور گوری نے پنہیں (جوتے) اتار کر متھرا کو خوب (خوب) پیٹا۔ کوئی دوسرا لڑکا اتنی مار کھا کر بگڑ کھڑا ہوتا۔ متھرا ایک گھونسہ بھی جما دیتا تو مہتو پھر نہ اٹھتے۔ مگر بے چارا پنہیں کھا کر بھی کچھ نہ بولا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے میرا منہ تکتا ہوا چلا گیا۔ تب مہتو! دو تین سو کوئی بڑی بھاری رکم (رقم) نہیں ہے اور ہوری مہتو اتنے میں بک نہ جائیں گے اور نہ تم ہی امیر ہو جاؤ گے، پر وہ سب دھن ناچ تماسے ہی میں اڑ جائے گا۔ ہاں ایسی بہو نہ پاؤ گے۔''

سلیا نے بات چھپا رکھی تھی، ایسی ذلیل بات سونا کے کانوں میں نہ ڈالنا چاہتی تھی مگر یہ سوان سن کر ضبط نہ کر سکی اور بولی ''وہی گوبر بھیا والی بات تھی۔ مہتو نے کہا کہ آدمی جوٹھا تو تبھی کھاتا ہے جب میٹھا ہو اور کلنک چاندی ہی سے دھلتا ہے۔ اس پر متھرا بولا کہ'' کاکا کون گھر کلنک سے بچا ہے؟ ہاں کسی کا کھل گیا اور کسی کا چھپا ہوا ہے۔ گوری جیسے بھوت چڑھ گیا۔ جتنا لالچی ہے، اتنا گسیل (غصہ) بھی ہے۔ بنا لیے نہ مانے گا۔''

دونوں گھر چلیں۔ سونا کے سر پر، رسا اور جوئے کا بھاری بوجھ تھا۔ مگر سارا وقت تو وہ اسے پھول سے بھی ہلکا لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں جیسے خوشی اور زندہ دلی کا سوتا کھل گیا تھا۔ متھرا کی وہ مردانہ مورت سامنے کھڑی تھی اور وہ گوا سے اپنے دل میں ٹھاکر اس کے پیروں کو اپنے آنسوؤں سے دھو رہی تھی جیسے آسمانی حوریں اسے گود میں اٹھائے آسمان میں پھیلی ہوئی سرخی میں لیے چیل جا رہی تھیں۔

اسی رات سونا کو شدت سے بخار آیا۔

تیسرے دن گوری مہتو نے نائی کے ہاتھ یہ خط بھیجا:

''سری سرب اپما جوگ سری ہوری مہتو کو گوری رام کو رام رام بانچنا۔ آگے جو ہم لوگوں میں دیج کی بات چیت ہوئی تھی۔ اس پر ہم نے من سے بچار کیا تو سمجھ میں آیا کہ لین دین سے بر (دولہا) اور کنیا دونوں ہی کے گھر والے جیر (زیر) بار ہوتے ہیں۔ جب ہمارا تمہارا ناتا ہو گیا تو ہمیں ایسا برتاؤ کرنا چاہیے کہ کسی کو نہ اکھرے (کھلے) تم دیج کی کوئی چنتا مت کرنا ہم تم کو سوگند دیتے ہیں۔ جو کھ

موٹا مہین ہو سکے، براتیوں کو کھلا دینا۔ ہم تو وہ بھی نہ مانگیں گے۔ رسد کا بندوبست ہم نے کرلیا ہے۔ ہاں، تم کھسی (خوشی) سے جو ہماری کھاطر (خاطر) کرو گے، وہ سر جھکا کر منجور (منظور) کریں گے۔''

ہوری نے خط پڑھا اور ڈرتے ہوئے اندر جا کر دھنیا کو سنایا۔ خوشی کے مارے اچھلا پڑتا تھا، مگر دھنیا سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی رہی۔ ایک لمحہ بعد بولی۔ ''یہ گوری مہتو کی کھلمنسی ہے، پر ہمیں بھی تو اپنی مریادکا نباہ کرنا ہے، سنسار کیا کہے گا؟ روپیہ ہاتھوں کا میل ہے۔ اس کے لیے مریادنہیں چھوڑی جا سکتی۔ جو کچھ ہم سے ہو سکے گا وہ دیں گے اور گوری مہتو کو لینا پڑے گا۔ تم یہی جواب لکھ دو۔ ماں باپ کی کمائی میں کیا لڑکی کا کوئی حصہ نہیں؟ نہیں، لکھنا کیا ہے، چلو میں نائی سے سندیسہ کہلائے دیتی ہوں۔''

ہوری بدحواس سا آنگن میں کھڑا تھا اور دھنیا اس فیاضی کے جواب میں جو گوری نے کی تھی، اپنا سندیسہ کہہ رہی تھی، پھر اس نے نائی کو شربت پلایا اور رخصتانہ دے کر رخصت کیا۔

وہ چلا گیا تو ہوری نے کہا۔ ''یہ تون کیا کر ڈالا دھنیا؟ تیرا سبھاؤ آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔ تو آگے بھی چلتی ہے، پیچھے بھی چلتی ہے۔ پہلے تو اس بات پر لڑ رہی تھی کہ کسی سے ایک پیسہ ادھار مت لو، کچھ دینے دلانے کا کام نہیں ہے اور جب بھگوان نے گوری کے دل میں بیٹھ کر یہ چٹھی لکھوائی تو تو نے گھرانے کی مریاد کا راگ چھیڑ دیا۔ تیرا بھید بھگوان ہی جانیں۔''

دھنیا بولی۔ ''منہ دیکھ کر بیڑا دیا جاتا ہے، جانتے ہو کہ نہیں؟ تب گوری اپنی

شان دکھاتے تھے، اب وہ بھلمنسی دکھاتے ہیں۔ اینٹ کا جواب چاہے پتھر ہو مگر پرنام (سلام) کا جواب تو گالی نہیں ہے۔''

ہوری نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ''تو دکھا اپنی بھلمنسی! دیکھوں کہ کہاں سے روپے لاتی ہے۔''

دھنیا آنکھیں مٹکا کر بولی۔ ''روپیہ لانا میرا کام نہیں ہے، تمہارا کام ہے۔''

''میں تو دلاری ہی سے لوں گا۔''

''لے لو اسی سے۔ سود تو سبھی لیں گے۔ جب ڈوبنا ہی تو کیا گہری اور کیا گنگا۔''

ہوری باہر جا کر حقہ پینے لگا۔ کتنے مزے سے گلا چھوٹا جاتا تھا، مگر دھنیا جب جان چھوڑے تب۔ جب دیکھو الٹا ہی چلتی ہے۔ اسے جیسے کوئی بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ گھر کی سدا دیکھ کر بھی اس کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

(25)

بھولا ادھر دوسری سگائی کرا لائے تھے۔ عورت کے بغیر ان کی زندگی بے کیف تھی۔ جب تک جھنیا تھی انہیں حقہ پانی دے دیتی تھی اور وقت پر کھانے کو بلا لے جاتی تھی۔ اب بے چارے بے بس ہو گئے تھے۔ بہوؤں کو گھر کے کام کاج ہی سے چھٹی نہ ملتی تھی۔ ان کی خدمت کیا کرتیں؟ اس لیے اب سگائی نہایت ضروری ہو گئی تھی۔ اتفاق سے ایک جوان بیوہ مل گئی جس کے شوہر کو مرے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا بھی تھا۔ بھولا کی رال ٹپک پڑی اور جھٹ پٹ شکار مار لائے۔ جب تک سگائی نہ ہوئی، اس کا گھر کھودڈالا۔

ابھی تک ان کے گھر میں جو کچھ تھا وہ بہوؤں کا تھا۔ جو چاہتی تھیں کرتی تھیں، جیسے چاہتی تھیں رہتی تھیں۔ جنگی جب اپنی عورت کو لے کر لکھنو چلا گیا تھا، اس وقت سے کالتا ہی کی عورت گھر کی مالکہ تھی۔ پانچ چھ مہینے ہی میں اس نے تیس چالیس روپے اپنے ہاتھ میں کر لیے تھے۔ سیر آدھ سیر دودھ دہی چرا کر بیچ لیتی تھی۔ اب مالکہ ہوئی اس کی سوتیلی ساس۔ اس کی حکومت بہو کو بری لگتی تھی اور آئے دن دونوں میں جھگڑا ہوتا رہتا تھا، حتیٰ کہ عورتوں کے پیچھے بھولا اور کامتا میں بھی کہا سنی ہو گئی۔ جھگڑا اتنا بڑھا کہ الگاوا کی نوبت آ گئی اور یہ ریت سدا سے چلی آئی ہے کہ الگاوے کے وقت مار پیٹ بھی ضروری ہوتی ہے۔ یہاں بھی اسی قاعدے پر عمل کیا گیا۔ کامتا جوان آدمی تھا۔ بھولا کا اس پر جو کچھ دباؤ تھا، وہ باپ کے ناتے، مگر نئی عورت لا کر بیٹے سے عزت پانے کا اب اسے کوئی حق نہ رہا۔ کم از کم کامتا اسے تسلیم نہ کرتا تھا۔ اس نے بھولا کو پٹک کر کئی لاتیں لگائیں اور گھر سے نکال باہر کر دیا گھر کی چیزیں چھونے بھی نہ دیں۔ گاؤں والوں میں بھی کسی نے بھولا کی حمایت نہ کی۔ نئے بیاہ نے انہیں نکو بنا دیا تھا۔ رات تو انہوں نے کسی طرح ایک پیڑ کے نیچے کاٹی مگر صبح ہوتے ہی انوکھے رام کے کے یہاں جا پہنچے اور فریاد کی۔ بھولا کا گاؤں بھی انہیں کے حلقے میں تھا اور حلقے بھر کے مالک مکھجیا جو کچھ تھے، وہی تھے۔ انوکھے رام کو بھولا پر تو کیا رحم آتا، مگر ان کے ساتھ ایک رنگیلی چھبیلی عورت دیکھی تو فوراً جگہ دینے پر راضی ہو گئے۔ جہاں ان کی گائیں بندھتی تھیں، وہیں ایک کوٹھری رہنے کو دے دی۔ اپنے جانوروں کی دیکھ بھال، سانی پانی کے لیے انہیں یکا یک ایک واقف کار آدمی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ بھولا کو تین روپے

ماہوار ایک سیر روزانہ اناج پر نوکر رکھ لیا۔

انوکھے رام ناٹے، موٹے، چندوے، لمبی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے آدمی تھے۔ بڑا سا پگڑ باندھتے، نیچا کرتا پہنتے اور جاڑوں میں لحاف اوڑھ کر باہر آتے جاتے تھے۔ انہیں تیل کی مالش کرانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ پس ان کے کپڑے ہمیشہ میلے کچیلے رہتے تھے۔ ان کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ سات بھائی اور ان کے بال بچے سبھی ان کے سہارے تھے۔ خود ان کا لڑکا نویں درجے میں انگریزی پڑھتا تھا اور اس کے بابو پن کا ٹھاٹ باٹ نبھانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ رائے صاحب سے انہیں صرف بارہ روپے تنخواہ ملتی تھی مگر خرچ سو روپے سے کوڑ کم نہ تھا، اس لیے اسامی کسی طرح کے چنگل میں پھنس جائے تو اسے خوب چوسے بغیر نہ چھوڑتے تھے۔ پہلے چھ روپے تنخواہ ملتی تھی، تب اسامیوں سے اتنی نوچ کھسوٹ کرتے تھے مگر جب سے بارہ روپے ہو گئے تھے، اس وقت سے ان کی ہوس اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس لیے رائے صاحب ان کی ترقی نہ کرتے تھے۔

گاؤں میں تو اور سبھی کسی نہ کسی صورت مُن ان کا دباؤ مانتے تھے حتیٰ کہ داتا دین اور جنگری سنگھ بھی ان کی خوشامد کرتے تھے، صرف پٹیشوری ان سے خم ٹھونکنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ انوکھے رام کو اگر یہ زعم تھا کہ ہم برہمن ہیں اور کایستھوں کو انگلی پر نچاتے ہیں تو پٹیشوری کو گھمنڈ تھا کہ ہم کایستھ ہیں، قلم کے بادشاہ۔ اس میدان میں کوئی دوسرا ہم سے کیا بازی لے جائے گا۔ پھر وہ زمیندار کے نوکر نہیں بلکہ ایسی سرکار کے نوکر ہیں جس کے راج میں آفتاب کبھی نہیں غروب ہوتا۔ انوکھے رام اگر ایکادشی کو برت رکھتے ہین اور پانچ برہمنوں کو کھلائیں گے۔ جب سے ان کا

بڑا لڑکا سزاول ہو گیا تھا، انوکھے رام اس تاک میں رہتے تھے کہ ان کا لڑکا بھی کسی طرح دسواں درجہ پاس کر لے تو اسے بھی کہیں نقل نویسی دلا دیں۔ اسی لیے حکام کے پاس فصلی تحفے لے کر برابر سلام کرنے جایا کرتے تھے۔ پٹیشوری ایک اور بات میں بھی ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیوہ کہارن کو رکھے ہوئے ہیں، تو اب انوکھے رام کو بھی اپنی شان میں یہ کسر پوری کرنے کا موقع ملتا ہوا معلوم ہوا۔

بھولا کو ڈھارس دیتے ہوئے بولے۔ ''تم یہاں آرام سے رہو بھولا، کسی بات کا کھٹکا نہیں، جو ضرورت ہو ہم سے آ کر کہو۔ تمہاری گھر والی ہے، سو اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی کام نکل آوے گا۔ بگھاروں میں اناج رکھنا، نکالنا، پچھوڑنا، پھٹکنا، کیا سب تھوڑا کام ہے۔

بھولا نے عرض کیا۔ ''ایک بار کامتا کو بلا کر پوچھ لو کہ کیا باپ کے ساتھ بیٹے کا یہی برتاؤ ہونا چاہیے۔ گھر ہم نے بنوایا، گائے بھینس ہم نے لیں، اب اس نے کچھ بتھیا لیا ہے اور ہمیں نکال کر باہر کر دیا ہے۔ یہ انیائے نہیں تو کیا ہے؟ ہمارے مالک تو تم ہی ہو، تمہارے دربار میں اس کا نیائے ہونا چاہیے۔''

انوکھے رام نے سمجھایا ''بھولا تم اس سے لڑ کر جیت نہ پاؤ گے۔ اس نے جیسا کیا ہے اس کا ڈنڈا اسے بھگوان دیں گے۔ بے ایمانی کر کے کوئی آج تک پھلا پھولا نہیں۔ دنیا میں بے ایمانی نہ ہوتی تو اسے نرک کیوں کہا جاتا؟ یہاں نیائے اور دھرم کو کون پوچھتا ہے؟ بھگوان سب دیکھتے ہیں۔ سنسار کارتی رتی حال جانتے ہیں۔ تمہارے من میں اس سمے کیا بات ہے، یہ ان سے کیا چھپا ہے؟ اس سے تو

انتر جامی (ہمہ داں) کہلاتے ہیں۔ان سے بچ کر کوئی کہاں جائے گا؟تم چپکے ہو کے بیٹھو۔بھگوان کی اچھا ہوئی تو یہاں تم اس سے برے نہ رہو گے۔''

یہاں سے اٹھ کر بھولا نے ہوری کے پاس جا رک اپنا دکھڑا رویا۔ہوری نے اپنی بیتی سنائی ''لڑکوں کی آج کل کچھ نہ پوچھو بھولا بھائی!مر مر کر پالو پوسو اور جوان ہوں تو بیری بن جائیں۔میرے ہی گوبر کو دیکھو، ماں سے لڑ کر گیا اور برسوں ہو گئے، نہ چٹھی نہ پتری!اس کے لیکھے (حساب سے) تو ماں باپ مر گئے۔لڑکی بیاہ سر پر ہے، پر اس سے کوئی مطلب نہیں۔کھیت رہن رکھ کر دوسو روپے لیے ہیں۔ اجت آبرو کو نباہ تو کرنا ہی ہوگا۔''

کامتا نے باپ کو نکال باہر تو کر دیا مگر اسے معلوم ہونے لگا کہ بوڑھا کتنے کام کا آدمی تھا۔سویرے اٹھ کر سانی پانی کرنا، دودھ دوہنا، کوئی پندرہ روز میں اس کا حلیہ بگڑ گیا۔مرد عورت میں لڑکائی ہوئی۔عورت نے کہا میں جان دینے کے لیے تمہارے گھر نہیں آئی ہوں، اگر میری روٹ تمہیں بھاری ہو تو میں اپنے گھر چلی جاؤں۔کامتا ڈرا کہ یہ کہیں چلی نہ جائے، تو روٹی کا بھی ٹھکانہ نہ رہے، اپنے ہی ہاتھ سے ٹھوکنا پڑے۔آخر ایک نوکر رکھا، مگر اس سے کام نہ چلا۔نوکر کھلی بھوسہ چرا کے بیچنے لگا تو اسے الگ کیا۔پھر عورت مرد میں لڑائی ہوئی۔عورت روٹھ کر میکے چلی گئی۔کامتا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ہار کر بھولا کے پاس آیا اور خوشامد کرنے لگا۔''دادا، مجھ سے کو کچھ بھول چوک ہوئی چھما کرو۔اب چل کر گھر سنبھالو۔جیسے تم رکھو گے، ویسے ہی رہوں گا۔''

بھولا کو یہاں مزدوروں کی طرح رہنا کھل رہا تھا۔پہلے مہینے دو مہینے ان کی جو

خاطر ہوئی وہ اب نہ تھی۔ انوکھے رام کبھی کبھی ان سے چلم بھرنے یا چارپائی بچھانے کو بھی کہتے تھے۔ اس وقت بے چارہ بھول زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ اپنے گھر میں لڑائی جھگڑا بھی ہو تو کسی کی سیوا ٹہل تو نہ کرنی پڑے گی۔

اس عورت نہرا نے یہ تجویز سنی تو اینٹھ کر بولی۔ ''جہاں سے لات کھا کر آئے وہیں پھر جاؤ گے؟ تمہیں لاج بھی نہیں آتی۔''

بھولا نے کہا۔ ''تو یہاں کون سنگھاسن پر بیٹھا ہوا ہوں۔''

نہرا نے مٹک کر کہا۔ ''تمہیں جانا ہو تو جاؤ، میں نہیں جاتی۔''

بھولا جانتا تھا کہ نہرا مخالفت کرے گی۔ اس کا سبب بھی وہ کچھ کچھ سمجھتا تھا اور کچھ کچھ دیکھتا بھی تھا۔ اس کے یہاں سے بھاگنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ یہاں اس کی تو کوئی نہ پوچھتا تھا مگر نہرا کی بڑی خاطر ہوتی تھی۔ پیادے اور شخے تک اس کا دباؤ مانتے تھے۔ اس کا جواب سن کر بھولا کو غصہ آیا مگر کرتا کیا؟ نہرا کو چھوڑ کر جانے کی ہمت اس میں ہوتی تو نہرا بھی جھک مار کر اس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی۔ اسے یہاں تنہا رکھنے کی ہمت انوکھے رام میں نہ تھی۔ وہ ٹٹی کی آڑ سے شکار کھیلنے والے آدمی تھے۔ مگر نہرا بھولا کے مزاج سے واقف ہو چکی تھی۔

بھولا منت کر کے بولا۔ ''دیکھ نہری! تنگ مت کر۔ اب تو وہاں بھوئیں بھی نہیں ہیں تیرے ہی ہاتھ میں سب کچھ رہے گا یہی مجوری کرنے سے برادری میں کتنی بدنامی ہو رہی ہے، یہ سوچ!''

نہرا نے انگوٹھا دکھا کر کہا ''تمہیں جانا ہو جاؤ، میں تمہیں روک تو نہیں رہی ہوں۔ تمہیں بیٹے کی لاتیں پیاری لگتی ہوں، مجھے تو نہیں لگتیں۔ میں اپنی مجوری میں

بھولا کو رہنا پڑا اور کامتا اپنی عورت کی خوشامد کر کے اسے منا لایا۔

ادھر نہرا کے بارے میں سرگوشیاں ہوتی رہیں۔

نہرا نے آج گلابی ساڑھی پہنی ہے۔ اب کیا پوچھتا ہے، چاہے نت نئی ساڑھی پہنے۔ سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا؟ بھولا کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟''

سو بھا بڑا پر مذاق تھا۔ سارے گاؤں کا مسخرا بلکہ نارد۔ ہر بات کی ٹوہ لگاتا رہتا تھا۔ ایک دن نہری اسے گھر مل گئی، کچھ ہنسی کر بیٹھا۔ نہرا نے انوکھے رام سے جڑ دیا۔ سو بھا کی چوپال میں طلبی ہوئی اور ایسی ڈانٹ پڑی کہ عمر بھر نہ بھولے گا۔

ایک دن لالا پٹیشوری پرشاد کی شامت آ گئی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ لالہ باغیچے میں آم تڑوا رہے تھے۔ نہرا بنی ٹھنی نکلی۔ لالہ نے پکارا۔

''نہرا رانی، ادھر آؤ تھوڑے سے آم لیتی جاؤ، بڑے میٹھے ہیں۔''

نہرا کو شک ہوا کہ لالہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اسے اب گھمنڈ ہونے لگا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ لوگ اسے زمیندارنیہ سمجھیں اور اس کی عزت کریں۔ مغرور شخص عموماً شکی ہوا کرتا ہے اور جب دل میں چور ہو تو یہ شک اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر کیوں ہنسا؟ سب لوگ مجھے دیکھ کر جلتے کیوں ہیں؟ میں کسی سے کچھ مانگنے نہیں جاتی۔ کون بڑی ستونتی ہے؟ تنک میرے سامنے آئے تو دیکھوں۔

اتنے دن میں نہرا گاؤں کے بھیدوں سے واقف ہو چکی تھی۔ یہی لالہ کہار ن کو رکھے ہوئے ہیں اور مجھے ہنستے ہیں! انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا، بڑے آدمی ہیں نا۔ نہرا

غریب ہے، کم ذات ہے۔ اس لیے سبھی اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور جیسا باپ ویسا ہی بیٹا۔ انہیں کا رمیشوری تو سلیا کے پیچھے پاگل بنا پھرتا ہے۔ چماریوں پر تو گدھ کی طرح ٹوٹتے ہیں، اس پر دعویٰ ہے کہ ہم اونچے ہیں۔

اس نے وہیں کھڑے ہو کر کہا ''تم ایسے دانی کب سے ہو گئے لالہ؟ چاہو تو دوسری کی تھالی روٹی اڑا جاؤ۔ آج بڑے آم والے ہوئے ہو۔ مجھ سے چھیڑ کھانی کی تو اچھا نہ ہوگا، کہے دیتی ہوں۔''

''اوہو، اس آہیرن کا اتنا مزاج! نوکھے رام کو کیا پھانس لیا، سمجھتی ہے ساری دنیا پر اسی کا راج ہے۔ بولے ''تو تو ایسی تنک رہی ہے جیسے اب کسی کو گاؤں میں رہنے دے گی۔ جرا (ذرا) جبان (زبان) سنبھال کر بات کیا کر، اتنی جلد اپنے کو بھول نہ جا۔''

''تو کیا تمہارے دوارے پر کبھی بھیک مانگنے آئی تھی۔''

''نوکھے رام نے چھانہہ نہ دی ہوتی تو بھیک مانگتی۔''

نہرا کو لال مرچ سی لگ گئی جو کچھ منہ میں آیا، بکا۔ ''داڑھی، جار، منہ جھونسا'' وغیرہ نہ جانے کیا کیا کہا اور اسی غصے میں بھری ہوئی اپنی کوٹھری میں آ گئی اور اپنا سامان نکال کر باہر رکھنے لگی۔

نوکھے رام نے سنا تو گھبرائے ہوئے آئے اور پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو نہرا! کپڑے لتے کیوں نکال رہی ہو؟ کسی نے کچھ کہا کیا؟''

نہرا مردوں کو نچانے کی حکمت جانتی تھی۔ اپنی زندگی میں اس نے یہی فن سیکھا تھا۔

انوکھے رام پڑھے لکھے آدمی تھے۔ قانون بھی جانتے تھے اور مذہبی کتابیں بھی بہت پڑی تھیں۔ بڑے بڑے وکیلوں، بیرسٹروں کی جوتیاں سیدھی کی تھیں، مگر اس گنوار نہرا کے ہاتھ کا کھلونا بنے ہوئے تھے۔ بھوس سکیڑ کر بولی۔ ''دن کا پھیر ہے کہ یہاں آ گئی، پر آبرو نہ گنواؤں گی۔''

برہمن آپے میں آ گیا۔ مونچھیں کھڑی کر کے بولا۔ ''تیری طرپھ (طرف) جوتا کے، اس کی آنکھیں نکال لوں۔''

نہرا نے لوہے کو گرم کر کے گھن جمایا۔ ''لالہ پٹیشوری جب دیکھو مجھ سے بے بات کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں ہرجاتی تھوڑے ہی ہوں کہ مجھے پیسے دکھائے؟ گاؤں بھر میں سبھی عورتیں تو ہیں، پر کوئی ان سے نہیں بولتا۔ جسے دیکھو وہ مجھی کو چھیڑتا ہے۔''

انوکھے رام پر بھوت سوار ہو گیا۔ اپنا موٹا ڈنڈا اٹھایا اور آندھی کی طرح ہراتے ہوئے باغ میں پہنچ کر لگے للکارنے۔ ''جا بڑا امرد ہے تو! مونچھیں اکھاڑ لوں گا، کھود کر گاڑ دوں گا، نکل آ سامنے، اگر پھر کبھی نہرا کو چھیڑا تو لہو پی جاؤں گا۔ ساری پٹوارگیری نکال دوں گا۔ جیسا آپ ہے، ویسا ہی اوروں کو بھی سمجھتا ہے۔ تو ہے کس گھمنڈ میں؟''

لالہ پٹیشوری سر جھکائے اور سانس روکے ہوئے بت کی طرح کھڑے تھے، ذرا بھی زبان کھولی اور شامت آئی۔ ان کی اتنی توہین زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ لوگوں نے انہیں تالاب کے کنارے رات کو گھیر کر خوب پیٹا تھا، مگر گاؤں میں کسی کو خبر نہ ہوئی تھی۔ کسی کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا، مگر آج تو سارے گاؤں

کے سامنے ان کا پانی اتر گیا۔ کل جو عورت گاؤں میں ٹھکانا کھوجتی آئی تھی، آج سارے گاؤں کے سامنے ان کا پانی اتر گیا۔ کل جو عورت گاؤں میں ٹھکانا کھوجتی آئی تھی، آج سارے گاؤں پر اس کا دبدبہ تھا۔ اب کس کی ہمت ہے، جو اسے چھیڑ سکتے؟

جب پٹیشوری کچھ نہ کر سکے تو دوسروں کی بساط ہی کیا؟

اب نہرا گاؤں کی رانی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر کسان لوگ اس کے راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ یہ کھلا ہوا راز تھا۔ اس کی تھوڑی سی پوجا کر کے انوکھے رام سے بہت کام نکل سکتا ہے۔ کسی کو پٹوار کرانا ہو، لگان کے لیے مہلت مانگنی ہو، مکان بنانے کے لیے زمین کی ضرورت ہو نہرا کی پوجا کیے بغیر اس کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اچھے اچھے اسامیوں کو ڈانٹ بتا دیتی تھی۔ اسامی ہی نہیں، اب وہ کارکن صاحب پر بھی رعب جمانے لگی تھی۔

بھولا اس کے محتاج بن کر نہ رہنا چاہتے تھے۔ عورت کی کمائی کھانے سے زیادہ برا ان کی نظروں میں دوسرا کام نہ تھا۔ انہیں کل تین روپے ماہوار ملتے تھے اور وہ بھی ان کے ہاتھ نہ لگتے تھے۔ نہری اوپر ہی اوپر اڑا دیتی تھی۔ انہیں تمباکو پینے کو ایک کوڑی میسر نہیں اور نہرا دو آنے کے روزانہ پان کھا جاتی تھی۔ جسے دیکھو، وہی ان پر رعب جماتا تھا۔ پیارے ان سے چلم بھرواتے اور لکڑی کٹاتے۔ بیچارا دن بھر کا تھکا ماندہ آتا اور دروازے پر پیڑ کے نیچے ایک جھنگی چارپائی پر پڑتا رہتا۔ کوئی ایک لوٹا پانی دینے والا بھی نہیں۔ دوپہر کی باسی روٹیاں رات کو کھانی پڑتیں اور وہ بھی نمک یا پانی کے ساتھ۔

آخر تنگ ہو کر اس نے گھر میں کامتا کے ساتھ رہنے کا ارادہ کیا۔ کچھ نہ ہوگا، ایک ٹکڑا روٹی تو مل ہی جائے گی۔ اپنا گھر تو ہے۔

نہرا بولی۔ ''میں وہاں کسی کی گلامی (غلامی) کرنے نہ جاؤں گی۔''

بھولا نے جی کڑا کر کے کہا۔ ''تمہیں جانے کو تو میں نہیں کہتا، میں تو اپنے جانے کو کہتا ہوں۔''

''تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ کہتے ہوئے لاج نہیں آتی؟''

''لاج تو گھول کر پی گیا۔''

''لیکن میں نے تو اپنی لاج نہیں پی۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔''

''تو اپنے من کی ہے، تو میں تیری گلامی کیوں کروں؟''

''پنچایت کرا کے منہ میں کالکھ لگاؤں گی، اتنا سمجھ لینا۔''

''کیا ابھی کچھ کالکھ کم لگی ہے؟ کیا اب بھی مجھے دھوکے میں رکھنا چاہتی ہے؟''

''تم ایسا تاؤ دکھا رہے ہو جیسے مجھے روج (روز) گنے تو گھڑواتے ہو، تو یہاں نہرا کسی کا تاؤ سہنے والی نہیں ہے۔''

بھولا جھلا کر اٹھے اور سرہانے سے لکڑی اٹھا کر چلے کہ نہرا نے لپک کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے طاقتور پنجے سے نکلنا بھولا کے لیے مشکل تھا۔ چپکے سے قیدی کی طرح بیٹھ گئے۔ ایک وقت تھا جب عورتوں کو وہ انگلیوں پر نچایا کرتے تھے۔ آج وہ ایک عورت کے پنجے میں پھنسے ہوئے ہیں اور کسی طرح نکل نہیں سکتے۔ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر کے وہ پردہ فاش نہیں کرنا چاہتے، اپنی طاقت کا اندازہ

انہیں ہوگیا ہے،مگر وہ کیوں اس سے نڈر ہوکر نہیں کہہ دیتے کہ تو میرے کام کی نہیں ہے اور میں تجھے چھوڑتا ہوں۔ پنچایت کی دھمکی دیتی ہے تو کیا پنچایت کوئی ہوا ہے۔اگر تجھے پنچایت کا ڈر نہیں تو میں کیوں پنچایت سے ڈروں؟

لیکن یہ خیال لفظوں میں آنے کی ہمت نہ کرسکتا تھا۔نہرا نے جیسے ان پر کوئی جادو کردیا تھا۔

(26)

لالہ پٹیشوری پٹواریا نہ اوصاف کے مجسمہ تھے۔وہ یہ نہ دیکھ سکتے تھے کہ کوئی اسامی اپنے دوسرے بھائی انچ بھر بھی زمین دبالے اور نہ وہ یہی دیکھ سکتے کہ اسامی کسی مہاجن کے روپے دبالے۔گاؤں کے سبھی لوگوں کے فوائد کی حفاظت کرنا ان کا اولیں فرض تھا۔سمجھوتہ یا میل جول پر ان کا اعتقاد نہ تھا۔یہ تو مردہ دلی کی علامتیں ہیں۔وہ کشمکش کے قائل تھے جو زندگی کی صلابت ہے۔آئے دن اس زندگی کو ابارنے کی کوشش کرتے تھے۔ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑتے رہتے تھے۔

منگرو ساہ پر ان دنوں کی خاص مہربانی تھی۔وہ گاؤں کا سب سے زیادہ دولتمند آدمی تھا،مگر مقامی سیاسیات میں بالکل حصہ نہ لیتا تھا۔رعب یا اقتدار کا لالچ اسے نہ تھا۔مکان بھی اس کا گاؤں کے باہر تھا،جہاں اس نے ایک باغ اور ایک کنواں اور ایک چھوٹا سا شوالا بنوالیا تھا۔بال بچہ کوئی نہ تھا۔اس لیے لین دین کم کردیا تھا اور زیادہ تر پوجا پاٹ ہی لگا رہتا تھا۔کتنے ہی اسامیوں نے اس کے روپے ہضم کر لیے تھے،مگر اس نے کسی پر نالش نہیں کی۔ہوری پر بھی اس کے سود کے تقریباً ڈیڑھ سو ہو گئے تھے مگر نہ ہوری کو قرض ادا کرنے کی کوئی فکر تھی اور نہ منگرو کو اسے

وصول کرنے کی۔ دو چار بار تقاضا کیا، ڈانٹ بھی بتائی مگر ہوری کی عادت دیکھ کر چپ ہو بیٹھا۔ اب کے اتفاق سے ہوری کی ایکھ گاؤں بھر کے اوپر تھی۔ کچھ نہیں تو اس کے دوڑھائی سو سیدھے ہو جائیں گے، لوگوں کا ایسا اندازہ تھا۔ پٹیشوری نے منگرو کو سمجھایا کہ اگر اس وقت ہوری پر دعویٰ کر دیا جائے تو سب روپے وصول ہو جائیں۔ منگرو اتنا رحیم نہیں جتنا کامل تھا۔ جھنجھٹ میں نہ پڑنا چاہتا تھا مگر جب پٹیشوری نے ذمہ لیا کہ اسے ایک دن بھی کچہری نہ جانا پڑے گا، نہ کوئی اور تکلیف ہوگی، بیٹھے بٹھائے اس کی ڈگر ہو جائے گی، تو وہ نالش کرنے پر راضی ہو گیا اور عدالتی صرفہ کے لیے روپے بھی دے دیئے۔ ہوری کو پتہ بھی نہ تھا کہ یہاں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ کب دعویٰ دائر ہوا اور کب ڈگری اسے بالکل معلوم نہ ہوا۔ جب قرضا میں اس کی ایکھ نیلام کرنے آیا تب اسے خبر ہوئی۔ سارا گاؤں کھیت کے کنارے جمع ہو گیا۔ ہوری منگرو ساہ کے پاس دوڑا اور دھنیا پٹیشوری کو گالیاں دینے لگی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ سب کام پٹیشوری ہی کا ہے۔ مگر منگرو شاہ پو جا پر تھے، ہل نہ سکے۔ دھنیا گالیوں کی بارش کر کے بھی پٹیشوری کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ ادھر ایکھ ڈیڑھ سو روپے میں نیلا ہو گئی اور بولی بھی منگرو ہی کے نام پر چھٹ گئی۔ کوئی دوسرا آدمی نہ بول سکا، داتا دین میں بھی دھنیا کی گالیاں سننے کی ہمت نہ تھی۔

دھنیا نے ہوری کو اکسا کر کہا۔ ''بیٹھے کیا ہو، جا کر پٹواری سے پوچھتے کیوں نہیں کہ یہی دھرم ہے تمہارا گاؤں گھر کے لوگوں کے ساتھ؟''

ہوری نے عاجزانہ کہا۔ ''پوچھنے کے لیے تم نے منہ بھی رکھا ہو، تیری گالیاں کیا انہوں نے نہ سنی ہوں گی؟''

''جو گالیاں کھانے کا کام کرے گا، اسے گالی ملے گی ہی۔''

''تو گالیاں بھی دے گی اور بھائی چارا بھی نبا ہے گی؟''

''دیکھوں گی کہ میرے کھیت کے پاس کون آتا ہے؟''

''مل والے آ کر کاٹ لے جائیں گے۔ تو کیا کرے گی اور میں کیا کروں گا؟ گالیاں دے کر اپنی جیٹھ کی کھجلی چاہے مٹا لے۔''

''میرے جیتے میرا کھیت کوئی کاٹ لے جائے گا؟''

''ہاں ہاں، تیرے اور میرے جیتے! سارا گاؤں مل کر بھی اسے نہیں روک سکتا۔ اب وہ پیچ (پیز) میری نہیں منگرو ساہ کی ہے۔''

''منگرو ساہ نے مرمر کی جیٹھ کی دوپہری میں سینچائی اور گڑائی کی تھی؟''

''وہ سب تو نے کیا، مگر اب پیچ منگرو ساہ کی ہے، ہم ان کے کرج دار (قرضدار) نہیں ہیں؟''

اکھی تو گئی مگر اس کے ساتھ ہی ایک نیا مسئلہ آ پڑا۔ دلاری اسی اکھی پر روپے دینے کو تیار ہوئی تھی۔ اب وہ کس ضمانت پر روپے دے؟ ابھی اس کے پہلے ہی کے دوسو روپے پڑے ہوئے تھے۔ سوچا تھا کہ اکھی کے پرانے روپے مل جائیں گے تو نیا حساب چلنے لگے گا۔ اس کی نظر میں ہوری کی ساکھ دوسو تک کی تھی۔ اس سے زیادہ دینا جوکھ تھا۔ سہالگ سر پر تھا، تاریخ بے ہو چکی تھی۔ گوری مہتو نے ساری تیاریاں کر لی ہوں گی۔ اب بیاہ کا ٹلنا ناممکن تھا۔ ہوری کو ایسا غصہ آتا تھا کہ جا کر دلاری کا گلا گھونٹ دے۔ جتنی منت سماجت ہو سکتی تھی وہ کر چکا، مگر وہ پتھر کی دیوی ذرا بھی نہ پسیجی۔ اس نے چلتے چلتے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''دلاری میں تمہارے

روپے لے کر بھاگ نہ جاؤں گا، نہ اتنی جلد مرا ہی جاتا ہوں۔ کھیت ہیں، پیڑ ہیں، گھر ہے، جوان لڑکا ہے، تمہارے روپے مارے نہ جائیں گے۔ میری مرجاد سکتی تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا، مگر رحم کو کاروباری صورت دے سکتی تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا، مگر رحم کو کاروباری صورت دینا اس نے نہ سیکھا تھا۔''

ہوری نے گھر آ کر دھنیا سے کہا۔ ''اب؟''

دھنیا نے اسی پر دل کا غبار نکالا۔ ''یہی تو چاہتے تھے۔''

ہوری نے زخمی آنکھوں سے دیکھا۔ ''میرا ہی دوکھ ہے؟''

''کسی کا دوکھ ہو، پر ہوئی تو تمہارے من کی۔''

''تیری اچھا ہے کہ جمین (زمین) رہن رکھ دوں؟''

''جمین رکھ دو گے تو کرو گے کیا؟''

''مجوری'' ''(مزدوری)۔''

مگر زمین مدونوں یکساں عزیز تھی۔ اسی پر تو ان کی عزت اور آبرو قائم تھی جس کے پاس زمین نہیں، وہ گرہست نہیں، مزدور ہے۔

ہوری نے کچھ جواب نہ پا کر پوچھا۔ ''تو کیا کہتی ہے؟''

دھنیا نے زخمی گلے سے کہا۔ ''کہنا کیا ہے۔ گوری برات لے کر آئیں گے تو ایک جون کھلا کر سیر سے لڑکی بدا کر دینا۔ دنیا ہنسے گی تو ہنس لے۔ بھگوان کی یہی اچھا ہے کہ ہماری ناک کٹے اور ہمارے منہ میں کالکھ لگے تو ہم کیاں کریں گے؟''

دفعتاً نہر اچوندری بہنے سامنے سے جاتی ہوئی نظر پڑی۔ ہوری کو دیکھتے ہی اس نے ذرا سا گھونگھٹ نکال لیا۔ اس سے سمدھی کا ناتا مانتی تھی۔

دھنیا سے اس کی شناسائی ہو چکی تھی۔ اس نے پکارا۔ ''آج کدھر چلیں سمدھن؟ آؤ بیٹھو۔''

نہرا نے فتح پائی تھی اور اب رائے عامہ کو اپنی موافقت میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آ کر کھڑی ہو گئی۔

دھنیا نے اسے سر سے پیر تک نقادانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''آج ادھر کیسے بھول پڑیں؟''

نہرا نے انکسار سے کہا۔ ''ایسے ہی تم لوگوں سے ملنے چلی آئی۔ لڑکی کا بیاہ کب تک ہے؟''

دھنیا شبہ سے بولی۔ ''بھگوان مالک ہیں، جب ہو جائے۔''

''ہاں، ساعت تو ٹھیک ہو گئی ہے۔''

''مجھے بھی نیوتہ دینا۔''

''تمہاری تو لڑکی ہے، نیوتہ کیسا؟''

''دیج کا سامان تو منگوالیا ہو گا، جرا (ذرا) میں بھی دیکھوں۔''

دھنیا شش و پنج میں پڑی، کیا ہے؟ ہوری نے اسے سنبھالا۔ ''ابھی تو کوئی سامان نہیں منگایا ہے اور سامان کیا کرنا ہے، کسا کنیا تو دینا ہے۔''

نہرا نے بے اعتباری سے دیکھا۔ ''کسا کنیا کیوں دو گے مہتو؟ پہلی لڑکی ہے، دل کھول کر کرو۔''

ہوری ہنسا، گویا کہہ رہا تھا کہ تمہیں چاروں طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہو گا مگر یہاں تو سکھا ہی پڑا ہے۔ ''روپے پیسے کی تنگی ہے، کیا دل کھول کر دوں؟ تم سے

کون پردہ ہے۔''

''لڑکا کماتا ہے، تم کماتے ہوم پھر بھی روپے پیسے کی تنگی؟ کسے بسوس آئے گا؟''

''بیٹا لایک (لایق) ہوتا تو پھر کاہے کا رونا تھا؟ چٹھی پتری تک بھیجتا نہیں، تو روپے کیا بھیجے گا؟ یہ دوسرا سال ہے، ایک بھی چٹھی نہیں آئی۔''

اتنے میں سونا بیلوں کے واسطے سبز چارے کا ایک گٹھا سر پر لیے ہوئے اور اپنے شباب کو آنچل سے چھپاتی ہوئی معصومانہ رفتار سے آئی اور گٹھا وہیں پٹک کر اندر چلی گئی۔

نہرا نے کہا۔ ''لڑکی تو سیانی ہوگئی ہے۔''

دھنیا بولی۔ ''لڑکی کی باڑھ تو رینڈ (آرنڈ) باڑھ ہے، نہیں، ہے ابھی کے دن کی۔''

''برا تو ٹھیک ہوگیا ہے نا؟''

''ہاں برتو ٹھیک ہے، روپے کا بندوبست ہوگیا تو اسی مہینے میں بیاہ کر دیں گے۔''

نہرا اوچھی طبیعت کی تھی۔ ادھر اس نے جو تھوڑے سے روپے جمع کیے تھے، وہ اس کے پیٹ میں اچھل رہے تھے۔ اگر سونا کے بیاہ میں کچھ روپے دے دے تو کتنا نام ہوگا۔ سارے گاؤں میں اس کا چرچا ہو جائے گا۔ لوگ تعجب سے کہیں گے کہ نہرا نے اتنے روپے دے دیئے۔ بڑی دیوی ہے۔ ہوری اور دھنیا دونوں گھر گھر اس کا بکھان ہمت ہے جو اس پر ہنسے یا بولیاں بولے؟ ابھی گاؤں بھر اس

کا بیری ہے، پھر گاؤں بھر اس کا ہتوا (خیر خواہ) ہو جائے گا۔ اس خیال سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ بولی۔

''تھوڑے بہت سے کام چلتا ہو تو مجھ سے لے لو، جب ہاتھ میں روپے آ جائیں تو دے دینا۔''

ہوری اور دھنیا نے اس کی طرف دیکھا، نہیں نہرا مذاق نہیں کر رہی ہے۔ دونوں کی آنکھوں میں حیرت تھی، ممنونیت تھی، شک تھا اور شرم تھی۔ نہرا اتنی بری نہیں ہے، جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔

نہرا نے پھر کہا۔ ''تمہاری اور ہماری آبرو ایک ہے۔ تمہاری ہنسی ہو تو کیا میری ہنسی نہ ہوگی؟ کیسے بھی ہوا ہو، پر اب تو تم ہمارے سمدھی ہو۔''

ہوری نے شرماتے ہوئے کہا ''تمہارے روپے تو گھر ہی میں ہی میں ہیں، جب کام پڑے گا، لے لیں گے۔ آدمی اپنوں ہی کا تو بھروسہ کرتا ہے۔ مگر اوپر سے بندوبست ہو جائے تو گھر کے روپے کیوں چھوئیں؟''

دھنیا نے تائید کی۔ ''ہاں اور کیا۔''

نہرا نے اپنا واجتایا ''جب گھر میں روپے ہیں تو باہر والوں کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلاؤ؟ بیاج بھی دینا پڑے گا، اس پر اسٹام لکھو، گواہی کراؤ، دستوری دو اور کھوسامد (خوشامد) کرو۔ ہاں میرے روپے میں چھوت لگی ہو تو دوسری بات ہے۔''

ہوری نے سنبھالا ''نہیں نہیں، جب گھر میں کام چل جائے گا تو باہر ہاتھ کیوں پھیلائیں گے؟ پر آپس والی بات ہے، کھیتی باڑی کا بھروسا نہیں، تمہیں جلدی کوئی

کام پڑا اور ہم روپے نہ دے سکے تو تمہیں بھی برا لگے گا اور ہماری جان بھی سنکٹ میں پڑے گی۔ اسی سے کہتا تھا۔ نہیں، لڑکی تو تمہاری ہے۔''

''مجھے ابھی روپے کی ایسی جلدی نہیں ہے۔''

''تو ہی سے لے لیں گے۔ کنیا دان کا پھل بھی کیوں باہر جائے؟''

''کتنے روپے چاہئیں؟''

''سو میں کام چل جائے گا؟''

ہوری کا لالچ آیا۔ بھگوان نے چھپر پھاڑ کر روپے دئی ے ہیں تو جتنا لے سکے کیوں نہ لے۔

''سو میں بھی چل جائے گا، پانسو میں بھی چل جائے گا، جیسا حوصلہ ہو۔''

''میرے پاس کل دوسو روپے ہیں، سو میں دے دوں گی۔''

''تو اتنے میں بہت اچھی طرح کام چل جائے گا۔ اناج گھر میں ہے۔ مگر ٹھکرائن آج تم سے سے کہتا ہوں کہ میں تمہیں ایسی لچھمی نہ سمجھتا تھا۔ آج کل کون کسی کی مدد کرتا ہے اور کس کے کے پاس ہے؟ تم نے مجھے ڈوبنے سے بچالیا۔''

چرغ جلنے کا وقت آ گیا تھا۔ ٹھنڈک پڑنے لگی تھی۔ زمین نے نیلی چادر اوڑھ لی تھی۔ دھنیا اندر جا کر انگیٹھی لائی اور سب تاپنے لگے۔ پوال کی روشنی میں جھیلی رنگینی، بدچلن نہرا اس کے سامنے بردان کی طرح بیٹھی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کتنی ہمدردی تھی، گالوں پر کتنی حیا اور ہونٹوں پر کتنی راست کلامی۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے نہرا اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ ''اب دیر ہو ہی ہے۔ کل تم آ کر روپے لے لینا مہتو۔''

''چلو میں تمہیں پہنچا دوں۔''

''نہیں نہیں، تم بیٹھو، میں چلی جاؤں گی۔''

انوکھے رام کی چوپال گاؤں کے دوسرے سرے پر تھی اور باہر جانے کا راستہ صاف تھا۔ دونوں اسی راستہ سے چلے۔ اب چاروں طرف سناٹا تھا۔

نہرا نے کہا۔ ''تنک سمجھا نہیں دیتے رادت کو۔ کیوں سب سے لڑائی کیا کرتے ہیں۔ جب ان ہی لوگوں کے بیچ میں رہنا ہے، تو ایسے رہنا چاہتے نا کہ چار آدمی اپنے ہو جائیں اور ان کا یہ حال ہے کہ سب سے لڑائی، سب سے جھگڑا۔ جب تم مجھے پردے میں نہیں رکھ سکتے اور مجھے دوسروں کی مجوری کرنی پڑتی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نہ کسی سے ہنسوں نہ بولوں اور نہ کوئی میری طرف (طرف) تاکے نہ ہنسے؟ یہ سب تو پردے ہی میں ہو سکتا ہے۔ پوچھو، کوئی مجھے تاکتا ہے یا گھورتا ہے تو میں کیا کروں؟ اس کی آنکھوں تو نہیں پھوڑ سکتی۔ پھر میل محبت سے آدمی کے سو کام نکلتے ہیں۔ جیسا بکھت (وقت) دیکھو ویسا بیوہار کرو۔ تمہارے گھر ہاتھی جھومتا تھا تو اب تمہارے کس کام کا؟ اب تو تم تین روپے کے مجور ہو۔ میرے گھر سو بھینسیں لگتی تھیں، پر اب تو مجورن ہوں مگر ان کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں۔ کبھی لڑکوں کے ساتھ رہنے کی سوچتے ہیں اور کبھی لکھنو جا کر رہنے کی سوچتے ہیں۔ میری ناک میں دم کر رکھا ہے۔''

ہوری نے چاپلوسی کی۔ ''یہ بھولا کی سراسر نادانی ہے۔ بوڑھے ہوئے، اب تو انہیں سمجھ آنی چاہیے۔ میں ''تو سبیرے آجانا، میں سمجھا دوں گا۔''

''کچھ لکھا پڑھی.....''

''تم میرے روپے کھا نہ جاؤ گے، یہ میں جانتی ہوں۔''

اس کا گھر آ گیا تھا۔ وہ اندر چلی گئی۔ ہوری گھر لوٹا۔

(27)

گوبر شراب کے نشے میں مست تھا۔ اس کی آسودہ نہ ہونے والی خواہشیں نفس پرستیوں کے سمندر میں غرق ہو جانا چاہتی تھیں۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ خوانچہ لے کر جاتا تو گھنٹے ہی بھر میں لوٹ آتا۔ دلچسپی کا کوئی دوسرا سامان نہ تھا۔ پڑوس کے مزدور اور رکیے والے رات رات بھر تاش اور جوا کھیلتے تھے۔ پہلے بھی وہ خوب کھیلتا تھا، مگر اب اس کے لیے صرف ایک ہی دلچسپ مشغلہ تھا اور وہ تھا جھنیا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا۔ تھوڑے ہی دنوں میں جھنیا اس زندگی سے اکتا گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ کہیں تخلیہ میں جا بیٹھے اور خوب بے فکری سے لیٹنے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ لڑکا ماں کو ایک لمحے کے لیے چھوڑتا نہ تھا اور جب کچھ کھیلنے کو نہ ہو تو کچھ کھانے اور دودھ پینے کے علاوہ اور کیا کرے؟ گھر پر کبھی دھنیا کھلاتی، کبھی روپا، کبھی ہوری، کبھی پنیا۔ یہاں تنہا جھنیا تھی اور اسے گھر کا سارا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔

اور گربر کے نشے میں مست تھا۔ اس کی آسودہ نہ ہونے والی خواہشیں نفس پرستیوں کے سمندر میں غرق ہو جانا چاہتی تھیں۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ خوانچہ لے جاتا تو گھنٹے ہی بھر میں لوٹ آتا۔ دلچسپی کا کوئی دوسرا سامان نہ تھا۔ پڑوس کے مزدور اور یکے والے رات رات بھر تاش اور جوا کھیلتے تھے۔ پہلے وہ خوب کھیلتا تھا، مگر اب اس کے لیے صرف ایک ہی دلچسپ مشغلہ تھا اور وہ تھا جھنیا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا۔ تھوڑے ہی دنوں میں جھنیا اس زندگی سے اکتا گئی۔ وہ

چاہتی تھی کہ کہیں تخلیہ میں جا بیٹھے اور خوب بے فکری سے لیٹے، سوئے مگر وہ تخلیہ کہیں نہ ملتا تھا۔ اسے اب گوبر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے شہری زندگی کی کتنی دلکش تصویر کھینچی تھی اور یہاں اس کال کوٹھری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بچے پر بھی چڑ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کو مار کر باہر نکال دیتی اور اندر سے کواڑ بند کر لیتی۔ بچہ روتے روتے بے دم ہو جاتا۔

اس پر مصیبت یہ کہ اس کے دوسرا بچہ ہونے والا تھا اور کوئی آگے نہ پیچھے۔ اکثر سر میں درد ہوا کرتا۔ کھانے سے بھی نفرت ہو گئی تھی، ایسی سستی تھی کہ گوشے میں خاموش پڑی رہے اور کوئی اس سے نہ بولے چالے، مگر یہاں گوبر کی بیدردانہ محبت اپنے خیر مقدم کے لیے ہمیشہ دروازہ کھٹکھٹاتی رہتی تھی۔ اگرچہ دودھ نام کو بھی نہ تھا پھر بھی للو سینے پر سوار رہتا۔ جسم کے ساتھ اس کا دل بھی کمزور ہو گیا تھا۔ وہ جو ارادہ کرتی، اسے ذرا سے اصرار پر فسخ کر دیتی۔ وہ لیٹ ہوتی اور للو آ کر جبراً اس کے سینے پر بیٹھ جاتا اور دودھ پینے کی کوشش کرتا۔ وہ اب دو سال کا ہو گیا تھا۔ بڑے تیز دانت نکل آئے تھے۔ منہ میں دودھ نہ جاتا تو وہ غصے میں آ کر دانتوں سے کاٹ لیتا۔ مگر جھنیا میں اب اتنی سکت نہ تھی کہ اسے اپنے اوپر سے دھکیل دے۔ اسے ہر وقت موت سامنے کھڑی نظر آتی۔ شوہر اور بچہ کسی سے بھی اسے رغبت نہ تھی۔ سبھی اپنے مطلب کے یار تھے۔ برسات کے دنوں میں جب للو کو دست آنے لگے اور اس نے دودھ پینا چھوڑ دیا تو جھنیا کو اپنے سر سے ایک بلا کے ٹل جانے کا احساس ہوا، مگر جب ایک ہفتے کے بعد لڑکا مر گیا تو اس کی یاد مہر ادی سے زندہ ہو کر رلانے لگی۔

جھنیا کو اب للو کی یاد للو سے زیادہ عزیز تھی۔ للو جب تک سامنے تھا تو وہ اس سے جتنا سکھ پاتی تھی، اب اس سے کہیں زیادہ دکھ پاتی ہے۔

اب للو اس کے دل میں آ بیٹھا تھا۔ مطمئن، ساکن، محبت سے معمور اور ہنستا ہوا، اس کے تصور میں اب المناک سرور تھا جس میں ظہور کا سیاہ سایہ نہ تھا۔ باہر والا للو اس کے اندر والے للو کا محض عکس تھا۔ وہ عکس سامنے نہ تھا جو بابل اور ناپائیدار تھا۔ حقیقی مجسمہ تو اس کے اندر تھا جو اس کی تمناؤں اور خیر اندیشوں سے زندہ ہو رہا تھا۔ دودھ کی بجائے وہ اسے اپنا خون پلا پلا کر پال رہی تھی۔ اسے اب وہ بند کوٹھری اور وہ بدبودار ہوا اور وہ دونوں وقت آگ کے سامنے جلنا، ان باتوں کا گویا احساس ہی نہ رہ گیا تھا۔ وہ میٹھی یاد دلنشین ہو کر گویا اسے قوت دے رہی تھی۔ جیتے جی جو اس کی زندگی کا بار تھا، وہ مر کر اس کی روح میں سما گیا تھا۔ اس کی ساری ممتا اندر کی طرف جا کر باہر کی جانب سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ گوبر دیر میں آتا ہے یا جلدی، رغبت سے کھانا کھتا ہے یا نہیں، خوش ہے یا رنجیدہ، ان باتوں کی اب اسے بالکل فکر نہ تھی۔ گوبر کیا کماتا ہے اور کیسے خرچ کرتا ہے، اس کی بھی اسے پروا نہ تھی۔ اس کی زندگی جو کچھ تھی اندر تھی، باہر تو صرف ایک بیجان مشین تھی۔

اس کے غم میں شریک ہو کر، اس کی اندرونی زندگی میں شریک ہو کر، گوبر اس کے پاس جا سکتا تھا اور اس کی زندگی کا جزو بن سکتا تھا، مگر اس بیرونی زندگی کے خشک ساحل پر جا کر ہی پیاسا لوٹ آتا تھا۔

ایک دن اس نے رکھائی سے کہا۔ ''تو للو کے نام کو کب تک روئے جائے گی؟ چار پانچ مہینے تو ہو گئے۔''

جھنیا نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''تم میرا دکھ نہیں سمجھ سکتے۔ اپنا کام دیکھو۔ میں جیسی ہوں ویسی پڑی رہنے دو۔''

''تیرے روتے رہنے سے للو لوٹ آوے گا؟''

جھنیا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اٹھ کر دیگچی میں کچالو کے لیے آلو ابالنے لگی۔ اس نے گوبر کو ایسا سنگدل نہ سمجھا تھا۔

اس بیدردی نے للو کو اس کے دل میں اور بھی متحرک کر دیا۔ للو اسی کا ہے، اس میں کسی کا ساجھا نہیں، کسی کا حصہ نہیں۔ ابھی تک للو کچھ نہ کچھ اس کے دل کے باہر بھی تھا، گوبر کے دل میں بھی اس کا کچھ شائبہ تھا، مگر اب وہ پورے طور پر اسی کا تھا۔

گوبر نے خونچے سے نراش ہو کر شکر مل میں نوکری کر لی تھی۔ مسٹر کھنہ نے پہلے مل سے حوصلہ پا کر حال ہی میں یہ دوسرا مل کھول دیا تھا۔ گوبر کو وہاں بڑے سویرے جانا پڑتا اور دن بھر کے بعد جب وہ چراغ چلتے گھر واپس آتا تو اس کے بدن میں ذرا بھی جان نہ رہ جاتی۔ پہلے گھر پر بھی اسے کچھ کم محنت نہ کرنی پڑتی تھی مگر وہاں اسے ذرا بھی تکان نہ ہوتا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ہنس بول بھی لیا کرتا تھا۔ پھر اس کھلے میدان میں، کھلے آسمان کے نیچے، گوبر کی یہ کمی بھی پوری ہو جاتی تھی۔ وہاں اس کا جسم چاہے کتنا کام کرے، دل آزاد رہتا تھا۔ اب یہاں اتنی جسمانی محنت نہ ہونے پر بھی جیسے اسے طوفانی شور اور ہلچل کا اس پر بوجھ سا لدا رہتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب ڈانٹ پڑ جائے۔ سبھی مزدوروں کی یہی حالت تھی۔ سبھی تاڑی یا شراب میں اپنی جسمانی اور دماغی تکان کو ڈبویا کرتے تھے۔ گوبر کو بھی شراب کو چسکا پڑا۔ گھر آتا تو نشہ میں چور اور پہر رات گئے اور اگر کوئی نہ

کوئی بہانہ کھوج کر جھنیا کو گالیاں دیتا، گھر سے نکالنے لگتا اور کبھی کبھی مار بھی دیتا۔

جھنیا کو اب یہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ داشتہ ہے۔ اسی لیے اس کی یہ ذلت ہوری ہے۔ منکوحہ ہوتے تو گوبر کی مجال نہ تھی کہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا، برادری اسے سزا دیتی، حقہ پانی بند کرتی۔ اس نے کتنی بڑی غلطی کی کہ اس بے وفا کے ساتھ گھر سے نکل بھاگی۔ ساری دنیا میں ہنسی بھی ہوئی اور ہاتھ کچھ نہ آیا۔ وہ گوبر کو اپنا دشمن سمجھنے لگی۔ نہ اس کے کھانے پینے کی پروا کرتی اور نہ اپنے کھانے پینے کی۔ گوبر اسے مارتا تو اسے ایسا غصہ آتا کہ اس کا گلا چھرے سے کاٹ ڈالے۔ زچگی کا زمانہ جیوں جیوں قریب آتا جاتا ہے، اس کی تشویش بڑھتی جاتی ہے۔ اس گھر میں تو اس کا مرن ہو جائے گا۔ کون اس کو دیکھ بھال کرے گا؟ کون سنبھالے گا؟ اور جو گوبر اسی طرح مارتا پیٹتا رہا، تو اس کا جینا اور بھی کٹھن ہوگا۔

ایک روز وہ نل پر پانی بھرنے گئی تو پڑوس کی ایک عورت نے پوچھا۔ ''کے مہینے کا ہے رہی؟''

جھنیا نے لجا کر کہا۔ ''کیا جانے دیدی، میں نے تو گنا ہی نہیں۔''

دوہرے بدن کی، سیاہ فام، پستہ قد، بدصورت عورت تھی۔ اس کا شوہر یکہ ہانکتا تھا اور وہ خود لکڑی کی دکان کرتی تھی۔ جھنیا کئی بار اس کے یہاں سے لکڑی لائی تھی۔ اسی قدر تعارف تھا۔

مسکرا کر بولی۔ ''مجھے تو جان پڑتا ہے کہ دن پورے ہو گئے ہیں۔ آج ہی کل میں ہوگا۔ کوئی دائی ٹھیک کر لی ہے؟''

جھنیا نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تو یہاں کسی کو نہیں جانتی۔''

''تیرا مرد کیسا ہے جو کان میں تیل ڈالے بیٹھا ہے؟''

''انہیں میری کیا پھکر (فکر)؟''

''ہاں دیکھ تو رہی ہوں۔ تم تو سودر (زچہ خانہ) میں بیٹھو گی، کوئی کرنے دھرنے والا چاہیے کہ نہیں؟ ساس، نند، دیورانی، جٹھانی کوئی ہے کہ نہیں؟ کسی کو بلا لینا تھا؟''

''میرے لیے سب مر گئے۔''

وہ پانی لا کر جھوٹھے برتن ملنے لگی تو زچگی کے اندیشے سے دل دھڑکنے لگا۔ سوچنے لگی کیسے کیا ہوگا بھگوان؟

انہہ! یہی تو ہوگا کہ مر جاؤں گی۔ اچھا ہے جنجال سے چھوٹ جاؤں گی۔

شام کو اس کے پیٹ میں درد شروع ہوا۔ سمجھ گئی کہ بپتا کی گھڑی آ پہنچی۔ پیٹ کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے اور پسینے میں بھیگی ہوئی اس نے چولھا جلایا، کھچڑی ڈالی اور درد سے بیتاب ہو کر وہیں زمین پر پڑی رہی۔ کوئی دس بجے رات کو گوبر آیا، تاڑی کی بدبو اڑتا ہوا لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اوٹ پٹانگ بک رہا تھا ''مجھے کسی کی پروا نہیں ہے جسے سو بار گرج (غرض) ہو، رہے، نہیں چلا جائے۔ میں کسی کا تاؤ نہیں سہہ سکتا۔ اپنے ماں باپ کا تاؤ نہیں سہا جن نے جنم دیا تب دوسروں کا تاؤ کیوں سہوں؟ جمعدار آنکھیں دکھاتا ہے تو یہاں کسی کی دھونس سہنے والے نہیں ہیں۔ لوگوں نے پکڑ نہ لیا ہوتا تو کھون (خون) پی جاتا کھون! کل دیکھوں گا بچہ کو پھانسی ہی تو ہوگی۔ دکھا دوں گا کہ مرد لوگ کیسے مرتے ہیں۔ ہنستا ہوا، اکڑتا ہوا اور مونچوں پر تاؤ دیتا ہوا پھانسی پر چڑھ جاؤں تو سہی۔ عورت کی جات! کتنی مطلبی ہوتی

ہے۔ کھچڑی ڈال دی اور پاؤں پسار کر سو رہی۔ کوئی کھائے چاہے نہ کھائے، اس کے ٹھینگے سے! آپ مجے (مزے) میں پھلکے اڑاتی ہے اور میرے لیے کھچڑی۔ اچھا ستالے جتنا ستائے بنے، تجھے بھگوان ستائیں گے۔

اس نے جھنیا کو جگایا نہیں۔ کچھ بولا بھی نہیں، چپکے سے کھچڑی تھالی میں نکالی اور دو چار لقمے نگل کر برآمدے میں لیٹ رہا۔ پچھلے پہر سے سردی لگی۔ کوٹھری میں کمبل لینے گیا تو جھنیا کے کراہنے کی آواز سنی، نشہ اتر چکا تھا۔

پوچھا۔ ''کیسا جی ہے جھنیا؟ کہیں درد ہے کیا؟''

''ہاں پیٹ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔''

''تو نے پہلے کیوں نہیں کہا؟ اب اس بکھت (وقت) کہاں جاؤں؟''

''کس سے کہتی؟''

''میں مر گیا تھا؟''

''تمہیں میرے مرنے جینے کی کیا چنتا؟''

گوبر گھبرایا۔ کہاں دائی کھوجنے جائے؟ اس وقت وہ آنے ہی کیوں لگی۔ گھر میں کچھ ہے بھی تو نہیں، چڑیل نے پہلے بتلا دیا ہوتا تو کسی سے دو چار روپے مانگ لاتا۔ ان ہی ہاتھوں میں سو پچاس روپے ہر دم پڑے رہتے تھے، چار آدمی کھسامد (خوشامد) کرتے تھے۔ اس چھنی کے یہاں آتے ہی جیسے لچھمی روٹھ گے، ٹکے ٹکے محتاج ہو گیا۔

دفعتاً کسی نے پکارا۔ ''یہ کیا تمہاری گھر والی کراہ رہی ہے؟ درد تو نہیں ہو رہا ہے؟''

یہ وہی موٹی کالی عورت تھی جس سے آج جھنیا کی بات چیت ہوئی تھی۔

گوبر نے برآمدے میں جا کر کہا۔ ''پیٹ میں درد ہے۔ چھٹ پٹا رہی ہے۔''

''یہاں کوئی دائی ملے گی؟''

''وہ تو میں آج اسے دیکھ گئی تھی۔ دائی کچی سرائے میں رہتی ہے۔ لپک کر بلا لاؤ، تب تک میں یہاں بیٹھی ہوں۔''

''میں نے کچی سرائے نہیں دیکھی، کدھر ہے؟''

''اچھا تم اسے پنکھا جھلتے رہو، میں بلائے لاتی ہوں۔ یہی کہتے ہیں کہ اناڑی آدمی کسی کام کا نہیں۔ پورا پیٹ اور دائی کی کھوج نہیں۔''

یہ کہتی ہوئی وہ چل دی۔ اس کے منہ پر تو لوگ اسے چوہیا کہتے تھے لیکن غیبت میں مطلی کہا کرتے تھے۔ کسی کو مطلی کہتے سن لیتی تھی تو اس کے ساتھ پرکھوں تک چڑھ جاتی تھی۔

گوبر بیٹھے دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گیوہ لوٹ آئی اور بولی۔ ''اب سنسار میں گریبوں کا کیسا نباہ ہوگا۔ رانڈ کہتی ہے کہ پانچ روپے لوں گی، تب چلوں گی اور آٹھ آنے روج (روز) اور بارہویں دن ایک ساڑھی میں نے کہا تیرا منہ جھلس دوں! تو جا چولھے میں! میں دیکھ لوں گی، بارہ بچوں کی ماں یوں ہی نہیں ہو گئی ہوں۔ تم باہر آ جاؤ گوبر دھن، میں سب کر لوں گی۔ بکھت پر آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ چار بچے جنا لیے تو دائی بن بیٹھی۔''

وہ جھنیا کے پاس جا بیٹھی اور اس کا سر اپنی جانگھ پر رکھ کر اس کا پیٹ سہلاتی ہوئی بولی ''میں آج تجھے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔ سچ پوچھو تو آج اسی دھڑکے میں

مجھے نیند نہیں آئی۔ یہاں تیرا کون سگا بیٹھا ہے؟''

جھنیا نے درد سے دانت جما کر سی کرتے ہوئے کہا۔ ''اب نہ بچوں گی دیدی۔ میں تو بھگوان سے مانگنے نہ گئی تھی۔ ایک کو پالا پوسا۔ اسے تم نے چھین لیا تو پھر اس کا کون کام تھا؟ میں مر جاؤں ماتا تو اس بچے پر دیا کرنا، اسے پال پوس لینا۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں گے۔''

چوہیا محبت سے اس کے بال سلجھاتی ہوئی بولی۔ ''دھیرج دھر بیٹی، دھیرج دھر! ابھی چھن بھر میں کشٹ (تکلیف) کٹا جاتا ہے۔ تو نے بھی جیسے چچی سادھ لی تھی۔ اس میں کس بات کی لاج؟ مجھ سے بتا دیا ہوتا تو میں مولوی صاحب کے پاس سے گنڈا لا دیتی، وہی مرجا (مرزا) جی جو اس حاطے میں رہتے ہیں۔''

اس کے بعد جھنیا کو کچھ ہوش نہ رہا۔ نو بجے صبح اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ چوہیا بچے کو لیے بیٹھی ہے اور وہ صاف ساڑھی پہنے ہوئے لیٹی ہے۔ ایسی کمزور تھی گویا بدن میں خون کا نام نہ ہو۔

چوہیا روزانہ صبح آ کر جھنیا کے لیے حریرہ اور حلوا پکا جاتی اور دن میں بھی کئی بار آ کر بچے کو ابٹن ملتی اور اوپر کا دودھ پلا جاتی۔ آج چوتھا دن تھا مگر جھنیا کے دودھ نہ اترا تھا۔ بچہ رو کر گلا پھاڑے لیتا تھا کیونکہ اوپر کا دودھ اسے ہضم نہ ہوتا تھا۔ ایک لمحہ بھی چپ نہ رہتا۔ چوہیا اپنا دودھ اس کے منہ میں دیتی۔ بچہ ایک منٹ چوستا مگر جب دودھ نہ نکلتا تو چیخنے لگتا۔ جب چوتھی شام تک بھی جھنیا کے دودھ اترا تو چوہیا گھبرائی۔ بچہ سوکھتا چلا جاتا تھا۔ بخاس پر ایک پنشنر ڈاکٹر رہتے تھے۔ وہ انہیں لے آئی۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا۔ ''اس کے بدن میں خون تو ہے نہیں، پھر دودھ کہاں

سے آئے؟ معاملہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بدن میں خون لانے کے لیے مہینوں مقوی دوائیں کھانی پڑیں گی تب کہیں دودھ اترے گا۔ اس وقت تک تو اس گوشت کے لوتھڑے کا کام ہی تمام ہو جائے گا۔''

پھر رات ہو گئی تھی۔ گوبر تاڑی پئے ہوئے دالان میں پڑا تھا۔ چوہیا بچے کو چپ کرانے کے لیے اس کے منہ میں اپنا دودھ ڈالے ہوئے تھی۔ یکا یک اسے معلوم ہوا کہ اس کے خود دودھ اتر آیا ہے۔ خوش ہو کر بولی

''لے جھنیا اب تیرا بچہ جی جائے گا، میرے دودھ آ گیا۔''

جھنیا نے تعجب سے کہا۔ ''تمہارے دودھ آ گیا۔''

''نہیں ری، سچ!''

''میں بسوا س نہیں کرتی۔''

''دیکھ لے۔''

اس نے اپنا دودھ دبا کر دکھایا۔ دھار پھوٹ نکلی۔

جھنیا نے پوچھا۔ ''تمہاری چھوٹی لڑکی تو آٹھ سال سے کم نہیں ہے؟''

''ہاں اٹھواں برس ہے، پر میرے دودھ ہوتا تھا۔''

''ادھر تو تمہیں کوئی بال بچہ نہیں ہوا؟''

''وہی لڑکی پیٹ پوچھنی (آخری) تھی، چھاتی بالکل سوکھی گئی تھی مگر بھگوان لیلا ہے اور کیا۔''

اب سے چوہیا چار پانچ بار آ کر بچے کو دودھ پلاتی۔ بچہ پیدا تو ہوا تھا کمزور، مگر چوہیا کا صحت بخش دودھ پی کر موٹا ہوتا جاتا تھا۔ ایک روز چوہیا ندی نہانے چلی گئی

۔ بچہ بھوک سے جھٹ پٹا نے لگا۔ چوہیا دس بجے لوٹی تو جھنیا بچہ کو کندے سے لگائے جھلا رہی تھی اور وہ روئے جاتا تھا۔ چوہیا نے بچے کو اس کی گود سے لے کر دودھ پلا دینا چاہا مگر جھنیا نے اسے جھڑک کر کہا۔ ''رہنے دو۔ ابھاگا مر جائے یہی اچھا۔ کسی کا احسان تو نہ لینا پڑے۔''

چوہیا گڑگڑانے لگی۔ جھنیا نے بڑے مناؤں کے بعد بچے کو اس کی گود میں دیا۔

لیکن جھنیا اور گوبر میں اب بھی نہ بنتی تھی۔ جھنیا کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ یہ پکا مطلبی اور بے درد آدمی ہے، مجھے صرف اپنے شوق و آرام کی چیز سمجھا ہے، چاہے میں مروں یا جیوں۔ اس کی اچھا پوری ہوتی جائے۔ اسے بالکل رنج نہیں۔ سوچتا ہوگا کہ یہ مر جائے گی تو سری لاؤں گا مگر منہ دھور کھیں بچو! میں ہی ایسی اکھڑ تھی کہ تمہارے پھندے میں آ گئی، تب تو پاؤں پڑتا رہتا تھا۔ اب یہاں آتے ہی نہ جانے کیوں جیسے اس کا سبھاؤ ہی بگڑ گیا۔ جاڑا آ گیا تھا۔ مگر نہ اوڑھنے کو تھا نہ بچھانے کو۔ روٹی دال سے جو دو چار روپے بچتے، وہ تاڑی میں اڑ جاتے تھے۔ ایک پرانا لحاف تھا، دونوں اسی میں سوتے تھے۔ پھر بھی ان میں سو کوس کا فاصلہ تھا۔ دونوں ایک ہی کروٹ میں رات کاٹ دیتے تھے۔

گوبر کا جی بچے کو گود میں لے کر کھلانے کے لیے ترس کر رہ جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات کو اٹھ کر اس کا پیار مکھڑا دیکھ لیا کرتا، مگر جھنیا کی جانب سے اس کے دل میں کشیدگی تھی۔ جھنیا بھی اس سے بات نہ کرتی، نہ اس کی کچھ خدمت ہی کرتی۔ دونوں کے درمیان میں یہ کدورت، وقت کے ساتھ لوہے میں زنگ کی طرح

گہری، مضبوط اور سخت ہوتی جاتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی باتوں کا الٹا مطلب نکالتے، وہی جس سے باہمی منافرت میں زیادتی ہو اور کئی دن تک ایک ایک بات کو دل میں رکھے رہتے اور اسے اپنا خون پلا پلا کر اک دوسرے پر جھپٹ پڑنے کے لیے تیاری کرتے رہتے، گویا شکاری کتے ہوں۔

ادھر گوبر کے کارخانے میں بھی آئے دن ایک نہ ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ اب کے بجٹ میں شکر پر ٹیکس لگ گیا تھا۔ مل کے مالکوں کو اجرت گھٹا کا اچھا بہانہ مل گیا۔ ٹیکس سے اگر پانچ کا نقصان تھا تو اجرت گھٹا دینے سے دس کا منافع تھا۔ ادھر مہینوں سے اس مل میں بھی یہی مسئلہ چھڑا ہوا تھا۔ مزدور جماعت ہڑتال کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔ ادھر مزدوری گھٹی اور ادھر ہڑتال ہوئی۔ مزدوری میں دھیلے کی کمی بھی منظور نہ تھی۔ جب اس مہنگائی کے دنوں میں ایک دھیلا بھی اجرت نہ بڑھی تو اب وہ گھاٹے میں کیوں ساتھ دے؟ مرزا خورشید مزدور سبھا کے پریذیڈنٹ اور پنڈت اونکار ناتھ ایڈیٹر 'بجلی' اس کے سیکرٹری تھے۔ دونوں ایسی ہڑتال کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ مل کے مالکوں کو کچھ دن یاد رہے۔ مزدوروں کو بھی ہڑتال سے نقصان پہنچے گا حتیٰ کہ ہزاروں آدمی کو روٹی کے لالے پڑ جائیں گے۔ اس پہلو پر ان کی نگاہ بالکل نہ تھی۔ گوبر ہڑتالیوں میں سب سے آگے تھے۔ اکھڑ سبھاؤ کا تھا ہی، للکارنے بھر کی ضرورت تھی، پھر تو وہ مرنے مارنے سے نہ ڈرتا تھا۔ ایک دن جھنیا نے اسے جی کڑا کر کے سمجھایا بھی کہ تم بال بچے والے آدمی ہو، تمہارا اس طرح آگ میں کودنا اچھا نہیں مگر گوبر بگڑا اٹھا۔ ''تو کون ہوتی ہے میری بیچ میں بولنے والی؟ میں تجھ سے صلاح نہیں ہو چھتا۔'' بات بڑھ گئی اور گوبر نے جھنیا کو

خوب پیٹا۔ چوہیا نے آ کر جھنیا کو چھڑایا اور گوبر کو ڈانٹنے لگی۔ گوبر کے سر پر شیطان سوار تھا۔ سرخ سرخ آنکھیں نکال کر بولا۔ ''تم میرے گھر مت آیا کرو چوہیا، تمہارے آنے کا کچھ کام نہیں۔''

چوہیا نے طنز سے کہا۔ ''تمہارے گھر میں نہ آؤں گی تو میری روٹیاں کیسے چلیں گی؟ یہیں سے مانگ مانگ کر لے جاتی ہوں تب تو اگرم ہوتا ہے، میں ہوتی لالہ تو یہ بی بی آج تمہاری لاتیں کھانے کے لیے بیٹھی نہ ہوتی۔''

چوہیا وہیں جمی ہوئی بے خوف کھڑی رہی۔ ''اچھا اب چپ رہنا گوبر۔ بیچاری ادھ مری عورت کو مار کر تم نے کوئی بڑی بہادری کا کام نہیں کیا ہے۔ تم اس کے لیے کیا کرتے ہو کہ تمہاری مار سہے؟ ایک روٹی کھلا دیتے ہو اسی لیے؟ اپنا بھاگ سراہو کہ ایسی گئو عورت پا گئے ہو۔ دوسری ہوتی تو تمہارے منہ پر جھاڑو مار کر نکل گ ء ہوتی۔''

محلے کے لوگ جمع ہو گئے اور چاروں طرف سے گوبر پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ وہی لوگ جو اپنے گھروں میں اپنی عورتوں کو روز پیٹتے تھے، اس وقت رحم و انصاف کے پتلے بنے ہوئے تھے۔ چوہیا اور شیر ہو گئی اور فریاد کرنے لگی۔ ''داڑھی جار کہتا ہے کہ میرے گھر نہ آیا کرو۔ بی بی بچہ رکھنے چلا ہے، پر یہ نہیں جانتا کہ بی بی بچوں کو پالنا بڑے گردے کا کام ہے۔ اس سے پوچھو۔ میں نہ ہوتی تو آج یہ بچہ جو بچھڑے کی طرح کلیلیں کر رہا ہے، کہاں ہوتا؟ عورت کو مار کر جوانی دکھاتا ہے۔ میں نہ ہوتی تو تیری بی بی نہیں تو یہی جوتی اٹھا کر تیرے منہ پر تڑاتڑ جماتی اور کوٹھری میں دھکیل کر باہر سے کنڈی بند کر دیتی۔ دانے دانے کو ترس

جاتے۔''

گوبر جھلایا ہوا اپنے کام پر چلا گیا۔ چوہیا مرد ہوتی تو مزا چکھا دیتا۔ عورت کے منہ کیا لگے؟

مل میں بے چینی کے بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ مزدور 'بجلی' پرچے جیب میں لیے پھرتے اور ذرا بھی موقع پاتے تو دو تین مزدور مل کر اسے پڑھنے لگتے۔ اخبار کی بکری خوب بڑھ رہی تھی۔ مزدوروں کی لیڈر 'بجلی' کے کارخانے میں آدھی رات تک بیٹھے ہڑتال کی تجویزیں سوچا کرتے اور صبح جب اخبار میں خبر جلی حروف میں نکلتی تو پبلک ٹوٹ پڑتی اور اخبار کی کاپیاں دوگنی تگنی قیمت پر بک جاتیں۔ ادھر کمپنی کے ڈائریکٹر بھی اپنی گھات میں بیٹھے تھے۔ ہڑتال ہونے میں ہی ان کا فائدہ تھا۔ آدمیوں کی کمی تو ہے نہیں..... بے کاری بڑھی ہوئی ہے۔ اس سے نصف اجرت پر ویسے ہی آدمی آسانی سے مل سکتے ہیں۔ مال کی تیاری میں ایک دم آدھی بچت ہو جائے گی۔ دس پانچ دن کام کا حرج ہوگا، کچھ پروا نہیں، آخر طے ہو گیا کہ اجرت میں کمی کا اعلان کر دیا جائے۔ دن اور وقت مقرر کر دیا گیا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی۔ مزدوروں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ اپنی گھات میں تھے۔ اسی وقت ہڑتال کرنا چاہتے تھے جب گودام میں بہت تھوڑا مال رہ جائے اور مانگ کی زیادتی ہو۔

یکا یک ایک روز جب مزدور شام کو چھٹی پا کر جانے لگے تو ڈائریکٹروں کا اعلان سنا دیا گیا۔ اسی وقت پولیس آ گئی۔ مزدوروں کو اپنی مرضی کے خلاف اسی وقت ہڑتال کرنی پڑے۔ جب گودام اتنا مال بھرا ہوا تھا کہ بہت زیادہ مانگ

ہونے پر بھی چھ مہینے کے پہلے نہ اٹھ سکتا تھا۔

مرزا خورشید نے یہ خبر سنی تو مسکرائے جیسے کوئی ہوشیار جنرل اپنے دشمن کی جنگی کمال پر خوش ہو گیا ہو۔ ایک لمحہ غور کرنے کے بعد بولے۔ ''اچھی بات ہے۔ اگر ڈائریکٹروں کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔ حالات ان کے موافق ہیں، لیکن ہمیں بھی حق و انصاف پر بھروسہ ہے۔ وہ لوگ نئے آدمی رکھ کر اپنا کام چلانا چاہتے ہیں۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ انہیں ایک بھی آدمی نہ ملے، یہی ہماری فتح ہو گی۔''

'بجلی' کے دفتر میں اس وقت خطرے کی میٹنگ ہوئی۔ کارکن کمیٹی بنائی گئی، عہدے داروں کا انتخاب ہوا اور آٹھ بجے رات کو مزدوروں کا لمبا جلوس نکلا۔ دس بجے رات کو اگلے دن کا سارا پروگرام طے کیا گیا اور یہ تاکید کر دی گئی کہ کسی طرح کا شر و فساد نہ ہونے پائے۔

مگر ساری کوشش بیکار ہوئی۔ ہڑتالیوں نے نئے مزدوروں کی کثیر تعداد مل کے پھاٹک پر کھڑی دیکھی تو ان کی مفسدانہ رغبت قابو سے باہر ہو گئی۔ سوچا تھا کہ سو سو پچاس پچاس آدمی روزانہ بھرتی کے لیے آئیں گے تو انہیں سمجھا بجھا کر یا دھمکا کر بھگا دیں گے۔ ہڑتالیوں کی تعداد دیکھ کر آنے والے مزدور آپ ہی ڈر جائیں گے، مگر یہاں تو نقشہ ہی دگرگوں تھا۔ اگر یہ کل آدمی بھرتی ہو گئے تو ہڑتالیوں کے لیے سمجھوتے کی کوئی امید نہ تھی۔ طے ہوا کہ نئے آدمیوں کو مل میں جانے ہی نہ دیا جائے۔ طاقت کے استعمال کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ نیا گروہ بھی مرنے مارنے پر تیار تھا۔ ان میں زیادہ تر مرد بھوکے تھے جو اس موقع کو کسی طرح بھی ہاتھ سے نہ

جانے دینا چاہتے تھے۔ پھر کون مرجانے یا اپنے بال بچوں کو بھوکوں مرتے دیکھنے سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ حالات حاضر کا مقابلہ کرتے ہوئے مریں۔ دونوں جماعتوں میں فوجداری ہوگئی۔ 'بجلی' کے ایڈیٹر تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہاں بیچارے مرزا جی پٹ گئے اور ان کے بچانے میں گوبر بھی بری طرح زخمی ہوا۔ مرزا پہلوان آدمی تھے اور منجھے ہوئے پھنکیٹ۔ اپنے اوپر کوئی گہرا وار نہ پڑنے دیا۔ گوبر دہقانی تھا، پورا لٹھ مار، اپنی حفاظت کرنا نہ جانتا تھا جو لڑائی میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی، سر پھٹ گیا اور آخر کار وہیں ڈھیر ہو گیا۔ کندھوں پر بے شمار لاٹھیاں پڑی تھیں جس سے اس کا ایک ایک عضو چور ہو گیا تھا۔ ہڑتالیوں نے اسے گرتے دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف دس بارہ چنے ہوئے آدمی مرزا کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ نئے آدمی فتح کا جھنڈا اڑاتے ہوئے مل میں داخل ہوئے اور ہارے ہوئے ہڑتالی اپنے زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر اسپتال پہنچانے لگے، مگر اسپتال میں اتنے آدمیوں کے لیے جگہ نہ تھی۔ مرزا تو لے لیے گئے، گوبر کو مرہم پٹی کر کے اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔

جھنیا نے گوبر کا وہ بے جان سا جسم دیکھا تو اس میں انسانیت پیدا ہوگئی۔ اب تک اس نے اسے طاقت کی شکل میں دیکھا تھا جو اس پر حکومت کرتا تھا اور اسے ڈانٹتا مرتا تھا۔ آج وہ ناکارا، بے کس اور قابل رحم تھا۔ جھنیا نے کھاٹ پر جھک کر آنسو بھری آنکھوں سے گوبر کو دیکھا اور گھر کی حالت کا خیال کر کے گوبر پر رشک آمیز غصہ آیا۔ گوبر جانتا تھا کہ گھر میں ایک پیسہ نہیں ہے۔ وہ بھی جانتا تھا کہ کہیں سے ایک پیسہ ملنے کی امید نہیں ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی اس کے بار بار سمجھانے

پر بھی اس نے یہ آفت اپنے اوپر لی۔ اس نے کتنی بار کہا تھا کہ تم اس جھگڑے میں نہ پڑو، آگ لگانے والے آگ لگا کر الگ ہو جائیں گے اور جائے گی غریبوں کے سر، لیکن وہ کب اس کی سننے والا تھا۔ وہ تو اس کی بیرن تھی۔ دوست تو وہ لوگ تھے جو مزے سے موٹروں میں گھوم رہے ہیں۔ اس غصے میں ایک طرح کا اطمینان تھا جیسے ہم ان بچوں کو کرسی سے گرتے دیکھ کر جو بار بار منع کرنے پر بھی کھڑے ہونے سے باز نہ آتے، چلا اٹھتے ہیں۔ ''اچھا ہوا،، بہت اچھا، تمہارا سر کیوں نہ پھٹ گیا۔''

لیکن ایک ہی لمحے میں گوبر کا چلانا سن کر اس کے سارے ہوش و حواس ٹھکانے آ گئے۔ درد و تکلیف میں ڈوبے ہوئے اس کے منہ سے یہ لفظ نکلے۔ ''ہائے ہائے! سارا بدن بھرکس ہو گیا۔ سبوں کو تنک بھی دیا نہ آئی۔''

وہ اسی طرح بڑی دیر تک گوبر کا منہ دیکھتی رہی۔ وہ بجھتی ہوئی امید سے زندگی کی کوئی علامت پا لینا چاہتی تھی اور ہر لمحہ اس کا صبر و استقلال غروب ہونے والے سورج کی طرح ڈوبتا جاتا تھا اور مستقبل کی تاریکی سے اپنے اندر سمیٹے لیتی تھی۔

دفعتاً چوہیا نے پکارا۔ ''گوبر کا کیا حال ہے بہو؟ میں نے تو ابھی سنا، دکان سے دوڑی آئی ہوں۔''

جھنیا کے رکے ہوئے آنسو ابل پڑے۔ کچھ بول نہ سکی۔ سہمی ہوئی آنکھوں سے چوہیا کی طرف دیکھا۔

چوہیا نے گوبر کا منہ دیکھا، اس کے سینے پر ہاتھ رکھا تشفی کے لہجے میں بولی۔ ''یہ چار دن میں اچھے ہو جائیں گے۔ گھبرا مت، کسل ہوئی، تیرا سہاگ بلوان تھا،

کئی آدمی اسی دنگے میں مر گئے۔ گھر میں کچھ روپے پیسے ہیں؟''

جھنیا نے شرم سے سر ہلا دیا۔

''میں لائے دیتی ہوں۔ تھوڑا سا دودھ لا کر گرم کر لے۔''

جھنیا نے اس کے پیر پکڑ کر کہا۔ ''دیدی! تم ہی میری ماتا ہو۔ میرا اور دوسرا کوئی نہیں ہے۔''

جاڑوں کی اداس شام آج اور بھی اداس لگ رہی تھی۔ جھنیا نے چولھا جلایا اور دودھ ابالنے لگی۔

چوہیا برآمدے میں بچے کو کھلا رہی تھی۔

دفعتاً جھنیا بھرے ہوئے گلے سے بولی۔ ''میں بڑی ابھاگن ہوں دیدی! میرے جی میں ایسا آ رہا ہے جیسے میرے ہی کارن ان کی یہ گت ہوئی ہے۔ جی کڑھتا ہے تب دل دکھی ہوتا ہی ہے۔ پھر گالیاں بھی نکلتی ہیں اور سراپ بھی نکلتا ہے۔ کون جانے میری گالیوں.....''

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ آنسوؤں کے بہاؤ میں آواز بھی بہہ گئی۔

چوہیا نے آنچل سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''کیسیا تیں سوچتی ہے بیٹی؟ یہ تیرے سیندور کا بھاگ ہے کہ بچ گئے مگر ہاں اتنا ہے کہ آپس میں لڑائی ہو تو منہ سے جتنا بک لے، پر من میں میل نہ رکھے۔ بیچ اندر پڑا تو انکھوا نکلے بنا نہیں رہتا۔''

جھنیا نے تھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''اب میں کیا کروں دیدی؟''

چوہیا نے ڈھارس دی۔ ''کچھ نہیں بیٹی۔ بھگوان کا نام لے، وہی گریبوں

(غریبوں) کی رکھشا (حفاظت) کرتے ہیں۔''

اسی وقت گوبر نے آنکھیں کھولیں اور جھنیا کو سامنے دیکھ کر التجا کے انداز سے کمزور آواز میں بولا۔ ''آج بہت چوٹ کھا گیا جھنیا! میں کسی سے کچھ نہیں بولا۔ سبوں نے ایک دم مجھے مارا۔ کہا سنا چھما کرنا! تجھے ستاتا تھا، اسی کا یہ پھل ملا۔ تھوڑی دیر کا اور مہمان ہوں۔ اب نہ بچوں گا۔ درد کے مارے سارا بدن پھٹا جاتا ہے۔''

چوہیا نے اندر آ کر کہا۔ ''چپ چاپ پڑے رہو، بولو چالو نہیں مرو گے نہیں، اس کا میرا جمہ (ذمہ)۔''

گوبر کے چہرے پر امید کی جھلک آ گئی، بولا۔ ''سچ کہتی ہو، میں مروں گا نہیں؟''

''ہاں، نہیں مرو گے۔ تمہیں ہوا کیا ہے؟ جرا (ذرا) سر میں چوٹ آ گئی ہے اور ہاتھ کی ہڈی اتر گئی ہے۔ ایسی چوٹیں مردوں کو نت ہی لگا کرتی ہیں۔ ان سے کوئی نہیں مرتا۔''

''اب جھنیا کو کبھی نہ ماروں گا۔''

''ڈرتے ہو گے کہ کہیں جھنیا تمہیں نہ مارے۔''

''وہ مارے گی بھی تو نہ بولوں گا۔''

''اچھے ہونے پر بھول جاؤ گے۔''

''نہیں دیدی، کبھی نہ بھولوں گا۔''

گوبر اس وقت بچوں کی سی باتیں کیا کرتا۔ دس پانچ منٹ غافل پڑا رہتا۔ اس

کا جی نہ جانے کہاں کہاں اڑتا پھرتا، کبھی دیکھتا کہ وہ ندی میں ڈوبا جا رہا ہے اور جھنیا اسے بچانے کے لیے ندی میں چلی آ رہی ہے، کبھی دیکھتا کہ دیو اس کے سینے پر سوار ہے اور جھنیا کی شکل کی کوئی دیوی اسے بچا رہی ہے اور بار بار چونک کر پوچھتا۔ ''میں مروں گا تو نہیں، جھنیا؟''

تین دن اس کے یہی حالت رہی اور جھنیا نے رات کو جاگ کر اور دن کو پاس کھڑے رہ کر گویا موت کے منہ سے اسے بچایا۔ بچے کو چوہیا سنبھالے رہتی تھی۔ چوتھے دن جھنیا یکہ لائی اور سب نے گوبر کو اس پر لاد کر اسپتال پہنچایا۔ وہاں سے لوٹ کر گوبر کو معلوم ہوا کہ اب وہ سچ مچ بچ جائے گا۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''مجھے چھما کر دو جھونا!''

ان تین چار دن میں چوہیا کے تین چار روپے خرچ ہو گئے تھے اور اب جھنیا کو اس سے کچھ لینے میں تامل ہوتا تھا۔ وہ بھی کوئی مالدار تو نہیں تھی، لکڑی کی بکری کے روپے جھنیا کو دے دیتی تھی۔ آخر جھنیا نے کچھ کام کرنے کا ارادہ کیا۔ ابھی گوبر کو اچھا ہونے میں مہینوں لگیں گے، کھانے پینے کو چاہیے۔ وہ کچھ کام کر کے کھانے بھر کو تو لے ہی آئے گی۔ بچپن سے اس نے گایوں کا پالنا اور گھاس چھیلنا سیکھا تھا۔ یہاں گائیں تو تھیں نہیں، وہاں وہ گھاس چھیلنے جاتے اور آٹھ دس آنے کما لیتے تھے وہ علی الصباح گوبر کا ہاتھ منہ دھلا کر اور بچے کو اسے سونپ کر گھاس چھیلنے چلی جاتی اور بھوکی پیاسی تیسرے پہر تک چھیلتی رہتی۔ پھر اسے منڈی میں لے جا کر بیچتی اور شام کو گھر آتی رات کو بھی وہ گوبر کی نیند سوتی اور گوبر کی نیند جاگتی۔ مگر اتنی سخت محنت کرنے پر بھی اس کا دل ایسا بشاش رہتا گویا جھولے پر بیٹھی گا رہی

ہو۔ راستے بھر ہمراہی عورتوں، مردوں سے ہنستی بولتی ہوئی چلی جاتی اور گھاس چھیلتے وقت بھی سب میں ویسی ہی باتیں ہوتی رہتیں، نہ تقدیر کا شکوہ نہ تباہی کا گلہ۔ زندگی کی معنویت میں یگانوں کے لیے زبردست سے زبردست ایثار میں اور آزادانہ مذمت میں جو خوشی ہے، اسی کی چمک اس کے ہر ہر عضو سے ظاہر تھی۔ بچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر جیسے تالیاں بجا بجا کر خوش ہوتا ہے، کچھ ویسی ہی خوشی وہ بھی محسوس کر رہی تھی، گویا اس کے دل میں خوشی کا کوئی چشمہ جاری ہو گیا ہو اور جب دل بحال ہو تو پھر بھی کیوں ویسا ہی نہ رہے؟ اسی ایک مہینے میں جیسے اس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ اس کے اعضاء میں اب سستی نہیں بلکہ تیزی ہے، لچک ہے اور نزاکت ہے۔ چہرے پر وہ زردی نہیں بلکہ خون کی گلابی رنگت ہے، اس کا شباب جو اس کوٹھری میں پڑے پڑے ذلت اور خانہ نگی سے افسردہ ہو گیا تھا، وہ گویا ہوا اور روشنی پا کر لہلہا اٹھا ہے۔ اب اسے کسی بات پر غصہ نہیں آتا۔ بچے کے ذرا سے رونے پر جو وہ جھنجھلا اٹھا کرتی تھی، اب گویا اس کی برداشت اور محبت کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ اس کے خلاف گوبر اچھا ہوتے جانے پر بھی کچھ اداس رہتا تھا۔ جب ہم اپنے عزیز ظلم کرتے ہیں اور جب مصیب آپڑنے سے ہم میں اتنی طاقت آجاتی ہے کہ اس کی شدید تکلیف کو خود محسوس کر سکیں تو اس سے ہمارا دل بیدار ہو جاتا ہے اور ہم اس بے جا سلوک کا کفارہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ گوبر اسی کفارے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ اب اس کی زندگی کا رویہ بالکل دوسرا ہو گا جس میں تلخی کی جگہ شیرینی ہو گی اور غرور کے بجائے انکسار، اسے اب معلوم ہوا کہ خدمت کرنے کا موقع بڑی خوش قسمتی سے ملتا ہے اور اب وہ اسے کبھی نہ بھولے

گا۔

(28)

مسٹر کھنا کو مزدوروں کی یہ ہڑتال بالکل بے جا معلوم ہوتی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ عوام کے ساتھ ملے رہنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خود کو عوام ہی کا آدمی سمجھتے تھے۔ سابق قومی تحریک میں انہوں نے بڑا حوصلہ دکھایا تھا۔ اس وقت ضلع کے خاص لیڈر تھے، دو بار جیل گئے تھے اور کئی ہزار کا نقصان اٹھایا تھا۔ اب وہ مزدوروں کی شکایتیں سننے کے لیے تیار تھے، مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ مل کے حصے داروں کے فائدے کا خیال قطعی چھوڑ دیں۔ اپنا سوارتھ چھوڑ دینے کو وہ تیار ہو سکتے تھے، بشرطیکہ ان کی بلند خیالی سے مس ہو مگر حصے داروں کے اغراض کی حفاظت نہ کرنا، یہ تو ادھر تھا، یہ تو کاروبار ہے، کوئی سدابرت نہیں کہ سب کا سب مزدوروں ہی کو بانٹ دیا جائے۔ حصے داروں کو یقین دلا کر روپے لیے گئے تھے کہ اس کام میں پندرہ بیس روپے سینکڑے کا منافع ہے اور اگر انہیں دس روپے سینکڑہ بھی نہ ملتے تو وہ ڈائریکٹر اور خصوصاً کھنا کو دھوکہ بازی سمجھیں گے۔ پھر اپنی تنخواہ وہ کیسے کم کر سکتے تھے؟ اور کمپنیوں کو دیکھتے انہوں نے اپنی تنخواہ بہت کم رکھی تھی۔ صرف ایک ہزار روپے ماہوار لیتے تھے تو مل کے چلانے کا سارا انتظام بھی تو ان ہی کے ذمہ تھا۔ مزدور صرف ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔ ڈائریکٹر اپنی عقل سے، اپنے علم سے اور اپنے اثر سے کام کرتا ہے۔ دونوں طاقتوں کی قیمت برابر تو نہیں ہو سکتی۔ مزدوروں کو یہ سوچ کر کیوں نہیں صبر ہوتا کہ کساد بازاری کا وقت ہے اور چاروں طرف بیکاری پھیلی ہونے کے سبب آدمی سستے ہو گئے ہیں، انہیں تو ایک کی جگہ پون بھی

ملے تو مطمئن رہنا چاہیے تھا۔ سچ پوچھو تو وہ مطمئن ہی ہیں۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو جاہل مطلق ہیں۔ شرارت تو اونکار ناتھ اور مرزا خورشید کی ہے۔ یہی لوگ ان غریبوں کو کٹھ پتلی کی طرح نچا رہے ہیں، صرف تھوڑے سے پیسے اور کچھ ناموری کے لالچ میں پڑ کر۔ یہ نہیں سوچتے کہ ان کی اس حرکت سے کتنے گھر تباہ ہو جائیں گے۔ اونکار ناتھ کا اخبار نہیں چلتا کھنا کیا کریں؟ اور آج ان کے اخبار کے ایک لاکھ گاہک ہو جائیں جس سے انہیں پانچ لاکھ کا منافع ہونے لگے تو کیا وہ صرف اپنی گزر بسر کے لیے لے کر بقیہ رقم کام کرنے والوں کو تقسیم کریں گے؟ کہاں کی بات اور یہ تیاگی مرزا بھی تو ایک دن لکھ پتی تھے اور ہزاروں مزدوران کے یہاں کام کرتے تھے، تو کیا وہ اپنی ضرورت بھری کی قلیل رقم میں یوروپین چھوکریوں کے ساتھ عیش وعشرت کرتے تھے، بڑے بڑے افسروں کے ساتھ دعوتیں اڑاتے، ہزاروں روپے ماہوار شراب پی جاتے تھے اور ہر سال فرانس اور سوئٹزر لینڈ کی سیر کرتے تھے؟ آج مزدوروں کی حالت پر ان کا کلیجا پھٹتا ہے!

ان دونوں لیڈروں کی تو کھنا کو پروا نہ تھی۔ ان کی نیت کی صفائی میں پورا شک تھا۔ نہ رائے صاحب ہی کی انہیں پروا تھی جو ہمیشہ کھنا کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے اور ان کی ہر بات کی تائی دکر دیا کرتے تھے، اپنے شناساؤں میں صرف ایک ہی شخص تھا جس کی غیر جانبدارانہ رائے پر کھنا کو کامل اعتماد تھا اور وہ تھے ڈاکٹر مہتا، جب سے انہوں نے مالتی سے اپنا تعلق بڑھانا شروع کیا تھا، کھنا کی نظروں میں ان کی عزت بہت کم ہو گئی تھی۔ مالتی برسوں کھنا کے دل کی ملکہ رہ چکی تھی مگر اس کو انہوں نے ہمیشہ کھلونا ہی سمجھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کھلونا انہیں بہت پیارا

تھا اور اس کے کھو جانے یا ٹوٹ جانے یا چھن جانے پر وہ روئے بھی تھے، مگر تھی وہ کھلونا ہی۔ انہیں کبھی مالتی پر بھروسا نہ ہوا، وہ کبھی کے شوق باہری پوشاک میں سما کر ان کے دل تک نہ پہنچ سکی تھی۔ وہ اگر خود کھنا سے بیاہ کے لیے کہتی تو وہ منظور نہ کرتے اور کسی نہ کسی حیلے سے ٹال دیتے۔ کتنے ہی اور انسانوں کی طرح کھنا کی زندگی بھی دوزخ تھی۔ ایک وہ تیاگ اور سیوک اور پکار کے پجاری تھے تو دوسری طرف خودغرضی، عیش پسندی اور اقتدار کے، ان کا اصلی رخ کون تھا، یہ کہنا مشکل ہے۔ شاید ان کی روح کا اعلیٰ نصف خدمت اور ہمدردی کے اجزاء سے بنا ہوا تھا اور ادنیٰ نصف خودغرضی اور عیش پسندی سے مگر اس اعلیٰ اور ادنیٰ میں برابر مقابلہ ہوتا رہتا تھا اور ادنیٰ ہی اپنی زبردستی اور ہٹ کے سبب امن اور سکون سے بھرے ہوئے اعلیٰ پر غالب آجاتا تھا۔ ادنیٰ مالتی کی طرف جھکتا تھا تو الی مہتا کی طرف، مگر وہ اب ادنیٰ میں شامل ہو گیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مہتا جیسا معیار پرست آدمی مالتی جیسی شوخ اور آرام پسند عورت پر کیسے فریفتہ ہو گیا۔ وہ بہت کوشش کرنے پر بھی مہتا کو نفس پرستیوں کا شکار نہ قرار دے سکتے تھے اور کبھی کبھی انہیں یہ شک بھی ہونے لگتا تھا کہ مالتی کا کوئی ایسا دوسرا روپ بھی ہے جسے نہ تو وہ دیکھ سکے اور نہ جسے دیکھنے کے وہ اہل ہی ہیں، موافق و مخالف، سبھی پہلوؤں پر غور کر کے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس حالت میں ان کو مہتا ہی سے واجبی ہدایت مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر مہتا کو کام کرنے کا نشہ تھا۔ آدھی رات کو سوتے تھے اور پھر رات رہے جاگ پڑتے تھے۔ کیسا ہی کام ہو، اس کے لیے وہ کہیں نہ کہیں سے وقت نکال

لیتے تھے۔ ہاکی کھیلنا ہو یا یونیورسٹی کے مباحثے میں حصہ لینا ہو، ''گاؤں سنگٹھن'' ہو یا کسی شادی کا نیوتا۔ سبھی کاموں کے لیے ان کے دل میں شوق تھا اور ان کے پاس وقت تھا۔ وہ اخباروں میں مضامین بھی لکھتے تھے اور کئی سال سے فلسفہ کی ایک ضخیم کتاب بھی لکھ رہے تھے جو اب ختم ہونے والی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک سائنس کا کھیل ہی کھیل رہے تھے۔ اپنے باغیچے میں بیٹھے ہوئے پودوں پر اثر کی آزمائش کر رہے تھے۔ انہوں نے حال میں ایک سائنس کی انجمن میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ فصلیں برقی طاقت سے بہت کم وقت میں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ ان کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے اور بے فصل کی چیزوں کی اپج بھی کی جا سکتی ہے۔ آج کل صبح کے دو تین گھنٹے وہ ان ہی باتوں کی آزمائش میں صرف کرتے تھے۔

مسٹر کھنا کی باتیں سن کر انہوں نے شردئی سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا یہ ضروری تھا کہ ٹیکس لگ جانے سے مزدوروں کی اجرت گھٹا دی جائے؟ آپ کو سرکار سے شکایت کرنی چاہیے تھی۔ اگر سرکار نے نہیں سنا تو اس کی سزا مزدوروں کو کیوں دی جائے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ مزدوروں کو اتنی اجرت دی جاتی ہے کہ اس میں ایک چوتھائی کی کمی سے انہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی؟ آپ کے مزدور بلوں میں رہتے ہیں، گندے اور بدبودار بلوں میں، جہاں آپ ایک منٹ رہیں تو قے ہو جائے، جو کپڑے وہ پہنتے ہیں، ان سے آپ اپنے جوتے بھی نہ صاف کریں گے، جو کھانا وہ کھاتے ہیں وہ آپ کا کتا بھی نہ کھائے گا۔ میں نے ان کی زندگی میں حصہ لیا ہے۔ آپ ان کی روٹیا چھین کر اپنے حصے داروں کا پیٹ بھرنا چاہتے ہیں.....''

کھنا نے بے صبری سے کہا۔ ''مگر ہمارے سبھی حصے دار تو امیر نہیں ہیں۔ کتنوں ہی نے اپنا سب کچھ اسی مل کی نذر کر دیا ہے اور اس کے نفع کے سوا ان کی زندگی کا کوئی سہارا نہیں ہے۔''

مہتا نے اس انداز سے جواب دیا گویا اس دلیل کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ بولے۔ ''جو آدمی کسی کاروبار میں حصہ لیتا ہے، وہ اتنا مفلس نہیں ہوتا کہ اس منافع ہی کو زندگی کا سہارا سمجھے۔ ہوسکتا ہے کہ نفع کم ملنے سے اسے اپنا ایک نوکر کم کر دینا پڑے یا اس کے مکھن اور پھلوں کا بل گھٹ جائے مگر وہ ننگا بھوکا نہ رہے گا۔ جو اپنی جان کھپاتے ہیں، ان کا حق ان لوگوں سے زیادہ ہے جو صرف روپیہ لگاتے ہیں۔''

یہی بات پنڈت اونکارناتھ نہ کہی تھی۔ مرزا خورشید نے بھی یہی صلاح دی تھی، حتیٰ کہ گوبندی نے بھی مزدوروں ہی کی حمایت کی تھی، مگر کھنا نے ان لوگوں کے کہنے کا خیال نہ کیا تھا، مگر مہتا کہ منہ سے ویسا ہی سن کر وہ متاثر ہو گئے۔ اونکارناتھ کو وہ مطلبی سمجھتے تھے۔ مرزا کو ذمہ دار اور گوبندی کو نا قابل۔ مہتا کی بات میں کردار، مطالعہ اور اخلاق کی طاقت تھی۔

دفعتاً مہتا نے پوچھا۔ ''آپ نے اپنی اہلیہ سے بھی اس بارے میں رائے لی؟''

کھنا نے لجاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، پوچھا تھا۔''

''ان کی کیا رائے تھی؟''

''وہی جو آپ کی رائے ہے۔''

''مجھے یہی امید تھی اور آپ اس قابلہ کو نا قبل سمجھتے ہیں۔''

اسی وقت مالتی آ پہنچی اور کھنا کو دیکھ کر بولی۔ ''اچھا، آپ موجود ہیں۔ میں نے مہتا جی کی آج دعوت کی ہے، سبھی چیزیں اپنے ہاتھوں تیار کی ہیں۔ آپ کو بھی نیوتا دیتی ہوں۔ گوبندی دیوی سے آپ کا یہ قصور معاف کرادوں گی۔''

کھنا کو تعجب ہوا۔ اب مالتی اپنے ہاتھوں سے کھانا پکانے لگی ہے۔ مالتی جو خود کبھی اپنے جوتے نہ پہنتی تھی، جو خود کبھی بجلی کا بٹن تک نہ دباتی تھی، عیش و آرام ہی جس کی زندگی تھی۔ مسکرا کر بولے۔ ''اگر آپ نے پکایا ہے تو ضرور کھاؤں گا۔ میں تو کبھی سوچ نہ سکتا تھا کہ آپ اس فن میں بھی ماہر ہیں۔''

مالتی نے بلا تامل کہا۔ ''انہوں نے مار مار کر حکیم بنا دیا ہے۔ ان کا حکم کیسے ٹال سکتی؟ مرد دیوتا ٹھہرے جو۔''

کھنا نے اس طنز سے لطف اٹھاتے ہوئے مہتا کی طرف آنکھیں مارتے ہوئے کہا۔ ''مرد تو آپ کی نگاہوں میں اتنے آدر کی چیز نہ تھے۔''

مالتی شرمائی نہیں۔ اس اشارہ کا مطلب سمجھ کر جوش کے لہجے میں بولی۔ ''لیکن اب ہو گئے ہیں، اس لیے میں نے مرد کا جو روپ اپنی جان پہچان والوں کے لیے دائرے میں دیکھا تھا، اس سے یہ کہیں بہتر ہے۔ مرد اتنا بہتر، اتنا نرم دل.....''

مہتا نے مالتی کی طرف انکسار سے دیکھا اور کہا۔ ''نہیں مالتی! مجھ پر رحم کرو ورنہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔''

ان دنوں جو بھی مالتی سے ملتا تو وہ اس سے مہتا کی تعریفوں کے پل باندھ دیتی

جیسے کوئی نومرید اپنے نئے عقائد کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے، پسند کا بھی اسے خیال نہ رہتا اور بے چارے مہتا دل میں کٹ کر رہ جاتے۔ وہ تلخ اور درشت تنقید کو تو بڑے شوق سے سنتے تھے لیکن اپنی تعریف سن کر گویا بے وقوف بن جاتے تھے اور منہ ذرا سا نکل آتا تھا اور مالتی ان عورتوں میں نہ بھی جو اندر رہ سکے، وہ باہر ہی رہ سکتی تھی۔ پہلے بھی اب بھی، عمل میں اور خیال میں بھی۔ دل میں کچھ رکھ چھوڑنا وہ نہ جانتی تھی۔ جس طرح ایک عمدہ ساڑھی پا کر وہ پہننے کے لیے بے چین ہو جاتی تھی، اسی طرح دل میں کوئی اچھا خیال آئے تو وہ اسے ظاہر کیے بغیر کل نہ پاتی تھی۔

مالتی نے اور قریب جا کر اور ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر گویا ان کی حفاظت کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بھاگونہیں، اب میں کچھ نہ کہوں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اپنی ہجو زیادہ پسند ہے تو وہی سنو کھنا جی! یہ حضرت مجھ پر اپنی محبت کا جال.....''

شکر مل کی چمنی یہاں سے صاف نظر آتی تھی۔ کھنا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چمنی کھنا کی نیک نامی کے ستون کی طرح آسمان میں سر اٹھائے کھڑی تھی۔ کھنا کی آنکھوں میں غرور چمک اٹھا۔ اسی وقت انہیں مل کے دفتر میں جانا ہے۔ وہاں ڈائریکٹروں کی ایک فوری اور ضروری میٹنگ کرنی ہوگی اور اس حالت کو ان کے ذہن نشین کرانا ہوگا اور ساتھ ہی اس مسئلے کے حل کی تدبیر بھی بتانی ہوگی۔

مگر چمنی کے پاس یہ دھواں کہاں سے اٹھ رہا ہے؟ دیکھتے دیکھتے سارا آسمان غبارے کی طرح دھوئیں سے بھر گیا۔ سب نے خائف ہو کر ادھر دیکھا۔ کہیں آگ تو نہیں لگ گئی؟ آگ ہی معلوم ہوتی ہے۔

دفعتاً سامنے سڑک پر ہزاروں آدمی مل کی طرف دوڑے جاتے تھے۔ کھنا نے

کھڑے ہو کر زور سے پوچھا ''تم لوگ کہاں دوڑے جا رہے ہو؟''

ایک آدمی نے رک کر کہا۔ ''اجی چکر مل میں آگ لگ گئی ! آپ دیکھ نہیں رہے؟

کھنا نے مہتا کی طرف دیکھا اور مہتا نے کھنا کی طرف۔ مالتی دوڑی ہوئی بنگلے میں گئی اور اپنے جوتے پہنچ آئی۔ افسوس اور شکایت کا موقع نہ تھا۔ کسی کے منہ سے ایک بات نہ نکلی۔ خطرے میں ہمارے ہوش و حواس کا رخ اندر کی طرف ہو جاتا ہے۔ کھنا کا موٹر کھڑا ہی تھا۔ تینوں آدمی گھبرائے ہوئے آ کر بیٹھے اور مل کی طرف بھاگے۔ چوراہے پر پہنچے تو دیکھا کہ سارا شہر امڈا چلا آ رہا ہے۔ آگ میں آدمیوں کے کھینچنے کا جادو ہے۔ موٹر آگے نہ بڑھ سکا۔

مہتا نے پوچھا۔ ''آگ کا بیمہ تو کرا لیا تھا نا؟''

کھنا نے لمبا سانس کھینچ کر کہا۔ ''کہاں بھئی؟ ابھی تو لکھا پڑھی ہو رہی تھی۔ کیا جانتا تھا کہ آفت آنے والی ہے۔''

موٹر وہیں چھوڑ دیا گیا اور تینوں آدمی بھیڑ کو چیرتے ہوئے مل کے سامنے جا پہنچے۔ دیکھا تو آگ کا ایک سمندر خلا میں امڈ رہا تھا۔ آگ کی پاگل لہریں ایک ہو کر دانت پیستی تھیں اور زبانیں نکال رہی تھیں، گویا آسمان کو بھی نگل جائیں گی۔ اس آگ کے سمندر کے نیچے ایسا دھواں چھایا ہوا تھا گویا ساون کی گھٹا کاجل میں نہا کر نیچے اتر آئی ہو۔ اس کے اوپر گویا آگ کا کانپتا اور ابلتا ہوا پہاڑ کھڑا تھا۔ احاطہ میں لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ تھی، پولیس بھی تھی فائر بریگیڈ بھی اور سیوا سمتی کے والنٹیر بھی، مگر سب کے سب آگ کی تیزی سے گویا سست ہو گئے تھے۔ فائر

بریگیڈ کے چھینٹے اس آتشیں سمندر میں پڑ کر جیسے بجھ جاتے تھے۔ اینڈیں جل رہی تھیں، آپنی گارڈر جل رہے تھے اور پگھلی ہوئی شکر کے پرنالے چاروں طرف جا رہے تھے۔ اور تو اور زمین سے بھی شعلے نکل رہے تھے۔

دور سے تو مہتا اور کھنا کو تعجب ہو رہا تھا کہ اتنے لوگ کھڑے تماشا کیوں دیکھ رہے ہیں، آگ بجھانے میں مدد کیوں نہیں دیتے؟ مگر اب انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تماشا دیکھنے کے سوا اور کچھ کرنا بس سے باہر ہے۔ مل کی دیواروں سے پچاس گز کے اندر جانا جان جوکھم تھا۔ اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے تڑاق تڑاق ٹوٹتے ہوئے اچھل رہے تھے۔ کبھی ہوا کا رخ ادھر ہو جاتا تھا تو بھگدڑ پڑ جاتی تھی۔

یہ تینوں بھیڑ کے پیچھے کھڑے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں، آخر آگ لگی کیسے اور اتنی جلد پھیل کیسے گئی؟ کیا پہلے کسی نے دیکھا نہیں، یا دیکھ کر بھی بجھانے کی کوشش نہیں کی؟ ایسے ہی سوال سبھی کے دل میں اٹھ رہے تھے مگر وہاں پوچھیں کس سے؟ مل میں کام کرنے والے ہوں گے تو ضرور، مگر اس مجمع میں ان کا ملنا مشکل تھا۔

دفعتاً ہوا کا اتنا تیز جھونکا آیا کہ آگ کی لپٹیں نیچی ہو کر ادھر دوڑیں جیسے سمندر میں جوار آ گیا ہو۔ لوگ سر پر پیر رکھ کر بھاگے، ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے گویا کوئی شیر جھپٹا آتا ہو، شعلوں میں جیسے جان پڑ گئی تھی، جیسے حرکت آ گئی تھی، جیسے ہزاروں پھن والے شیش ناگ جی اپنے منہ سے آگ اگل رہے تھے، کتنے ہی آدمی تو دھکے میں کچلے گئے۔ کھنا منہ کے بل گر پڑے۔ ماتی کو مہتا صاحب دونوں ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھے۔، ورنہ وہ ضرور کچل گئی ہوتی۔ تینوں آدمی

احاطہ کی دیوار کے پاس ایک املی کے پیڑ کے نیچے آ کر رکے۔ کھنا ایک طرف کی بے حس محویت کے ساتھ مل کی چمنی کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑے ہوئے تھے۔

مہتا نے پوچھا۔ ''آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟''

کھنا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی طرف تاکتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں وہ بے حسی تھی جو جنون کی علامت ہے۔

مہتا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ ''ہم لوگ یہاں بیکار کھڑے ہیں۔ مجھے خوف ہو رہا ہے۔ کہ آپ کے چوٹ زیادہ آ گئی ہے، آیئے لوٹ چلیں۔''

کھنا نے ان کی طرف دیکھا اور جیسے اپنے سنک میں بولے۔ ''جس کی حرکت ہے، انہیں میں خوب جانتا ہوں۔ اگر ان کو اسی میں اطمینان ملتا تو ایشو ران کا بھلا کرے۔ مجھے کچھ پروا نہیں، کچھ پروا نہیں، آج چاہوں تو ایسی نئی مل کھڑی کر سکتا ہوں۔ جی ہاں! بالکل نئی مل کھڑی کر سکتا ہوں۔ یہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ مل نے مجھے نہیں بنایا، میں نے مل کو بنایا ہے اور میں پھر بنا سکتا ہوں۔ مگر جن کی یہ حرکت ہے، انہیں میں خاک میں ملا دوں گا۔ مجھے سب معلوم ہے۔ رتی رتی معلوم ہے۔''

مہتا نے ان کا چہرا اور ان کی حرکات کو دیکھا تو گھبرا کر بولے ''چلیے آپ کو گھر پہنچا دوں، آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔''

کھنا نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''میری طبیعت اچھی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ مل جل گئی۔ ایسی ملوں کو چٹکیوں میں کھول سکتا ہوں۔ میرا نام کھنا ہے، چندر پرکاش کھنا! میں نے اپنا سب کچھ اس مل میں لگا دیا ہے۔ پہلی مل میں ہم نے بیس فیصد منافع دیا۔ میں نے حوصلہ پا کر یہ مل کھولا، اس میں آدھے روپے میرے ہیں۔ میں نے

بینک کے دو لاکھ روپے اس مل میں لگا دیئے۔ میں ایک گھنٹہ پہلے دس لاکھ کا آدمی تھا۔ جی ہاں دس لاکھ! مگر اس وقت فاقہ مست ہوں نہیں دوالیہ ہوں! مجھے بینک کا دو لاکھ دینا ہے، جس مکان میں رہتا ہوں، وہ اب میرا نہیں ہے، جس برتن میں کھاتا ہوں، وہ بھی اب میرا نہیں ہے۔ بینک سے میں نکال دیا جاؤں گا۔ جس کھنا کو دیکھ کر لوگ جلتے تھے، وہ کھنا اب خاک میں مل گیا ہے۔ سوسائٹی اب میرا کوئی درجا نہیں ہے، میرے احباب اب مجھے اپنی عقیدت کا نہیں بلکہ اپنے رحم کا مستحق سمجھیں گے۔ میرے دشمن مجھ سے جلیں گے نہیں بلکہ مجھ پر ہنسیں گے۔ آپ نہیں جانتے مسٹر مہتا! میں نے اپنے اصولوں کا کتنا خون کیا ہے۔ کتنی رشوتیں دی ہیں، کتنی رشوتیں لی ہیں۔ کسانوں کی ایکھ تولنے کے لیے کیسے آدمی رکھے، کیسے نقلی باٹ رکھے کیا کیجیے گا یہ سن کر؟ مگر کھنا اپنی یہ درگت کرانے کے لیے کیوں زندہ ہے؟ جو کچھ ہونا ہو، دنیا جتنا چاہے ہنسے، احباب جتنا چاہیں افسوس کریں، لوگ جتنی گالیاں دینا چاہیں دیں، کھنا اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے کے لیے زندہ نہ رہے گا۔ وہ بے حیا نہیں ہے، بے غیرت نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر کھنا دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ کر زار و قطار رونے لگے۔

مہتا نے انہیں سی ۹ نے سے لگا کر غمگین لہجے میں کہا۔ ''کھنا جی! ذرا صبر سے کام لیجیے۔ آپ سمجھدار ہو کر دل اتنا چھوٹا کرتے ہیں۔ دولت آدمی کو جو وقار ملتا ہے، وہ اس کا وقار نہیں بلکہ اس کی دولت کا وقار ہے۔ آپ مفلس رہ کر بھی دوستوں کی عقیدت کے مستحق رہ سکتے ہیں اور دشمنوں کی بھی بلکہ تب کوئی آپ کا دشمن رہے گا نہیں آیئے گھر چلیں۔ ذرا آرام کر لینے سے آپ کا دل ٹھہر جائے گا۔''

کھنا نے کوئی جواب نہ دیا۔ تینوں آدمی چوراہے پر پہنچے۔ موٹر کھڑا تھا۔ دس منٹ میں کھنا کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔

کھنا نے اتر کو سکون کے لہجے میں کہا۔ ''موٹر آپ لے جائیں، اب مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔

مالتی اور مہتا بھی اتر پڑے۔ مالتی نے کہا۔ ''تم چل کر ذرا آرام سے لیٹو، ہم بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔ گھر جانے کی تو ایسی کوئی عجلت نہیں ہے۔''

کھنا نے ممنونیت سے ان کی طرف دیکھا اور بھرے ہوئے گلے سے بولے ''مجھ سے جو خطائیں ہوئی ہیں انہیں بخش دینا مالتی! تم اور مہتا بس اور دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم دونوں مجھے اپنی نظروں سے نہ گراؤ گے۔ شاید دس پانچ دن میں یہ کوٹھی بھی چھوڑنی پڑے۔ قسمت نے کیسی دغا کی۔''

مہتا نے کہا ''میں آپ سے سچ کہتا ہوں کھنا جی کہ آج میری نظروں میں جو آپ کی وقعت ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔''

تینوں آدمی کمرے میں گئے۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ پاتے ہی گوبندی اندر سے آکر بولی۔ ''کیا آپ لوگ وہیں سے آرہے ہیں؟ مہراج تو بڑی بری خبر لایا ہے۔''

کھنا کے دل میں ایسا زبردست اور نہ رکنے والا طوفانی جوش اٹھا کہ وہ گوبندی کے پیروں میں گر پڑے اور انہیں آنسوؤں سے تر کر دیا۔ بھرے گلے سے بولے۔ ''ہاں پیاری ہم تباہ ہو گئے۔''

ان کے بے حس، مایوس اور مجروح دل تسکین کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ سچی

اور محبت میں ڈوبی ہوئی تسکین کے لیے اس مریض کی طرح جو زندگی کی قوت زائل ہو جانے پر بھی طبیب کے چہرے کی طرف آس بھری آنکھوں سے تاک رہا ہو۔ وہی گوبندی جس پر انہوں نے ہمیشہ ظلم کیا، جسے ہمیشہ ذلیل کیا، جس سے ہمیشہ بے وفائی کی، جسے ہمیشہ زندگی کا بار سمجھا، جس کی موت کے ہمیشہ خواہشمند رہے، وہی اس وقت گویا اپنے آنچل میں دعا اور شگون اور تحفظ کے لیے ہوئے ان پر نچھاور کر رہی تھی، گویا اس کے قدموں میں ہی ان کی زندگی کی بہشت تھی، گویا وہ ان کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر ہی ان کی بے جان رگوں میں پھر خون کی گردش قائم کر دے گی۔ دل کی اس کمزور حالت میں اس بھاری مصیبت میں گویا انہیں گلے سے لگا لینے کو تیار کھڑی تھی۔ کشتی پر بیٹھ کر آبی سیر کا لطف اٹھاتے ہوئے ہم جن چٹانوں کو خطرناک سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی انہیں کھود کر پھینک دے، ان ہی چٹانوں سے کشتی کے ٹوٹ جانے پر ہم بے اختیار لپٹ جاتے ہیں۔

گوبندی نے انہیں ایک صوفے پر بٹھا دیا اور محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ’تو تم اتنا دل کیوں چھوٹا کرتے ہو دھن کے لیے جو سارے پاپوں کی جڑ ہے؟ اس دھن سے ہمیں کیا سکھ تھا؟ سویرے سے آدمی رات تک ایک نہ ایک جھنجھٹ، آتما کی تباہی اور بربادی، بچے تم سے بات کرنے کو ترس جاتے تھے، تمہیں رشتہ داروں کو خط لکھنے تک کی فرصت نہ ملتی تھی۔ کیا بڑی عزت تھی؟ ہاں تھی، کیونکہ دنیا آج کل دھن کی پوجا کرتی ہے اور سدا کرتی چلی آئی ہے۔ اس کو تم سے کوئی مطلب نہیں۔ جب تک تمہارے پاس لچھمی ہے، تمہارے سامنے دم ہلائے گی اور پھر کل اتنی ہی

بھگتی سے دوسروں کے دروازے پر ماتھا رگڑے گی اور پھر تمہاری طرف تاکے گی بھی نہیں۔ سچا انسان دھن کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ تم کیا ہو۔ اگر تم میں سچائی ہے، انصاف ہے، تیاگ ہے اور مردانگی ہے تو تمہاری پوجا کرے گا اور نہ تمہیں سماج کا لٹیرا سمجھ کر منہ پھیر لے گا بلکہ تمہارا دشمن ہو جائے گا۔ میں جھوٹ تو نہیں کہتی مہتا جی؟''

مہتا نے گویا جنت کے خواب سے چونک کر کہا۔ ''جھوٹ؟ وہی کہہ رہی ہیں جو دنیا کے عظیم لوگوں نے زندگی کا ٹھوس تجربہ کرنے کے بعد کہا ہے، زندگی کا سچا سہارا یہی ہے۔''

گوبندی نے مہتا کو مخاطب کر کے کہا۔ ''دھنی کون ہوتا ہے، اس کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ وہی جو اپنی چالاکی سے دوسروں کو بے وقوف بنا سکتا ہے۔''

کھنا نے بات کاٹ کر کہا ''نہیں گوبندی! دھن کمانے کے لیے اپنے میں فطری جوہر چاہیے۔ صرف چالاکی سے دھن نہیں ملتا۔ اس کے لیے بھی تیاگ اور تپسیا کرنا لازمی ہے۔ شاید اتنی ریاضت سے خدا بھی مل جائے۔ ہمارے سارے جسمانی، روحانی اور عقلی طاقتوں کے توازن کا نام دولت ہے۔''

گوبندی نے مخالفت نہ کرتے ہوئے ثالث کے لہجے میں کہا۔ ''میں مانتی ہوں کہ دھن کے لیے تھوڑی تپسیا نہیں کرنی پڑتی مگر پھر بھی ہم نے اسے زندگی میں جتنی اہم چیز سمجھ رکھا ہے، اتنی وہ نہیں ہے۔ میں تو خوش ہوں کہ تمہارے سر سے بوجھ ٹلا۔ اب تمہارے لڑکے کے انسان بنیں گے، خودغرضی اور غرور کے پتلے نہیں۔ زندگی کا سکھ دوسروں کو سکھی کرنے میں ہے، انہیں لوٹنے میں نہیں۔ برا نہ ماننا

اب تک تمہاری زندگی کا مطلب تھا خود پروری اور عیش کوشی۔ ایشور نے تمہیں ان ذرائع سے محروم کر کے تمہارے لیے زندہ، بلند اور پاک زندگی کا راستہ کھول دیا ہے۔ اس کے حصول میں اگر کچھ تکلیف بھی ہو تو اس کا خیر مقدم کرو۔ تم اسے مصیبت سمجھتے ہی کیوں ہو؟ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ تمہیں بے انصافیوں سے لڑنے کا موقع ملا ہے۔ میرے خیال میں تو ظالم ہونے سے مظلوم ہونا کہیں بہتر ہے۔ دھن کھو کر اگر ہم اپنی آتما پا سکیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ انصاف کے سپاہی بن کر لڑنے میں جو عظمت اور راحت ہے، کیا اسے اتنی جلد بھول گئے۔''

گوبندی کے زرد خشک چہرے پر جلال کی ایسی چمک تھی، گویا اس میں کوئی عجیب طاقت آ گئی ہو، گویا اس کی ساری خاموش ریاضت میں گویائی آ گئی ہو۔

مہتا اس کی طرف عقیدت سے تاک رہے تھے، سر جھکائے اسے خدائی الہام سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور مالتی دل میں نادم تھی۔ گوبندی کے خیالات کتنے بلند، اس کا دل کتنا کشادہ اور اس کی زندگی کتنی روشن ہے۔

(29)

نہرا ان عورتوں میں نہ تھی جو نیکی کر کے دریا میں ڈال دیتی ہیں۔ اس نے نیکی کی ہے تو اس کا خوب ڈھنڈورا پیٹے گی اور اس سے جتنی نیک نامی مل سکتی ہے، اس سے کچھ زیادہ ہی پانے کے لیے ہاتھ پیر مارے گی۔ ایسے آدمی کو نیک نامی کے عوض بدنامی ہی ملتی ہے۔ نیکی کرنا بدنامی کی بات نہیں۔ اپنی خواہش یا اپنے میں سکت نہیں ہے، اس کے لیے کوئی ہمیں برا نہیں کہہ سکتا مگر جب ہم نیکی کر کے اس کا احسان جتاتے ہیں تو وہی شخص جس کے ساتھ ہم نے نیکی کی تھی، ہمارا دشمن ہو جاتا

ہے اور ہمارے احسان کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ وہ نیکی اگر کرنے والے کے دل میں رہے تو نیکی ہے اور باہر نکل آئے تو بدی ہے۔ نہرا چاروں طرف کہتی پھرتی تھی۔

''بیچارا ہوری بڑی بپتا میں تھا، بیٹی کے بیاہ کے لیے کھیت رہن رکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ دسا دیکھی تو مجھے دیا آ گئی۔ دھنیا سے تو جی جلتا تھا۔ وہ رانڈ تو مارے گھمنڈ کے دھرتی پر پاؤں نہیں رکھتی۔ بیچارا ہوری چنتا سے گھلا جاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سنکٹ میں اس کی کچھ مدد کروں۔ آدمی ہے آدمی کے کام آتا ہے اور ہوری تو اب کوئی گیر (غیر) نہیں ہے، مانو چاہے نہ مانو وہ تمہارے ناتے دار ہو چکے، روپے نکال کر دے دیئے۔ نہیں لڑکی اب تک بیٹھی ہی ہوتی۔''

دھنیا بھلا یہ ڈینگ کب سننے لگی۔ ''روپے کھیرات (خیرات) دیئے تھے، بڑا کھیرات دینے والی، بیاج مہاجن بھی لے گا اور تم بھی لوگی، پھر احسان کاہے کا؟ دوسروں کو دیتی تو بیاج کی جگہ اصل بھی چلا جاتا، ہم نے لیا ہے تو ہاتھ میں روپیہ آتے ہی ناک پر رکھ دیں گے۔ ہمی تھے کہ تمہارے گھر کا بس اٹھا کے پی گئے اور کبھی منہ پر نہ لائے، کوئی یہاں دوارے پر کھڑا نہیں ہونے دیتا تھا۔ ہم نے تمہاری مریاد بنا دی، تمہارے منہ کی لالی رکھ لی۔''

رات کے دس بج گئے تھے۔ ساون کی اندھیری گھٹا چھائی تھی۔ سارے گاؤں میں اندھیرا تھا۔ ہوری نے کھانا کھا کر تمباکو پی اور سونے جا رہا تھا کہ بھولا آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہوری نے پوچھا ''کہ کیسے چلو بھولا مہتو؟ جب اسی گاؤں میں رہنا ہے تو الگ کیوں چھوٹا سا گھر نہیں بنا لیتے؟ گاؤں میں لوگ کیسی کیسی برائی کرتے ہیں، کیا یہ تمہیں اچھا لگتا ہے؟ برا نہ ماننا، تم سے ناتا ہو گیا ہے۔ اس لیے تمہاری بدنامی

نہیں سنی جاتی، نہیں تو مجھے کیا کرنا تھا۔''

دھنیا اسی وقت لوٹے میں پانی لے کر ہوری کے سرہانے رکھنے آئی تھی، سن کر بولی۔ ''دوسرا مرد ہوتا تو ایسی عورت کا سر کاٹ لیتا۔''

ہوری نے ڈانٹا۔ ''کیوں بے بات کی بات بکتی ہے؟ پانی رکھ دے اور جا سو۔ آج تو ہی بری راہ چلنے لگے تو کیا میں تیرا سر کاٹ لوں گا؟ تو کاٹنے دے گی؟''

دھنیا اسے پانی کا ایک چھینٹا مار کر بولی۔ ''بری راہ چلے تمہاری بہن، میں کیوں چلنے لگی؟ میں تو دنیا کی بات کہتی ہوں اور مجھے گالی دینے لگے۔ اب منہ میٹھا ہو گیا ہوگا۔ عورت چاہے جس راہ جائے، مرد ٹکر ٹکر دیکھتا رہے! ایسے مرد کو میں مرد نہیں کہتی۔''

ہوری دل میں کٹا جاتا تھا۔ بھولا اس سے اپنا دکھ درد کہنے آیا ہوگا، یہ الٹا اسی پر ٹوٹ پڑی۔ ذرا گرم ہو کر بولا ''تو جو سارے دن اپنے ہی من کی کیا کرتی ہے تو میں تیرا کیا بگاڑ لیتا ہوں ہوں تو کاٹنے دوڑتی ہے۔ یہی سوچ!''

دھنیا نے چاپلوسی کرنا سیکھا تھا۔ بولی۔ ''عورت گھی کا گھڑا ڈھلکا دے، گھر میں آگ لگا دے تو یہ سب مرد سہہ لے گا، مگر اس کا بدرراہ چلنا کوئی مرد نہ سہے گا۔''

بھولا غمگین لہجے میں بولا۔ ''تو بہت ٹھیک کہتی ہے۔ دھنیا بیشک مجھے اس کا سر کاٹ لینا چاہیے تھا، لیکن اب اتنا بل تو نہیں رہا۔ تو چل کر سمجھا دے، میں تو سب کچھ کر کے ہار گیا۔''

''جب عورت کو بس میں رکھنے کا بوتا نہ تھا تو سگائی کیوں کی تھی؟ چھیچھا لیدر کے لیے؟ کیا سوچتے تھے کہ وہ آ کر تمہارے پاؤں دبائے گی، تمہیں چلم بھر بھر

کر پلائے گی اور جب تم بیمار پڑو گے تو تمہاری سیوا ٹہل کرے گی؟ تو ایسا وہی عورت کر سکتی ہے جس نے تمہارے ساتھ جوانی کا سکھ اٹھایا ہو۔ میری سمجھ میں یہی نہیں آتا کہ تم اسے دیکھ کر لٹو کیسے ہو گئے، دیکھ تو لیا ہوتا کہ وہ کس بھاؤ کی ہے، کس رنگ ڈھنگ کی ہے، تم تو بھوکے سیار (گیدڑ) کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اب تو تمہارا دھرم یہی ہے کہ گنڈاسے سے اس کا سر کاٹ لو۔ پھانسی ہی تو پاؤ گے۔ اس چھچھالیدر سے پھانسی اچھی!''

بھولا کے خون میں کچھ گرمی آ گئی۔ بولا۔ ''تو تمہاری یہی صلاح ہے؟''

دھنیا بولی۔ ''ہاں میری یہی صلاح ہے، اب سو پچاس برس تو جیوں گے نہیں، سمجھ لینا کہ اتنی ہی عمر تھی۔''

ہوری نے اب کے زور سے پھٹکارا۔ ''چپ رہ، بڑی آئی ہے وہاں سے ستونتی بن کے۔ جبردستی (زبردستی) چڑیا تک تو پنجرے میں رہتی نہیں، پھر آدمی کیا رہے گا؟ تم اسے چھوڑ دو بھولا اور سمجھ لو کہ مر گئی۔ جا کر اپنے بال بچوں میں آرام سے رہو۔ دو روٹی کھاؤ اور رام کا نام لو۔ جوانی کے سکھ اب گئے۔ وہ عورت چنچل ہے، سوبدنامی اور جلن کے سوا تم اس سے کوئی سکھ نہ پاؤ گے۔''

بھولا نہرا کو چھوڑ دے؟ ناممکن! نہرا اس وقت بھی اس کی طرف غصہ بھری آنکھوں سے تیز تیز دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مگر نہیں، بھولا اب اسے چھوڑ ہی دے گا۔ جیسا کر رہی ہے اس کا پھل بھوگے۔

آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولا۔ ''ہوری بھیا! اس عورت کے پیچھے میری جتنی سانست ہو رہی ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اسی کے پیچھے کامتا سے لڑائی ہوئی۔

بڑھاپے میں یہ داگ (داغ) بھی لگنا تھا، سو لگ گیا۔ مجھے روج (روز) طعنہ دیتی ہے کہ تمہاری تو لڑکی نکل گئی۔ میری لڑکی نکل گئی، چاہے بھاگ گئی، پر اپنے آدمی کے ساتھ پڑی تو ہے، اس کے دکھ سکھ کی ساتھن ہے اور مجھے دیکھ کر کپا سا منہ پھلا لیتی ہے۔ میں گریب (غریب) آدمی ٹھہرا، تین چار آنے روز کی مجوری (مزدوری) کرتا ہوں تب دودھ، دہی، ماس، مچھلی، بڑی ملائی کہاں سے لاؤں؟''

بھولا یہاں سے عہد کر کے اپنے گھر گئے۔ اب بیٹوں کے ساتھ رہیں گے، بہت دھکے کھا چکے، مگر دوسرے دن صبح ہوری نے دیکھا، ٹھیک نہ سمجھا۔ عشق میں انسان کو خود پر قابو نہیں ہوتا۔ وہاں سے آ کر دھنیا سے بولا۔ ''بھولا تو ابھی وہیں ہیں۔ نہر انے سچ مچ ان پر کوئی جادو کر دیا ہے۔''

دھنیا نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ''جیسی بے حیا وہ ہے، ویسا ہی بے حیا یہ ہے۔ ایسے مرد کو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ اب وہ سیکھی (شیخنی) نہ جانے کہاں گئی۔ جھنیا یہاں آئی اس کے لیے ڈنڈا لیے پھر رہے تھے۔ مریدا چلی جاتی تھی۔ اب مر جا نہیں جاتی۔''

ہوری کو بھولا پر رحم آ رہا تھا۔ بے چارا اس ہرجائی کے پھیر میں پڑ کر اپنے کو برباد کیے ڈالتا ہے۔ چھوڑ کر جائے بھی تو کیسے؟ عورت کو اس طرح چھوڑ کر جانا کیا سہل ہے؟ وہ چڑیل اسے وہاں بھی تو چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔ کہیں پنچایت کرائے گی، کہیں روٹی کپڑے کا دعویٰ کرے گی، ابھی تو گاؤں کے ہی لوگ جانتے ہیں، کسی کو کچھ کہتے سوچ ہوتا ہے۔ کانا پھوسی کر کے ہی رہ جاتے ہیں۔ تب تو دنیا بھی بھولا ہی کو برا کہے گی۔ لوگ یہی تو کہیں گے کہ جب مرد نے چھوڑ دیا تو

بے چاری عورت کیا کرے؟ مرد برا ہو تو عورت کی گردن کاٹ لے گا، عورت بری ہو تو مرد کے منہ میں کالکھ لگا دے گی۔

اس کے دو مہینے بعد ایک روز گاؤں میں یہ خبر پھیلی کہ نہرا نے مارے جوتے کے بھولا کی چاند گنجی کر دی۔ برسات ختم ہو گئی تھی اور ربیع بونے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہوری کی ایکھ تو نیال ہو گئی تھی۔ بیج کے لیے اسے روپے نہ ملے اور ایکھ نہ بوئی جا سکی۔ ادھر دھنا بیل بھی بیٹھان لینے کو تھا اور ایک نئے بیل کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا۔ پنیا کا ایک بیل نالے میں گر کر مر گیا تھا، اس وقت سے اور بھی وقت پڑ گئی تھی۔ ایک دن پنیا کے کھیت میں ہل جاتا تو ایک دن ہوری کے کھیت میں کھیتوں کی جتائی جیسی ہونی چاہیے تھی، نہ ہو پائی تھی۔

ہوری ہل لے کر کھیت میں گیا، مگر بھولا کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ سنا تھا کہ کسی عورت نے اپنے خاوند کو جوتوں سے مارا ہو۔ جوتوں سے کیا تھپڑ یا گھونسے مارنے کا بھی کوئی واقعہ اسے یاد نہ آتا تھا۔ مگر آج نہری نے بھولا کو جوتوں سے پیٹا اور سب لوگوں نے تماشا دیکھا۔ اس عورت سے کیسے اس ابھاگے کا گلا چھوٹے؟ اب تو بھولا کو کہیں ڈوب ہی مرنا چاہیے۔ جہ جندگی (زندگی) میں بدنامی اور درگت کے سوا اور کچھ نہ ہو تو آدمی کو مر جانا ہی اچھا۔ کون بھولا کے نام کو رونے والا بیٹھا ہے۔ بیٹے چاہے کریا کرم کر دیں، سو وہ بھی دنیا کی لاج کے کارن، آنسو کسی کی آنکھ میں نہ آئے گا۔ موہ کے بس میں پڑ کر آدمی اس طرح اپنے جو چوپٹ کرتا ہے۔ جب کوئی روز نے والا ہی نہیں، تو پھر جینے کا کیا موہ اور مرنے سے کیسا ڈر؟

ایک یہ نہرا ہے اور ایک یہ چمارن ہے سلیا! دیکھنے سننے میں اس سے لاکھ درجہ اچھی۔ چاہے تو دو کو کھلا کر کھائے اور رادھا بنی گھومے، لیکن مجوری کرتی ہے، بھوکوں مرتی ہے اور پتی کے نام پر بیٹھی ہے اور وہ بے درد بات بھی نہیں پوچھتا۔ کون جانے، دھنیا مر گئی ہوتی تو آج ہوری کی بھی یہی دسا ہوتی۔ اس کی موت کے خیال ہی سے ہوری کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دھنیا کی خیالی شکل آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوگئی، سیوا اور تیاگ کی دیوی، زبان کی تیز مگر موم جیسا دل رکھنے والی پیسے پیسے کے لیے جان دینے والی مگر آبرو بچانے کے لیے اپنا سب کچھ دے دینے کو تیار! جوانی میں وہ کم سندر نہ تھی۔ نہرا اس کے سامنے کیا ہے؟ چلتی تھی تو رانی سی لگتی تھی، جو دیکھتا تھا، دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ یہی پٹیشوری اور جھنگری تب جوان تھے۔ دونوں دھنیا کو دیکھ کر سینے پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ دروازے کے سو سو چکر لگاتے تھے۔ ہوری ان کی تاک میں رہتا تھا مگر چھیڑنے کا کوئی حیلہ نہ پاتا تھا۔ اس وقت گھر میں کھانے پینے کی بڑی تکلیف تھی۔ پالا پڑ گیا تھا اور کھیتوں میں بھوسا تک نہ ہوا۔ لوگ جھڑ بیریاں کھا کھا کر دن کاٹتے تھے۔ ہوری کو قحط کے کیمپ میں کام کرنے جانا پڑتا تھا۔ چھ پیسے روزانہ ملتے تھے۔ دھنیا گھر میں اکیلی رہتی تھی مگر کبھی کسی نے اس کو کسی مرد کی طرف تاکتے نہیں دیکھا۔ پٹیشوری نے ایک بار کچھ چھیڑ چھاڑ کی تھی، سو اس کا ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ لالہ آج تک نہیں بھولے۔

دفعتاً اس نے ماتا دین کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ کسائی (قصائی) کہیں کا، کیسا تلک لگائے ہوئے ہے جیسے بھگوان کا پورا بھگت ہے۔ رنگا سیار! ایسے باہمن کو پالا گن کون کرے؟

ماتا دین نے قریب آ کر کہا۔ ''کیسا پانچواں؟ آٹھواں سال چل رہا ہے بھائی! جی تو چاہتا ہے کہ اسے پنشن دے دوں م پر کسان کو اور کسان کے بیل، ان کو یمراج (فرشتہ اجل) پنشن دے تو ملے۔ اس کی گردن پر جوار کھے میرا من مسوستا ہے۔ بے چارا سوچتا ہوگا کہ اب بھی چھٹی نہیں، اب کیا میرا ہاڑ جوتے گا کیا؟ پر اپنا کوئی بس نہیں ہے۔ تم کیسے چلے؟ اب تو جی اچھا ہے؟''

ماتا دین ادھر ایک مہینے سے فصل بخار میں پڑا ہوا تھا۔ ایک دن تو اس کی نبض چھوٹ گئی تھی اور چارپائی سے نیچے اتار دیا گیا تھا۔ اس وقت سے اس کے دل میں یہ تھریک ہوئی تھی کہ سیلا پر ظلم کرنے کی اسے یہ سزا ملی ہے۔ جب اس نے سلیا کو گھر سے نکالا تب وہ حاملہ تھی۔ اسے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ پورے حمل کے ساتھ بھی وہ مزدوری کرتی رہی اگر دھنیا نے اس پر ترس نہ کھایا ہوتا تو مر گئی ہوتی۔ کیسی کیسی مصیبتیں جھیل کر جی رہی ہے۔ مزدوری بھی تو اس حالت میں نہیں کر سکتی۔ اب نادم اور نرم ہو کر وہ سلیا کو ہوری کی معرفت دو روپے دینے آیا ہے۔ اگر ہوری یہ روپے اسے دے دے تو اس کا بڑا احسان پائے گا۔

ہوری نے کہا۔ ''تمہی جا کر کیوں نہیں دے دیتے؟''

ماتا دین نے عاجزی سے کہا۔ ''مجھے اس کے پاس نہ بھیجو ہوری مہتو! کون سا منہ لے کر جاؤں؟ ڈر بھی لگ رہا ہے کہ مجھے دیکھ کر کہیں ڈانٹنے نہ لگے۔ تم مجھ پر اتنی مہربانی کرو۔ ابھی مجھ سے چلا نہیں جاتا مگر اسی روپے کے لیے ایک جج بان کے پاس کوس بھر دوڑا گیا تھا۔ اپنی کرنی کا پھل بہت بھوگ چکا۔''

اس باہمن ہونے کا بوجھ اب نہیں اٹھائے اٹھتا۔ چھپ کر چاہے کرم کرو کوئی

نہیں بولتا، مگر کھل کر کچھ کر سکتے، نہیں تو کل خاندان میں کلنک لگ جائے گا۔ تم اسے سمجھا دینا دادا کہ میرا پرادھ چھما کر دے۔ یہ دھرم کا بندھن بہت کڑا ہوتا ہے۔ جس سماج میں پیدا ہوئے اور پلے، اس کی مریادتو نبھانی ہی پڑتی ہے اور کسی جات کا دھرم بگڑ جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا مگر باہمن کا دھرم بگڑ جائے تو وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ اس کا دھرم ہی اس کے پرکھوں کی کمائی ہے ہے۔ اسی کی وہ روٹی کھاتا ہے۔ اس پراُچت کے پیچھے ہمارے تین سو روپے بگڑ گئے۔ تو جب بے دھرم ہی ہو کر رہنا ہے، تو پھر جو کچھ کرنا ہے وہ کھل کر کروں گا۔ سماج کے ناتے آدمی کا اگر کچھ دھرم ہے تو آدمی کے ناتے بھی تو اس کا کچھ دھرم ہے۔ سماج کا دھرم رکھنے سے سماج آدر کرتا ہے، مگر آدمی کا دھرم رکھنے سے تو ایشور پرسن (خوش) ہوتا ہے۔

شام کو جب ہوری نے سلیا کو ڈرتے ڈرتے روپے دیئے تو وہ جیسے اپنی ریاضت کا ثمر پا گئی۔ دکھ کا بوجھ تو وہ اکیلی اٹھا سکتی تھی، مگر سکھ کا بوجھ تو تنہا نہیں اٹھتا۔ کیسے یہ خوشخبری سنائے؟ دھنیا سے وہ اپنے دل کی باتیں نہیں کہہ سکتی۔ گاؤں میں اور کوئی نہیں، جس سے اس کا کافی ربط وضبط ہو۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ سونا ہی اس کی سہیلی تھی۔ سلیا اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ رات بھر کیسے صبر کرے؟ دل میں ایک آندھی سی اٹھ رہی تھی، اب وہ بیکس نہیں ہے۔ ماتا دین نے اس کی باہنھ پھر پکڑ لی ہے۔ زندگی کے راستے میں اس کے سامنے اب خوفناک منہ والی اندھیری خندق نہیں ہے بلکہ لہلہاتا ہوا ہرا بھرا میدان ہے، جس میں جھرنے اپنا سہاونا گیت گاتے یں اور ہرن کلیلیں کر رہے ہیں۔ اس

کی روٹھی ہوئی محبت آج سرمست ہوگئی ہے۔ ماتا دین کو اسی نے دل میں کتنا پانی پی پی کر کوسا تھا۔ اب وہ ان سے چھما مانگے گی۔ اس سے سچ مچ بڑی بھول ہوئی کہ اس نے سارے گاؤں کے آگے ان کی ہتک کی۔ وہ تو چمارن ہے، جات کی کمم اس کا کیا بگڑا۔ آج دس بیس لگا کر برادری کو روٹی دے دے، تو پھر برادری میں ہو جائے گی۔ ان بیچارے کو تو سدا کا دھرم ہی ناس ہو گیا۔ وہ مریادا اب انہیں پھر نہیں مل سکتی۔ وہ اس میں کتنی اندھی وہ گئی تھی کہ سب سے ان کے پریم کا ڈھنڈورا پیٹتی پھری۔ ان کا تو دھرم بگڑ گیا تھا۔ انہیں تو رس تھی ہی، پر اس کے سر پر کیوں بھوت سوار ہو گیا؟ وہ اپنے ہی گھر چلی جاتی تو کون برائی ہو جاتی؟ گھر میں اسے کوئی باندھ تو نہ لیتا؟ ماتا دین کی سب اسی لیے تو پوجا کرتے ہیں کہ وہ نیم دھرم سے رہتے ہیں، تو وہی دھرم جب نہ رہ گیا تو وہ کیوں نہ اس کے لہوں کے پیادے ہو جاتے؟

ذرا دیر پہلے تک اس کی نگاہوں میں سارا قصور ماتا دین کا تھا اور اب سارا قصور اپنا تھا۔ ہمدردی نے ہمدردی پیدا کر دی تھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ اب اسے دیکھ کر ندامت و پشیمانی نہیں ہوتی۔ وہ اب صرف اس کے رحم کا مستحق نہیں، اب اس کی پوری مادرانہ محبت کا مستحق ہے۔

کاتک کی روپہلی چاندنی ساری فضا پر کسی میٹھے راگ کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ سلیا گھر سے نکلی۔ وہ سونا کے پاس جا کر اسے یہ مژدہ سنائے گی، اب اس سے نہیں رہا جاتا۔ ابھی تو شام ہوئی ہے۔ ڈونگی اس پار تھی اور ملاح کا کہیں پتہ نہیں۔ چاند گھل جیسے ندی میں بہا جا رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ کھڑی سوچتی رہی، پھر ندی میں گھس

پڑی۔ندی کہیں پتہ نہیں۔چاند گھل کر جیسے ندی میں بہا جا رہا تھا۔وہ ایک لمحہ کھڑی سوچتی رہی، پھر ندی میں گھس پڑی۔ندی میں کچھ ایسا زیادہ پانی تو کیا ہوگا۔اس خوشی کے سمندر کے آگے ندی کیا چیز تھی۔پانی پہلے تو گھٹنوں تک تھا، پھر کمر تک آیا اور آخر گلے تک پہنچ گیا۔سلیا ڈری کہ کہیں دوب نہ جائے،، کہیں کوئی گڑھا نہ پڑ جائے مگر اس نے جان پر کھیل کر پیر آگے بڑھایا۔اب وہ منجدھار میں ہے۔موت اس کے سامنے ناچ رہی ہے، مگر وہ گھبرائی نہیں۔اسے تیرانا آتا ہے۔لڑکپن میں وہ کتنی ہی بار اسی ندی میں تیر چکی ہے اور کھڑے کھڑے ندی کو پار بھی کر چکی ہے۔پھر اس کا دل دھڑک رہا ہے، مگر پانی کم ہونے لگا۔اب کوئی ڈر نہیں ہے۔اس نے جلد جلد ندی کو پار کیا اور کنارے پہنچ کر اپنے کپڑے نچوڑے اور ٹھنڈ سے کانپتی ہوئی آگے بڑھی۔چاروں طرف سناٹا تھا۔گیدڑوں کی آواز بھی نہ سنائی پڑتی تھی اور سونا سے ملنے کا خوش کن خیال اسے اڑائے لیے جاتا تھا۔

مگر اس گاؤں میں پہنچ کر اسے سونا کے گھر جاتے ہوئے تامل ہونے لگا۔متھرا کیا کہے گا؟ اس کے گھر والے کیا کہیں گے؟ سونا بھی بگڑے گی کہ اتنی رات گئے تو کیوں آئی۔دیہاتوں میں دن بھر کے ماندے کسان سر شام ہی سو جاتے ہیں۔سارے گاؤں میں سوتا پڑ گیا تھا۔متھرا کے گھر کا دروازہ بند تھا۔سلیا اسے نہ کھلا سکی۔لوگ اسے اس بھیس میں دیکھ کر کیا کہیں گے؟ وہیں دروازہ کھلا اور متھرا نے باہر آ کر پکارا۔''ارے کون بیٹھا ہے، الاؤ کے پاس؟''

سلیا نے جلد ہی آنچل کو سر پر کھینچ لیا اور قریب جا کر بولی۔''میں ہوں سلیا۔''

''سلیا! اتنی رائے گئے کیسے آئی؟ وہاں تو سب اچھائی بھلائی ہے؟''

''ہاں سب اچھائی بھلائی ہے۔ جی گھبرا رہا تھا، سوچا کہ چلوں سب سے بھینٹ کر آؤں، دن کو تو چھٹی ہی نہیں۔''

''تو کیا آپ ندی پار کر کے آئی ہیں؟''

''اور کیسے آتی؟ پانی؟ پانی کم تھا۔''

متھرا اسے اندر لے گیا۔ بروٹھے میں اندھیرا تھا۔ اس نے سلیا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ سلیا نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور غصے سے بولی۔ ''دیکھو متھرا، مجھے چھیڑو گے تو میں سونا سے کہہ دوں گی۔ تم میرے چھوٹے بہنوئی ہو، تم سمجھ لو، جان پڑتا ہے کہ سونا سے من نہیں بھرتا۔''

متھرا نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ ''تم بڑی بے درد ہو سلو! اس بکھت کون دیکھتا ہے؟''

''کیا میں سونا سے سندر ہوں؟ اپنا بھاگ نہیں سراہتے کہ ایسی اندر کی پری پا گئے۔ اب بھونرا بننے کو من چلا ہے، اس سے کہہ دوں تو تمہارا منہ نہ دیکھے۔''

متھرا عیاش نہ تھا۔ سونا اسے محبت بھی تھی۔ اس وقت تاریکی اور تخلیہ سلیا کا شباب دیکھ کر اس کا جی ڈانواں ڈول ہوا اٹھا تھا۔ یہ تنبیہ پا کر ہوش میں آ گیا۔ سلیا کو چھوڑتا ہوا بولا۔ ''تمہارے پیروں پڑتا ہوں سلو! اس سے نہ کہنا۔ ابی جو ڈنڈو چاہو، لے لو۔''

سلو کو اس پر رحم آ گیا۔ آہستہ سے اس کے منہ پر چپت جما کر بولی۔ ''اس کا ڈنڈ یہی ہے کہ پھر مجھ سے ایسی چھیڑ نہ کرنا اور نہ کسی اور سے کرنا، نہیں تو سونا تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔''

''میں کسم کھاتا ہوں سلو! اب کبھی ایسا نہ ہوگا۔''

اس کی آواز میں التجا تھی۔ سلو کا جی بھی ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ اس کا رحم پر کیف ہو چلا تھا۔

''اور جو کرو؟''

''تو تم جو چاہنا سو کرنا۔''

سلو کا منہ اس کے منہ کے پاس آ گیا اور دونوں کے سانس، جسم اور آواز میں لرزش ہو رہی تھی کہ دفعتاً سونا نے پکارا۔ ''کس سے باتیں کرتے ہو وہاں؟''

سلو پیچھے ہٹ گئی۔ متھرا آگے بڑھ کر آنگن میں آ گیا اور بولا ''سلو تمہارے گاؤں سے آئی ہے۔''

سلو بھی پیچھے پیچھے آ کر آنگن میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ سونا وہاں کتنے آرام سے رہتی ہے۔ دالان میں چارپائی ہے جس پر سوزنی کا نرم بستر بچھا ہوا ہے، بالکل ویسا ہی ماتا دین کی چارپائی پر بچھا رہتا ہے۔ تکیہ بھی ہے اور لحاف بھی۔ چارپائی کے نیچے لوٹے میں پانی رکھا ہوا ہے۔ صحن میں چاندنی نے آئینہ سا بچھا رکھا ہے۔ ایک طرف تلسی کا چبوترا ہے اور دوسری جوار کے ڈنٹھلوں کے کئی بوجھ دیوار کے سہارے رکھے ہوئے ہیں اور بیچ میں پوال کے گٹھے ہیں۔ پاس ہی اوکھلی ہے، جس کے پاس کٹا ہوا دھان پڑا ہے۔ کھپریل پر کدو کی بیل چڑھی ہوئی ہے اور کدو بھی دکھائی پڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف دالان میں ایک گائے بندھی ہوئی ہے۔ اس حصے میں متھرا اور سونا سوتے ہیں اور لوگ دوسرے حصے میں ہوں گے۔ سلیا نے سوچا کہ سونا کی زندگی کتنے آرام کی زندگی ہے۔ سونا اٹھ کر آنگن میں آ گئی تھی

مگر سلو سے بے اختیار گلے نہیں ملی۔ سلو نے سمجھا کہ شاید متھرا کے کھڑے ہونے کی وجہ سے سونا سوچ کر رہی ہے۔ یا کون جانے اسے اب گھمنڈ ہو گیا ہو، سلو چمارن سے گلے ملنے میں اپنی ہتک سمجھتی ہو۔ اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس ملاقات سے خوشی کے بجائے حس پیدا ہوا۔ سونا کا رنگ کیسا کھل گیا ہے اور بدن کیسا کنچن سا نکھر آیا ہے۔ گٹھن بھی سڈول ہو گئی ہے۔ چہرے پر گرہست پن کی رونق کے ساتھ شباب کی ہنستی ہوئی بہار ہے۔ سلو ایک لمحہ کے لیے گویا مبہوت سی تاکتی ہوئی کھڑی رہ گئی۔ یہ وہی سونا ہے جو سوکھا سا بدن لیے، بال بکھرائے ادھر ادھر دوڑا کرتی تھی۔ مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا تھا۔ پھٹے پرانے چیتھڑے لپیٹے پھرتی رہتی تھی۔ آج گھر کی رانی ہے۔ گلے میں ہنسلی اور جمیل، کانوں میں کرن پھول اور سونے کی بالیاں، ہاتھوں میں چاندی کے کڑے اور کنگن، آنکھوں میں کاجل اور مانگ میں سندور۔ سلیا کی زندگی کا بہشت یہی تھا اور سونا کو وہاں دیکھ کر وہ خوش نہ ہوئی اسے کتنا گھمنڈ ہو گیا ہے۔ کہاں تو سلیا کے گلے میں بانہیں ڈالے گھاس چھیلنے جاتی تھی اور آج سامنے دیکھتی بھی نہیں۔ اس نے سوچا تھا کہ سونا اس کے گلے لگ کر ذرا روئے گی، اسے آدر سے بٹھائے گی، اسے کھجلائے پلائے گی، اس سے گاؤں گھر کی سینکڑوں باتیں پوچھے گی اور اس سے اپنی نئی زندگی کے تجربے، سہاگ رات کی کیفیت بیان کرے گی اور یہاں سونا کے منہ میں وہی جما ہوا ہے۔ وہ تو یہاں آ کر پچھتائی۔

آخر سونا نے رکھائی سے پوچھا۔ ''اتنی رات گئے کیسے چلیں سلو؟''

سلو نے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔ ''تم سے ملنے کو جی چاہتا تھا، اتنے دن

ہو گئے تو بھینٹ کرنے چلی آئی۔''

سونا کا لہجہ اور سخت ہوا۔ ''مگر آدمی کسی کے گھر آتا ہے تو دن کو کہ اتنی رات بیتے؟''

واقعی سونا کو اس کا آنا برا لگ رہا تھا۔ یہ وقت اس کے عیش و آرام اور ہنسنے بولنے کا تھا۔ سلو نے اسی میں دخل دے کر گویا اس کے آگے سے پروسی ہوئی تھالی کھینچ لی تھی۔

سلو ساکت سی بیٹھی ہوئی زمین کی طرف تاک رہی تھی۔ دھرتی کیوں نہیں پھٹ جاتی کہ وہ اس میں سما جائے۔ اتنی ہتک! اس نے اپنی اتنی سی زندگی میں بہت ہتک سہی، بڑ درگت دیکھی تھی مگر آج یہ کانٹا جس طرح اس کے دل میں چبھ گیا تھا، ویسی کبھی کوئی اور بات نہ چبھی تھی۔ گڑ گھر کے اندر مٹکوں میں بند رکھا ہو تو کتنی ہی موسلا دھار بارش ہو، پھر بھی کوئی نقصان نہیں ہوتا مگر جس وقت وہ دھوپ میں سوکھنے کے لیے باہر پھیلا دیا گیا ہو تب تو پانی کا ایک چھینٹا بھی اسے بالکل خراب کر دے گا۔ سلیا کے دل کے سارے نازک جذبات اس وقت منہ کھولے ہوئے تھے کہ آسمان سے امرت برسے گا مگر برسا کیا؟ امرت کی جگہ بس، جو سلیا کے روئیں روئیں میں دوڑ گیا۔ مار گزیدہ کی طرح لہریں آئیں۔ گھر میں فاقے سے سو رہنا اور بات ہے مگر دعوت کی سف سے اٹھا دیا جانا تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ سلیا کو یہاں ایک لمحہ ٹھہرنا برا معلوم ہوا، جیسے کوئی اس کا گلا دبائے ہوئے ہو۔ وہ کچھ نہ پوچھ سکی۔ سونا کے دل میں کیا ہے؟ اس وقت وہ کیا قیاس کر رہی تھی؟ بل میں بیٹھا ہوا سانپ کہیں باہر نکل آئے اس سے پہلے ہی وہ یہاں سے بھاگ

جانا چاہتی تھی، کیسے بھاگے؟ کیا بہانہ کرے اس کی جان کیوں نہیں نکل جاتی؟

متھرا نے توشہ خانے کی کنجی اٹھالی کہ سلیا کے ناشتہ کے لیے کچھ نکال لائے مگر دم بخود سا کھڑا ہوا تھا۔ ادھر سلیا کا سانس معلق تھا، جیسے سر پر ننگی تلوار لٹک رہی ہو۔

سونا کی نظر میں سب سے بڑا گنا کسی مرد کا دوسری عورت کو اور کسی عورت کا دوسرے مرد کو تاکنا تھا۔ اس خطا کے لیے اس کے پاس کوئی معافی نہ تھی۔ ڈاکہ، قتل، جعل، کوئی جرم اتنا سنگین نہ تھا۔ ہنسی دل لگی کو وہ برا نہ سمجھتی تھی، اگر علانیہ ہو مگر پوشیدہ مذاق کو بھی وہ قابل گرفت سمجھتی تھی۔ بچپن ہی سے وہ بہت سی رواجی باتیں جاننے اور سمجھنے لگی تھی۔ ہوری کو جب کبھی باہر گھر آنے میں دیر ہو جاتی تھی اور دھنیا کو پتہ لگ جاتا تھا کہ وہ دلاری کی دکان پر گیا تھا، خواہ تمباکو ہی لینے کیوں نہ گیا ہو، تو وہ کئی کئی روز تک ہوری سے بولتی نہ تھی اور نہ گھر کا کوئی کام کاج کرتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اسی بات پر اپنے میکے بھاگ گئی تھی۔ وہی خیال سونا میں زیادہ ترقی کر گیا تھا۔ جب تک اس کا بیاہ نہ ہوا تھا وہ خیال اتنا زبردست نہ تھا، مگر بیاہ ہو جانے کے بعد تو اس میں کافی پختگی اور مضبوطی آ گئی تھی۔ ایسے عورتوں مردوں کی اگر کھال بھی کھینچ لی جائے تو اسے رحم نہ آتا۔ عشق کے لیے ازدواجی دائرے کے باہر اس کی نظر میں کوئی جگہ نہ تھی۔ عورت مرد کا ایک دوسرے کے متعلق جو عین فرض ہے، اسی کو وہ عشق سمجھتی تھی۔ پھر سلو آج اس سے بسواس گھات کر رہی ہے۔ متھرا اور سلو میں ضرور ہی پہلے تعلق رہا ہوگا۔ متھرا اس سے ندی کے کنارے یا کھیتوں میں ملتا ہوگا اور آج وہ اتنی رات گئے ندی پار کر کے اسی لیے یہاں آئی ہے۔ اگر اس نے ان دونوں کی باتیں نہ سن لی ہوتیں تو اسے خبر تک نہ ہوتی۔ متھرا نے عشقیہ ملاقات

کے لیے یہی موقع سب سے زیادہ مناسب سمجھا ہوگا۔ گھر میں سناٹا جو ہے، اس کا دل سب کچھ جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ سارا بھید جان لینا چاہتی تھی تا کہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچ سکے اور یہ متھرا یہاں کیوں کھڑا ہے؟ کیا وہ اسے کچھ بولنے بھی نہ دے گا؟

اس نے غصے میں کہا۔ ''تم باہر کیوں نہیں جاتے، یا یہیں پہرا دیتے رہو گے؟''

متھرا کچھ بولے بغیر باہر چلا گیا۔ اس کا خون خشک ہو رہا تھا کہ کہیں سلو سب کچھ نہ ڈالے اور سلو کی جان سوکھ رہی تھی کہ اب وہ لٹکتی ہوئی تلوار سر پر گرا ہی چاہتی ہے۔

تب سونا نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ ''دیکھو سلو! سب ٹھیک ٹھیک بتا دو، نہیں تو میں تمہارے سامنے یہیں اپنی گردن پر گنڈاسا مار لوں گی، پھر میری سوت بن کر راج کرنا۔ دیکھو گنڈاسا وہ سامنے پڑا ہے۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔''

اس نے لپک کر گنڈاسا اٹھا لیا اور اس ہاتھ میں لے کر بولی ''یہ مت سمجھنا کہ میں نری دھمکی دے رہی ہوں۔ رس میں میں کیا کر بیٹھوں، نہیں کہہ سکتی۔ ٹھیک ٹھیک بتا دو۔''

سلیا کانپ اٹھی۔ اس کے منہ منہ سے ایک ایک لفظ اس طرح نکل پڑا جیسے گراموفون میں بھری ہوئی آواز ہو۔ وہ ایک بات بھی نہ چھپا سکی۔ سونا کے چہرے سے خوفناک ارادہ ظاہر ہو رہا تھا گویا اس پر خون سوار ہو۔

سونا نے اس کی طرف برچھی سی چبھ جانے والی نگاہوں سے دیکھا اور کٹار سے چوٹ کرتی ہوئی سی بولی۔ ''ٹھیک ٹھیک کہتی ہو؟''

''بالکل ٹھیک۔ اپنے بچے کی سوگند۔''

''کیا چھپایا تو نہیں؟''

''اگر میں نے رتی بھر بھی چھپایا ہو تو میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔''

''تو نے اس پاپی کو لات کیوں نہیں ماری؟ اسے دانت سے کاٹ کیوں نہیں لیا؟ اس کا لہو کیوں نہیں پی لیا؟ تو چلائی کیوں نا ہیں؟''

سلو کیا جواب دے؟

سونا نے پاگل کی طرح انگاروں کی سی آنکھیں نکال کر کہا۔ ''بولتی کیوں نہیں؟ کیوں تو نے اس کی ناک دانتوں سے نہیں کاٹ لی؟ کیوں نہیں دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبایا؟ تب میں تیرے چرنوں پر سر جھکاتی۔ اب تو تو میری آنکھوں میں ہر جائی ہے، پوری بیسوا! اگر یہی کرنا تھا تو ماتا دین کے نام کو کیوں کلنک لگا رہی ہے؟ کیوں کسی کو لے کر بیٹھ نہیں جاتی؟ کیوں اپنے گھر نہیں چلی گئی؟ یہی تو تیرے گھر والے چاہتے تھے، تو اپلے اور گھاس لے کر ہاٹ جاتی۔ وہاں سے پیسے لاتی اور تیرا باپ بیٹھا ہوا اس پیسے کی تاڑی پیتا۔ پھر کیوں اس باہمن کی ہتک کرائی؟ کیں اس کی آبرو میں بٹہ لگایا؟ کیوں ست ونتی بنی بیٹھی ہے؟ جب اکیلے نہیں رہا جاتا تو کیوں کسی سے سگائی نہیں کر لیتی، کیوں ندی یا تالاب میں ڈوب نہیں مرتی؟ کیوں دوسروں کی ندی میں بس گھولتی ہے۔ آج میں تجھے سے کہے دیتی ہوں کہ اگر اس طرح کی بات پھر کبھی ہوئی اور مجھے پتہ چلا تو ہم تینوں میں سے ایک بھی

جیتا نہ رہے گا۔ بس اب منہ میں کالکھ لگا کر چلدے، آج سے میرے اور تیرے بیچ کوئی ناتا نہیں ہے۔''

سلو چپکے سے اٹھی اور سنبھل کر کھڑی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ایک لمحہ تک ہمت کی فراہمی کی کوشش کرتی رہی مگر اپنی صفائی سے کچھ سوجھ نہ پڑا۔ آنکھوں میں اندھیرا تھا۔ اسر میں شکر، گلا سوکھ رہا تھا اور سارا بدن بے حس تھا، جیسے مسامات سے جان نکل رہی ہو۔ ایک ایک قدم اس طرح رکھتی ہوئی جیسے سامنے کوئی گڑھا ہو، وہ باہر آئی اور ندی کی طرف چلی دی۔

دروازے پر متھرا کھڑا بولا۔ ''اس بکھت (وقت) کہاں جاتی ہو سلو!''

سلو نے کچھ جواب نہ دیا۔ متھرا نے بھی پھر کچھ نہ پوچھا۔

وہی روپہلی چاندنی اب بھی چھائی ہوئی تھی۔ ندی لہریں اب بھی چاندنی میں نہا رہی تھیں اور سلو دیوانگی کی سی حالت میں خواب کے سائے کی طرح ندی می چلی جا رہی تھی۔

(30)

مزدوروں کی ہڑتال جاری ہے مگر اب اس سے مل کر مالکوں کا کوئی خاص نقصان نہیں ہے، نئے آدمی کم اجرت پر مل جاتے ہیں اور جان توڑ کر کام کرتے ہیں کیونکہ ان میں سبھی ایسے ہیں جو بیکار کی تکلیفیں اٹھا چکے ہیں اور اب اپنی سکت بھر کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے جس سے رزق میں خلل پڑے، چاہے جتنا کام لو اور چاہے جتنی کم چھٹیاں دو، انہیں کوئی شکایت نہیں، سر جھکائے ہوئے بیلوں کیطرح کام میں لگے رہتے ہیں۔ گھرکیوں، گالیوں، یہاں تک کہ ڈنڈوں کی مار

سے بھی انہیں کوئی شکایت نہیں ہوتی۔

اور اب پرانے مزدوروں کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے کہ وہ اس گھٹی ہوئی مزدوری پر کام کرنے آئیں اور کھنا صاحب کی خوشامد کریں۔ پنڈت اونکارناتھ پر تو انہیں ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔ انہیں وہ تنہا پائیں، تو شاید بری طرح خبر لیں۔

مگر پنڈت جی بہت بچے ہوئے رہتے ہیں۔ چراغ جلنے کے بعد اپنے دفتر سے باہر نکلتے اور افسروں کی خوشامد میں بھی لگے رہتے ہیں۔

مرزا خورشید کی دھاک اب بھی جیوں کی تیوں ہے، لیکن مرزا ان غریبوں کی تکلیف اور اس کے دور کرنے کی کوئی سبیل نہ دیکھ کر دل سے چاہتے ہیں کہ سب کے سب بحال کر دئی جائیں مگر اس کے ساتھ ہی نئے آدمیوں کی تکلیف کا خیال کر کے پوچھنے والوں سے یہی کہہ دیا کرتے ہیں کہ جیسی مرضی ہو ویسا کریں۔

مسٹر کھنا نے پرانے آدمیوں کو پھر نوکری کرنے کا خواہشمند دیکھا تو وہ بھی اکڑ گئے، حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس کی اجرت پر پرانے آدمی نئے لوگوں سے کہیں بہتر ہیں۔ پرانے آدمیوں میں زیادہ تر تو بچپن ہی سے مل میں کام کرنے کے عادی تھے اور خوب مشاق تھے۔ نئے آدمیوں میں زیادہ تر دیہاتوں کے دکھی کسان جنہیں کھلی ہوا اور میدان میں پرانے زمانے کے چوبی اوزاروں سے کام کرنے کی عادت تھی۔ مل کے اندر ان کا دم گھٹتا تھا اور مشینری کے تیز چلنے والے پرزوں سے انہیں ڈر لگتا تھا۔ آخر جب پرانے آدمی خوب پست ہو گئے، تب کھنا انہیں بحال کرنے پر راضی ہوئے مگر نئے آدمی اس سے کم اجرت پر کام کرنے کو

تیار تھے اور اب ڈائریکٹروں کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ پرانے لوگوں کو بحال کریں یا نئے آدمیوں ہی کو رہنے دیں۔

ڈائریکٹروں میں نصف تو نئے آدمیوں کی اجرت گھٹا کر رکھنے کے حق میں تھے اور بقیہ نصف کی یہ رائے تھی کہ پرانے ہی آدمیوں کو موجودہ اجرت پر رکھ لیا جائے، کچھ روپے زیادہ خرچ ہوں گے ضرور، مگر کام اب سے کہیں زیادہ ہوگا۔ کھنا مل کے روح رواں تھے اور ڈائریکٹر تو ان کے ہاتھ کی کٹھ پتلیاں تھے۔

فیصلہ کھنا ہی کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اپنے دوستوں ہی سے نہیں بلکہ دشمنوں سے بھی اس بارے میں رائے لے رہے تھے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے گوبندی کی رائے لی۔ جب سے مالتی کی طرف سے انہیں مایوسی ہوگئی تھی اور گوبندی کو معلوم ہوگیا تھا کہ مہتا جیسا عالم، تجربہ کار اور دانا شخص میری کتنی عزت کرتا ہے اور مجھ سے کس قسم کی ریاضت کی امید رکھتا ہے تب سے زن وشوہر میں پھر محبت پیدا ہوگئی تھی۔ محبت نہ سہی تو باہمی ربط وضبط تو تھا ہی۔ آپس میں وہ جلن اور بے چینی نہ تھی۔ درسیانی دیوار تو ٹوٹ گئی تھی۔

مالتی کے رنگ ڈھنگ کی بھی کایا پلٹ ہو رہی تھی۔ مہتا کی زندگی اب تک مطالعہ اور غور وخوض میں گزری تھی۔ سب کچھ پڑھ چکنے اور دینداری کو کفر کو خوب پرکھ لینے کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ تعلق و بے تعلقی دونوں کے بیچ کا جو خدمتی راستہ ہے، وہی زندگی کو بامعنی اور ہستی کو بلند بنا سکتا ہے۔

کسی ہمہ دان خدا پر ان کا اعتقاد نہ تھا۔ اگرچہ وہ اپنی دہریت کو ظاہر نہ کرتے تھے اس لیے کہ اس کے متعلق قطعی طور سے کوئی رائے قائم کرنا وہ اپنے لیے ناممکن

سمجھتے تھے، مگر یہ خیال ان کے دل میں مضبوطی سے قائم ہو گیا تھا کہ جانداروں کی پیدائش و موت اور ان کے تکلیف و آرام یا عذاب و ثواب کے متعلق کوئی خدائی قانون نہیں ہے۔

ان کا خیال تھا کہ انسان نے اپنی خودی میں اپنے کو اتنا عظیم بنالیا ہے کہ اسے ہر ایک کام کی تحریک خدا ہی سے ملا کرتی ہے۔

اسی طرح وہ ٹڈیاں بھی خدا کو ذمہ دار ٹھہراتی ہوں گی جو اپنی راہ میں سمندر کے حائل ہو جانے پر اربوں کی تعداد میں مر جاتی ہیں۔ اگر خدائی قوانین اتنے ناقابل فہم ہیں کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتے تو انہیں ماننے ہی سے انسان کو ڈھارس مل سکتی ہے۔ خدائی تصور کا ایک ہی مقصد ان کی سمجھ میں آتا تھا اور وہ تھا انسانی زندگی کا ہونا۔

وحدت یا کثرت یا عدم تشدد کو روحانی نہیں بلکہ مادی نقطۂ خیال سے دیکھتے تھے۔ اگر چہ ان باتوں کا کسی تاریخی زمانے میں بھی بول بالا نہیں رہا، پھر بھی بنی نوع انسان کے جبلی ارتقاء میں ان کا درجہ بڑا اہمیت کا ہے۔ انسانوں کی یکسانیت میں مہتا کا بہت بڑا اعتقاد تھا مگر اس اعتقاد کے لیے انہیں خدائی وجود کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہ معلوم ہوتی تھی۔ ان کی انسانی محبت کا انحصار اس پر نہ تھا کہ جملہ جانداروں میں ایک روح ہے۔ توحید و شرک کا مسئلہ ان کی نظر میں رواجی اہمیت کے سوا کوئی اور اہمیت نہ رکھتا تھا اور وہ استعمالی اہمیت ان کے نزدیک انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے، ان کی باہمی تفریق کے مٹانے اور ان میں اخوت کا جذبہ پیدا کرنے ہی میں مضمر تھی۔

یہ یکسانیت ان کے دل میں کچھ ایسی قائم ہوگئی تھی کہ اس کے لیے کسی روحانی بنیاد کا پیدا کرنا ان کی نظر میں بالکل فضول تھا، پھر ایک بار اس اصلیت کو جان کر وہ خاموش نہ بیٹھ سکتے تھے۔ بےلوثی کے ساتھ بلا کسی ذاتی غرض کے زیادہ سے زیادہ کام کرنا ان کے لیے ضروری ہوگیا تھا، جس کے بغیر ان کے دل کو سکون نہ مل سکتا تھا۔ شہرت، منفعت یا فرض کی ادائیگی کے خیالات ان کے دل میں آتے ہی نہ تھے، ان کی بےمائیگی ہی انہیں ان سے بچانے کے لیے کافی تھی۔ خدمت ہی اب ان کی خاص غرض ہوتی جاتی تھی اور ان کی اس فراخ دلی کا اثر درپردہ مالتی پر بھی پڑتا جاتا تھا۔ اب تک جتنے مرد اسے ملے، سب نے اس کی عیاشانہ رغبت ہی کو اکسایا۔ اس کے ترک و ایثار کی طاقت روز بروز گھٹتی ہی رہی تھی مگر مہتا کی صحبت سے اس پر تازگی آنے لگی۔ سبھی حقیقی انسانوں میں یہ جذبہ چھپا رہتا ہے اور روشنی پاکر چمک اٹھتا ہے۔

انسان اگر دولت یا شہرت کے پیچھے پڑا ہے تو سمجھ لو کہ ابھی تک وہ کسی اہل دل کے لگاؤ میں نہیں آیا۔ مالتی اب اکثر غریبوں کے گھر بلا فیس لیے مریضوں کو دیکھنے چلی جاتی تھی اور مریضوں کے ساتھ اس کے برتاؤ میں بڑی نرمی آگئی تھی۔ ہاں ابھی تک وہ بناؤ سنگھار سے اپنا دل نہ ہٹا سکتی تھی۔ رنگ اور پاؤڈر کا چھوڑنا اسے اپنی باطنی تبدیلیوں سے بھی کہیں زیادہ مشکل معلوم ہوتا تھا۔

ادھر کبھی کبھی وہ دونوں دیہاتوں کی طرف چلے جاتے تھے اور کسانوں کے ساتھ دو چار گھنٹے رہ کر اور کبھی کبھی ان کے جھونپڑوں میں رات کاٹ کر اور ان ہی کا سا کھانا کھا کر اپنے کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔ ایک روز وہ سمری پہنچ گئے اور گھومتے

ہوئے بلاری بھی جا پہنچے۔ ہوری دروازے پر بیٹھا چلم پی رہا تھا کہ مالتی اور مہتا آ کر کھڑا ہو گئے۔ مہتا نے ہوری کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور بولے یہی تمہارا گاؤں ہے؟ یاد ہے جب ہم لوگ رائے صاحب کے یہاں آئے تھے اور تم دھنش یگیہ میں مالی بنے تھے؟''

ہوری کی یاد تازہ ہو گئی، پہچان گیا اور پٹیشوری کے گھر کی طرف کرسیاں لانے چلا۔

مہتا نے کہا۔ ''کرسیوں کا کوئی کام نہیں، ہم لوگ اسی چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں کرسی پر بیٹھنے نہیں، تم سے کچھ سیکھنے آئے ہیں۔''

دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہوری متحیر کھڑا رہا۔ ان لوگوں کی کیا خاطر کرے؟ بڑے آدمی ہیں، ان کی خاطر کرنے کے لائق اس کے پاس ہے کیا۔ آخر اس نے پوچھا:

''پانی لاؤں؟''

مہتا نے کہا۔ ''ہاں پیاس تو لگی ہے۔''

''کچھ مٹھائی بھی لیتا آؤں؟''

''لاؤ اگر گھر میں ہو۔''

ہوری گھر میں مٹھائی اور پانی لانے گیا۔ تب تک گاؤں کے لڑکوں نے آ کر دونوں کو گھیر لیا اور دیکھنے لگے گویا عجائب خانے سے دو نئے نمونے آ گئے ہوں۔

سلیا بچے کو لیے کسی کام سے چلی جا رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر تعجب سے ٹھہر

گئی۔

مالتی نے آ کر اس کے بچے کو گود میں لے لیا اور پیار کرتی ہوئی بولی:

''کتنے دونوں کا ہے؟''

سلیا کو ٹھیک نہ معلوم تھا۔ ایک دوسری عورت نے بتایا۔

''کوئی سال بھر کا ہوگا؟''

سلیا نے تائید کی۔

مالتی نے مذاق کیا ''پیارا بچہ ہے، اسے ہمیں دے دو۔''

سلیا نے گھمنڈ سے پھول کر کہا۔ ''آپ ہی کا تو ہے۔''

''تو میں اسے لے جاؤں؟''

''لے جائیے۔ آپ کے ساتھ رہ کر آدمی ہو جائے گا۔''

گاؤں کی دوسری عورتیں آ گئیں اور مالتی کو ہوری کے مکان میں لے گئیں، کیونکہ یہاں مردوں کے سامنے مالتی سے گفتگو کرنے کا موقع انہیں نہ ملتا۔ مالتی نے دیکھا کہ چارپائی بچھی ہے اور اس پر ایک دری پڑی ہوئی ہے جو پٹیشوری کے یہاں سے مانگ کر لائی گئی تھی۔ مالتی جا کر بیٹھی۔ بچوں حفاظت اور پرورش کی بات چلی۔ عورتیں جی لگا کر سنتی رہیں۔

دھنیا نے کہا۔ ''یہاں یہ سب کام کیسے ہوگا سرکار؟ کھانے تک کا ٹھکانا تو ہے نہیں۔''

مالتی نے سمجھایا۔ ''صفائی میں خرچ نہیں، صرف تھوڑی سی محنت اور ہوشیاری سے کام چل سکتا ہے۔''

دلاری نے پوچھا۔ ''یہ سب باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں سرکار؟ آپ کا تو ابھی بیاہ نہیں ہوا؟''

مالتی نے مسکرا کر پوچھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا بیاہ نہیں ہوا؟''

سبھی عورتیں منہ پھیر کر مسکرائیں۔ پنیا بولی۔ ''بھلا یہ بھی چھپا رہتا ہے سرکار؟ آپ کا تو ابھی بیاہ نہیں ہوا؟''

سبھی عورتیں منہ پھیر کر مسکرائیں پنیا بولی۔ ''بھلا یہ بھی چھپا رہتا ہے سرکار! منہ دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے۔''

مالتی نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے بیاہ نہیں کیا کہ آپ لوگوں کی خدمت کیسے کرتی۔''

سب نے ایک زبان ہو کر کہا

''دھن ہو سرکار، دھن ہو!''

سلیا، مالتی کے پیر دبانے لگی۔ ''سرکار کتنی دور سے آئی ہیں، تھک گئی ہوں گی۔''

مالتی نے پیر کھینچ کر کہا:

''نہیں، نہیں۔ میں تھکی نہیں ہوں۔ میں تو موٹر پر آئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگ اپنے بچے لائیں تو میں انہیں دیکھ کر بتاؤں کہ آپ انہیں کس طرح تندرست رکھ سکتی ہیں۔''

ذرا دیر میں بیس پچیس بچے آ گئے۔ مالتی انہیں دیکھنے لگی۔ کئی بچوں کی آنکھیں دیکھنے لگی۔ کئی بچوں کی آنکھیں اٹھی تھیں، ان کی آنکھوں میں دوائی ڈالی۔ زیادہ تر

بچے کمزور تھے، جس کا سبب تھا والدین کو اچھا کھانا نہ ملنا۔ مالتی کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ دودھ بہت کم گھروں میں ہوتا تھا اور گھی کے تو برسوں درشن نہ ہوتے تھے۔

مالتی نے یہاں بھی انہیں کھانے کی اہمیت بتائی جیسا وہ سبھی گاؤں والوں میں بتایا کرتی تھی۔ اس کا جی اس لیے کڑھتا تھا کہ یہ لوگ اچھا کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ اس کا جی اس لیے کڑھتا تھا کہ یہ لوگ اچھا کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ اسے دیہاتیوں پر غصہ آجاتا تھا۔

کیا تمہارا جنم اسی لیے ہوا ہے کہ تم مر مر کر کماؤ اور جو کچھ پیدا ہوا، اسے کھا نہ سکو؟ جہاں دو چار بیلوں کے لیے چارا ہے، وہاں دو ایک گائے بھینسوں کے لیے چارا نہیں ہے؟ کیوں یہ لوگ غذا کو زندگی کی خاص چیز سمجھ کر اسے صرف جان بچانے کی چیز سمجھتے ہیں۔ کیوں سرکار سے نہیں کہتے کہ برائے نام سود پر روپیہ دے کر انہیں دوسو دخور مہاجنوں کے نیچے سے بچائے۔ اس نے جس کسی سے پوچھا تو یہی معلوم ہوا کہ اس کی کمائی کا بڑا حصہ مہاجنوں کا قرض ادا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔

بٹوارے کا مرض بھی بڑھتا جاتا تھا۔ آپس میں اتنی مغائرت تھی کہ شاید ہی کوئی دو بھائی ایک ساتھ رہتے ہوں۔ ان کی اس درگت کا سبب بہت کچھ ان کی تنگ خیالی اور خودغرضی تھی۔ مالتی یہی باتیں عورتوں سے کرتی رہی۔ ان کی عقیدت دیکھ کر اس کے دل میں خدمت کی تحریک اور بھی زور پکڑ رہی تھی۔ اس قربانی کی زندگی کے سامنے وہ عیش و آرام کی زندگی کتنی حقیر اور مصنوعی تھی۔

آج اس کے وہ ریشمی کپڑے جن پر زری کا کام تھا اور وہ خوشبو سے مہکتا ہوا

بدن اور وہ پاؤڈر لگا ہوا چہرہ اسے شرمندہ کرنے لگا۔ اس کی کلائی پر بندھی ہوئی سونے کی گھڑی جیسے ٹکٹکی لگائے اسے گھور رہی تھی۔ اس کے گلے میں چمکتا ہوا جڑاؤ نیکلس جیسے اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔

ان تیاگ اور بھگتی کی دیویوں کے سامنے وہ اپنی ہی نظر میں حقیر ہو رہی تھی۔ وہ ان دیہاتیوں سے بہت سی باتیں زیادہ جانتی تھی۔ وقت کی رفتار سے زیادہ واقف تھی، لیکن جن حالات میں یہ غریب عورتیں اپنی زندگی کو کارآمد بنا رہی ہیں کیا، وہ ایک دن بھی رہ سکتی ہے؟ دل میں غرور کا نام بھی نہیں۔ دن بھر کام کرتی ہیں، فاقہ کرتی ہیں، روتی ہیں، پھر بھی اتنی ہنس مکھ اور زندہ دل ہیں۔ بیگا نے ان کے لیے اس قدر یگانے ہو گئے ہیں کہ ان کا اپنا وجود ہی نہیں رہا۔

ان کی یگانگت اپنے بچوں میں، اپنے شوہر میں اور اپنے رشتہ داروں میں ہے، اسی خیال کی حفاظت کرتے ہوئے اور اسی کے دائرے کو بڑھاتے ہوئے مستقبل کا نسائی معیار بنے گا۔ بیدار عورتوں میں اس کے بجائے خود پروری کا جو خیال پیدا ہو گیا ہے، یعنی سب کچھ اپنے لیے، اپنے ہی عیش و آرام کے لیے، اس سے تو یہ خواب کی حالت ہی بھلی۔ مانا کہ مرد بے رحم ہے، مگر ہے تو انہی ماؤں کا جنا ہوا؟

کیوں ماں نے لڑکے کو ایسی تعلیم دی کہ وہ ماں کی اور اس کے ناتے کل نسوانی طبقہ کی پرستش کرتا؟ اسی لیے کہ ماں کو ویسی تعلیم دینا نہیں آتا، اسی لیے کہ اس نے خود کو اتنا مٹا دیا ہے کہ اس کی ہیئت ہی تبدیل ہو گئی ہے، اس کی شخصیت ہی ختم ہو گئی ہے۔

نہیں، خود کو مٹانے سے کام نہ چلے گا۔ عورت کو سماج کی فلاح کے لیے اپنے

حقوق کی حفاظت کرنی ہوگی، اسی طرح جیسے ان کسانوں کو اپنی حفاظت کے لیے، اپنی اس فرشتہ خصلتی کو کسی قدر ترک کرنا پڑے گا۔

شام ہوگئی تھی۔ مالتی کو عورتیں اب تک گھیرے ہوئے تھیں۔ اس کی باتوں سے جیسے ان کا جی ہی نہ بھرتا تھا۔ کئی عورتوں نے ان سے رات میں یہی رہنے کا اصرار کیا۔ مالتی کو بھی ان کا سادہ پریم ایسا پیارا لگا کہ اس نے ان کی دعوت منظور کر لی۔ رات کو عورتیں اسے اپنا گانا سنائیں گی۔ مالتی نے گھر گھر میں جا کر ہر جگہ کی حالت سے واقفیت حاصل کرنے میں اپنا وقت صرف کیا۔ اس کی پرخلوص ہواہی اور ہمدردی اتی عورتوں کے لیے دیوی کے وردان سے کم نہ تھی۔

ادھر مہتا صاحب چارپائی پر بیٹھے ہوئے کسانوں کی کشتی دیکھ رہے تھے، پچھتا رہے تھے کہ مرزا صاحب کو کیوں نہ ساتھ لے لیا، ورنہ ان کی بھی ایک کشتی ہو جاتی۔ انہیں تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے مضبوط اور معصوم لڑکوں کے ساتھ تعلیمیافتہ لوگ کیسے بے رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ نادانی کی طرح دانائی بھی سادا، صاف اور سنہرے سپنوں والی ہوتی ہے۔ انسانیت پر اس کا اتنا زبردست اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ مخالفانہ سلوک کو انسانیت کے خلاف سمجھنے لگتی ہے۔ وہ بھول جاتی ہے کہ بھیڑیوں کی معصومیت اور بے چارگی کا جواب ہمیشہ پنجوں اور دانتوں سے دیا ہے۔

وہ اپنی ایک معیاری دنیا بنا کر اسے معیاری شخصیتوں سے آباد کرتی ہے اور اسی میں مگن رہتی ہے۔ حقیقت کتنی نا قابل فہم، مشکل اور غیر قدرتی ہے، یہ خیال کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

مہتا صاحب اس وقت ان گنواروں کے بیچ میں بیٹھے ہوئے اسی مسئلے کو حل کر

رہے تھے کہ ان کی حالت اتنی قابل رحم کیوں ہے، وہ اس سچائی کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے کہ ان کی فرشتہ خصلتی ہی ان کی تباہ حالی کا سبب ہے۔ کاش یہ لوگ زیادہ تر انسان اور کم تر فرشتہ ہوتے تو اس طرح نہ ٹھکرائے جاتے۔ ملک میں کچھ بھی ہو، انقلاب ہی کیوں نہ آ جائے مگر ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی جماعت ان کے سامنے طاقت ور بن کر آئے تو اس کے سامنے یہ سر جھکانے کو تیار ہیں۔

ان کی معصومیت بے حسی کی حد تک پہنچ گئی ہے، جسے کوئی سخت صدمہ ہی ذی حس اور متحرک بنا سکتا ہے۔ ان کی آتما گویا ہر طرف سے مایوس ہو کر اب اپنے اندر ہی پیڑ توڑ کر بیٹھ گئی ہے، گویا ان میں زندگی کا احساس ہی نہیں ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ جو لوگ اب تک کھیتوں میں کام کر رہے تھے، وہ بھی دوڑے چلے آتے تھے۔ اسی وقت مہتا نے مالتی کو گاؤں کی کئی عورتوں کے ساتھ ایسی محویت سے ایک بچے کو گود میں لیے دیکھا، گویا وہ بھی ان ہی میں سے ایک ہو۔ مہتا کا دل خوشی سے بھر گیا۔ مالتی نے ایک طرح سے خود کو مہتا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کے متعلق مہتا کو اب کوئی شک و شبہ نہ تھا۔

مگر ابھی تک ان کے دل میں مالتی کے لیے وہ پاک اور بلند خواہش پیدا نہ ہوئی تھی، جس کے بغیر شادی کی تجویز کرنا ان کے لیے مضحکہ انگیز تھا۔ مالتی ناخواندہ مہمان کی طرح ان کے دروازے پر آ کھڑی ہو گئی تھی اور مہتا نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس میں محبت کا جذبہ نہ تھا، صرف مردانیت کا جذبہ تھا۔

اگر مالتی انہیں اس قابل سمجھتی ہے کہ ان پر عنایت کی نظر کرے تو مہتا ان کی اس عنایت کو نامنظور نہ کر سکتے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مالتی کو گوبندی کے راستے سے

ہٹا دینا چاہتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ مالتی جب تک اپنا پیر آگے نہ جمائے گی، پچھلا پیر نہ اٹھائے گی۔ وہ جانتے تھے کہ مالتی کے ساتھ فریب کر کے وہ کمینگی ہی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے لیے ان کا ضمیر انہیں برابر ملامت کرتا رہتا تھا، مگر جیوں جیوں وہ مالتی کو قریب سے دیکھتے تھے ان کے دل میں کشش بڑھتی جاتی تھی۔ حسن کی دلکشی تو ان پر کوئی اثر نہ ڈال سکتی تھی۔

یہ اوصاف کی دلکشی تھی، وہ جانتے تھے کے جسے سچی محبت کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک رشتے میں منسلک ہو جانے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سے قبل جو محبت ہوتی ہے وہ تو محض فریفتگی ہے، جسے ذرا بھی قیام و قرار نہیں مگر اس سے پہلے یہ تصفیہ کر لینا تو ضروری تھا کہ جو پتھر باہمی قربت کی خراد پر چڑھے گا، وہ خراد کے لیے موزوں بھی ہے یا نہیں۔ سبھی پتھر تو خراد پر چڑھ کر خوبصورت مورتوں کی شکل نہیں اختیار کر لیتے۔ اتنے دنوں میں مالتی نے ان کے دل کے مختلف حصوں پر اپنی شعاعیں ڈالی تھیں جو ابھی تک مرکوز ہو کر شعلے کی صورت میں نہ پھوٹ پڑی تھیں، جس سے ان کا سارا دل روشن ہو جاتا۔

آج مالتی نے اپنی دیہاتی بہنوں سے مل کر اور ساری تفریق کو مٹا کر گویا ان شعاعوں کو مرکوز کر دیا اور آج پہلی بار مہتا کو مالتی کے متعلق یگانگت کا احساس ہوا۔ جیوں ہی مالتی گاؤں کا گشت لگا کر لوٹی، انہوں نے اسے ساتھ لے کر ندی کی طرف رخ کیا۔ رات یہیں گزارنے کا ارادہ ہو گیا۔ مالتی کا دل آج نہ جانے کیوں دھڑکنے لگا۔ مہتا کے چہرے پر آج اسے ایک عجیب روشنی اور خواہش جھلکتی ہوئی نظر آئی۔

ندی کے کنارے چاندی کا فرش بچھا ہوا تھا اور ندی جواہرات سے جڑے ہوئے گہنے پہنے ہوئے میٹھے سروں میں گا گا کر چاندا ور اور تاروں اور غنودگی کی حالت میں سر جھکائے ہوئے پیڑوں کو اپنا رقص دکھا رہی تھی۔ مہتا قدرت کی متوالی چھبن پر جیسے مست ہو گئے۔ گویا ان کا بچپن اپنے سارے کھیلوں کے ساتھ لوٹ آیا تھا۔ ریت پر کودتے اور دوڑتے ہوئے ندی میں جا کر گھٹنے تک پانی میں کھڑے ہو گئے۔

مالتی نے کہا۔ ''پانی میں کھڑے نہ ہوں، کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔''

مہتا نے پانی اچھال کر کہا۔ ''میرا تو جی چاہتا ہے کہ تیر کر ندی کے اس پار چلا جاؤں۔''

''نہیں نہیں۔ پانی سے نکل آؤ۔ میں نے جانے دوں گی۔''

''تم میرے ساتھ نہ چلو گی؟ اس سونی بستی میں، جہاں سپنوں کا راج ہے۔''

''مجھے تو تیرنا نہیں آتا۔''

''اچھا آؤ اک ناؤ بنائیں اور اس پر بیٹھ کر چلیں۔''

وہ باہر نکل آئے۔ آس پاس بڑی دور دور تک جھاؤ کا جنگل کھڑا تھا۔

مہتا نے جیب سے چاقو نکالا اور بہت سی ٹہنیاں کاٹ کر جمع کیں۔ کنارے پر سرپت اگا ہوا تھا۔ وہاں جا کر ایک گٹھا کاٹ لائے اور وہیں بالو کے فرش پر بیٹھ کر رسی بٹنے لگے۔ ایسے خوش گویا بہشت جانے کی تیاری کر رہے ہوں۔

کئی بار انگلیاں چر گئیں، خون نکلا۔ مالتی ناراض ہو رہی تھی اور بار بار گاؤں واپس جانے کے لیے اصرار کر رہی تھی مگر انہیں کوئی پروا نہ تھی۔ وہی بچوں کی خوشی

تھی، وہی الھڑ پن تھا، وہی ہٹ تھی۔ فلسفہ اور سائنس سبھی اس بہاؤ میں بہہ گئے تھے۔

رسی تیار ہوگئی۔ جھاؤ کا بڑا تختہ سا بن گیا۔ ٹہنیاں دونوں سروں پر رسی سے جوڑ دی گئی تھیں۔ اس کے سوراخوں میں جھاؤ کی پتیاں بھر دی گئیں تا کہ پانی اوپر نہ آئے۔ ناؤ تیار ہوگئی رات اور بھی خواب آلود ہوگئی تھی۔

مہتا نے ناؤ کو پانی میں ڈال کر مالتی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''آؤ بیٹھو۔''

مالتی نے ڈرتے ہو کہا ''دو آدمیوں کا بوجھ سنبھال سکے گی؟''

مہتا نے فلسفیانہ تبسم سے کہا، جس ناؤ پر بیٹھے ہوئے ہم لوگ زندگی کا سفر پورا کر رہے ہیں وہ تو اس سے کہیں زیادہ کمزور ہے۔ مالتی! کیا ڈر رہی ہو؟

''ڈر کس بات کا، جب تم ساتھ ہو؟''

''سچ کہتی ہو؟''

''اب تک میں نے بلا کسی کی مدد کے مشکلوں کو سر کیا ہے، اب تو تمہارے ساتھ ہوں۔''

دونوں اس جھاؤ کے تختے پر بیٹھے اور مہتا نے جھاؤ ہی کے ایک ڈنڈے سے اسے گھسینا شروع کیا۔ تختہ ڈگمگا ہوا پانی میں بہہ چلا۔

مالتی نے دل سے اس خطرے کا خیال دور کرنے کے لیے پوچھا:

''تم تو ہمیشہ شہروں میں رہے، دیہاتی زندگی کے عادی کیسے ہو گئے؟ میں تو ایسا تختہ کبھی نہ بنا سکتی۔''

مہتا نے اسے چاہت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''شاید یہ میرے پچھلے جنم کا سنسکار ہے، قدرت سے مس ہوتے ہی جیسے مجھ میں نئی زندگی سی آجاتی ہے۔ رگ رگ میں جنبش ہونے لگتی ہے۔ ایک ایک شڑیا، ایک ایک جانور جیسے مجھے خوشی کی دعوت دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جیسے بھولے ہوئے سکھوں کی یاد دلا رہا ہو، یہ خوشی مجھے اور کہیں نہیں ملتی! موسیقی کے رلانے والے راگوں میں بھی نہیں، فلسفہ کی بلند پروازیوں میں بھی نہیں، جیسے یہ سب میرے اپنے سگے ہوں، قدرت کے بیچ میں پڑ کر جیسے میں اپنے آپ کو پا جاتا ہوں، جیسے پرندہ اپنے گھونسلے میں آجائے۔''

تختہ ڈگمگاتا، کبھی ترچھا، کبھی سیدھا، کبھی چکر کھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

دفعتاً مالتی نے آزردگی سے پوچھا۔ ''اور میں تمہاری زندگی میں کبھی نہیں آتی؟''

مہتا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''آتی ہو۔ بار بار آتی ہو۔ خوشبو کے ایک جھونکے کی برح، تصور کے ایک عکس کی طرح اور پھر غائب ہو جاتی ہو۔ دوڑتا ہوں کہ تمہیں ہاتھوں سے جکڑ لوں، مگر ہاتھ کھلے رہ جاتے ہیں اور تم ہوا ہو جاتی ہو۔''

مالتی نے مجنونانہ کہا۔ ''مگر تم نے اس کا سبب بھی سوچا یا سمجھنا چاہا؟''

''ہاں مالتی! بہت سوچا اور بار بار سوچا۔''

''تو کیا معلوم ہوا؟''

''یہی کہ میں جس بنیاد پر اپنی زندگی کا گھر کھڑا کرنا چاہتا ہوں، وہ ناپائیدار ہے، یہ کوئی بڑا محل نہیں بلکہ صرف ایک چھوٹی سی اکیلی کٹیا ہے، مگر اس کے لیے بھی

تو کوئی مستقل بنیاد چاہیے۔''

مالتی نے اپنا ہاتھ چھڑا کر جیسے روٹھتے ہوئے کہا۔''یہ جھوٹا جملہ ہے۔''

''یہ جھوٹا جملہ ہے تم نے مجھے ہمیشہ امتحانی نظر سے دیکھا۔کبھی پیار کی نگاہوں سے نہیں۔کیا تم اتنا بھی نہیں جانتی کہ عورت امتحان نہیں چاہتی بلکہ محبت چاہتی ہے۔امتحان کے اوصاف کو عیوب اور حسن و قبح بنانے والی چیز ہے محبت، جو اس کے برعکس کر دکھاتی ہے۔میں نے تم سے محبت کی تو میں خیال ہی نہیں کر سکی کہ تم میں کوئی عیب ہے مگر تم نے میرا امتحان لیا اور تم مجھے متلون،شوخ اور نہ جانے کیا کیا سمجھ کر مجھ سے ہمیشہ دور بھاگتے رہے۔نہیں، میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ مجھے کہہ لینے دو۔میں کیوں متلون اور شوخ تھی؟اسی لیے کہ مجھے وہ محبت نہیں ملی جو مجھے مستقل اور متین بناتی۔اگر تم نے اپنے آپ کو اس طرح میرے لیے وقف کر دیا ہوتا جیسا میں نے تمہارے لیے کیا ہے،تو تم آج مجھ پر ایسا نامناسب حملہ نہ کرتے ۔''

مہتا نے مالتی کے روٹھنے کا لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم نے میرا امتحان کبھی نہیں لیا؟سچ کہتی ہو؟''

''کبھی نہیں۔''

''تو تم نے غلطی کی۔''

''میں اس کی پروا نہیں کرتی۔''

''جذبے میں نہ آؤ مالتی،محبت کرنے سے پہلے ہم سب امتحان لیتے ہیں اور تم نے بھی لیا۔در پردہ ہی سہی۔میں آج تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ پہلے

میں نے تمہیں اس طرح دیکھا جیسے ہر روز ہزاروں عورتوں کو دیکھا کرتا ہوں، صرف تفریحی خیال سے اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو تم نے بھی مجھے اپنی تفریح کے لیے ایک نیا کھلونا سمجھا۔''

مالتی نے ٹوکا۔ ''غلط کہتے ہو۔ میں نے کبھی تم کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میں نے پہلے ہی دن تمہیں اپنا دیوتا بنا کر اپنے دل.....''

مہتا نے بات کاٹ کر کہا۔

''پھر وہی جذبہ! مجھے ایسے اہم معاملے میں جذبے کو دخل دینا پسند نہیں، اگر تم نے پہلے ہی دن سے مجھے اس عنایت کے قابل سمجھا تو اس کا یہی سبب ہو سکتا ہے کہ میں بھیس بنانے میں تم سے زیادہ ہوشیار ہوں، ورنہ جہاں تک میں نے نسوانی فطرت پر غور کیا ہے، عورتیں محبت کے بارے میں کافی چھان بین کرتی ہیں۔ پہلے تو سوئمبر سے مردوں کی آزمائش ہوتی تھی، وہی بات اب بھی موجود ہے، چاہے اس کا روپ کچھ بدل گیا ہو۔ میں نے تب سے برابر یہی کوشش کی ہے کہ خود کو سراپا تمہارے سامنے رکھ دوں اور اس کے ساتھ ہی تمہارے دل تک پہنچ جاؤں۔ اور میں جیوں جیوں تمہارے دل کی گہرائی میں گیا ہوں، مجھے جواہرات ہی ملے ہیں۔ میں تفریح کے لیے آیا اور آج پرستار بنا ہوا ہوں۔ تم نے میرے اندر کیا پایا، یہ مجھے معلوم نہیں۔''

ندی کا دوسرا کنارہ آ گیا۔ دونوں اتر کر اسی ریت کے فرش پر بیٹھے اور مہتا پھر اسی رو میں بولے:

''اور آج میں یہاں وہی پوچھنے کے لیے تمہیں لایا ہوں۔''

مالتی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کیا ابھی تمہیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت باقی ہے؟''

''ہاں اسی لیے کہ میں آج تمہیں اپنا وہ روپ دکھاؤں گا جو شاید ابھی تک تم نے نہیں دیکھا اور جسے میں نے بھی چھپایا ہے۔ اچھا مان لو کہ میں تم سے شادی کر کے کل بے وفائی کروں، تو مجھے کیا سزا دو گی؟''

مالتی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا، اس کا مطلب وہ نہ سمجھی۔ بولی۔ ''ایسا سوال کیوں کرتے ہو؟''

''میرے لیے یہ بہت اہم ہے۔''

''میں اسے ممکن نہیں سمجھتی۔''

''دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے، بڑے سے بڑا مہاتما بھی ایک لمحے میں بھرشٹ ہو سکتا ہے۔''

''میں اس کا سبب کھوجوں گی اور اسے دور کروں گی۔''

''مان لو کہ میری عادت نہ چھوٹے۔''

''پھر میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا کروں گی۔ شاید زہر کھا کر سو رہوں۔''

مالتی نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔ ''بتاؤ؟''

مہتا نے استقلال سے کہا۔ ''میں پہلے تمہاری جان لے لوں گا، پھر اپنی دے دوں گا۔''

مالتی نے زور سے قہقہہ مارا اور سر سے پیر تک کانپ اٹھی۔ اس کا قہقہہ اس لرزش کو چھپانے ہی کے لیے تھا۔

مہتا نے پوچھا۔ ''تم ہنسیں کیوں؟''

''اسی لیے کہ تم ایسے ہنسنے والے نہیں معلوم ہوتے۔''

''نہیں مالتی! اس بارے میں میں پورا حیوان ہوں اور اس پر لجانے کا کوئی سبب نہیں دیکھتا۔ روحانی محبت اور ایثار آمیز محبت اور بے غرضانہ محبت جس میں آدمی خود کو مٹا کر صرف معشوق کے لیے جیتا ہے، اس کی خوشی میں خوش ہوتا ہے اور اس کے پیروں پر اپنی روح قربان کر دیتا ہے۔ یہ سب میرے لیے محض بے معنی الفاظ ہیں۔''

''میں نے کتابوں میں ایسی محبت کے قصے پڑھے ہیں۔ جہاں عاشق نے معشوق کے نئے عشاق کے لیے اپنی جان دے دی ہے مگر اس جذبے کو میں حقیقت کہہ سکتا ہوں، اطاعت کہہ سکتا ہوں، مگر محبت کبھی نہیں۔ محبت سیدھی سادی گائے نہیں بلکہ خونخوار شیرنی ہے جو اپنے شکار پر کسوی کی آنکھ بھی نہیں پڑنے دیتی۔''

مالتی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی:

''اگر محبت خونخوار شیرنی ہے تو میں اس سے دور ہی رہوں گی۔ میں نے تو اسے گائے ہی سمجھ رکھا تھا۔ میں محبت کو بدگمانی سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ اسے جسمانی نہیں بلکہ روحانی چیز سمجھتا ہے۔ بدگمانی کی وہاں ذرا بھی گنجائش نہیں۔ اور اہنسا تو بدگمانی ہی کا پھل ہے۔ وہ محبت روح کا پورے طور پر وقف کر دینا ہے، اس کے مندر میں تم آزمائش سے نہیں بلکہ عبادت ہی سے بردان پا سکتے ہو۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور تیزی سے ندی کی طرف چلی۔ جیسے اس نے اپنا کھویا

ہوا اراستہ پالیا ہو۔ ایسی زبردست تحریک کا اسے احسان نہ ہوا تھا۔ اس نے آزادانہ زندگی میں خود میں ایک کمزوری محسوس کی تھی جو اسے متزلزل اور بےقرار رکھتی تھی۔ اس کا دل جیسے کسی سہارے کی تلاش میں تھا جس کے ذریعے وہ دنیا کا مقابلہ کر سکے۔ خود میں اسے وہ سکت نہ ملتی تھی۔ دانائی اور کردار کی طاقت دیکھ کر وہ اس طرف راغب ہو جاتی تھی، پانی کی طرح ہر ایک برتن کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ اس کی اپنی کوئی شکل نہ تھی۔

اس کی طبیعت ابھی تک کسی امتحان دینے والے متعلم کی سی تھی۔ متعلم کو کتابوں سے محبت ہو سکتی ہے اور ہو بھی جاتی ہے مگر وہ کتاب کے ان ہی حصوں پر زیادہ توجہ دیتا ہے جو امتحان میں آ سکتے ہیں۔ اس کی اوّل غرض امتحان میں کامیاب ہونا ہے۔ واقفیت حاصل کرنا، اس کے بعد کا کام ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ممتحن بڑا رحم دل یا اندھا ہے اور متعلموں کو یوں ہی پاس کر دیا کرتا ہے تو شاید وہ کتابوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ مالتی جو کچھ کرتی تھی وہ مہتا کو خوش کرنے کے لیے۔ اس کی غرض تھی مہتا کی محبت اور عقیدت حاصل کرنا، ان کے دل کی رانی بن جانا، لیکن اسی متعلم کی طرح اپنی قابلیت کا یقین دلا کر قابلیت آ جانے پر ممتحن خود بخود اس سے مطمئن ہو جائے گا، اتنا صبر اس میں نہ تھا۔

مگر آج مہتا نے جیسے اسے ٹھکرا کر اس کی روحانی قوت کو بیدار کر دیا۔ مہتا کو جب اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا جبھی سے اس کا دل ان کی طرف جھک رہا تھا۔ اسے وہ اپنا شناساؤں میں قابل ترین معلوم ہوئے۔ اس کی پاکیزہ زندگی میں عقل کی تیزی اور خیالوں کی مضبوطی ہی بہترین شے تھے۔ دولت و اقتدار کو تو وہ صرف

کھلونا سمجھتی تھی، جسے کھیل کر لڑکے توڑ پھوڑ ڈالتے ہیں۔ صورت میں اب اس کے لیے کوئی خاص کشش نہ تھی۔ اگرچہ اسے بدصورتی سے نفرت تھی۔ اس کو تو اب عقلی قوت ہی اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی جس کا سہارا پا کر اس میں خود اعتمادی پیدا ہو، نجی ترقی کی تحریک ملے، اپنے میں طاقت آئے اور اپنی زندگی کو کارآمد بنانے کی واقفیت ہو۔ مہتا کی عظمت و دانائی نے اس پر اپنا سکہ جما دیا تھا اور تب سے وہ اپنی اصلاح کرتی چلی آ رہی تھی۔ جس حرکت دینے والی طاقت کی اسے ضرورت تھی، مل گئی تھی اور پوشیدہ طور پر اسے طاقت اور حرکت دے رہی تھی۔ زندگی کا نیا معیار جو اس کے سامنے تھا، وہ خود کو اس حد تک پہنچانے کی کوشش کرتی اور کامیابی کا احساس کرتی ہوئی اس دن کا تصور کر رہی تھی جب وہ اور مہتا ایک سے ہو جائیں گے۔ آج یہ تصور اسے اور بھی مستقل اور مضبوط بنا رہا تھا۔

مگر آج جب مہتا نے اس کی امیدوں کے دروازے تک لا کر محبت کا وہ معیار اس کے سامنے رکھا جس میں محبت کو روحانیت اور ایثار کی بلندی سے گرا کر مادی سطح تک پہنچا دیا گیا تھا، جہاں بدگمانی اور حسد کا راج ہے، تب اس کی پاک و صاف عقل کو چٹ لگی اور مہتا سے اس کی جو عقیدت تھی، اسے ایک دھچکا سا لگا جیسے کوئی شاگرد اپنے استاد کو کوئی کمینی حرکت کرتے ہوئے دیکھ لے۔ اس نے دیکھا کہ مہتا کی تیز فہمی محبت کو حیوانیت کی طرح کھینچے لیے جاتی ہے اور اس کی فرشتہ صفتی کی جانب سے آنکھیں بند کیے لیتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔

مہتا نے کچھ نادم ہو کر کہا۔ ''آؤ کچھ دیر اور بیٹھیں۔''

مالتی بولی۔ ''نہیں اب لوٹنا چاہیے۔ دیر ہو رہی ہے۔''

رائے صاحب کا ستارہ بلند تھا۔ ان کے تینوں منصوبے پورے ہو گئے تھے۔ لڑکی کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی تھی۔ مقدمہ بھی جیت گئے تھے اور چناؤ میں کامیاب ہی نہ ہوئے تھے بلکہ ہوم ممبر بھی ہو گئے تھے۔ چاروں طرف سے مبارکباد مل رہی تھی، وقار تو ان کا پہلے بھی کسی سے کم نہ تھا مگر اس کی جڑ اور بھی گہری اور مضبوط ہو گئی تھی۔ وقتی اخباروں میں ان کی تصویر اور سوانح عمری زوروں سے نکل رہی تھی۔ قرض بہت بڑھ گیا تھا، مگر اب رائے صاحب کو اس کی پروا نہ تھی۔ وہ اس نئی جائیداد کا ایک چھوٹا سا جزو فروخت کر کے قرض سے سبکدوش ہو سکتے تھے۔ راحت و آرام کا جو بلند سے بلند تصور انہوں نے کیا تھا، وہ اس سے بھی زیادہ بلندی پر جا پہنچے تھے۔ ابھی تک ان کا بنگلہ صرف لکھنو میں تھا۔ اب نینی تال، منصوری اور شملہ تینوں مقاصد میں ایک ایک بنگلہ بنوانا ضروری ہو گیا۔ اب انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ان مقامات میں جائیں تو ہوٹل میں یا کسی دوسرے راجہ کے بنگلے میں ٹھہریں جیسور پرتاپ سنگھ کے بنگلے ان سبھی مقاموں میں تھے تو رائے صاحب کے لیے یہ بڑی شرم کی بات تھی کہ ان کے بنگلے نہ ہوں۔ اتفاق سے بنگلے بنوانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ بنے بنائے بنگلے سستے داموں مل گئے۔ ہر بنگلے کے لیے مالی چوکیدار، کارندہ، خانساماں وغیرہ بھی رکھ لیے گئے تھے اور سب سے بڑی خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ اب کے ہز میجسٹی کی سالگرہ کے موقع پر انہیں راجہ کا خطاب بھی مل گیا تھا۔ اب ان کی اعلیٰ خواہشیں تمام و کمال ہو گئی تھیں۔ اس دن خوب جشن منایا گیا اور ایسی شاندار دعوت ہوئی کے سارے پچھلے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ جس وقت

ہزار کسلنسی گورنر صوبہ نے انہیں خطاب دیا تو غرور کے ساتھ بھگتی کی ایسی ترنگیں کے من میں اُٹھیں کہ ان کا رواں رواں پھول اٹھا۔ یہ ہے زندگی! ورنہ باغیوں کے پھیر میں پڑ کر مفت کی بدنامی لی۔ جیل گئے اور افسروں کی نظروں سے گر گئے۔ جس سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انہیں پچھلی مرتبہ گرفتار کیا تھا، وہ اس وقت ان کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔ شاید اپنی خطاؤں کے لیے معافی مانگ رہا تھا۔

مگر زندگی کی اعلیٰ ترین فتح تو انہیں فتح تو انہیں اس وقت ملی جب ان کے پرانے اور ہارے ہوئے رقیب سورج پرتاپ سنگھ نے ان کے بڑے لڑکے روپال سنگھ سے اپنی لڑکی کے بیاہ کا پیغام دیا۔ رائے صاحب کو نہ مقدمہ جیتنے کی اتنی خوشی ہوئی تھی، نہ ہوم ممبر ہونے کی۔ وہ ساری باتیں خیال میں آتی تھیں مگر یہ بات تو خلاف امید ہی نہیں بلکہ خیال سے بھی باہر تھی۔ وہی سورج پرتاپ سنگھ جو ابھی کئی ماہ قبل انہیں اپنے کتے سے بھی کم تر سمجھتا تھا، وہ آج ان کے لڑکے سے اپنی لڑکی کا بیاہ کرنا چاہتا ہے، کتنی ناممکن بات! روپال اس وقت ایم اے میں پڑھتا تھا، نہایت بے خوف، اپکا معیار پرست، اپنے اوپر بھروسہ رکھنے والا مغرور، رنگین مزاج اور قابل نوجوان تھا جسے اپنے باپ کی زر پرستی اور جاہ طلبی بری معلوم ہوتی تھی۔

رائے صاحب اس وقت نینی تال میں تھے۔ یہ پیغام پر کا پھول اٹھے۔ اگرچہ وہ شادی کے بارے میں لڑکے پر کسی طرح کا دباؤ نہ ڈالنا چاہتے تھے مگر انہیں یقین تھا کہ وہ جو کچھ طے کر لیں گے، اس میں روپال کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور راجہ سورج پرتاپ سنگھ سے رشتہ ہو جانا ایک ایسی خوش قسمتی کی بات تھی کہ روپال کا متفق نہ ہونا ان کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ انہوں نے فوراً راجہ صاحب کو قول

دے دیا، اسی وقت روپال کو فون کیا۔

''وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔''

''میں ابھی جاننا چاہتا ہوں۔''

''نہیں نہیں بتانا چاہتا۔''

''تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا۔''

''جس بات کو میرا دل قبول نہیں کرتا، اسے میں آپ کے حکم سے نہیں مان سکتا۔''

''رائے صاحب نے بڑی التجا سے سمجھایا۔''بیٹا تم معیار کے لیے اپنے پیروں میں کلہاڑی مار رہے ہو۔ اس رشتے سے سوسائٹی میں تمہارا درجہ کتنا اونچا ہو جائے گا، کچھ تم نے سوچا ہے؟ اسے خدائی تحریک سمجھو۔ اس خاندان کی کوئی بے کس لڑکی بھی مجھے ملتی تو میں اپنے بھاگ کو سراہتا۔ یہ تو راجہ سورج پرتاپ کی لڑکی ہے جو ہمارے سرتاج ہیں۔ میں اسے روز دیکھتا ہوں۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ روپ، گن ،سبھاؤ میں ایسی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی، میں تو چار دن کا مہمان ہوں۔ تمہارے سامنے ساری زندگی پڑی ہے۔ میں تم پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم جانتے ہو کہ شادی کے بارے میں میرے خیالات کتنے وسیع ہیں لیکن میرا یہ بھی تو فرض ہے کہ اگر تمہیں غلطی کرتے دیکھوں، تو آگاہ کر دوں۔''

روپال نے جواب دیا۔''میں اس بارے میں بہت پہلے طے کر چکا ہوں اور اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔''

رائے صاحب کو لڑکے کی ہٹ اور نادانی پر غصہ آ گیا۔ گرج کر بولے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا سر پھر گیا ہے۔ آ کر مجھ سے ملو، تو قف نہ کرنا۔ میں راجہ صاحب کو قول دے چکا ہوں۔''

ورپال نے جواب دیا ''افسوس کہ ابھی مجھے فرصت نہیں ہے۔''

دوسرے دن رائے صاحب خود آ گئے۔ دونوں اپنے اپنے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر تیار کھڑے تھے۔ ایک طرف پوری زندگی کا حاصل کیا ہوا زبردست تجربہ تھا، مصلحتوں سے بھرا ہوا اور دوسری طرف خام معیار پرستی تھی، ضدی شریر اور بے مروت!

رائے صاحب نے سیدھا وار کیا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون لڑکی ہے۔''

روپال نے استقلال سے کہا۔ ''اگر آپ اتنے خواہشمند ہیں تو سنیے، وہ مالتی دیوی کی بہن سروج ہے۔''

رائے صاحب جیسے چوٹ کھا کر گر پڑے۔ ''اچھا وہ۔''

''آپ نے تو سروج کو دیکھا ہوگا۔''

''خوب دیکھا ہے۔ تم نے راجکماری کو دیکھا ہے یا نہیں؟''

''جی ہاں! خوب دیکھا ہے۔''

''پھر بھی.....''

''میں صورت کو کوئی چیز نہیں سمجھتا۔''

تمہاری سمجھ پر مجھے رنج ہوتا ہے۔ مالتی کو جانتے ہو کیسی عورت ہے؟ تو اس کی بہن؟

روپال نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''میں اس بارے میں آپ سے اور کچھ کہنا

نہیں چاہتا مگر میری شادی ہوگی تو سروج سے۔''

''میرے جیتے جی کبھی نہیں ہوسکتی۔''

''تو آپ کے بعد ہوگی۔''

''اچھا تمہارے یہ ارادے ہیں۔''

اور رائے صاحب کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں، گویا ساری زندگی اجڑ گئی ہو۔ ہوم ممبری اور علاقہ اور خطاب، سب جیسے باسی پھولوں کی طرح بے کیف اور نا خوشگوار ہو گئے ہوں۔ زندگی کی ساری ریاضت اور عیش و آرام بے کار گئی۔ ان کی اہلیہ کا جب انتقال ہوا تھا تو ان کی عمر چھتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ شادی کر سکتے تھے اور عیش و آرام کا لطف بھی اٹھا سکتے تھے۔ سبھی ان سے شادی کے لیے اصرار کر رہے تھے، مگر انہوں نے ان لڑکوں اور لڑکیوں کا منہ دیکھا اور تجرد انہ زندگی کی مشق و ریاضت قبول کر لی۔ ان ہی پر زندگی کے سارے عیش و آرام قربان کر دیئے۔ آج تک اپنے دل کی ساری محبت ان ہی لڑکوں اور لڑکیوں کو دیتے ہوئے چلے آئے اور آج یہ لڑکا اتنی بے مروتی سے باتیں کر رہا ہے، گویا ان سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ پھر وہ کیوں جائیداد اور عزت و اقتدار کے لیے جان دیں؟ ان ہی لڑکوں ہی کے لیے وہ سب کچھ کر رہے تھے۔ جب لڑکوں کو ان کا ذرا بھی لحاظ نہیں تو وہ کیوں تپسیا کریں؟ انہیں کون دنیا میں بہت دن رہنا ہے۔ انہیں بھی آرام سے پڑے رہنا آتا ہے۔ ان کے اور ہزاروں بھائی مونچھوں پر تاؤ دے کر زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں اور مست گھومتے ہیں، پھر وہ بھی کیوں نہ وہی رویہ اختیار کریں؟ انہیں اس وقت یاد نہ رہا کہ وہ جو تپسیا کر رہے ہیں وہ لڑکوں کے لیے نہیں

بلکہ اپنے لیے اور صرف شہرت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ کام کرنے کے عادی ہیں اور انہیں زندہ رہنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ وہ عیاش اور کاہل بن کر اپنے دل کو مطمئن نہیں رکھ سکتے، انہیں معلوم نہیں کہ کچھ لوگوں کی طبیعت ہی ایسی ہوتی ہے۔ وہ عیاشی اور کاہلی کو پسند نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے جگر کا خون پینے کے لیے بنے ہیں۔ پیتے ہی جائیں گے۔

مگر اس صدمے کا ردعمل بھی فوراً ہی ہوا۔ ہم جس کے لیے ایثار کرتے ہیں، ان سے کسی صلے کی امید نہ رکھ کر بھی ان کے دل پر حکومت کرنا چاہتے ہیں، خواہ وہ حکومت ان ہی کے فائدے کے لیے ہو، اگرچہ فائدے کو ہم اس قدر اپنا بنا لیتے ہیں کہ گویا وہ ہمارا ہی فائدہ بن جاتا ہے۔ ترک جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، حکومت کا خیال بھی اتنا ہی زبردست ہوتا ہے اور جب دفعتاً ہمیں احتجاج کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو ہم بھڑک اٹھتے ہیں اور وہ ترک گویا انتقام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ رائے صاحب کو یہ ضد پڑ گئی کہ روپال کی شادی سروج سے نہ ہو پائے، چاہے اس کے لیے انہیں پولیس سے مدد کیوں نہ لینی پڑے۔ دھرم کی ہتیا کیوں نہ کرنی پڑے۔

انہوں نے جیسے تلوار کھینچ کر کہا۔ ''ہاں! میرے بعد ہی ہوگی اور ابھی اسے بہت دن ہیں۔''

روپال نے جیسے گولی چلا دی۔ ''ایشور کرے آپ امر ہوں، سروج سے میرا بیاہ ہو چکا۔''

''جھوٹ۔''

''بالکل نہیں۔سند موجود ہے۔''

رائے صاحب صدمے سے گر پڑے۔اتنی تیز انتقامانہ نظر سے انہوں نے کبھی کسی دشمن کو بھی نہ دیکھا تھا۔دشمن زیادہ سے زیادہ ان کے نفع پر چوٹ کر سکتا تھا یا ان کے جسم پر یا وقار پر،مگر یہ چوٹ تو ان کی نازک جگہ پر تھی جہاں زندگی کی ساری رغبتوں کا اجتماع تھا۔ایک آندھی تھی جس نے ان کی زندگی کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا تھا۔اب وہ بالکل بے دست و پا ہیں۔پولیس کی ساری طاقت ہاتھ میں رکھتے ہوئے بھی بے دست و پا ہیں۔تشدد ان کا آخری ہتھیار تھا۔وہ ہتھیار ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔روپال بالغ ہے،سروج بھی بالغ ہے اور روپال اپنی ریاست کا مالک ہے۔ان کا اس پر کوئی دباؤ نہیں،آہ!اگر جانتا کہ یہ لونڈا ایسی مخالفت کرے گا تو اس ریاست کے لیے لڑتا ہی کیوں؟اس مقدمے بازی میں دو ڈھائی لاکھ بگڑ گئے۔زندگی ہی تباہ ہوگئی۔اب تو ان کی لاج اسی طرح بچے گی کہ اس لونڈے کی خوشامد کرتے رہیں۔وہ ذرا بھی خلل انداز ہوئے اور عزت خاک میں مل گئی،وہ اپنی زندگی کو قربان کر کے بھی اب مالک نہیں۔آہ ساری زندگی برباد ہوگئی۔ساری زندگی!

روپال چلا گیا تھا۔رائے صاحب نے موٹر منگوایا اور مہتا سے ملنے چلے۔مہتا اگر چاہیں تو مالتی کو سمجھا سکتے ہیں۔سروج بھی ان کی عدول حکمی نہ کرے گی،اگر دس بیس ہزار روپے غم کھانے سے بھی یہ شادی رک جائے تو وہ اس کے لیے تیار تھے۔انہیں خودغرضی کے نشے میں یہ بالکل خیال نہ رہا کہ وہ مہتا کے پاس ایسی تجویز لے کر جا رہے ہیں جس پر مہتا کی ہمدردی ان کے ساتھ ہوگی۔

مہتا نے کل ماجرا سن کر انہیں بنانا شروع کیا۔ سنجیدگی سے بولے۔ ''یہ تو آپ کی عزت کا سوال ہے؟''

رائے صاحب بھانپ نہ سکے۔ اچھل کر بولے۔ ''جی ہاں! خالص عزت کا، راجہ پرتاپ سنگھ کو تو آپ جانتے ہیں۔''

''میں نے ان کی لڑکی کو بھی دیکھا ہے۔ سروج اس کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہے۔''

''مگر اس لونڈے کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔''

''تو مار دیجیے گو، آپ کو کیا کرنا ہے؟ وہی پچھتائے گا۔''

''آہ! یہی تو نہیں دیکھا جاتا مہتا جی! ملتی ہوئی عزت نہیں چھوڑی جاتی۔ میں اس عزت پر اپنی ریاست قربان کرنے کو تیار ہوں۔ آپ مالتی دیوی کو سمجھاویں تو سب کام بن جائے، ادھر انکار ہو جائے تو روپال سر پیٹ کر رہ جائے گا اور یہ نشہ دس پانچ دن میں آپ ہی اتر جائے گا۔ یہ پریم نہیں، صرف سنک ہے۔''

''لیکن مالتی بلا کچھ رشوت لیے مانے گی نہیں۔''

''آپ جو کچھ کہیے، میں اسے دے دوں گا۔ وہ چاہے تو میں اسے یہاں کے ڈفر اسپتال کا انچارج بنا دوں۔''

مان لیجیے کہ وہ آپ ہی کو چاہے تو آپ راضی ہوں گے؟ جب سے آپ کو ہوم ممبری ملی ہے، آپ کے بارے میں اس کی رائے ضرور بدل گئی ہوگی۔

رائے صاحب نے مہتا کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس پر مسکراہٹ سی نظر آئی۔ سمجھ گئے۔ غمگین لہجے میں بولے۔ ''آپ کو مجھ سے مذاق کرنے کا یہی موقع

ملا۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا تھا کہ مجھے یقین تھا کہ آپ میری حالت پر غور کریں گے اور مناسب رائے دیں گے اور آپ مجھے بنانے لگے۔ جس کے دانت نہیں دکھے، وہ دانتوں کا درد کیا جانے؟''

مہتا نے متانت سے کہا۔ ''معاف کیجیے گا، آپ ایسا سوال ہی لے کر آئے ہیں کہ اس پر سنجیدگی سے غور کرنا میں مضحکہ انگیز سمجھتا ہوں۔ آپ اپنی شادی کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ لڑکے کی شادی کی ذمہ داری آپ کیوں اپنے اوپر لیتے ہیں، خصوصاً جب آپ کا لڑکا بالغ ہے اور اپنا نفع و نقصان سمجھتا ہے۔ کم سے کم میں تو شادی جیسے اہم معاملے میں عزت کی کوئی گنجائش نہیں دیکھتا۔ عزت، دولت سے ہوتی ہے تو راجہ صاحب اس ننگے بابا کے سامنے گھنٹوں غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے نہ کھڑے رہتے۔ معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے، مگر راجہ صاحب اپنے علاقے کے سب انسپکٹر تک کو سلام کرتے ہیں۔ اسے آپ عزت کہتے ہیں؟ لکھنو میں آپ کسی دکاندار، کسی اہلکار، کسی راہ گیر سے پوچھتے تو ان کا نام سن کر گالیاں دے گا۔ اسی کو آپ عزت کہتے ہیں؟ جا کر آرام سے بیٹھیے۔ سروج سے بہتر بہو آپ کہو بہت مشکل سے ملے گی۔''

رائے صاحب نے احتجاج کیا۔ ''بہن تو مالتی ہی کی ہے۔''

مہتا نے گرم ہو کر کہا۔ ''مالتی کی بہن ہونا کیا ذلت کی بات ہے؟ مالتی کو آپ نے جانا نہیں اور نہ جاننے پر وا کی۔ میں نے بھی یہی سمجھا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ وہ آگ میں پڑ کر چمک اٹھنے والی سچی دھات ہے۔ وہ ان جانبازوں میں سے ہے جو موقع پڑنے پر اپنا جوہر دکھاتے ہیں، تلوار گھماتے نہیں چلتے۔ آپ کو معلوم

ہے کھنا کی آج کل کیا حالت ہے؟''

رائے صاحب نے ہمدردی سے سر ہلا کر کہا۔ ''سن چکا ہوں اور بار بار خواہش ہوئی کہ ان سے ملوں مگر فرصت نہ ملی۔ اس مل میں آگ لگنا ان کی تباہی و بربادی کا باعث ہو گیا۔''

''جی ہاں، اب وہ ایک طرح سے دوستوں کی عنایتوں پر گزر بسر کر رہے ہیں۔ اس پر گوبندی مہینوں سے بیمار ہے۔ اس نے کھنا پر خود کو قربان کر دیا۔ اس حیوان پر جس نے ہمیشہ اسے جلایا۔ اب وہ مر رہی ہے اور مالتی رات کی رات اس کے سرہانے بیٹھی رہ جایت ہے۔ وہی مالتی جو کسی راجہ یا نواب سے پانچ سو فیس پاتے ہوئے بھی رات بھر نہ بیٹھے گی۔ کھنا کے خورد سال بچوں کی پرورش کا باری بھی مالتی پر ہے۔ یہ مادریت اس میں کہاں سوئی ہوئی تھی، معلوم نہیں۔ مجھے تو مالتی کا یہ رویہ دیکھ کر اپنے دل میں عقیدت کا احساس ہونے لگا، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ میں زبردست دہریہ ہوں اور باطنی صفائی کے ساتھ اس کے چہرے پر بھی فوق البشریت کی چمک آنے لگی ہے۔ انسانیت اتنے زیادہ رنگوں والی اور اتنی طاقتور ہے، اس کا مجھے کھلا تجربہ ہو رہا ہے۔ آپ ان سے ملنا چاہیں تو چلیے، اس بہانے میں بھی چلا چلوں گا۔''

رائے صاحب نے شبہ سے کہا۔ ''جب آپ ہی میرے درد کو نہیں سمجھ سکے تو مالتی دیوی کیا سمجھیں گی؟ مفت میں شرمندگی ہوگی۔ مگر آپ کو ان کے پاس جانے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت کیوں؟ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ نے ان پر اپنا جادو ڈال دیا ہے۔''

مہتا نے حسرت بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''وہ باتیں اب خواب و خیال ہوگئیں، اب تو کبھی ان کے درشن بھی نہیں ہوتے۔ انہیں اب فرصت بھی نہیں رہتی۔ دو چار بار گیا مگر مجھے معلوم ہوا کہ مجھے سے مل کر وہ بہت خوش نہیں ہوئیں۔ تب سے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہاں خوب یاد آیا، آج نسوانی ورزش گاہ کا جلسہ ہے، آپ چلیں گے؟''

رائے صاحب نے بے دلی کے ساتھ کہا۔ ''جی نہیں، مجھے فرصت نہیں ہے، مجھے فکر تو سوار ہے کہ راجہ صاحب کو کیا جواب دوں گا۔ میں انہیں قول دے چکا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلے۔ جس گتھی کو سلجھانے آئے تھے وہ اور بھی الجھ گئی۔ تاریکی اور بھی زیادہ تاریک ہو گئی۔ مہتا نے انہیں موٹر تک آ کر رخصت کیا۔

رائے صاحب سیدھے اپنے بنگلے تک آئے اور روزنامہ اٹھایا ہی تھا کہ ٹنخا کا کارڈ ملا۔ ٹنخا سے انہیں نفرت تھی اور ان کا منہ بھی نہ دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اس وقت دل کی کمزور حالت میں انہیں کسی ہمدرد کی تلاش تھی جو اور کچھ نہ کر سکے مگر ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار تو کر سکے۔ فوراً بلا لیا۔

ٹنخا دبے پیروں رونی صورت بنائے کمرے میں داخل ہوئے اور زمین تک جھک کر سلام کرتے ہوئے بولے۔ ''میں تو حضور کے درشن کرنے نینی تال جا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے یہیں درشن ہو گئے۔ حضور کا مزاج تو اچھا ہے؟''

اس کے بعد انہوں نے بڑی لچھے دار زبان میں اور اپنے پچھلے سلوک کو بالکل

بھول کر رائے صاحب کی تعریف کرنی شروع کی۔ ''ایسی ہوم ممبری کوئی کیا کرے گا؟ جدھر دیکھیے حضور ہی کا چرچا ہے، یہ عہدہ حضور کی شان کے شایان ہے۔''

رائے صاحب دل میں سوچ رہے تھے کہ یہ شخص بھی کتنا بڑا مکار ہے۔ اپنی غرض پڑنے پر گدھے کو دادا کہنے والے، پرلے سرے کا بے وفا اور بے شرم، مگر انہیں اس پر غصہ نہ آیا، رحم آ گیا۔ پوچھا۔ ''آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟''

کچھ نہیں حضور بیکار بیٹھا ہوں۔ اسی امید سے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہا تھا کہ اپنے پرانے خادموں پر عنایت کی نظر رہے۔ آج کل بڑی مصیبت میں پڑا ہوا ہوں۔ راجہ پرتاپ سنگھ کو تو حضور جانتے ہیں کہ وہ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے ایک روز آپ کی ہجو کرنے لگے۔ مجھ سے نہ سنا گیا۔ میں نے کہا بس کیجیے مہاراج! رائے صاحب میرے مالک ہیں اور میں ان کی برائی نہیں سن سکتا۔ بس اسی بات پر بگڑ گئے۔ میں نے بھی سلام کیا اور گھر چلا آیا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ آپ کتنی ہی شان و شوکت دکھلائیں مگر رائے صاحب کی جو عزت ہے، وہ آپ کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ عزت لیاقت سے ہوتی ہے اور آپ میں جو لیاقت ہے، وہ دنیا جانتی ہے۔

رائے صاحب نے کچھ بن کر کہا۔ ''آپ نے تو سیدھے میں آگ لگا دی۔''

ٹخا نے اکڑ کر کہا۔ ''میں تو حضور صاف کہتا ہوں، خواہ کسی کو اچھا لگے یا برا، جب حضور کے قدموں کو پکڑے ہوئے ہوں تو کسی سے کیوں ڈروں؟ حضور کے تو نام سے جلتے ہیں۔ جب دیکھیے حضور کی بدگوئی، جب سے آپ ہوم ممبر ہوئے ہیں، ان کے سینے پر سانپ لوٹ رہا ہے۔ میری ساری کی ساری اجرت صاحت

ہضم کر گئے۔ دنیا کو جانتے ہی نہیں۔ اسامیوں پر اتنا ظلم کرتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کسی کی آبرو سلامت نہیں۔ دن دہاڑے عورتوں کو.....''

موٹر کی آواز آئی اور راجہ سورج پرتاپ سنگھ اترے۔ رائے صاحب نے کمرے سے نکل کر ان کا خیر مقدم کیا اور اس عزت افزائی کے بارے میں جھکتے ہوئے بولے۔ ''میں تو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے ہی والا تھا۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ راجہ سورج پرتاپ سنگھ نے اس مکان میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ یہ خوش قسمتی!

ٹنخا بھیگی بلی بنے ہوئے بیٹھے تھے۔ ''راجہ صاحب یہاں! کیا ادھر ان ہر دو اصحاب میں دوستانہ ہو گیا ہے؟ انہوں نے رائے صاحب کی آتش حس مشتعل کر کے اپنے ہاتھ سینکنے چاہے تھے مگر نہیں، راجہ صاحب یہاں چاہے ملنے کے لیے آ گئے ہوں مگر دلوں میں جو آگ ہے، وہ تو کمہار کے بھٹے کی طرح صرف اوپر کی لیپا پوتی سے بجھنے والی نہیں۔''

راجہ صاحب نے ۔گار جلاتے ہوئے ٹنخا کی طرف بے رحمانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''تم نے صورت ہی نہیں دکھائی مسٹر ٹنخا۔ مجھ سے اس دعوت کے کل روپے وصول کر لیے اور ہوٹل والوں کو ایک پائینہ دی۔ اب وہ میرا سر کھا رہے ہیں۔ اسے دغا سمجھتا ہوں۔ چاہوں تو ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے رائے صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ ''ایسا بے ایمان آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ رائے صاحب میں سچ کہتا ہوں کہ میں کبھی آپ کے مقابلے میں نہ کھڑا ہوتا مگر مجھے اسی شیطان نے بہکایا اور میرے لاکھ روپے برباد

کرادیئے۔ بنگلہ خرید لیا، موٹر رکھ لیا، ایک بیسوا سے آشنائی بھی کر رکھی ہے۔ پورے رئیس بنے ہوئے ہیں اور اب دغابازی شروع کی ہے۔ رئیسوں کی شان نبھانے کے لیے ریاست چاہیے اور آپ کی ریاست اپنے احباب کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔''

رائے صاحب ٹنخا کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''آپ چپ کیوں ہیں مسٹر ٹنخا؟ جواب دیجیے۔ راجہ صاحب نے تو آپ کا سارا محنتانہ ہضم کرلیا تھا۔ اسد کا ہے جواب آپ کے پاس؟ اب براہ کرم یہاں سے چلے جایئے اور خبر دار، پھر اپنی صورت نہ دکھایئے گا۔ دو بھلے مانسوں کو لڑا کر اپنا الوسیدھا کرنا بے پونجی کا روزگار ہے مگر اس کے نفع ونقصان دونوں ہی جان جوکھم ہیں، یہ سمجھ لیجیے۔ ''

ٹنخا نے ایسا سر جھکایا کہ پھر نہ اٹھا سکے۔ چپکے سے چلے گئے، جیسے کوئی چور کتا مالک کے اندر آجانے پر دبک کر نکل جائے۔

جب وہ چلے گئے تو راجہ صاحب نے پوچھا۔ ''میری برائی کرتا ہوگا۔''

''جی ہاں، مگر میں نے بھی خوب بنایا۔''

''شیطان ہے۔''

''پورا۔''

''باپ بیٹے کو لڑا دے، میاں بیوی کو لڑا دے، اس فن میں استاد ہے۔ خیر آج حضرت کو اچھا سبق مل گیا۔''

اس کے بعد روپال کے بیاہ کی بات چیت شروع ہوئی۔ رائے صاحب کی

جان سوکھی جا رہی تھی ۔ گویا ان پر کوئی نشانہ لگایا جا رہا ہو۔ کہاں چھپ جائیں؟ کیسے کہیں کہ روپال پر ان کا کوئی قابو نہیں رہا؟ مگر راجہ صاحب کو حالات معلوم ہو چکے تے ۔ رائے صاحب کو خود کچھ نہ کہنا پڑا ۔ جان بچ گئی ۔

انہوں نے پوچھا ''آپ کو اس کی خبر کیوں کر ہوئی ؟''

''ابھی ابھی روپال نے لڑکی کے نام ایک خط بھی بھیجا ہے جو اس نے مجھے دے دیا۔''

''آج کل لڑکوں میں اور تو کوئی خوبی نظر نہیں آتی ،بس آزادی کی سنک سوار ہے ۔''

''سنک تو ہے ہی، مگر اس کی دوا میرے پاس ہے۔ میں اس چھوکری کو ایسا غائب کر دوں گا کہ کہیں پتہ نہ لگے گا۔ دس پانچ روز میں یہ سنک ٹھنڈی ہو جائے گی۔ سمجھانے سے کوئی فائدہ نہیں ۔''

رائے صاحب کانپ اٹھے ۔ان کے دل میں بھی اس طرح کی بات آئی تھی مگر انہوں نے اسے کوئی صورت نہ پکڑنے دی تھی ۔ سنسکار (سرشت) دونوں صاحبوں کے ایک سے تھے ۔ گھاؤں میں رہنے والی شخصیت دونوں ہی اصحاب میں زندہ تھی ۔ ۔ رائے صاحب نے اسے بیرونی لباس سے ڈھانک دیا تھا، راجہ صاحب میں وہ عریاں تھی ۔ اپنی عظمت دکھانے کے اس موقع کو رائے صاحب نہ چھوڑ سکے ،لجائے ہوئے بولے ۔''مگر یہ بیسویں صدی ہے، بارہویں نہیں ۔''

روپال کے اوپر اس کا کیا اثر ہو گا، میں نہیں کہہ سکتا ۔ مگر انسانیت کے نقطۂ خیال سے.....''

راجہ صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ ''آپ انسانیت لیے پھرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ دنیا میں آج بھی انسان کو حیوانیت ہی اس کی انسانیت پر فتح پا رہی ہے، ورنہ سلطنتوں میں لڑائیاں کیوں ہوتیں؟ پنچایتوں سے جھگڑے طے نہ ہو جاتے۔ جب تک انسان رہے گا، اس کی حیوانیت بھی رہے گی۔''

چھوٹی موٹی بحث چھڑ گئی۔ بالآخر بات کا بتنگڑ بن گئی اور راجہ صاحب ناراض ہو کر چلے گئے۔ دوسرے دن رائے صاحب بھی نینی تال روانہ ہو گئے اور اس کے ایک روز بعد روپال نے سروج کو ساتھ لے کر انگلستان کی راہ لی۔ اب ان میں باپ بیٹے کا رشتہ نہ تھا۔ ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے تھے۔ ٹنکھا صاحب اب روپال کے مشیر و پیروکار تھے۔ انہوں نے روپال کی طرف سے رائے صاحب پر حساب فہمی کا دعویٰ کیا۔ رائے صاحب پر دس لاکھ کی ڈگری ہو گئی۔ انہیں ڈگری ہو جانے کا اتنا ملال نہ ہوا تھا جتنا اپنی بے عزتی کا۔ بے عزتی سے بھی زیادہ افسوس تھا۔ زندگی کی مجتمع خواہشات کے خاک میں مل جانے کا اور سب سے بڑا رنج تھا اس بات کا کہ اپنے ہی بیٹے نے دغا کی۔ فرمانبردار بیٹے کے باپ بننے کا فخر ان کے ہاتھ سے بڑی بے دردی کے ساتھ چھین لیا گیا تھا۔

مگر ابھی شاید ان کے غم کا پیمانہ لبریز نہ ہوا تھا۔ جو کچھ کسر تھی، وہ لڑکی اور داماد کے قطع تعلق نے پوری کر دی۔ عام ہندو لڑکیوں کی طرح مینا کشی بھی بے زبان تھی۔ باپ نے جس کے ساتھ بیاہ کر دیا تھا، اس کے ساتھ چلی گئی، لیکن زن و شوہر میں محبت نہ تھی۔ دگ بجے سنگھ عیاش بھی تھے اور شرابی بھی۔ مینا کشی اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی اور کتابوں اور رسالوں سے دل بہلایا کرتی تھی۔ دگ بجے

سنگ کی عمر تو تیس سال سے زیادہ تھی، پڑھا لکھا بھی تھا مگر بڑا مغرور اور اپنے خاندانی وقار کی ڈینگ مارنے والا اور بے رحم و بخیل۔ گاؤں کی کم ذات والی بہو بیٹیوں پر ڈورے ڈالا کرتا تھا۔ صحبت بھی کمینوں کی تھی۔ جن کی خوشامد نے اسے اور بھی خوشامد پسند بنا دیا تھا۔ مینا کشی ایسے شخص کی عزت دل سے نہ کر سکتی تھی۔ پھر اخباروں میں عورتوں کے حقوق کا تذکرہ پڑھ پڑھ کر اس کی آنکھیں بھی کھلنے لگی تھیں اور وہ زنانہ کلب میں آنے جانے لگی تھی جہاں کتنی ہی تعلیم یافتہ اور خاندانی عورتیں آتی رہتی تھیں۔ ان میں ووٹ اور حقوق اور آزادی اور نسوانی بیداری کا خوب چرچا ہوتا تھا، جیسے مردوں کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہو۔ زیادہ تر وہی عورتیں تھیں جن کی اپنے شوہروں سے نہ بنتی تھی اور جو تعلیم یافتہ ہونے کے سبب قدیم رواجی بندشوں کو توڑ ڈالنا چاہتی تھیں۔ کئی ایسی لڑکیاں بھی تھیں جو ڈگریاں لے چکی تھیں اور ازدواجی زندگی کی خودداری کے لیے مہلک سمجھ کر ملازمت کی تلاش میں تھیں۔ ان ہی میں ایک مس سلطانہ تھیں، جو ولایت سے بیرسٹر ہو کر آئی تھیں اور یہاں پردہ نشین عورتوں کو قانونی مشورہ دینے کا پیشہ کرتی تھیں۔ ان ہی کی رائے سے مینا کشی نے شوہر پر نان و نفقہ کا دعویٰ کیا۔ وہ اب اس کے گھر میں نہ رہنا چاہتی تھی۔ گزارے کی ضرورت اسے نہ تھی اور وہ میکے میں بڑے آرام سے رہ سکتی تھی۔ مگر وہ دگ بجے سنگھ کے چہرے پر کالکھ لگا کر یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ دگ بجے سنگھ نے اس پر الٹا بدچلنی کا الزام لگایا۔ رائے صاحب نے اس لڑائی کو رفع کرنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر مینا کشی اب شوہر کی صورت سے بھی بیزار تھی۔ اگرچہ دگ بجے کا دعویٰ خارج ہو گیا تھا اور مینا کشی نے ان پر گزارے کی

ڈگری پائی، مگر وہ بے عزتی اس کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہی۔ وہ علیحدہ ایک کوٹھی میں رہتی تھی اور سوشلسٹ تحریک میں نمایاں حصہ لیتی تھی، پھر بھی اس کی جلن ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔

ایک روز وہ غصے میں آ کر ہنٹر لیے ہوئے دگ بجے سنگھ کے بنگلے پر پہنچی۔ شہدے جمع تھے اور رقاصہ ناچ رہی تھی۔ اس نے جنگ کی دیوی کی طرح شیطانوں کے اس مجمع میں پہنچ کر تہلکہ مچا دیا۔ ہنٹر کھا کر لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس کے رعب کے سامنے وہ کمینے کیا ٹھہرتے؟ جب دگ بجے سنگھ تنہا رہ گئے، تو اس نے ان پر تڑاق تڑاق ہنٹر جمانے شروع کیے اور تنا مارا کہ کنور صاحب بے دم ہو گئے۔ رنڈی ابھی تک گوشے میں دبکے ہوئے کھڑی تھی۔ اب اس کا نمبر آیا۔ میناکشی ہنٹر تاج کر جمانا ہی چاہتی تھی کہ وہ اس کے پیروں پر گر پڑی اور رو کر بولی۔ ''بہو! آج میری جان بخشی کریں، میں پھر کبھی یہاں نہ آؤں گی۔ میں بے قصور ہوں۔''

میناکشی نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا کر کہا۔ ''تو بے قصور ہے۔ جانتی ہے نا کہ میں کون ہوں؟ چلی جا، اب یہاں کبھی نہ آنا۔ ہم عورتیں مردوں کی تفریح و تعیش کا سامان ہی تو ہیں، تیرا کوئی قصور نہیں۔''

بیسوا نے اس کے پیروں پر سر رکھ کر کہا۔ ''خدا آپ کو خوش رکھے، جیسا نام سنتی تھی ویسی ہی پایا۔''

''خوش رکھنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''آپ جو سمجھیں مہارانی جی۔''

''نہیں، تم ہی بتاؤ۔''

بیسوا کی جان ناخنون میں آ گئی، کہاں سے دعا بھی دینے چلی! جان بچ گئی تھی، چپکے سے اپنی راہ لینا چاہتی تھی۔ بڑے دعا دینے کا خبط سوار ہوا۔ اب جان کیسے بچے؟ ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''سرکار کا اقبال بڑھے، رتبہ بڑھے، نام بڑھے۔''

مینا کشی مسکرائی۔ ''ہاں ٹھیک ہے۔''

وہ آ کر اپنے موٹر پر بیٹھی۔ حاکم ضلع کے بنگلے پر پہنچ کر اس واقعہ اطلاع دی اور پھر اپنی کوٹھی کو چلی گئی۔ اس وقت سے عورت مرد ایک دوسرے کے پیاسے تھے۔ دگ بجے سنگھ ریوالور لیے اس کی تاک میں پھرا کرتے تھے اور وہ بھی اپنے حفاظت کے لیے دو پہلوان ٹھاکروں کو اپنے ساتھ لیے رہتی تھی اور رائے صاحب نے سکھوں کا جو سورگ (بہشت) بنایا تھا، اسے اپنی زندگی میں غارت ہوتے دیکھ رہے تھے۔ اب دنیا سے مایوس ہو کر ان کی روح اندر کی جانب متوجہ ہو رہی تھی۔ اب خواہشات سے جیتے رہنے کی تحریک ملتی رہتی تھی، اب ادھر کا راستہ بند ہو جانے پر ان کا دل خود بخود عبادت کی طرف جھکا جس میں خواہشات سے کہیں زیادہ سچائی تھی، جس نئی جائیداد کے بھروسے قرض لیا تھا، وہ جائیداد ادائی کے بغیر ہی ہاتھ سے نکل گئی تھی اور وہ بوجھ سر پر لدا ہوا تھا۔ ہوم ممبری سے ضروری اچھی رقم ملتی تھی مگر وہ سب کی سب اس عہدے کا وقار قائم رکھنے ہی میں صرف ہو جاتی تھی اور رائے صاحب کو اپنی شاہانہ شان و شوکت نبھانے کے لیے وہی اسامیوں پر اضافہ اور بے دخلی کرنا اور ان سے نذرانہ لینا پڑتا تھا، جس سے انہیں دلی نفرت تھی۔ وہ رعایا کو تکلیف نہ دینا چاہتے تھے، ان کی حالت پر انہیں رحم آتا تھا مگر اپنی

ضروریات سے مجبور تھے مگر موہ انہیں چھوڑتا نہ تھا اور اس کشمکش میں بھی انہیں سکون نہ ملتا تھا۔ وہ موہ (رغبت) کو چھوڑنا چاہتے تھے، مگر موہ انہیں چھوڑتا نہ تھا اور اس کشمکش پر پڑ کر انہیں ذلت، افسوس اور اضطراب سے چھٹکارا نہ ملتا تھا اور جب دل میں سکون نہیں تو جسم کیسے ٹھیک رہتا؟ صحت قائم رکھنے کی پوری تدبیر کرنے پر بھی ایک نہ ایک روگ لگا رہتا تھا۔ رسوئی میں سبھی طرح کے لذیذ کھانے پکتے تھے مگر ان کی تقدیر میں تو وہی مونگ کی دال اور پھلکے تھے۔ اپنے بھائیوں کو دیکھتے تھے جو ان سے بھی زیادہ مقروض، پست اور مغموم تھے، جن کی عیش وعشرت اور شان و شوکت میں کوئی کمی نہ تھی، مگر ایسی بے حیائی کرنا ان کے امکان سے بعید تھا۔ ان کی روح کے اونچے سنسکاروں کی بربادی نہ ہوئی تھی۔ ظلم، مکاری، بے عزت اور تکلیف رسانی کا تعلقہ داری کی زینت اور شان وشوکت کا نام دے کر اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکتے تھے۔ یہی ان کی سب سے بڑی شکست تھی۔

(32)

مرزا خورشید نے اسپتال سے نکل کر ایک نیا کام شروع کر دیا تھا۔ بے فکری سے بیٹھے رہنا ان کے مزاج میں داخل نہ تھا۔ یہ کام وام کیا تھا؟ شہری بیسواؤں کی ایک ناٹک منڈلی بنانا۔ فارغ البالی کے زمانے میں انہوں نے خوب عیاشی کی تھی اور ان دنوں اسپتال کے تخلیے میں زخموں کی تکلیف سہتے سہتے ان کا دل بھگتی سے بھر گیا تھا۔ اس زندگی کی یاد کر کے انہیں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اس وقت اگر ان میں سمجھ ہوتی تو وہ لوگوں کی کتنی بھلائی کر سکتے تھے، کتنوں کے رنج و افلاس کا بوجھ ہلکا کر سکتے تھے، مگر وہ دولت انہوں نے عیاشی میں اڑائی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں کہ

مصیبت ہی میں ہماری روح بیدار ہوتی ہے ۔ بڑھاپے میں کوئی اپنی جوانی کی غلطیوں پر افسوس نہیں کرتا؟ کاش وہ وقت عقل و طاقت کے حاصل کرنے میں لگایا جاتا، نیک اعمال کا خزانہ بھر لیا جاتا تو آج دل کو کتنی تسکین ملتی !وہیں ان کو اس امر کا افسوس ناک تجربہ ہوا کہ دنیا میں کوئی اپنا نہیں، کوئی ان کی موت پر دو آنسو بہانے والا نہیں ۔ انہیں رہ رہ کر زندگی کا ایک پرانا واقعہ یاد آتا تھا۔ بصرہ کے ایک گاؤں میں جب وہ کیمپ میں ملیریا سے بیمار پڑے تھے۔ اس وقت ایک دیہاتی لڑکی نے ان کی تیمارداری کتنی جانفشانی سے کی تھی۔ صحت ہو جانے پر جب انہوں نے روپے اور زیوروں سے اس کے احسانوں کا بدلہ چکانا چاہا تو اس نے کس طرح آنکھوں میں آنسو بھر کر سر نیچا کر لیا تھا اور ان تحائف کے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دائیوں کی خدمت میں ضبط، ہے، قاعدہ ہے، سچائی ہے مگر وہ محبت کہاں، وہ انہماک کہاں جو اس لڑکی کی بے شفق اور طفلانہ خدمات میں تھا؟ وہ محبت کی مورت ان کے دل سے کب کی مٹ چکی تھی، وہ اس سے پھر آنے کا وعدہ کر کے کبھی اس کے پاس نہ گئے ۔ عیش و عشرت کی مصروفیتوں میں کبھی اس کی یاد ہی نہ آئی ۔ آئی بھی تو اس میں صرف رحم تھا، محبت نہ تھی ۔ معلوم نہیں اس لڑکی پر کیا گزری، مگر آج کل اس کا وہ انکسار، سکون اور سادگی سے بھرا ہوا چہرہ برابر ان کی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتا تھا۔ کاش اس سے شادی کر لی ہوتی تو آج زندگی پر کیف ہوتی اور اس کے متعلق اس نا منصفانہ سلوک کی دکھ بھری یاد نے کل نسوانی طبقے کو ان کی خدمت اور ہمدردی کا مستحق بنا دیا تھا۔ جب تک ندی بڑھاؤ پر تھی، گدلے، تیز اور جھاگ دار بہاؤ میں روشنی کی شعاعیں بکھر کر رہ جاتی تھیں ۔ اب پانی برابر اور برق

رفتار ہو گیا تھا اور کرنیں اس کی تہہ تک پہنچ رہی تھیں۔

مرزا صاحب بسنت رت کی اس ٹھنڈی شام میں اپنے جھونپڑے کے برآمدے میں دو طوائفوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے کہ مسٹر مہتا آ پہنچے۔ مرزا نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور بولے۔ ''میں تو آپ کی خاطر داری کا سامان لیے ہوئے آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔''

دونوں بیسوائیں مسکرائیں۔ مہتا کٹ گئے۔

مرزا نے دونوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور مہتا کو مسند پر بٹھاتے ہوئے بولے۔ ''میں تو آپ کے پاس آنے والا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میں جو کام کرنے جا رہا ہوں وہ آپ کی مدد کے بغیر پورا نہ ہوگا۔ آپ صرف میری پشت پر ہاتھ رکھے رہیے اور للکارتے جائیے، ہاں مرزا، بڑھا چل پٹھے۔''

مہتا نے ہنس کر کہا ''آپ جس کام میں ہاتھ لگائیں گے، اس میں ہم جیسے کتابی کیڑوں کی امداد کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ کی عمر مجھ سے زیادہ ہے، دنیا بھی آپ نے خوب دیکھی ہے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمیوں پر اپنا اثر ڈالنے کی جو طاقت آپ میں ہے، وہ مجھ میں ہوتی تو میں نے خدا جانے کیا کچھ کر دیا ہوتا۔''

مرزا صاحب نے مختصر الفاظ میں اپنی نئی تجویز بیان کی۔ ان کی رائے تھی کہ حسن کے بازی میں وہ عورتیں آتی ہیں جنہیں یا تو اپنے گھر میں کسی وجہ سے باعزت مقام نہیں ملتا یا جو مالی تکلیفوں سے مجبور ہو جاتی ہیں اور اگر یہ دونوں مسئلے حل کر دیئے جائیں تو بہت کم عورتیں اس طرح ذلیل و خوار ہوں۔

مہتا نے بھی دوسرے سمجھدار لوگوں کی طرح اس مسئلہ پر کافی غور کیا تھا اور ان کا

خیال تھا کہ زیادہ تر فطرتی رجحان اور عیش وعشرت کا شوق ہی عورتوں کو اس طرف کھینچتا ہے۔ اسی بات پر دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑ گئے۔

مہتا نے مٹھی باندھ کر ہوا میں پٹکتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا۔ مرزا صاحب! رزق کے لیے اور بہت سے ذرائع ہیں مگر عیش وآرام کی بھوک روٹیوں سے نہیں مٹتی۔ اس کے لیے دنیا کی بڑھیا بڑھیا چیزیں چاہئیں۔ جب تک سوشل نظام اوپر سے نیچے تک بدل نہ ڈالا جائے، اس طرح منڈلی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

مرزا نے مونچھیں کھڑی کیں۔ ''اور میں کہتا ہوں کہ یہ محض رزق کا سوال ہے۔ ہاں یہ سوال سبھی لوگوں کے لیے یکساں نہیں ہے۔ مزدور کے لیے وہ صرف آٹا دال اور ایک پھوس کی جھونپڑی کا سوال ہے۔ وکیل کے لیے وہ ایک موٹر، بنگلہ اور خدمت گاروں کا سوال ہے۔ آدمی روٹی نہیں چاہتا اور بھی بہت سی چیزیں چاہتا ہے۔ اگر عورتوں کے سامنے بھی وہ سوال انواع واقسام کی صورتوں میں آتا ہے تو اس کا کیا قصور ہے؟''

ڈاکٹر مہتا اگر ذرا غور کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ ان میں اور مرزا میں کوئی فرق نہیں، صرف الفاظ کا ردوبدل ہے، مگر بحث کی گرما گرمی میں غور کرنے کے لیے صبر کہاں؟ گرم ہوکر بولے۔ ''معاف کیجیے مرزا صاحب! جب تک دنیا میں دولت والے رہیں گے بیسوائیں بھی رہیں گی، آپ کی منڈلی اگر کامیاب بھی ہوجائے، حالانکہ مجھے اس میں بہت شک ہے، تو آپ دس پانچ عورتوں سے زیادہ اس میں

کبھی نہ لے سکیں گے اور وہ بھی تھوڑے دنوں کے لیے۔ سبھی عورتوں میں ناٹک کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی، اسی طرح جیسے سبھی لوگ شاعر نہیں ہو سکتے اور یہ بھی مان لیں کہ یہ عورتیں آپ کی منڈلی میں مستقل طور پر ٹھہر جائیں گی تو بھی بازار میں ان کی جگہ خالی نہ رہے گی۔ جڑ پر جب تک کلہاڑے نہ چلیں گے، پتیاں توڑنے سے کوئی نتیجہ نہیں۔ دولت والوں میں کبھی کبھی ایسے لوگ نکل آتے ہیں جو سب کچھ چھوڑ کر خدا کی راہ میں جا بیٹھتے ہیں۔ مگر دولت کا راج بدستور قائم ہے۔ اس میں ذرا بھی زوال نہیں آنے پایا۔

مرزا کو مہتا کی ہٹ دھرمی پر رنج ہوا۔ اتنا پڑھا لکھا سمجھدار آدمی ایسی باتیں کرے! سوشل نظام کیا آسانی سے بدل جائے گا؟ وہ تو صدیوں کا معاملہ ہے۔ تب تک کیا یہ اندھیر ہونے دیا جائے؟ اس کی روک تھام نہ کی جائے اور ان غریب عورتوں کو مردوں کی ہوس کا شکار ہونے دیا جائے؟ کیوں نہ شیر کو پنجرے میں بند کر دیا جائے کہ وہ دانت اور ناخن رکھتے ہوئے بھی کسی کو نقصان نہ پہنچا سکے؟ کیا اس وقت تک خاموش بیٹھا رہا جائے، جب تک شیر آہنسا کا برت نہ لے لے؟ دولت والے اور جس طرح چاہیں اپنی دولت اڑائیں، مرزا کو غم نہیں۔ شراب میں ڈوب جائیں، موٹروں کی مالا گلے میں ڈال لیں، قلعے بنوائیں، دھرم شالے اور مسجدیں کھڑی کریں، مرزا کو کوئی پروا نہیں۔ ہاں عورتوں کی زندگی نہ خراب کریں۔ اسے مرزا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ حسن کے بازار کو ایسا سنسان کر دیں گے کہ دولت مندوں کی اشرفیوں پر کوئی تھوکنے والا بھی نہ ملے۔ کیا جن دنوں شراب کی دکانوں پر پکٹنگ ہوتی تھی، بڑے بڑے شرابی پانی پی پی کر دل کی آگ

نہیں بجھا لیتے تھے؟

مہتا نے مرزا کی بے وقوفی پر ہنس کر کہا۔ ''آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں کسبیاں نہیں ہیں، مگر امیروں کی دولت وہاں بھی اپنی دلچسپیوں کا سامان پیدا کر لیتی ہے۔''

مرزا بھی مہتا کی نادانی پر ہنسے۔ ''جانتا ہوں مہربان، جانتا ہوں۔ آپ کی دعا سے دنیا دیکھ چکا ہوں مگر یہ ہندوستان ہے، یورپ نہیں ہے۔''

''انسانی سرشت ساری دنیا میں ایک سی ہے۔''

''مگر یہ بھی معلوم رہے کہ ہر قوم میں ایک ایسی چیز ہوتی ہے جسے اس کی روح کہہ سکتے ہیں اور عصمت ہندوستانی تہذیب کی روح ہے۔''

''اپنے منہ میاں مٹھو بن لیجیے۔''

''دولت کی آپ اتنی برائی کرتے ہیں، پھر بھی کھنا کی حمایت کرتے نہیں تھکتے۔ نہ کہیے گا۔''

مہتا کی تیزی رخصت ہو گئی، انکسار سے بولے۔ ''میں نے کھنا کی حمایت اس وقت کی ہے جب وہ دولت کے پنجے سے چھوٹ گئے ہیں اور آج کل ان کی حالت آپ دیکھیں تو آپ کو رحم آئے گا اور میں کیا حمایت کروں گا، جسے اپنی کتابوں اور لائبریری سے فرصت نہیں؟ زیادہ سے زیادہ خشک ہمدردی ہی تو کر سکتا ہوں۔ حمایت کی ہے مس مالتی نے کہ کھنا کو بچا لیا۔ انسان کی گہرائیوں میں ایثار کی کتنی طاقت چھپی ہوتی ہے، اس کا مجھے اب تک تجربہ نہ ہوا تھا۔ آپ بھی ایک دن کھنا سے مل آئیے۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ اس وقت اسے جس چیز کی سب

سے زیادہ ضرورت ہے، وہ ہمدردی ہے۔''

مرزا نے جیسے اپنی مرضی کے خلاف کہا۔ ''آپ کہتے ہیں تو جاؤں گا۔ آپ کے ساتھ جہنم میں بھی عذر نہیں، مگر مس مالتی سے تو آپ کی شادی ہونے والی تھی۔ بڑی گرم خبر تھی۔''

مہتا نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''ریاضت کر رہا ہوں، دیکھیے ثمرہ کب ملے۔''

''اجی وہ تو آپ پر مرتی تھی۔''

''مجھے بھی وہم ہوا تھا مگر جب میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا تو دیکھا کہ وہ آسمان میں جا بیٹھی ہے۔ اس بلندی تک تو میں کیا پہنچوں گا، ہاں اسی سے التجا کر رہا ہوں کہ نیچے آجائے آج کل تو وہ مجھ سے بولتی بھی نہیں۔''

یہ کہتے ہوئے مہتا زور سے ایک روتی ہوئی ہنسی ہنسے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

مرزا نے پوچھا۔ ''اب پھر کب ملاقات ہوگی؟''

''اب کے آپ کو تکلیف کرنا پڑے گی۔ کھنا کے پاس جایئے گا ضرور۔''

''مر جاؤں گا۔''

مرزا نے کھڑکی سے مہتا کو جاتے دیکھا۔ رفتار میں وہ تیزی نہ تھی، جیسے کسی فکر میں ڈوبے ہوئے ہوں۔

(33)

ڈاکٹر مہتا ممتحن سے ہو گئے ہیں۔ مالتی سے دور دور رہ کر انہیں یہ شک ہونے لگا ہے کہ کہیں اسے کھو نہ بیٹھیں۔ کئی مہینے سے مالتی ان کے پاس نہ آئی تھی اور جب وہ بے قرار ہو کر اس کے گھر گئے تو ملاقات نہ ہوئی۔ جن دنوں روپال اور

سروج کا عشقیہ واقعہ ہو رہا تھا تو مالتی ان کی صلاح لینے عموماً روز نہ دو ایک بار آتی تھی مگر جب سے دونوں انگلستان چلے گئے تھے، اس کا آنا جانا بند ہو گیا تھا، گھر پر بھی مشکل سے ملتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے بچتی ہے۔ گویا ان کی طرف سے اپنے دل کو جبراً ہٹا لینا چاہتی ہے۔ جس کتاب کو وہ آج کل لکھ رہے تھے وہ آگے بڑھنے سے انکار کر رہی تھی۔ گویا ان کی توجہ مفقود ہو گئی ہو۔ خانہ داری کے انتظام میں تو وہ کبھی بڑے ہوشیار نہ تھے۔ فی الجملہ ایک ہزار روپے سے زیادہ مہینے میں کما لیتے تھے مگر بچت ایک کوڑی بھی نہ ہوتی تھی۔ روٹی دال کھانے کے سوا اور ان کے ہاتھ کچھ نہ لگتا تھا۔ تکلیف کا اگر کوئی سامان تھا تو وہ ان کا موٹر تھا جسے وہ خود چلاتے تھے۔ کچھ روپے کتابوں میں اڑ جاتے تھے، کچھ چندوں، کچھ غریب طلباء کی امداد میں اور کچھ باغ کی آرائش میں، جس سے انہیں عشق سا تھا۔ طرح طرح کے پودے اور نباتاتی نمونے بدیسوں سے مہنگے داموں منگانا اور ان کی نگہداشت کرنا، یہی ان کا چٹورا پن تھا۔ مگر ادھر کئی مہینے سے اس باغیچے کی طرف سے بھی وہ کچھ بیزار ہو رہے تھے۔ اور گھر کا انتظام بھی ابتر ہو گیا تھا۔ کھاتے دو پھلکے اور خرچ ہوتا ایک سو سے زیادہ۔ اچکن پرانی ہو گئی تھی، مگر اسی میں انہوں نے کڑاکے کا جاڑا کاٹ دیا، نئی اچکن سلانے کی توفیق نہ ہوئی۔ کبھی کبھی بلا گھی کی دال کھا کر اٹھ آنا پڑتا۔ کب گھی کا کنستر منگایا تھا، اس کی انہیں یاد ہی نہ تھی اور مہراج سے پوچھیں بھی تو کیسے؟ وہ سمجھے گا نہیں کہ اس پر بے اعتباری ہو رہی ہے؟ آخر ایک روز جب تین مرتبہ مایوسیوں کے بعد چوتھی مرتبہ مالتی سے ملاقات ہوئی اور اس نے ان کی یہ حالت دیکھی تو اس سے نہ رہا گیا۔ بولی۔ ''تم کیا اب کے جاڑا یوں ہی کاٹ دو

گے؟ یہ اچکن پہنتے ہوئے شرم نہیں آتی؟''

مالتی ان کی بیوی نہ ہو کر بھی ان کے اتنے پاس تھی کہ یہ سوال اس نے اسی معمولی انداز سے کیا جس طرح وہ اپنے کسی یگانے سے کرتی۔

مہتا نے بلا شرماتے ہوئے کہا۔''کیا کروں مالتی، پیسہ تو بچتا ہی نہیں۔''

مالتی کو تعجب ہوا۔''تم ایک ہزار سے زیادہ کماتے ہو اور تمہارے پاس اپنے کپڑے بنوانے کو بھی پیسے نہیں؟ میری آمدنی کبھی چار سو سے زیادہ نہ تھی مگر میں اسی میں ساری گرہستی چلاتی ہوں اور کچھ بچا بھی لیتی ہوں۔ آخر تم کیا کر ڈالتے ہو؟''

میں ایک پیسہ بھی فالتو نہیں خرچ کرتا۔ مجھے کوئی ایسا شوق بھی تو نہیں ہے۔''

''اچھا تو مجھ سے روپیہ لے جاؤ اور دو اچکنیں بنوا لو۔''

مہتا نے خجالت سے کہا۔''اب کے بنوالوں گا، سچ کہتا ہوں۔''

''اب آپ یہاں آئیں تو آدمی بن کر آئیں۔''

''یہ تو بڑی کڑی شرط ہے۔''

''کڑی سہی۔ تم جیسوں کے ساتھ کڑائی کیے بغیر کام بھی نہیں چلتا۔''

مگر وہاں تو صندوق خالی تھا اور پیسے کے بغیر کسی دکان پر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مالتی کے گھر جائیں کس منہ سے؟ دل میں تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ ایک دن ایک نئی مصیبت آپڑی۔ ادھر کئی مہینے سے مکان کا کرایہ نہیں دیا۔ پچھتر روپے ماہوار بڑھتے جاتے تھے۔ مالک مکان نے جب کئی تقاضوں کے بعد روپے نہ وصول کر پائے تو نوٹس دے دیا۔ مگر نوٹس روپیہ بنانے کی کوئی مشین تو ہے نہیں۔

تاریخ نکل گ ءاور روپے نہ پہنچے۔تب مالک مکان نے مجبور ہو کر نالش کر دی۔وہ جانتا تھا کہ مہتا جی بڑے شریف اور فیاض آدمی ہیں مگر اس سے زیادہ بھلمنسی وہ کیا کرتا کہ چھ ماہ تک صبر کیے بیٹھا رہا؟ مہتا نے کوئی پیروی نہ کی اور ایک طرف ڈگری ہوگئی۔ مالک نے فوراً ڈگری جاری کرائی اور قرق امین مہتا صاحب کے پاس پہلی اطلاع دینے آیا، کیونکہ اس کا لڑکا یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور اسے مہتا صاحب کچھ وظیفہ بھی دیتے تھے۔ اتفاقاً اس وقت مالتی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ بولی۔ ''کیسی قرقی ہے؟ کس بات کی؟''

امین نے کہا۔ ''وہی کرایہ کی ڈگری جو ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ حضور کو اطلاع دے دوں۔ چار پانچ سو کا معاملہ ہے، کون سی بڑی رقم ہے؟ دس دن میں بھی روپے دے دیجیے تو کوئی حرج نہیں۔ میں مہاجن کو دس تک الجھائے رکھوں گا۔''

جب امین چلا گیا تو مالتی نے حقارت کے لہجے میں پوچھا۔ ''تو اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی! مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تم اتنی موٹی موٹی کتابیں کیسے لکھتے ہو۔ مکان کرایہ چھ چھ ماہ باقی پڑا ہے اور تمہیں خبر نہیں۔''

مہتا شرم سے سر جھکا کر بولے ''خبر کیوں نہیں ہے، لیکن روپے بچتے ہی نہیں۔ میں ایک پیسہ بھی فضول صرف نہیں کرتا۔''

''کوئی حساب کتاب بھی ہے؟''

''حساب کیوں نہیں لکھتا۔ جو کچھ پاتا ہوں وہ سب درج کر لیتا ہوں، ورنہ انکم ٹیکس والے زندہ نہ چھوڑیں۔''

''جو کچھ خرچ کرتے ہو وہ؟''

''اس کا تو کوئی حساب نہیں رکھتا۔''

''کیوں؟''

''اور یہ پوتھے کیسے لکھ ڈالتے ہو؟''

''اس میں تو زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ قلم لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور لکھنے لگتا ہوں۔ ہر وقت خرچ کا کھاتا کھول کر تو نہیں بیٹھتا۔''

''تو یہ روپے کیسے ادا کرو گے؟''

''کسی سے قرض لے لوں، تمہارے پاس ہوں تو تم ہی دے دو۔''

''میں تو ایک ہی شرط پر دے سکتی ہوں کہ تمہاری آمدنی سب میرے ہاتھ میں آئے اور خرچ بھی میرے ہی ہاتھ سے ہو۔''

مہتا خوش ہو کر بولے۔ ''واہ! اگر یہ ذمہ داری لے لو تو کیا کہنا! موسلوں سے ڈھول بجاؤں۔''

مالتی نے ڈگری کے روپے دیئے اور دوسرے ہی روز مہتا کو بنگلہ خالی کر دینے پر مجبور کیا۔ اپنے بنگلے میں اس نے انہیں دو بڑے بڑے کمرے دے دیئے۔ ان کے کھانے کا بندوبست بھی اپنے ہی گھر میں کر دیا۔ مہتا کے پاس اور سامان تو زیادہ نہ تھا مگر کتابیں کئی گاڑی تھیں۔ ان کے دونوں کمرے کتابوں سے بھر گئے۔ باغیچہ چھوڑنے کا انہیں ضرور قلق تھا، لیکن مالتی نے اپنا پورا احاطہ ان کے لیے چھوڑ دیا تھا کہ جو پھول پودے چاہیں، لگائیں۔

مہتا تو بے فکر ہو گئے، لیکن مالتی کو ان کی اور خرچ کے ٹھیک کرنے میں بھڑی وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے دیکھا کہ آمدنی تو ہزار سے زیادہ ہے مگر وہ ساری

کی ساری خفیہ خیرات میں صرف ہو جاتی ہے۔ بیس پچیس لڑکے انہی سے وظیفہ پا کر اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ بیواؤں کی تعداد بھی اس سے کم نہ تھی۔ کس خرچ میں کمی کرے، اسے یہ نہ سوجھتا تھا۔ سارا الزام اسی کے سر مندھا جائے گا۔ ساری بدنامی اسی کے حصے آئے گی۔ کبھی مہتا پر جھنجلاتی، کبھی اپنے اوپر اور کبھی سائلوں کے اوپر جو ایک سادہ اور سخی انسان پر اپنا بار رکھتے ہوئے ذرا بھی نہ شرماتے تھے۔ یہ دیکھ کر اور جھجلاہٹ ہوتی تھی کہ ان خیرات لینے والوں میں کچھ تو اس کے مستحق نہ تھے۔ ایک روز مہتا کو آڑے ہاتھوں لیا۔

مہتا نے اس کا اعتراض سن کر بے فکری سے کہا۔ ''تمہیں اختیار ہے کہ جسے چاہے دو اور جسے چاہے نہ دو۔ مجھ سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ جواب بھی تم ہی کو دینا پڑے گا۔''

مالتی نے چڑ کر کہا۔ ''ہاں، اور کیا؟ نیک نامی تم لو اور بدنامی میری ہو۔ میں نہیں سمجھتی کہ تم کس دلیل سے اس خیرات کی حمایت کر سکتے ہو۔ انسانوں کو اس رواج نے جتنا کاہل اور مفت خور بنایا ہے اور اس کی خودداری کو جتنا دھچکا پہنچایا ہے، اتنا بے انصافی نے بھی نہ کیا ہوگا، بلکہ میرے خیال سے بے انصافی نے انسانوں میں انقلابی جذبہ پیدا کر کے سماج کو بڑا نفع پہنچایا ہے۔''

مہتا نے تسلیم کیا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''تمہارا یہ خیال نہیں ہے۔''

''نہیں مالتی، میں سچ کہتا ہوں۔''

''تو خیال اور عمل میں اتنا فرق کیوں؟''

مالتی نے تیسرے مہینے بہتوں کو مایوس کیا۔ کسی کو صاف جواب دیا، کسی سے مجبوری جتائی اور کسی کی فضیحت کی۔

مہتا صاحب کا بجٹ تو رفتہ رفتہ ٹھیک ہو گیا مگر اس سے انہیں ایک طرح کا رنج ہوا۔ مالتی نے جب تیسرے مہینے میں تین سو کی بچت دکھائی تب وہ اس سے کچھ بولے تو نہیں مگر ان کی نظر میں ان کی عظمت کچھ کم ضرور ہو گئی۔ عورت میں دان اور تیاگ ہونا چاہیے۔ یہی اس کی سب سے بڑی پونجی ہے۔ اسی کی بنیاد پر سوسائٹی کا محل کھڑا ہوا ہے۔ تجارتی عقل کو وہ ضروری برائی ہی سمجھتے تھے۔

جب مہتا کی اچکنیں بن کر آئیں اور نئی گھڑی بھی آئی تو وہ شرم کے مارے کئی دن باہر نہ نکلے۔ خود آرائی سے بڑا ان کی نظر میں دوسرا گناہ نہ تھا۔

مگر راز کی بات یہ تھی کہ مالتی ان کو تو حسابی شکنجے میں کس کر رکھنا چاہتی تھی۔ ان کی مالی خیرات کا دروازہ بند کر دینا چاہتی اور ذاتی ایثار میں اپنے وقت اور اپنی خیر اندیشی کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتی تھی۔ امیروں کے گھر تو وہ بلا فیس لیے نہ جاتی تھی، مگر غریبوں کو مفت دیکھتی تھی اور مفت دوا بھی دیتی تھی۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہی تھا کہ مالتی گھر کی بھی تھی اور باہر کی بھی جبکہ مہتا صرف باہر کے تھے۔ گھر ان کے لیے نہ تھا۔ اپنے کو دونوں مٹا دینا چاہتے تھے۔ مہتا کا راستہ صاف تھا۔ ان پر ذاتی ذمہ داری یک سوا اور کوئی بندش نہ تھی۔ مالتی کا راستہ مشکل تھا۔ اس پر ذمہ داری تھی اور بندش تھی، جسے وہ نہ توڑ سکتی تھی اور توڑنا چاہتی تھی۔ اس بندش ہی میں اسے زندگی کی تحریک ملتی تھی۔ اسے اب مہتا کو پاس دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کھلے جنگل میں گھومنے والے جیو کو پنجرے میں بند نہیں کر سکتی اور بند کر

دے گی تو وہ کاٹنے اور نوچنے دوڑے گا۔ پنجرے میں سب طرح کا آرام ملنے پر بھی اس کا دل ہمیشہ جنگل کے لیے بےقرار رہے گا۔ مہتا کے لیے گھر کی دنیا ایک اجنبی دنیا تھی، جس کے رسم و رواج سے وہ ناآشنا تھے۔

انہوں نے دنیا کو باہر سے دیکھا تھا اور اسے مکر و فریب ہی سے معمور سمجھتے تھے۔ جدھر دیکھتے تھے، ادھر ہی برائیاں نظر آتی تھیں، مگر سماج میں جب گہرائی تک جا کر دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ ان برائیوں کے نیچے ایثار بھی ہے، محبت بھی ہے اور اس شک و شبہ کی حالت میں جب مالتی کا تاریکی سے نکلتا ہوا دیوی کا روپ انہیں نظر آیا تب وہ اس کی طرف عجلت اور بھے صبری کے ساتھ دوڑ پڑے اور چاہا کہ اسے ایسی حکمت سے چھپا کر رکھیں کہ کسی دوسرے کی آنکھ بھی نہ پڑے۔ یہ خیال نہ رہا کہ یہ انتہائی رغبت ہی تباہی کی جڑ ہے۔ محبت جیسی بےمروت سی شے کیا خوف سے باندھ کر رکھی جا سکتی ہے؟ وہ تو پورا اعتبار چاہتی ہے، پوری آزادی چاہتی ہے اور پوری ذمہ داری چاہتی ہے۔ اس کی نشوونما، اس کی طاقت اس کے اندر ہے، اسے روشنی اور فضا ملنی چاہیے۔ وہ کوئی دیوار نہیں ہے جس پر اوپر سے اینٹیں رکھی جاتی ہیں۔ اس میں تو جان ہے، ارتقاء ہے اور پھیلنے کی بےحد سکت ہے۔

جب سے مہتا اس بنگلے میں آئے ہیں، انہیں مالتی سے دن میں کئی بار ملنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کے دوست سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے بیاہ کی تیاری ہے اور صرف رسم ادائی کی دیر ہے۔ مہتا بھی یہی خواب دیکھتے ہیں۔ اگر مالتی نے انہیں سدا کے لیے ٹھکرا دیا ہوتا تو کیوں ان سے اتنی محبت رکھتی؟ شاید وہ انہیں سوچنے کا موقع

دے رہی ہے اور وہ خوب سوچ کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مالتی کے بغیر وہ نصف ہیں اور وہی انہیں تکمیل کی طرف لے جا سکتی ہے۔ باہر سے وہ رنگین مزاج ہے مگر اندر سے وہی رجحان طاقت کا مرکز ہے۔ حالت تبدیل ہو گئے ہیں۔ پہلے مالتی پیاسی تھی اور اب مہتا پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور ایک مرتبہ جواب پا جانے کے بعد انہیں اس مسئلے پر مالتی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اگرچہ ان کے دل میں اب شک کا نام بھی نہیں رہا۔ مالتی کو قریب سے دیکھ کر ان کی کشش بڑھتی ہی جاتی ہے دور سے کتاب کے جو حروف ملے جلے سے لگتے تھے، اب قریب سے وہ صاف ہو گئے ہیں۔ ان میں مطلب ہے اور پیغام ہے۔

ادھر مالتی نے باغ میں مالی کا کام کرنے کے لیے گوبر کو رکھ لیا تھا۔ ایک روز وہ کسی مریض کو دیکھ کر آ رہی تھی کہ راستہ میں پٹرول ختم ہو گیا۔ وہ خود موٹر چلا رہی تھی۔ فکر ہوئی کہ پٹرول کیسے آئے۔ رات کے نو بج گئے تھے اور ماگھ کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ سڑکوں پر سناٹا ہو گیا تھا۔ کوئی ایسا آدمی نظر نہ آیا تھا جو موٹر کو دھکیل کر پٹرول کی دکان تک لے جائے۔ بار بار نوکروں پر جھنجلا رہی تھی۔ حرام خور کہیں کا! بے خبر پڑا رہتا ہے۔

اتفاقاً گوبر ادھر سے آ نکلا۔ مالتی کو کھڑے دیکھ کر اس نے سبب سمجھ لیا اور گاڑی کو دو فرلانگ دھکیل کر پٹرول کی دکان تک لایا۔

مالتی نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''نوکری کرو گے؟''

گوبر نے شکریے کے ساتھ منظور کیا۔ پندرہ روپے ماہوار تنخواہ طے ہوئی۔ مالی کا کام اسے پسند تھا۔ یہی کام اس نے کیا تھا اور اس میں مشاق تھا۔ مل کی مزدوری

میں اجرت زیادہ ملتی تھی مگر اس میں اس کو الجھن ہوتی تھی۔

دوسرے دن سے گوبر نے مالتی کے یہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ اسے رہنے کو ایک کوٹھری بھی مل گئی۔ جھنیا بھی آ گئی۔ مالتی باغ میں آتی تو اسے جھنیا کا بچہ دھول مٹی میں کھیلتا ملتا۔ ایک دن مالتی نے اسے مٹھائی دے دی۔ بچہ اس دن سے مانوس ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے پیچھے لگ جاتا اور جب تک مٹھائی نہ لے لیتا، پیچھا نہ چھوڑتا۔

ایک دن مالتی باغ میں آئی تو بچہ نہ دکھائی دیا۔ جھنیا سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بچے کو بخار آ گیا ہے۔ مالتی نے گھبرا کر کہا۔ ''بخار آ گیا تو میرے پاس کیوں نہیں لاتی۔ چل دیکھوں۔''

بچہ کھٹولے پر بخار میں غافل پڑا تھا۔ کھپریل کی کوٹھری میں اتنی نمی، اتنی تاریکی اور ان جاڑے کے دنوں میں بھی مچھروں کی اتنی کثرت تھی کہ مالتی ایک منٹ بھی وہاں نہ ٹھہر سکی۔ فوراً آ کر تھرمامیٹر لیا اور پھر جا کر دیکھا تو بخار ایک سو چار تھا۔ مالتی کو اندیشہ ہوا کہ کہیں چیچک نہ ہو۔ بچے کے ابھی ٹیکہ نہ لگا تھا اور اگر اس نم کوٹھری میں رہا تو اندیشہ تھا کہ بخار نہ بڑھ جائے۔

دفعتاً بچے نے آنکھیں کھول دیں اور مالتی کو کھڑا دیکھ کر رونی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی گود کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے۔ مالتی نے اسے گود میں اٹھا لیا اور تھپکیاں دینے لگی۔

بچہ مالتی کی گود میں جا کر جیسے بڑے سکھ کا احساس کرنے لگا اور اپنی جلتی ہوئی انگلیوں سے اس کے گلے کی موتیوں کی مالا پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ مالتی نے

نیکلس اتار کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ بچے کو خود غرضانہ فطرت اس حالت میں بھی برقرار تھی۔ نیکلس پا کر اب ایس گود میں رہنے کی کوئی ایسی ضرورت نہ رہی ۔ یہاں نیکلس کے چھن جانے کا خوف تھا۔ اس وقت جھنیا کی گود زیادہ محفوظ تھی۔

مالتی نے شگفتہ دلی سے کہا۔ ''بڑا چالاک ہے، چیز لے کر کیسا بھاگا۔''

جھنا نے کہا۔ ''دے دو بیٹا، مس صاحب کا ہے۔''

بچے نے مالا دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور ماں کی طرف غصے سے دیکھا۔ مالتی بولی۔ ''تم پہنے رہو بچہ، میں مانگتی نہیں ہوں۔''

اسی وقت بنگلے میں آ کر اس نے اپنی نشست کا کمرہ خالی کر دیا اور اسی وقت جھنیا اس میں آ کر مقیم ہو گئی۔ منگل نے اس بہشت کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ چھت میں پنکھا تھا، رنگین برقی بلب تھے، دیواروں پر تصویریں تھیں، ان چیزوں کو کچھ دیر ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ مالتی نے بڑے پیار سے پکارا ''منگل۔''

منگل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''آج تو ہنسا نہیں جاتا مس صاحب کیا کروں؟ آپ سے کچھ ہو سکے تو کیجیے۔''

مالتی نے جھنیا کو بہت سی باتیں سمجھائیں اور جاتے ہوئے پوچھا۔ تیرے گھر میں کوئی دوسری عورت ہو تو گوبر سے کہہ دے کہ دو چار روز کے لیے بلا لائے، مجھے چیچک کا اندیشہ ہے۔ کتنی دور ہے تیرا گھر؟

جھنیا نے اپنے گاؤں کا نام اور پتہ بتایا۔ ''اٹھارہ بیس کوس کے قریب ہو گا۔''

مالتی کو بلاری یاد تھا۔ بولی۔ ''وہی گاؤں تو نہیں جس کے پچھم کی طرف آدھے میل پر ندی ہے؟''

''ہاں ہاں صاحب، وہی گاؤں ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''ایک بار ہم لوگ وہاں گئے تھے اور رہوری کے گھر ٹھہرے تھے۔ تو اسے جانتی ہے؟''

''وہ تو میرے سسر ہیں مس صاحب، میری ساس بھی ملی ہوں گی۔''

''ہاں ہاں، بڑی سمجھدار عورت معلوم ہوتی تھی۔ مجھ سے خوب باتیں کرتی رہی تو گوبر کو بھیج دے، اپنی ماں کا بلا لائے۔''

''وہ نہیں بلانے نہ جائیں گے۔''

''کیوں؟''

''کچھ ایسا کارن ہے۔''

جھنیا کو اپنے گھر کا چوکا برتن، روٹ پانی اور جھاڑنا، بٹورنا وغیرہ سبھی کچھ کرنا پڑتا تھا۔ دن کو تو دونوں چربن پر رہ جاتے تھے اور رات کو جب مالتی آجاتی تو جھنیا اپنا کھانا پکاتی اور مالتی بچے کے پاس بیٹھتی۔ جھنیا بار بار چاہتی کہ بچے کے پاس بیٹھے، مگر مالتی اسے نہ آنے دیتی۔ رات کو بچے کا بخار تیز ہو جاتا اور وہ بے چینی سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیتا۔ مالتی اسے گود میں لے کر گھنٹوں کمرے میں ٹہلتی، چوتھے دن چیچک نکل آئی۔ مالتی نے سارے گھر کو ٹکہ لگایا، خود اپنے ٹیکہ لگایا اور مہتا کو بھی لگایا۔ گوبر، جھنیا، مراج کوئی نہ بچا۔ پہلے دن تو دانے چھوٹے اور الگ الگ تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹی چیچک ہے۔ دوسرے دن دانے جیسے کھل اٹھے اور انگور کے برابر ہو گئے اور پھر کئی دانے مل کر بڑے بڑے آنولہ سے ہو گئے۔ منگل جلن اور کھجلی اور درد سے بے چینی ہو کر دکھ بھری آواز میں کراہتا اور عاجزی اور بے

چارگی بھری نظروں سے مالتی کی طرف دیکھتا۔ اس کا کراہنا بھی بڑوں کا سا تھا اور نگاہوں میں بھی پختگی تھی، گویا وہ یکا یک جوان ہو گیا ہو۔ اس نہ سہنے کے قابل تکلیف نے گویا اس کے معصوم بچپن کو مٹا ڈالا تھا۔ اس کی طفلانہ عقل گویا وسعت پا کر سمجھ رہی تھی کہ مالتی ہی کے جتن سے وہ اچھا ہو سکتا ہے۔ مالتی جیوں ہی کسی کام سے چلی جاتی تو وہ رونے لگتا اور مالتی کو عموماً ساری ساری رات بیٹھنا پڑ جاتا۔ مگر وہ کبھی جھلاتی، نہ چڑتی۔ ہاں، جھنیا پر اسے ضرور کبھی کبھی غصہ آتا، کیونکہ وہ اپنی نادانی کے سبب نہ کرنے والا کام بھی کر بیٹھتی۔ گوبر اور جھنیا دونوں کا جھاڑ پھونک پر زیادہ اعتقاد تھا، مگر یہاں ایک کا کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اس پر جھنیا دو بچوں کی ماں ہو کر بھی بچے کی داشت کرنا نہیں جانتی تھی۔ منگل دق کرتا تو اسے ڈانٹتی ڈپٹتی، ذرا بھی موقع پاتی تو زمین پر سو جاتی اور صبح سے پہلے نہ اٹھتی اور گوبر تو اس کمرے میں جیسے آتے ڈرتا تھا۔ مالتی وہاں بیٹھی ہے، کیسے جائے۔ جھنیا سے بچے کا حال ہو چھ لیتا اور کھاپی کر سو جاتا۔ اس پرانی چوٹ کے بعد وہ پورا تندرست نہ ہونے پایا تھا۔ ذرا سا کام کر کے بھی تھک جاتا تھا۔ ان دنوں جب جھنیا گھاس بیچتی تھی اور وہ آرام سے پڑا رہتا تھا تب کچھ سنبھل گیا تھا مگر ادھر کئی مہینوں تک بوجھ ڈھونے اور چونے گارے کا کام کرنے سے اس کی حالت پھر گر گئی تھی۔ اس پر یہاں کام بہت تھا۔ سارے باغ کو سینچنا، کیاریوں کو گوڑنا، گھاس چھیلنا، گایوں کو چارہ پانی دینا اور دوہنا اور جو مالک اتنا رحم دل ہو، اس کے کام میں تساہلی کیسے کرے؟ یہ احسان اسے ایک منٹ بھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتا تھا اور مہتا جب خود کھرپی لے کر گھنٹوں باغ میں کام کرتے تھے وہ کیسے آرام کرتا؟ وہ خود سوکھتا جاتا تھا مگر باغ ہرا ہو رہا

تھا۔

مہتا کو بھی بچے سے محبت ہوگئی تھی۔ ایک روز مالتی نے اسے گود میں دے کر ان کی مونچھیں اکھڑوا دی تھیں۔ ڈشت نے مونچوں کو ایسا پکڑا تھا جیسے جڑ سے اکھاڑ لے گا۔ مہتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے بگڑ کر کہا تھا، بڑا شیطان لونڈا ہے۔

مالتی نے انہیں ڈانٹا۔ ''تم مونچھیں صاف کیوں نہ کر لیتے۔''

''میری مونچیں مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔''

''اب کے پکڑے گا تو اکھاڑ ہی کر چھوڑے گا۔''

''میں اس کے کان بھی اکھاڑ لوں گا۔''

منگل کو ان کی مونچیں اکھاڑنے میں کوئی خاص مزہ آتا تھا۔ وہ خوب کھلکھلا کر ہنستا تھا اور مونچھوں کو زیادہ زور سے کھینچتا تھا، مگر مہتا کو بھی شاید مونچھیں اکھڑوانے میں مزہ آتا تھا کیونکہ وہ عموماً دو ایک بار روزانہ اس سے اپنی مونچھوں کی رسہ کشتی کرا لیا کرتے تھے۔

ادھر جب منگل کو چیچک نکل آئی تھی، مہتا کو بڑی تشویش ہوگئی تھی۔ اکثر کمرے میں جا کر منگل کو مغموم آنکھوں سے دیکھا کرتے، اس کی تکلیف کے خیال سے ان کا نرم و نازک دل کانپ جاتا تھا۔ ان کی دوڑ دھوپ سے وہ اچھا ہو جاتا تو زمین کے دوسرے سرے تک بھی دوڑ لگانے، روپے خرچ کرنے سے اچھا ہوتا تو خواہ انہیں بھیک ہی مانگنا پڑتا وہ اسے اچھا کر ہی کے رہتے مگر یہاں کوئی بس نہ تھا۔ اسے چھوتے ہوئے بھی ان کے ہاتھ لرزتے تھے۔ کہیں اس کے آبلے نہ ٹوٹ

جائیں۔ مالتی کتنی آہستگی سے اسے اٹھاتی ہے، کندھے پر بٹھا کر کمرے میں ٹہلتی ہے اور کتنی محبت سے اسے بہلا کر دودھ پلاتی ہے۔ یہ مادرانہ محبت مالتی کو ان کی نظروں میں نہ جانے کتنا اونچا اٹھا دیتی ہے۔ مالتی صرف عورت نہیں بلکہ اصلی معنی میں ماں اور دیوی اور زندگی دینے والی جو پرائے بچے کو بھی اپنا سمجھ سکتی ہے۔ گویا اس نے مادری جذبات کو سدا سے فراہم کیا ہو اور آج انہیں دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہے۔ اس کے عضو عضو سے مادریت پھوٹی پڑتی تھی، گویا یہ ہی اس کا اصلی روپ ہو۔ وہ ناز و انداز، وہ بناؤ اور سنگھار اس کی مادریت کے محض پردے تھے تاکہ اس کے اندر وہ پونجی خوب محفوظ رہے۔

رات کو ایک بج گیا تھا۔ منگل کا رونا سن کر مہتا چونک پڑے۔ سوچا بیچاری مالتی آدھی رات تک تو جاگتی رہی ہوگی، اس وقت اسے اٹھنے میں کتنی تکلیف ہوگی، پس اگر دروازہ کھلا ہو تو میں کود ہی بچے کو چپ کرا دوں۔ وہ فوراً اٹھ کر کر اس کمرے کے دروازے پر گئے اور شیشے سے اندر جھانکا۔ مالتی بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور بچہ یوں ہی رو رہا تھا۔ شاید اس نے خواب دیکھا تھا یا کسی اور وجہ سے ڈر گیا تھا۔ مالتی پچکارتی تھی، تھپکتی تھی، تصویریں دکھاتی تھی، گود میں لے کر ٹہلتی تھی مگر بچہ چپ نہ ہوتا تھا۔ مالتی کی یہ بے حد محبت اور یہ لازوال مادریت دیکھ کر ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ دل میں ایسی گدگدی اٹھی کہ اندر جا کر مالتی کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیں دل سے محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کا ایک ہجوم نکل پڑا۔ ''پیاری، میری بہشت کی دیوی، میری رانی.....''

اور اسی مجنونانہ محبت میں پکار اٹھے۔ ''مالتی ذرا دروازہ کھول دو۔''

مالتی نے آ کر دروازہ کھولا اور ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

مہتا نے پوچھا۔ ''کیا جھنیا نہیں اٹھی؟ یہ تو بہت رو رہا ہے۔''

مالتی نے تکلیف کے لہجے میں کہا۔ ''آج آٹھواں دن ہے، درد زیادہ ہو گا، اسی لیے۔''

''تو لاؤ کچھ دیر ٹہلا دوں، تم تھک گئی ہو گی۔''

مالتی نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہیں ذرا دیر میں غصہ آ جائے گا۔''

بات سچ تھی مگر اپنی کمزوری کون تسلیم کرتا ہے؟ مہتا نے ضد سے کہا۔ ''تم نے مجھے اتنا سبک سمجھ رکھا ہے۔''

مالتی نے بچے کو ان کی گود میں دے دیا۔ ان کی گود میں جاتے ہی وہ یکدم چپ ہو گیا۔ بچوں میں جو ایک فطری سمجھ ہوتی ہے۔ اسی نے اس کو بتا دیا کہ رونے میں اب تمہارا کوئی فائدہ نا ہیں۔ یہ نیا آدمی عورت نہیں بلکہ مرد ہے اور مرد غصہ ور ہوتا ہے اور بے رحم بھی ہوتا ہے اور چارپائی پر لٹا کر اور باہر اندھیرے میں ڈال کر وہ دور بھی جا سکتا ہے اور کسی کو پاس آنے بھی نہ دے گا۔

مہتا نے فخریہ کہا۔ ''دیکھا کیسا چپ کرا دیا۔''

مالتی نے مذاق کیا۔ ''ہاں، تم اس فن میں بھی طاق ہو۔ کہاں سیکھا؟''

''تم سے۔''

''میں عورت ہوں اور مجھ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔''

مہتا نے چرم سے کہا۔ ''مالتی! میں تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ اب میری باتوں کو بھول جاؤ۔ ان کئی مہینوں میں کتنا پچھتایا ہوں، کتنا نادم اور ملول ہوا ہوں،

اس کا اندازہ شاید تم نہ کر سکو گی۔''

''مجھے کیسے یقین آئے؟''

''اس کا ثبوت یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، ایک ہی ساتھ کھاتے ہیں، ہنستے ہیں۔ بولتے ہیں۔''

''کیا مجھے کچھ مانگنے کی اجازت نہ دو گی؟''

انہوں نے منگل کو چارپائی پر لٹا دیا، جہاں وہ سکڑ کر سو رہا اور مالتی کی طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھا، گویا اسی اجازت پر ان کا پورا دارومدار تھا۔

مالتی نے متاثر ہو کر کہا ''تم جانتے ہو کہ تم سے زیادہ قریبی دنیا میں میرا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ میں نے بہت دن ہوئے کہ خود کو تمہارے چرنوں کی بھینٹ کر دیا ہے۔ تم میرے رہنما ہو، میرے دیوتا ہو، میرے استاد ہو، تمہیں مجھ سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں، صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ جب تک مجھے تمہارے درشن نہ ہوئے تھے اور میں نے تمہیں پہچانا نہ تھا، اس وقت تک عیش اور خود پروری ہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ تم نے آ کر اسے تحریک دی، پائیداری دی۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں نے ندی کے کنارے والی تمہاری باتیں گرہ کر لیں۔ رنج یہی ہوا کہ تم نے بھی مجھے وہی سمجھا جو دوسرا مرد سمجھتا اور جس کی امید مجھے تم سے نہ تھی۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے، یہ میں جانتی ہوں۔ مگر تمہاری گراں بہا محبت پا کر بھی وہی بنی رہوں گی۔ ایسا سمجھ کر تم نے میرے ساتھ بے انصافی کی، میں اس وقت کتنے غرور کا احساس کر رہی ہوں۔ یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ تمہارا عشق اور اعتماد پا کر اب میرے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ یہ برکت میری زندگی کو بامعنی بنا

دینے کے لیے کافی ہے۔ یہی میری تکمیل ہے۔''

یہ کہتے ہوئے مالتی کے دل میں ایسی رغبت پیدا ہوئی کہ مہتا کے سینے سے لپٹ جائے، اندر کی خواہشیں باہر آ کر گویا سچ ہوگئی تھیں۔ اس کا رواں رواں پھول اٹھا۔ جس سرور کو اس نے نایاب سمجھ رکھا تھا، وہ اتنا قابل حصول اور اتنا قریب ہے اور دل کا وہ سرور چہرے پر آ کر اسے ایسی رونق دینے لگا کہ مہتا کو اس میں دیوتا پن کی سی جھلک دکھائی پڑے۔ یہ عورت ہے یا خیر اور پاکیزگی اور ایثار کی مجسم صورت

۔

اسی وقت جھنیا جاگ کر اٹھ بیٹھی اور مہتا اپنے کمرے میں چلے گئے اور پھر دو ہفتے تک مالتی سے کچھ بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا۔ مالتی کبھی ان سے تنہائی میں نہ ملتی۔ مالتی کے وہ الفاظ ان کے دل میں گونجتے رہتے ان میں کتنی تشفی تھی، کتنی عاجزی تھی، کتنا نشہ تھا۔

دو ہفتے میں منگل اچھا ہو گیا۔ البتہ منہ پر چیچک کے داغ نہ بھر سکے۔ اس دن مالتی نے پڑوس کے لڑکوں کو خوب مٹھائی کھلائی اور جو منتیں کر رکھی تھیں، وہ بھی پوری کیں قربانی کی زندگی میں کتنی خوشی ہے۔ اس کا اب اسے تجربہ ہو رہا تھا۔ جھنیا اور گوبر کی خوشی گویا اس کے دل میں منعکس ہو رہی تھی۔ دوسروں کی تکلیف دور کرنے میں اس نے جو خوشی محسوس کی وہ کبھی عیش و آرام کی زندگی میں نہ ملی تھی۔ وہ ہوس اب ان پھولوں کی طرح کمزور ہو گئی تھی، جن میں پھل لگ رہے تھے۔ اب وہ اس درجے سے آگے نکل چکی تھی، جب انسان مادی خوشی کو اصلی خوشی سمجھتا ہے۔ وہ خوشی اب اسے ہیچ اور پستی کی طرف لے جانے والی اور ہلکی بلکہ بھیانک سی لگتی

تھی۔ اس بڑے بنگلے میں رہنے کا کیا لطف جب اس کے آس پاس مٹی کے جھونپڑے گویا فریاد کر رہے ہوں؟ موٹر پر چڑھ کر اب اسے فخر نہیں ہوتا۔ منگل جیسے نادان بچے نے اس کی زندگی کو کتنا منور کر دیا تھا۔ اس کے لیے حقیقی خوشی کا دروازہ سا کھول دیا تھا۔

ایک روز مہتا کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے پلنگ پر پڑے تڑپ رہے تھے کہ مالتی نے آ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ درد کب سے ہو رہا ہے؟''

مہتا کو ایسا معلوم ہوا گویا ان نرم و نازک ہاتھوں نے سارا درد کھینچ لیا۔ اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے۔ ''درد تو دوپہر ہی سے ہو رہا تھا اور ایسا درد مجھے آج تک نہیں ہوا تھا، مگر تمہارے ہاتھ رکھتے ہی سر ایسا ہلکا ہو گیا ہے گویا درد تھا ہی نہیں۔ تمہارے ہاتھوں میں شفا ہے۔''

مالتی نے انہیں کوئی دوا لا کر کھانے کے لیے دی اور آرام سے لیٹے رہنے کی تاکید کر کے فوراً ہی کمرے سے نکل جانے کو ہوئی کہ مہتا نے اصرار سے کہا ''دو منٹ بیٹھو گی نہیں۔''

مالتی نے دروازے پر سے مڑ کر کہا۔ ''اس وقت باتیں کرو گے تو شاید پھر درد ہونے لگے۔ آرام سے لیٹے رہو۔ آج کل میں تمہیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پڑھتے یا لکھتے دیکھتی ہوں۔ دو چار دن پڑھنا لکھنا بند کر دو۔''

''تم ایک منٹ بیٹھو گی نہیں؟''

''مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔''

اچھا بات ہے، جاؤ۔

مہتا کے چہرے پر کچھ ایسی اداسی چھا گئی کہ مالتی لوٹ پڑی اور سامنے آ کر بولی ''اچھا کہو، کیا کہتے ہو؟'' مہتا نے بے دلی سے کہا ''کوئی خاص بات نہیں۔ یہی کہہ رہا تھا کہ اتنی رات گئے کس مریض کو دیکھنے جاؤ گی؟'' ''وہی رائے صاحب کی لڑکی ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی، مگر اب کچھ سنبھل گئی ہے۔''

اس کے جاتے ہی مہتا پھر لیٹ رہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ مالتی کے ہاتھ رکھتے ہی درد کیوں رفع ہو گیا۔ ضرور اس میں کوئی عجیب طاقت ہے اور اس کی ریاضت، اس کی عملی انسانیت ہی کی برکت ہے۔ مالتی نسائیت کے اس بلند معیار پر پہنچ گئی تھی جہاں وہ نور کے ایک ستارے کی طرح روشن نظر آتی تھی۔ اب وہ عشق کی چیز نہیں، عقیدت کی چیز تھی۔ اب وہ نایاب ہوگئی تھی اور ایسا ہونا فہم و فراست والوں کے لیے سعی و کوشش کرنے کا ایک منتر ہے۔ مہتا عشق میں جس خوشی کا تصور کر رہے تھے، اسے عقیدت نے اور بھی گہرائی اور جانداری دے دی تھی۔ عشق میں کچھ گھمنڈ بھی ہوتا ہے اور کچھ لگاؤ بھی، مگر عقیدت تو خود کو فنا کر دیتی ہے اور اپنی اس فنا ہی کو اپنا اعلیٰ مقصد بنا لیتی ہے۔ عشق اقتدار جمانا چاہتا ہے، جو کچھ دیتا ہے۔ اس کے عوض میں کچھ چاہتا بھی ہے، مگر عقیدت کی انتہائی خوشی نجی قربانی ہے جس میں خودی کا فقدان ہو جاتا ہے۔

مہتا کی وہ بڑی کتاب ختم ہوگئی تھی جسے وہ تین سال سے لکھ رہے تھے اور جس میں انہوں نے دنیا کے سبھی فلسفیانہ اجزاء کو شامل کیا تھا۔ یہ کتاب انہوں نے مالتی کے نام معنون کی اور جس دن اس کی جلدیں انگلستان سے آئیں اور انہوں نے

ایک جلد مالتی کی نذر کو تو وہ اسے معنون دیکھ کر متعجب بھی ہوئی اور مغموم بھی۔

اس نے کہا۔ ''یہ تم نے کیا کیا؟ میں تو اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتی۔''

مہتا نے فخریہ کہا ''مگر میں تو سمجھتا ہوں۔ یہ تو کوئی چیز نہیں، مجھ میں تو اگر سو جانیں ہوتیں تو وہ سب تمہارے قدموں پر نثار کر دیتا۔''

''مجھ پر! جس نے خود غرضی کے سوا کچھ اور جانا ہی نہیں۔''

''تمہارے تیاگ کا ایک ٹکڑا بھی میں پا جاتا تو خود کو خوش نصیب سمجھتا۔ تم دیوی ہو۔''

''پتھر کی، اتنا اور کیوں نہیں کہتے؟''

''قربانی کی، راحت کی پاکیزگی کی۔''

''تب تم نے مجھے خوب سمجھا۔ میں اور تیاگ! میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ سیوا یا تیاگ کا خیال میرے دل میں کبھی نہیں آیا۔ میں جو کچھ کرتی ہوں وہ پوشیدہ علانیہ غرض کے لیے کرتی ہوں۔ میں گاتی اس لیے نہیں کہ تیاگ کرتی ہوں یا اپنے گیتوں سے غمزدوں کو تسکین دیتی ہوں بلکہ صرف اس لیے کہ اس سے میرا دل خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح دوا بھی غریبوں کو دے دیتی ہوں بلکہ صرف اس لیے کہ اس سے میرا دل خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح دوا بھی غریبوں کو دے دیتی ہوں، صرف اپنے دل کو خوش کرنے کے لیے۔ شاید دل کی خودی اس میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ تم مجھے خواہ مخواہ دیوی بنائے ڈالتے ہو۔ اب تو اتنی ہی کسر رہ گئی ہے کہ آرتی اور چڑھاوا وغیرہ لے کر میری پوجا کرو۔''

مہتا بولے۔ ''تو میں برسوں سے کر رہا ہوں مالتی! اور اس وقت تک کرتا رہوں

گا جب تک بردان نہ مل جائے گا۔''

مالتی نے چٹکی لی۔ ''تو بردان پا جانے کے بعد شاید دیوی کو مندر سے نکال پھینکو۔''

مہتا نے سنبھل کر کہا۔ ''تب تو میری جداگانہ ہستی ہی نہ رہے گی۔ عابد معبود میں جذب ہو جائے گا۔''

مالتی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''نہیں مہتا! میں مہینوں سے اس مسئلے پر غور کر رہی ہوں اور آخر میں نے یہ طے کیا ہے کہ دوست بن کر رہنا زن و شوہر بن کر رہنے سے کہیں زیادہ آرام دہ ہے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھ پر اعتبار کرتے ہو اور مجھے بھروسہ ہے کہ آج موقع آپڑے تو تم اپنی جان دے کر بھی میری حفاظت کرو گے۔ تم میں میں نے اپنا ہادی ہی نہیں بلکہ اپنا محافظ بھی پایا ہے۔ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں اور تم پر اعتبار کرتی ہوں اور تمہارے لیے کوئی ایسی قربانی نہیں جو میں نہ کر سکوں۔ ایشور سے مری یہی بینتی ہے کہ وہ زندگی بھر مجھے اسی راہ پر قائم رکھے۔ ہماری تکمیل کے لیے، ہمارے روحانی ارتقاء کے لیے اور کیا چاہیے؟ اپنی چھوٹی سی گرہستی بنا کر، اپنی روحوں کو چھوٹے سے پنجرے میں بند کر کے، اپنے سکھ دکھ کو اپنے ہی تک رکھ کر، کیا ہم لامحدود کے قریب تک پہنچ سکتے ہیں؟ ویسا کرنا تو ہماری راہ میں رکاوٹ ہی ڈالے گا۔ معدودے چند آدمی ایسے بھی ہیں جو پیروں میں بیڑیاں ڈال کر بھی ارتقائی راستے پر چل سکتے ہیں اور چل رہے ہیں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تکمیل کے لیے اس محبت اور ترک و ایثار میں بڑی اہمیت ہے، جو کنبے کے لیے کیے جاتے ہیں، لیکن میں اپنے دل کو اتنا مضبوط و مستقل نہیں پاتی جب

تک محبت نہیں ہے، خودی نہیں ہے، اس وقت تک زندگی کا لالچ نہیں ہے، خود غرضی کا زور نہیں ہے۔ جس روز دل لالچ میں پڑا اور ہمارے لیے بندش تیار ہوگئی، اسی دن ہماری انسانیت کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔ نئی نئی ذمہ داریاں پیدا ہوں گی اور ہماری ساری طاقت ان ہی کے پورا کرنے میں لگنا شروع ہو جائے گی۔ تم جیسے طباع و دانشمند انسان کی روح کو میں اس قید میں بند نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی تک تمہاری زندگی ایک یگیہ تھی جس میں خود غرضی کے لیے بہت کم گنجائش تھی۔ میں اس کو پستی کی طرف نہ لے جاؤں گی۔ دنیا کو تم جیسے مرتاضوں کی ضرورت ہے، جو اپنے دل کو اتنا وسیع بنا دیں کہ ساری دنیا ان کی اپنی ہو جائے۔ دنیا میں بے انصافی کی، ظلم کی اور خوف کی دہائی مچی ہوئی ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا، مذہبی مکاری کا اور خود غرضی کا دور دورہ ہے۔ تم سے وہ پکار سنی ہے۔ تم بھی نہ سنو گے تو سننے والے آئیں گے کہاں سے؟ دوسرے ظاہر انسانوں کی طرح تم بھی اس کی طرف سے اپنے کان نہیں بند کر سکتے۔ تمہیں ویسی ہی زندگی وبال ہو جائے گی۔ اپنے علم و عقل کو، اپنی بیدار انسانیت کو زیادہ حوصلہ اور رزور کے ساتھ اسی راستے پر لے جاؤ۔ میں بھیتمہارے پیچھے پیچھے چلوں گی۔ اپنی زندگی کے ساتھ میری زندگی بھی سپھل کر دو، تم سے میرا یہی کہنا ہے۔ اگر تمہارا دل دنیویت کی طرف دوڑتا ہے، جب بھی میں اپنا بس چلتے تمہیں ادھر سے ہٹاؤں گی اور ایشور نہ کرے کہ مجھے اپنے اس ارادے میں ناکامیاب ہونا پڑے، لیکن میں ان حالات میں دو بوند آنسو بہا کر تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گی اور کہہ نہیں سکتی کہ پھر میرا کیا انجام ہوگا، میں کس گھاٹ لگوں گی۔ مگر چاہے وہ کوئی گھاٹ ہو پھر بھی اس دنیوی بندش کا گھاٹ نہ ہوگا۔

بولو، مجھے کیا حکم دیتے ہو؟''

مہتا سر جھکائے سنتے رہے۔ ایک ایک لفظ گویا ان کے دل کی آنکھیں اس طرح کھولے دیتا تھا جیسے اب تک کبھی نہ کھلی تھیں۔ وہ خیالات جواب تک ان کے سامنے خواب کی تصویروں کی طرح آئے تھے۔ اب زندگی کی سچائیوں سے معمور ہو کر متحرک ہو رہے تھے۔ وہ اپنے روئیں روئیں میں روشنی اور ترقی کا احساس کر رہے تھے۔ زندگی کے بڑے ارادوں کے سامنے ہمارا بچپن ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ مہتا کی آنکھوں میں بھی میٹھی یا دوالا بچپن پھر گیا۔ جب وہ اپنی بیوہ ماں کی گود میں بیٹھ کر بہت بڑے سکھ کا احساس کیا کرتے تھے۔ کہاں ہے وہ ماں؟ آئے اور دیکھے اپنے بیٹے کی اس شہرت و نیک نامی کو! مجھے دعا دو۔ تمہاری وہ ہٹی لڑکا آج ایک نیا جنم لے رہا ہے۔

انہوں نے مالتی کے پیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیے اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ ''تمہارا حکم منظور ہے مالتی!''

اور دونوں ایک سے دل والے ہو کر باہم بغلگیر ہو گئے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

(34)

سلیا کا لڑکا اب دو سال کا ہو رہا تھا اور سارے گاؤں کی دوڑ لگاتا تھا۔ اپنے ساتھ ایک عجیب بولی لایا تھا اور اسی میں بولتا تھا، خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اس کی بولی میں ٹ، ل اور گھ کی کثرت تھی اور س، ر وغیرہ غائب تھے۔ اس بولی میں روٹی کا نام تھا اوٹی، دودھ کا توت، ساگ کا چھاگ اور کوٹی کا تولی۔ جانوروں کی

بولیوں کیا یسی نقل کرتا ہے کہ ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتا ہے۔ کسی نے پوچھا۔ ''راموا! کتا کیسے بولتا ہے؟'' تو راموسنجیدگی سے کہتا ''بھوں بھوں'' اور کاٹنے دوڑتا۔ بلی کیسے بولے؟ اور ''اور راموميا ؤں میاؤں'' کے کے آنکھیں نکال کر، تا کتا اور پنجوں سے نوچتا۔ بڑا مست لڑکا تھا۔ جب دیکھو کھیلنے میں مگن رہتا۔ کھانے پینے کی سدھ نہ تھی۔ گود سے اسے چڑ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوشی کے لمحے وہ ہوتے جب وہ دروازہ میں نیم کے نیچے منوں دھول اکٹھا کر کے اس میں لوٹتا، اسے سر پر چڑھاتا، اس کی ڈھی ۸ریاں لگاتا، اس کے گھروندے بناتا۔ اپنے ہم عمروں سے اس کی ایک لمحہ بھی نہ پٹتی۔ وہ شاید ان کو اپنے ساتھ کھیلنے کے قابل ہی نہ سمجھتا تھا۔

کوئی پوچھتا۔ ''تمہارا کیا نام ہے؟''

فوراً کہتا ''لاموں''

''تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟''

''ماتا دین۔''

''اور تمہاری ماں کا؟''

''چھلیا۔''

''اور ماتا دین کون ہے؟''

''وہ امالا چھالا ہے۔''

نہ جانے کس نے ماتا دین سے اس کا یہ رشتہ بتا دیا تھا۔

راموا ور روپا میں خوب بنتی تھی۔ وہ روپا کا کھلونا تھا۔ اسے ابٹن ملتی، کاجل

لگاتی، نہلاتی، بال سنوارتی اور اپنے ہاتھوں لقمے بنا بنا کر کھلاتی اور کبھی کبھی اسے گود میں لیے رات کو سو بھی جاتی۔ دھنیا ڈانٹتی کہ تو سب چھوا چھوت کیے دیتی ہے۔ مگر وہ کسی کی نہ سنتی۔ چیتھڑے کی گڑیوں نے اسے ماں بننا سکھایا تھا۔ وہ مادرانہ جذبہ جیتا جاگتا بچہ پا کر اب گڑیوں سے مطمئن نہ ہو سکتا تھا۔

ہوری کے گھر کے پچھواڑے جس مکان میں کسی وقت اس کے بیل بندھتے تھے، اسی کے کھنڈر میں سلیا اپنا ایک پھوس کا جھونپڑا ڈال کر رہنے لگی تھی۔ ہوری کے گھر میں مر تو نہیں کٹ سکتی تھی۔

ماتا دین کو کئی سو روپے خرچ کرنے کے بعد اخیر میں کاشی کے پنڈتوں نے پھر برہمن بنا دیا تھا۔ اس روز بڑا بھاری ہوم ہوا، بہت سے برہمنوں نے کھانا کھایا اور بہت سے منتر اور اشلوک پڑھے گئے۔ ماتا دین کو شدھ گوبر اور گوموتر کھانا پینا پڑا۔ گوبر اسے اس کا دل پاک ہو گیا اور گوموتر سے اس کی روح کے ناپاک جراثیم ہلاک ہو گئے۔

لیکن ایک طرح سے اس پرائشچت نے اسے سچ مچ پوتر کر دیا۔ ہوم کے جلتے ہوئے کنڈ میں اس کی بشریت نکھر گئی اور ہوم کے شعلوں کی روشنی میں اس کے مذہبی ارکان کو اچھی طرح پرکھ لیا۔ اس دن سے اسے دھرم کے سے چڑ ہو گئی۔ اس نے جنیئو اتار کر پھینک دیا اور پروہتی کو گنگا میں ڈبو دیا۔ اب وہ پکا کسان تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اگرچہ علماء نے اس کا برہمن ہونا تسلیم کر لیا، لیکن لوگ اب بھی اس کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے۔ اس سے مہورت پوچھتے ہیں، ساعت اور لگن کا بچار کراتے ہیں، اسے تیوہار کے موقعوں پر دان دکشنا بھی دیتے ہیں۔ مگر اپنے برتن

نہیں چھوتے دیتے۔

جس دن سلیا کے بچہ پیدا ہوا، اس نے دگنی مقدار میں بھنگ پی اور گھمنڈ سے جیسے اس کا سینہ تن گیا اور انگلیاں بار بار مونچھوں پر پڑنے لگیں۔ بچہ کیسا ہوگا؟ اسی کا سا؟ کیسے دیکھیں؟ اس کا دل مسوس کر رہ گیا۔

تیسرے دن روپا کھیت میں اس سے ملی تو اس نے پوچھا۔ ''روپیا تو نے سلیا کا لڑکا دیکھا؟''

روپیا بولی ''دیکھا کیوں نہیں؟ لال لال ہے، کھوب (خوب) موٹا، بڑی بڑی آنکھیں ہیں ہر میں جھرالے بال ہیں، ٹکر ٹکر تاکتا ہے۔''

ماتا دین کے دل میں جیسے وہ لڑکا ابیٹھا تھا اور ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا۔ اس نے اس بچی کو گود میں اٹھالیا، پھر کندھے پر بٹھالیا اور پھر کندھے سے اتار کر اس کے گالوں کو چم لیا۔

روپا بال سنبھالتی ہوئی ڈھیٹ ہو کر بولی۔ ''طلو، میں تم کو دور سے دکھا دوں۔ دالان ہی میں تو ہے۔ سلا بہن نہ جانے کیوں ہر دم روتی رہتی ہے۔''

ماتا دین نے منہ پھیر لیا۔ اس کی آنکھیں پر نم ہو گئی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

اس رات کو جب سارا گاؤں سو گیا اور پیڑ تاریکی میں سما گئے تو وہ سلیا کے دروازے پر آیا اور پوری توجہ سے بچے کا رونا سنا جس میں ساری دنیا کی موسیقیت مسرت اور حلاوت بھری ہوئی تھی۔

سلیا بچے کو ہوری کے مکان میں کھٹولے پر سلا کر مزدوری کرنے چلی جاتی تو

ماتا دین کسی نہ کسی بہانے سے ہوری کے گھر آتا اور کنکھیوں سے بچے کو دیکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتا۔

دھنیا مسکرا کر کہتی۔ ''لجاتے کیوں ہو؟ گود میں لے لو، پیار کرو، کیسا کاٹھ کا کلیجہ ہے تمہارا؟ بالکل تم پر پڑا ہے۔''

ماتا دین دو ایک روپے سلیا کے لیے باہر نکالا آتا۔ بچے کے ساتھ اس کی روح میں بھی بالیدگی، شگفتگی اور چمک آ رہی تھی۔ اب اس کی زندگی کا بھی ایک ہی مقصد تھا، ایک ہی عہد تھا۔ اس میں باقاعدگی آ گئی، سنجیدگی آ گئی، ذمہ داری آ گئی۔

ایک دن رامو کھٹولے پر لیٹا ہوا تھا۔ دھنیا کہیں گئی تھی۔ روپا بھی لڑکوں کا شور وغل سن کر کھیلنے چلی گئی تھی۔ گھر سونا تھا۔ اسی وقت ماتا دین پہنچا۔ بچہ نیلے آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھینک رہا تھا، ہمک رہا تھا۔ زندگی کی اس خوشی کے ساتھ جو ابھی اس میں تازہ تھی۔ ماتا دین کو دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ ماتا دین محبت سے بے چین ہو گیا۔ اس نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اس کا دل اور سارا بدن خوشی سے کانپ اٹھا، گویا پانی کی لہروں میں نور کی شعاعیں کانپ رہی ہوں۔ بچہ کی گہری، صاف، اتھاہ خوشی بھری آنکھوں میں گویا وہ نگاہیں اس کے دل میں کھبی جاتی ہوں، وہ کتنا ناپاک ہے، ایشور کی اس دین کو کیسے چھو سکتا ہے؟ اس نے بچے کو خوب بھرے دل کے ساتھ پھر لٹا دیا۔ اسی وقت روپا باہر سے آ گئی اور وہ باہر نکل گیا۔

ایک دن خوب اولے پڑے۔ سلیا گھاس لے کر بازار گئی ہوئی تھی اور روپا اپنے کھیل میں مگن تھی۔ رامو نے آنگن میں بنولے بچے دیکھے تو سمجھا کہ بتاشے

پھیلے ہوئے ہیں۔ کئی بنولے اٹھا کر کھائے اور آنگن میں خوب کھیلا۔ رات کو اسے بخار آ گیا اور دوسرے دن نمونیا ہو گیا اور تیسرے دن شام کو سلیا کی گود میں بچے کی روح پرواز کر گئی۔

لیکن بچہ مر کر بھی سلیا کی زندگی کا مرکز بنا رہا۔ اس کے سینے میں دودھ کا ابال سا آتا اور آنچل تر ہو جاتا۔ اسی وقت آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو جاتے۔ پہلے سب کاموں سے فراغت پا کر رات کو جب وہ رامو کو سینے سے لگا کر اس کے منہ میں دودھ ڈالتی تو گویا اس کا دل بچے کی تازگی سے بھر جاتا۔ تب وہ پیارے پیارے گیت گاتی اور میٹھے میٹھے سپنے دیکھی اور نئی نئی دنیا بناتی جس کا راجہ رامو ہوتا۔ اب سب کاموں سے فرصت پا کر وہ اپنی سونی جھونپڑی میں روتی اور اس کی روح تڑپتی رہتی تھی۔ اڑ جانے کے لیے اس لوک میں جہاں اس کی گودی کا لال اس وقت بھی کھیل رہا ہو گا، اس کے غم میں کل گاؤں شریک تھا۔ رامو کتنا چلبلا تھا، جو بلاتا، اسی کی گود میں چلا جاتا۔ مر کر اور پہنچ سے باہر ہو کر اب اور بھی عزیز ہو گیا تھا۔ اس کا عکس اسے کہیں زیادہ سندر، چلبلا اور لبھاؤنا تھا۔

ماتا دین اس دن کھل پڑا۔ پردہ ہوتا ہے ہوا کے لیے۔ آندھی میں پردے اٹھا کر رکھ دیئے جاتے ہیں کہ آندھی کے ساتھ اڑ نہ جائیں۔ اس نے لاش کو دونوں ہتھیلیوں پر اٹھا لیا اور تنہا ندی کے کنارے تک لے گیا جو ایک میل کا پٹ چھوڑ کر ایک پتلی سی دھار میں سما گئی تھی۔ آٹھ روز تک اس کے ہاتھ سیدھے نہ ہو سکے۔ اس دن وہ ذرا بھی نہ شرمایا، ذرا بھی نہ جھجکا۔

اور کسی نے کٹھ کہا بھی نہیں بلکہ سب نے اس کی ہمت اور استقلال کی تعریف

کی۔

ہوری نے کہا۔ ''یہی مرد کا دھرم ہے۔ جس کی بانہہ پکڑی، اسے کیا چھوڑنا۔''

دھنیا نے آنکھیں نچا کر کہا۔ ''مت بکھان کرو، جی جلتا ہے وہ مرد ہے؟ میں تو ایسے مرد کو نامرد کہتی ہوں۔ جب بانہہ پکڑی، تب کیا دودھ پیتا تھا کہ سلیا باہمنی ہوگئی تھی؟''

ایک مہینہ بیت گیا۔ سلیا پھر مزدوری کرنے لگی تھی۔ شام ہوگئی تھی۔ پورنماشی کا چاند ہنستا ہوا سا نکل آیا۔ سلیا نے کٹے ہوئے کھیت میں سے گرے ہوئے جو کے خوشے چن کر ٹوکری میں رکھ لیے تھے اور گھر جانا چاہتی تھی کہ چاند پر نظر پڑ گئی اور درد بھری یاد کا جیسے سوتھ سا کھل گیا۔ آنچل دودھ سے بھیگ گیا اور چہرہ آنسوؤں سے۔ اس نے سر جھکا لیا اور گویا رونے کا لطف اٹھانے لگی۔

دفعتاً کسی کی آہٹ پا کر چونک پڑی۔ ماتا دین پیچھے سے آ کر سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''کب تک روئے جائے گی سلیا؟ رونے سے وہ پھر تو نہ آ جائے گا۔''

اور یہ کہتے کہتے وہ خود رو پڑا۔

سلیا کہ منہ میں آئے ہوئے شکوے کے الفاظ پگھل گئے اور آواز سنبھال کر بولی۔ ''تم آج ادھر کیسے آ گئے؟''

ماتا دین نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ ''ادھر سے جا رہا تھا، تجھے بیٹھے دیکھا تو چلا آیا۔''

''تم تو اسے کھلا بھی نہ پائے۔''

''نہیں سلیا! ایک دن کھلا آیا تھا۔''

''سچ؟''

''سچ!''

''میں کہاں تھی؟''

''تو ہاٹ گئی تھی۔''

''تمہاری گود میں رویا نہیں؟''

''نہیں سلیا ہنستا تھا۔''

''سچ؟''

''سچ!''

''بس ایک ہی دن کھلایا؟''

''ہاں، ایک ہی دن۔ مگر دیکھنت آتا تھا۔ اسے کھٹولے پر کھیلتے دیکھتا تھا اور دل تھام کر چلا جاتا تھا۔''

''تم ہی پر پڑا تھا۔''

''مجھے تو پچھتاوا ہوتا ہے کہ ناحک (ناحق) اس دن اسے گود میں لیا۔ یہ میرے پاپوں کا ڈنڈ ہے۔''

سلیا کی آنکھوں میں عفو جھلک رہا تھا۔ اس نے ٹوکری سر پر رکھ لی اور گھر چلی۔ ماتا دین بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔

سلیا نے کہا۔ ''میں تو اب دھنیا کا کی کے بروٹھے میں سوتے ہوں، اپنے گھر میں اچھا نہیں لگتا۔''

''دھنیا مجھے برابر سمجھاتی رہتی تھی۔''

''سچ؟''

''ہاں، سچ! جب ماتی تھی سمجھانے لگتی تھی۔''

گاؤں کے قریب جا کر سلیا نے کہا۔ ''اچھا، اب ادھر سے اپنے گھر چلے جاؤ، کہیں پنڈت دیکھ نہ لیں۔''

ماتا دین نے گردن اٹھا کر کہا۔ ''میں اب کسی سے نہیں ڈرتا۔''

''گھر سے نکال دیں گے تو کہاں جاؤ گے؟''

''میں نے اپنا گھر بنالیا ہے۔''

''سچ؟''

''ہاں، سچ۔''

''کہاں؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔''

''چل تو، دکھاتا ہوں۔''

دونوں اور آگے بڑھے۔ ماتا دین آگے تھا اور سلیا پیچھے۔ ہوری کا گھر آ گیا۔ ماتا دین اسی کے پچھواڑے جا کر سلیا کی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور بولا ''یہی میرا گھر ہے۔''

سلیا نے بے اعتباری، عفو، طنز اور درد سے بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ تو سلیا چمارن کا گھر ہے۔''

ماتا دین نے دروازے کی ٹٹی کھولتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری دیوی کا مندر ہے۔''

سلیا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بولی ''مندر ہے تو ایک لوٹا پانی انڈیل کر چلے جاؤ گے۔''

ماتا دین نے اس کے سر کی ٹوکری اتارتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ نہیں سلیا، جب تک جان ہے تیری سرن (پناہ) میں رہوں گا اور تیری ہی پوجا کروں گا۔

''جھوٹ کہتے ہو۔''

''نہیں، تیرے چرن چھو کر کہتا ہوں، سنا کہ پٹواری کا لونڈا بھنسیری تیرے پیچھے بہت پڑا تھا۔ تو نے اسے کھوب (خوب) ڈانٹا۔''

''تم سے کس نے کہا؟''

''بھنسیری آپ ہی کہتا تھا۔''

''سچ؟''

''ہاں سچ!''

سلیا نے دیا سلائی سے کپی جلائی۔ ایک طرف مٹی کا گھڑا تھا اور دوسری طرف چولہا، جہاں دو تین پتیلی اور لوہے کے برتن صاف کئے ہوئے رکھتے تھے۔ درمیان میں پوال بچھا ہوا تھا۔ وہ سلیا کا بستر تھا اس بستر کے سرہانے رامو کا چھوٹا سا کھٹولا پڑا ہوا گویا رو رہا تھا اور اسی کے پاس دو تین مٹی کے ہاتھی گھوڑے ٹوٹی ہوئی حالت میں پڑے تھے۔ جب مالک ہی نہ رہا تو کون ان کو دیکھ بھال کرتا؟ ماتا دین پوال پر بیٹھ گیا۔ دل میں ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ خوب روئے۔

سلیا نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ''تمہیں کبھی میری یاد آئی تھی؟''

ماتا دین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا تو ہر دم میری آنکھوں میں پھرتی رہتی تھی۔ تو بھی کبھی مجھے یاد کرتی تھی؟

''میرا تو تم سے جی جلتا تھا۔''

''اور دیا نہیں آتی تھی؟''

''کبھی نہیں۔''

''تو بھنسیری.....''

''اچھا گالی مت دو۔ میں ڈر رہی ہوں کہ گاؤں والے کیا کہیں گے۔''

''جو بھلے آدمی ہیں وہ کہیں گے کہ یہی اس کا دھرم ہے۔ جو برے ہیں ان کی میں پروا نہیں کرتا۔''

''اور تمہارا کھانا کون پکائے گا؟''

''میری رانی سلیا۔''

''تو باہمن کیسے رہو گے؟''

''میں باہمن نہیں، چمار ہی رہنا چاہتا ہوں۔ جو اپنا دھرم پالے وہی باہمن ہے، جو دھرم سے منہ موڑے وہی چمار ہے۔''

سلیا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

(35)

ہوری کی حالت روز بروز ابتر ہی ہوتی جا رہی تھی۔ زندگی کی جدوجہد میں اسے ہمیشہ شکست ملی، مگر اس نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ ہر شکست نے گویا اسے قسمت سے لڑنے کی طاقت دے دی تھی، مگر وہ اس آخری حالت میں پہنچ گیا تھا جب اس میں خود اعتمادی بھی نہ رہ گئی تھی۔ اگر وہ اپنے دھرم پر اٹل رہ سکتا تو بھی اشک شوئی ہو جاتی۔ مگر یہ بات نہ تھی۔ اس نے نیت بھی بگاڑی، ادھر بھی کمایا، کوئی

ایسی برائی نہ تھی جس میں نہ پڑا ہو، پھر بھی زندگی کی کوئی خواہش پوری نہ ہوئی اور اچھے دن سراب کی طرح دور ہی ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اب اسے دھوکا بھی نہ رہ گیا تھا۔ جھوٹی امید کی ہریالی اور چمک بھی اب نہ دکھائی دیتی تھی۔ ہارے ہوئے راجہ کی طرح اس نے خود کو اس تین بیگھے کھیت کے قلعے میں بند کر دیا تھا اور اسے جان کی طرح بچا رہا تھا۔ فاقے کیے، بدنام ہوا، مزدوری کی، مگر قلعے کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مگر اب وہ قلعہ بھی قبضہ سے نکلا جاتا تھا۔ تین سال سے لگان باقی پڑا ہوا تھا اور اب پنڈت انوکھے رام نے اس پر بیدخلی دائر کر دی تھی۔ کہیں سے روپے ملنے کی امید نہ تھی۔ زمین اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی اور اس کی بقیہ زندگی مزدوری میں کٹے گی۔ بھگوان کی اچھا! رائے صاحب کو کیوں دوکھ دے۔ اسامیوں ہی سے ان کا بھی گجر (گزر) ہے۔ اسی گاؤں پر آدھے سے ادھک گھروں پر بگید کھلی (بیدخلی) آ رہی ہے۔ آوے۔ اوروں کی جو دسا ہوگی، وہی اس کی بھی ہوگی۔ بھاگ میں سکھ مدا ہوتا تو لڑکا کیوں ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جاتا؟

شام ہو گئی تھی۔ وہ اسی فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ پنڈت داتا دین نے آ کر کہا۔ ''کیا ہوا ہوری تمہاری بید کھلی کا؟ ان دنوں انوکھے رام سے میری بول چال بند ہے۔ کچھ پتہ نہیں۔ سنا کہ تاریکھ (تاریخ) کے پندرہ دن اور رہ گئے ہیں۔''

ہوری نے ان کے لیے کھاٹ ڈال کر کہا۔ وہ مالک ہیں، جو چاہیں سو کریں۔ میرے پاس روپیہ ہوتا تو یہ درگت کیوں ہوتی؟ کھایا نہیں، اڑایا نہیں پر اچ ہی نہ ہو، اور جو ہونہار وہ کوڑی مول جائے، تو کسان کیا کرے؟

''مگر دھرتی بچانا ہی پڑے گی۔ نباہ کیسے ہوگا؟ باپ دادوں کی اتنی ہی نسانی تو

باقی ہے۔وہ نکل گئی تو کہاں رہو گے؟''

''بھگوان کی مرجی (مرضی) ہے،میرے کیا بس ہے؟''

''ایک اپائے ہے جو تم کرو۔''

ہوری کو جیسے جان سی مل گئی۔اس کے پاؤں پڑ کر بولا۔''بڑا دھرم ہو گا مہراج تمہارے سوا میرا کون ہے؟ میں تو نراس ہو گیا تھا۔''

''نراس ہونے کی کوئی بات نہیں۔بس اتنا ہی سمجھ لو کہ سکھ میں آدمی کا دھرم کچھ اور ہوتا ہے، دکھ میں کچھ اور۔سکھ میں آدمی دان دیتا ہے پر دکھ میں بھیک تک مانگتا ہے۔تب آدمی کا یہی دھرم ہو جاتا ہے۔چولا اچھا رہتا ہے تو ہما سنان پوجا کیے بنا منہ میں پانی بھی نہیں ڈالتے، پر بیمار ہو جاتے ہیں، اس سمے کا یہی دھرم ہے اور کھاٹ پر بیٹھے ہوئے کھا لیتے ہیں۔اس سمے کا یہی دھرم ہے۔یہاں ہم میں تم میں کتنا پھرک (فرق) ہے۔مگر جگناتھ پوری میں ایسی کوئی بات نہیں۔اونچے نیچے سبھی ایک پنگت (قطار) میں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔برے دنوں میں رام چندر جی نے سبوری کے جوٹھے بیر کھائے تھے اور بال کو چھپ کر مارا تھا۔جب سنگت میں بڑے بڑے لوگوں کی مریادٹوٹ جاتی ہے تو ہماری تمہاری کون چلاوے؟ رام سیوک مہتو کو تو جانتے ہو نا؟''

''ہوری نے بے دلی سے کہا۔''ہاں جانتا کیوں نہیں؟''

''میرا اجمان بڑا اچھا جمانہ (زمانہ) ہے اس کا۔کھیتی باڑی الگ، لین دین الگ، ایسے رعب داب کا آدمی ہی نہیں دیکھا۔کئی مہینے ہوئے کہ اس کی عورت مر گئی۔اولاد کوئی نہیں ہے۔اگر روپا کا بیاہ اس سے کرنا چاہو تو میں اسے راجی

(راضی) کرلوں۔میری بات وہ کبھی نہ ٹالے گا۔لڑکی سیانی ہوگئی ہے اور بکھت (وقت) برا ہے۔کہیں کوئی بات ہو جائے تو منہ میں کالکھ لگے۔یہ بڑا اچھا موکا (موقع) ہے۔لڑکی کا بیاہ ہو جائے گا اور تمہارے کھیت بھی بچ جائیں گے۔بیاہ کے کھرچ (خرچ) سے بچے جاتے ہو۔''

رام سیوک ہوری سے دو ہی چار برس چھوٹا تھا۔ایسے آدمی سے روپا کے بیاہ کرنے کی تجویز ہی ہتک آمیز تھی۔کہاں پھول سی روپا اور کہاں وہ بوڑھا ٹھونٹھ۔ زندگی میں ہوری نے بڑی بڑی چوٹیں سہی تھیں مگر یہ چوٹ سب سے گہری تھی۔ آج اس کے ایسے دن آ گئے ہیں کہ اس سے لڑکی بیچنے کی بات کہی جاتی ہے۔اس میں انکار کرنے کی ہمت نہیں ہے۔رنج سے اس کا سر جھک گیا۔

داتا دین نے ایک منٹ کے بعد پوچھا تو کیا کہتے ہو؟

ہوری نے صاف جواب نہ دیا۔بولا ''سوچ کر کہوں گا۔''

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟''

''دھنیا سے بھی تو پوچھ لوں۔''

''تم راجی (راضی) ہو کہ نہیں؟''

''تنک سوچ لینے دو مہراج۔آج تک گھرانے میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔اس کی مریاد بھی تو رکھنی ہے۔''

''پانچ چھ دن کے اندر مجھے جواب دے دیا۔ایسا نہ ہو کہ تم سوچتے ہی رہو اور بے دکھلی ہو جائے۔''

داتا دین چلے گئے۔ہوری کی طرف انہیں کوئی اندیشہ نہ تھا۔اندیشہ تھا دھنیا کی

طرف سے۔ اس کی ناک بڑی لمبی ہے ۔ چاہے آپ مٹ جائے، مریاد نہ چھوڑے گی۔ مگر ہوری ہاں کرلے تو وہ بھی رو دھو کر مان ہی جائے گی۔ کھیتوں کہ نکل جانے میں بھی تو مریاد بگڑتی ہے۔

دھنیا نے آکر پوچھا۔ ''پنڈت کیوں آئے تھے؟''

''کچھ نہیں، بے دکھلی کی بات چیت تھی۔''

''آنسو پوچھنے آئے ہوں گے، یہ تو نہ ہوگا کہ سو روپے ادھار دیں۔''

''مانگنے کا منہ بھی تو نہیں ہے۔''

''تو یہاں آتے ہی کیوں ہیں؟''

''روپیا کی۔گائی کی بات بھی تھی۔''

''کس سے؟''

''رام سیوک کو جانتی ہے؟ ان ہی سے۔''

''میں نے انہیں کب دیکھا؟ ہاں نام بہت دن سے سنتی ہوں۔ وہ تو بوڑھا ہو گا؟''

''بوڑھا نہیں ہے، ہاں ادھیڑ ہے۔''

''تم نے پنڈت کو پھٹکارا نہیں، مجھ سے کہتے تو ایسا جواب دیتی کہ یاد کرتے۔''

''پھٹکارا نہیں، مگر انکار کر دیا۔ کہتے تھے کہ بیاہ بھی بنا کھرچ ہو جائے گا اور کھیت بھی بچ جائیں گے۔''

کھل کے کیوں نہیں کہتے کہ لڑکی بیچنے کو کہتے تھے۔ کیسے اس بوڑھے کی ہمت

پڑی۔

لیکن ہوری اس مسئلے پر جتنا غور کرتا تھا، اتنی ہی اس کی ہٹ کمزور ہوتی جاتی تھی۔ مریادکی لاج اسے کچھ کم نہ تھی، لیکن جس مریض کا عارضہ مہلک ہو گیا، وہ کھانے پینے کا پرہیز کی پروا کب کرتا ہے؟ داتا دین کے سامنے ہوری نے کچھ ایسے طرز کا اظہار کیا تھا جسے منظوری نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مگر اندر سیوہ پگھل گیا تھا۔ عمر کی کوئی ایسی بات نہیں۔ مرنا جینا بھاگ کے ہاتھ ہے۔ بوڑھے بیٹھے رہتے ہیں، جوان چلے جاتے ہیں۔ روپا کے بھاگ میں سکھ لکھا ہے تو وہاں بھی سکھ اٹھاوے گی اور دکھ لکھا ہے تو کہیں بھی دکھ اٹھاوے گی۔ کہیں بھی سوکھ نہیں پا سکتی۔ اور لڑکی بیچنے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ہوری اس سے جو کچھ لے گا۔ ادھار لے گا اور ہاتھ میں روپیہ آتے ہی ادا کرے گا۔ اس میں شرم یا ہتک کی کوئی بات نہیں۔ ہاں اس میں سائی ہوتی تو وہ روپا کا بیاہ کسی جوان لڑکے سے اور اونچے گھرانے میں کرتا، جہیز بھی دیتا اور برات کے کھلانے پلانے میں دل کھول کر خرچ بھی کرتا۔ مگر جب ایشور نے اسے اس لائق نہیں بنایا تو کسا کنیا دینے کے سوا وہ اور کیا کر سکتا ہے؟ لوگ ہنسیں گے، مگر جو لوگ صرف ہنستے ہیں اور کوئی مدد نہیں کرتے ان کی ہنسی کی وہ کیوں پروا کرے؟ مشکل یہی ہے کہ دھنیا نہ مانے گی۔ گدھی تو ہے ہی! وہی پرانی لاج لیے بیٹھی رہے گی۔ یہ گھرانے کی مریادنبا ہنے کا سمے نہیں ہے۔ اپنی جان بچانے کا سمے ہے۔ ایسی ہی بڑی لاج مریادوالی ہے تو لائے پانچ سو روپے، نکالے کہاں دھرے ہیں؟

دو دن گزر گئے اور اس کے متعلق دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ ہاں،

دونوں اشارتاً گفتگو کرتے رہتے تھے۔

''دھنیا کہتی ہر اور کنیا جوڑ کے ہوں تبھی بیاہ کا سکھ ہے۔''

ہوری جواب دیتا۔''بیاہ سکھ کا نام نہیں ہے پگلی، یہ تو تپسیا ہے۔''

''چلو، تپسیا ہے۔''

''ہاں، میں کہتا جو ہوں، جو ہوں بھگوان آدمی کو جس دسا میں ڈال دیں اس میں سکھی رہنا تپسیا نہیں تو اور کیا ہے؟''

دوسرے دن دھنیا نے ازدواجی مسرت کا دوسرا پہلو سوچ نکالا۔گھر میں جب تک ساس سسر، دیورانیاں، جٹھانیاں نہ ہوں تب تک سسرال کا سکھ ہی کیا؟ کچھ دن تو لڑکی بہو بننے کا سکھ پائے۔''

ہوری نے کہا۔''یہ بیاہ کا سکھ نہیں ہے، دکھ ہے؟''

دھنیا بگڑ اٹھی۔''تمہاری باتیں بھی نرالی ہوتی ہیں۔ اکیلی بہو گھر میں کیسے رہے گی؟ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔''

ہوری بولا تو اس گھر میں آئی تو ایک نہیں دو دو دیور تھے، ساس تھی، سسر تھا۔ تو نے کونسا سکھ اٹھالیا؟ بتا؟

کیا سبھی گھروں میں ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں؟

''اور نہیں تو کیا، آسمان کی دیویاں آجاتی ہیں؟ اکیلی تو بہو اور اس پر حکم چلانے والا سارا گھر، بے چاری کس کس کا کہنا کرے، جس کا حکم نہ مانے وہی بیری، سب سے بھلا اکیلا۔''

پھر بھی بات یہیں تک رہ گئی، مگر دھنیا کا پلڑا ہلکا ہوتا جاتا تھا۔ چوتھے دن رام

سیوک مہتو خود آ پہنچے۔ کلاں راس گھوڑے پر سوار، ساتھ میں ایک نائی اور خدمتگار لیے، جیسے کوئی بڑا زمیندار ہو۔ عمر چالیس سے اوپر تھی اور بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ مگر چہرے پر رونق تھی اور بدن مضبوط تھا۔ ہوری ان کے سامنے بالکل بوڑھا لگتا تھا۔ کسی مقدمے کی پیروی کرنے جا رہے تھے۔ یہاں ذرا دو پہر گزارنا چاہتے تھے۔ دھوپ کتنی تیز ہے اور لو کتنے زوروں کی چل رہی ہے۔ ہوری دلاری کی دکان سے گیہوں کا آٹا اور گھی لایا۔ پوریاں بنیں، تینوں مہمانوں نے کھایا۔ داتا دین بھی دعا دینے آ پہنچے تھے۔ باتیں ہونے لگیں۔

داتا دین نے پوچھا۔ ''کیسا مکدمہ (مقدمہ) ہے مہتو؟''

رام سیوک نے شان جماتے ہوئے کہا ''مکدمہ (مقدمہ) تو ایک نہ ایک لگا ہی رہتا ہے، مہراج! دنیا میں گئو بننے سے کام نہیں چلتا۔ جتنا دبتے جاؤ اتنا ہی لوگ دباتے ہیں۔ تھانہ پولیس، کچہری، عدالت، سب ہی ہماری رکشا (حفاظت) کے لیے ہے مگر رکشا کوئی نہیں کرتا۔ ہر جگہ لوٹ رہے ہیں۔ جو گریب (غریب) ہے لاچار ہے۔ اس کی گردن کاٹنے کے لیے سبھی تیار رہتے ہیں۔ بھگون نہ کرے کوئی بے ایمانی کرے۔ یہ بڑا پاپ ہے۔ پر اپنے حک (حق) اور نیاؤ کے لیے نہ لڑنا اس سے بھی بڑا پاپ ہے۔ تم ہی سوچو کہ آدمی کہاں تک دبے۔ یہاں تو جو کسان ہے وہ سب کا ملائم چارا ہے۔ پٹواری کو نجر (نذر) اور دستوری نہ دیں تو گاؤں میں رہنا کٹھن، جمیندار (زمیندار) کے چپراسیوں اور کارندوں کا پیٹ نہ بھرے تو نباہ نہیں۔ تھانیدار کانسٹیبل تو جیسے اس کے داماد ہی ہیں۔ جب ان کا دورا گاؤں میں ہو جائے تو کسانوں کا دھرم ہے کہ وہ ان کی ہر طرح سے آؤ بھگت کریں، نہیں تو

ایک رپٹ میں گاؤں کا گاؤں بندھ جائے۔ کبھی کانونگو (قانون گو) کبھی تھیلدار (تحصیلدار) کبھی ڈپٹی، کبھی جنٹ، کبھی کلٹر (کلکٹر) کبھی کپتان آتے ہی رہتے ہیں اور کسان کو ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا رہنا چاہیئے۔ ان کے لیے رسد چارا، انڈا مرغی، دودھ گھی کا بندوبست کرنا چاہیے۔ تم پر بھی تو وہی بیت رہی ہے مہراج۔ ایک نہ ایک حاکم نت نئے بڑھتے جاتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کنوؤں میں دوائی ڈالنے کے لیے آنے لگا ہے۔ ایک دوسرا ڈاکٹر کبھی کبھی آ کر ڈھوروں (مویشی) کو دیکھتا ہے۔ لڑکوں کا امتحان لینے والا انسپکٹر (انسپکٹر) ہے اور نہ جانے کون کون اپسر (افسر) ہیں۔ نہر کے الگ، جنگل کے الگ، سراب تاڑی کے الگ، گاؤں سدھار کے الگ، کھیتی کے الگ، کہاں تک گناؤں؟ پادری آجاتا ہے تو اسے بھی رسد دینا پڑتا ہے اور جو کہو کہ اتنے محکموں اور اتنے اپسروں سے کسان کا کچھ بھلا ہوتا ہے تو نام کو نہیں۔ ابھی زمیندار (زمیندار) نے گاؤں میں ہل پیچھے دو دو روپیہ چندا لگایا۔ کسی بڑے اپسر کی دعوت کی تھی۔ کسانوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ بس اسی نے گاؤں بھر پر جاپھا (اضافہ) کر دیا۔ حکم بھی زمیندار کا پچھ (طرفداری) کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ کسان بھی آدمی ہے۔ اس کے بھی بال بچے ہیں، اس کی بھی اجت (عزت) آبرو ہے۔ اور یہ سب ہمارے دبو پن کا نتیجہ ہے۔ میں نے گاؤں بھر میں ڈھول بجوا دی کہ کوئی بیسی لگان نہ دو اور نہ کھیت چھوڑو۔ ہم کو کوئی کائل (قائل) کر دے تو ہم بیسی دینے کو تیار ہیں، پر جو تم چاہو کہ بے منہ کے کسانوں کو پیس کر پی جائیں تو یہ نہ ہوگا گاؤں والوں نے میری بات مان لی اور سب نے بیسی دینے سے انکار کر دیا۔ زمیندار نے دیکھا کہ سارا گا ایک ہو گیا ہے تو

لاچار ہو گیا کھیت بید کھل (بید خل) بھی کر دے تو جوتے کون؟ آج کل جب تک کڑے نہ پڑو کوئی نہیں سنتا۔ روئے بنا تو لڑکا بھی ماں سے دودھ نہیں پاتا۔''

رام سیوک تیسرے پہر چلا گیا مگر دھنیا اور ہوری پر ایک نہ مٹنے والا اثر چھوڑ گیا۔ داتا دین کا جادو چل گیا انہوں نے پوچھا۔ ''اب کیا کہتے ہو ہوری؟''

ہوری نے دھنیا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اس سے پوچھو۔''

''تم دونوں سے پوچھتے ہیں۔''

دھنیا بولی۔ ''عمر تو ادھک ہے پر تم لوگوں کی رائے ہے کہ مجھے بھی منجور (منظور) ہے۔ بھاگ میں جو لکھا ہو گا وہ تو آگے آوے ہی گا، پر آدمی اچھا ہے۔''

اور ہوری کو رام سیوک پر ویسا بھروسہ ہو گیا تھا جیسا کمزور کو طاقتور پر ہوتا ہے۔ وہ شیخ چلی کے سے منصوبے باندھنے لگا تھا۔ ایسا آدمی اس کا ہاتھ پکڑ لے تو بیڑا پار ہے۔

بیاہ کا مہورت ٹھیک ہو گیا۔ گوبر کو بھی بلانا ہو گا۔ لکھنا چاہیے۔ پھر آنا آنا، اس کے من کی بات ہے۔ یہ کہنے کو تو منہ رہے کہ مجھے بلایا کب تھا۔ سونا کو بھی بلانا ہو گا۔

دھنیا نے کہا۔ ''گوبر تو ایسا نہیں تھا مگر جب جھنیا آنے دے۔ پردیس جا کر ایسا بھول گیا کہ نہ چٹھی نہ پتری۔ نہ جانے کیسے ہے۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

گوبر کو خط ملا تو چلنے کو تیار ہو گیا۔ جھنیا کو جانا اچھا تو نہ لگتا تھا مگر اس موقع پر کچھ کہہ نہ سکی۔ بہن کے بیاہ میں بھائی کا نہ جانا کیسے ممکن ہے۔ سونا ہی کے بیاہ میں نہ

جانے کا کلنک کیا کم ہے۔

گوبر بھرے ہوئے گلے سے بولا۔ ''ماں باپ سے کھنچے رہنا کوئی اچھا کام نہیں۔ اب ہمارے ہاتھ پاؤں ہیں تو ان سے کھنچیں، چاہے لڑیں، مگر جنم تو انہوں نے دیا، پال پوس کر جوان تو انہوں ہی نہ کیا، اب وہ ہمیں چار بات بھی کہیں تو گم (غم) کھانا چاہیے۔ ادھر مجھے بار بار اماں دادا کی یاد آیا کرتی ہے۔ اس سے مجھے نہ جانے کیوں ان پر گسہ (غصہ) آ گیا تھا۔ تیرے کارن ماں باپ کو بھی چھوڑنا پڑا۔''

جھنیا بگڑ اٹھی۔ ''مجھ پہ پاپ نہ لگاؤ، ہاں تم ہی کو لڑنا سوجھا تھا۔ میں تو اماں کے پاس اتنے دن رہی کبھی سانس تک نہ لیا۔''

''لڑائی تیرے کارن ہوئی۔''

''اچھا میرے ہی کارن سہی، میں نے بھی تو تمہارے لیے اپنا گھر چھوڑ دیا۔''

''تیرے گھر کون تجھے پیار کرتا تھا؟ بھائی بگڑتے تھے، بھاوجیں ستاتی تھیں اور بھولا تو تجھے پاتے تو کچا ہی کھا جاتے۔''

''تمہارے ہی کارن۔''

''اب کی جب تک رہیں اس طرح رہیں کہ انہیں بھی جندگانی (زندگانی) کا کچھ سکھ ملے۔ ان کی مرجی (مرضی) کے بنا کوئی کام نہ کریں۔ دادا اتنے اچھے ہیں کہ کبھی مجھے ڈانٹا بھی نہیں۔ اماں نے کئی بار مارا ہے مگر وہ جب مارتی تھیں تب کچھ نہ کچھ کھانے کو بی دے دیتی تھیں۔ مارتی تھیں، پر جب تک مجھے ہنسا نہ لیں انہیں چین نہ آتا تھا۔''

دونوں نے مالتی سے ذکر کیا۔ مالتی نے چھٹی ہی نہیں بلکہ کنیا کی بھینٹ کے لیے ایک چرخہ اور ہاتھ کا کنگن بھی دیا۔ وہ خود جانا چاہتی تھی مگر کئی ایسے مریض اس کے زیر علاج تھے جنہیں ایک دن کے لیے نہ چھوڑ سکتی تھی، ہاں شادی کے دن آنے کا وعدہ کیا اور بچے کے لیے کھلونوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اسے بار بار چومتی اور پیار کرتی تھی۔ گویا سب کچھ پیشگی لینا چاہتی ہے اور بچہ اس کی بالکل پروا نہ کر کے گھر جانے کے لیے خوش تھا، اسی گھر کے لیے جس نے اس کو دیکھا تک نہ تھا۔ اس کے طفلانہ تصور میں گھر بہشت سے بڑھ کر کوئی چیز تھا۔

گوگوبر نے گھر پہنچ کر وہاں کی حالت دیکھی تو ایسی مایوسی ہوئی کہ اسی وقت واپس جائے۔ گھر کا ایک حصہ گرنے کے قریب تھا۔ دروازے پر صرف ایک بیل بندھا ہوا تھا اور وہ بھی ادھ مرا سا۔ دھنیا اور ہوری دونوں خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ مگر گوبر کا جیہ اچاٹ تھا۔ اب اس گھت کے سنبھلنے کیہ کیا امید ہے؟ وہ غلامی کرتا ہے۔ مگر پیٹ بھر کر کھاتا ہے۔ صرف ایک ہی مالک کا نوکر تو ہے یہاں تو جسے دیکھو وہی رعب جماتا ہے۔ غلامی ہے مگر خشک! محنت کر کے اناج پیدا کر کو اور جو روپے ملیں وہ دوسرے کو دے دو اور آپ بیٹھے ہوئے ''رام، رام'' جپو۔ دادا ہی کا کلیجہ ہے کہ یہ سب سہتے ہیں۔ اس سے تو ایک دن نہ سہا جائے اور یہ حالت کچھ ہوری ہی کی نہ تھی۔ سارے گاؤں پر یہی مصیبت تھی۔ ایسا ایک آدمی بھی نہیں جس کی حالت زار نہ ہو، گویا جسم میں جان کے بجائے کلفت ہی بیٹھی ہوئی لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہی تھی۔ چلتے پھرتے تھے، کام کرتے تھے، پستے تھے، صرف اس لیے کہ ایسا ہونا ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ زندگی میں نہ کوئی امید ہے اور نہ

امنگ ۔گویا ان کی زندگی کے سوتے سوکھ گئے ہوں اور ساری ہریالی مرجھا گئی ہو۔ جیٹھ کے دن ہیں، ابھی تک کھلیانوں میں اناج موجود ہے۔مگر کسی کے چہرے پر خوشی نہیں ہے۔ بہت کچھ اناج تو کھلیان ہی میں تل کر مہاجنوں اور کارندوں کی نذر ہو چکا ہے اور جو کچھ بچ رہا ہے وہ بھی دوسروں کا ہے۔مستقبل، تاریکی کی طرح ان کے سامنے ہے جس میں انہیں کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ان کی ساری حیات مردہ ہوگئی ہے۔دروازے پر منوں کوڑا کرکٹ جمع ہے، بدبو اڑ رہی ہے مگر ان کی ناک میں نہ بو ہے اور نہ آنکھوں میں نور۔سر شام سے دوارے پر گیدڑ رونے لگتے ہیں مگر کسی کو غم نہیں۔سامنیی جو کچھ موٹا جھوٹا آجاتا ہے کھا لیتے ہیں، اسی طرح جیسے انجن کوئلہ کھالیتا ہے۔ان کے بیل چنی چوکر کے بغیر ناند میں منہ نہیں ڈالتے مگر انہیں صرف پیٹ میں کچھ ڈالنے کو چاہیے۔ذائقے سے کچھ مطلب نہیں۔ان کی قوت ذائقہ مر چکی ہے۔ان کی زندگی میں اس کا فقدان ہو گیا ہے۔ان سے دھیلے دھیلے کے لیے بے ایمانی کرالو، مٹھی بھر اناج کے لیے لاٹھیاں چلوالو۔پستی کی وہ انتہا ہے جب آدمی عزت وغیرت کو بی بھول جاتا ہے۔

لڑکپن سے گوبر نے گاؤں کی یہی حالت دیکھی تھی اور اس کا عادی ہو چکا تھا، مگر آج چار سال کے بعد اس نے جیسے ایک نئی دنیا دیکھی۔بھلے آدمیوں کے ساتھ رہنے سے اس کی عقل کچھ جاگ اٹھی ہے۔اس نے سیاسی جلسوں میں لیکچر سنے ہیں جو اس کے عضو عضو میں پیوست ہو گئے ہیں۔اس نے سنا ہے اور سمجھا ہے کہ اپنا بھاگ خود بنانا ہوگا، اپنی عقل و ہمت سے ان تکلیفوں پر فتح پانا ہوگا۔کوئی دیوتا، کوئی پوشیدہ طاقت، ان کی مدد کرنے نہ آئے گی۔اس میں احساس آگیا ہے۔اب اس

میں وہ پہلے کا گنوار پن اور گھمنڈ نہیں ہے۔ وہ منکسر مزاج اور مدبر ہو گیا ہے جس حالت میں پڑے ہوئے ہو اسے خود غرضی اور حرص میں مبتلا ہو اور کیوں بگاڑتے ہو؟ غم نے تم کو ایک رشتے میں باندھ دیا ہے۔ اخوت کی اس قدرتی بندش کو کیوں اپنی ہیچ اغراض سے توڑے ڈالتے ہو؟ اس بندش کو اتحاد کی بندش بنالو۔ اس طرح کے خیالات نے اس کی بشریت کو گویا پر لگا دیئے ہیں۔ دنیوی نشیب و فراز دیکھ لینے کے بعد سیدھے سادے لوگوں میں جو فراخدلی آجاتی ہے وہ گویا اب آسمان میں اڑنے کے لیے پروں کو تول رہی ہے۔ ہوری کو جب کوئی کام کرتے دیکھتا ہے تو اسے ہٹا کر خود کرنے لگتا ہے۔ گویا اگلی بدسلوکیوں کا کفارہ کرنا چاہتا ہو۔ کہتا ہے دادا اب تم کوئی چنتا مت کرو۔ سارا بار مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اب ہر مہینے خرچ بھیجوں گا۔ اتنے دن تو مرتے کھپتے رہے، اب کچھ دن تو آرام کرلو۔ مجھ پر لعنت ہے کہ میرے رہتے میں اتنی تکلیف اٹھائی پڑے اور ہوری کے روئیں روئیں سے بیٹے کے لیے دعا نکلتی ہے۔ اسے اپنے کمزور جسم میں قدرتی طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس وقت اپنے فرض کی صراحت کر کے اس کی اٹھتی جوانی پر تفکر اور تردد کی بجلی کیوں گرائے؟ وہ آرام سے کھائے پیے، زندگی کا سکھ اٹھائے۔ مرنے کھپنے کے لیے وہ تیار ہے۔ یہی اس کی زندگی ہے۔ ''رام رام'' جپ کر وہ جی بھی تو نہیں سکتا۔ اسے تو پھاوڑا اور کدال چاہیے۔ رام کے نام کی مالا پھیر کر اس کے دل کو سکون نہ ہوگا۔

گوبر نے کہا ''کہو تو میں سب سے کست (قسط) کروادوں اور ہر مہینے ادا کرتا جاؤں۔ کل ملا کر کتنا ہوگا؟''

ہوری نے سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں بیٹا، تم کاہے کو کشٹ اٹھاؤ گے۔ تم ہی کو کون بہت ملتا ہے۔ میں سب دیکھ لوں گا۔ ایسا سمے تھوڑے رہے گا۔ روپا چلی جاتی ہے۔ اب کرج (قرض) ہی چکانا تو ہے۔ تم کوئی چنتا مت کرنا۔ اچھی طرح کھانا پینا۔ ابھی بدن بنالوگے تو سدا سکھ رہوگے۔ میری کون؟ مجھے تو مرنے کھپنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ابھی تم کو کھیتی میں نہیں جوتنا چاہتا۔ مالک اچھا مل گیا ہے۔ اس کی کچھ دن سیوا کرلوگے تو آدمی بن جاؤگے۔ وہ تو یہاں آچکی ہیں۔ پوری دیوی ہیں۔''

''بیاہ کے دن پھر آنے کو کہا ہے۔''

''ہمارے سر آنکھوں پر آویں۔ ایسے بھلے مانسوں کے ساتھ رہنے میں چاہے پیسے کم ہی ملیں مگر گیان بڑھتا ہے اور آنکھیں کھلتی ہیں۔''

اسی وقت پنڈت داتا دین نے ہوری کو اشارے سے بلایا اور دور لے جا کر کمرے سو سو روپے کے دو نوٹ نکالتے ہوئے بولے۔ ''تم نے میری صلاح مان لی۔ بڑا اچھا کیا۔ دونوں کام بن گئے۔ کنیا سے بھی ارن (سبکدوش) ہو گئے اور باپ داداؤں کی نسانی بھی بچ گئی۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ میں نے تمہارے لیے کر دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔''

ہوری نے روپے لیے تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کا سر اوپر نہ اٹھ سکا۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکلا، گویا ذلت کے اتھاہ سمندر میں گر پڑا ہو اور گرتا چلا جا رہا ہے۔ آج تیس سال تک زندگی سے لڑتے رہنے کے بعد وہ ہار گیا ہے اور ایسا ہارا ہے کہ گویا اسے شہر کے پھاٹک پر کھڑا کر دیا گیا ہے اور جو جاتا ہے وہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ بھائیو! میں رحم کو مستحق ہوں۔ میں نے نہیں جانا کہ جیٹھ کی لو کیسی ہوتی ہے

اور مجاگھ کی برکھا کیسی ہوتی ہے۔ اس بدن کو چیر کر دیکھو کہ اس میں کتنی جان رہ گئی ہے اور وہ کتنی جوٹوں سے چور اور ٹھوکروں سے کچل اہوا ہے۔ اس سے پوچھو، کبھی تو نے آرام کے درشن کیے ہیں، کبھی تو چھاؤں میں بیٹھا ہے؟ اس پر یہ ذلت! اور وہ اب بھی جیتا ہے، نامرد، لالچی، کمینہ! اس کا سارا اعتقاد جو بہت گہرا ہو کر ٹھوس اور اندھا ہو گیا تھا گویا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو۔

داتا دین نے کہا۔ ''تو میں جاتا ہوں۔ نہ ہو۔ تم اپنے انوکھے رام کے پاس چلے جاؤ۔''

ہوری نے عاجزی سے کہا۔ ''چلا جاؤں گا مہراج! مگر میری آبرو تمہارے ہاتھ ہے۔''

(36)

دو دن تک گاؤں میں خوب دھوم دھام رہی۔ باجے بجے، گانا بجانا ہوا اور روپا رو دھو کو رخصت ہو گئی۔ مگر ہوری کو کسی نے گھر سے نکلتے نہ دیکھا۔ ایسا چھپا بیٹھا تھا جیسے منہ میں کالکھ لگی ہو۔ مالتی کے آجانے سے چہل پہل اور بڑھ گئی۔ دوسرے گاؤں کی عورتیں بھی آ گئیں۔

گوبر نے اپنے انس و اخلاق سے سارے گاؤں کو گرویدہ بنا لیا ہے۔ ایسا کوئی گھر نہ تھا جہاں وہ اپنے اچھے سلوک کی یاد نہ چھوڑ آیا ہو۔ بھولا تو اس کے پیروں پر گر پڑے۔ اس کی عورت نے اسے پان دیئے اور ایک روپیہ رخصتانہ دیا اور اس کا لکھنو کا پتہ بھی پوچھا۔ کبھی لکھنو آئے گی تو اس سے ضرور ملے گی۔ اپنے روپے کا اس نے کوئی ذکر نہ کیا۔

تیسرے دن جب گوبر چلنے لگا تو ہوری نے دھنیا کے سامنے آنکھوں میں آنسو بھر کر اس گناہ کا اعتراف کر لیا جو کئی روز سے اس کے دل کو پریشان و پشیمان کر رہا تھا اور رو کر بولا۔ ''بیٹا میں نے اس دھرتی کے موہ سے یہ پاپ کی گٹھری سر پر لادی۔ نہ جانے بھگوان مجھے اس کا کیا ڈنڈ دیں گے۔''

گوبر ذرا بھی ناخوش نہ ہوا۔ کسی طرح کی خفگی اس کے چہرے پر نہ تھی۔ عقیدت سے بولا۔ ''اس میں پاپ کی تو کوئی بات نہیں ہے دادا! ہاں رام سیوک کے روپے ادا کر دینا چاہیے اور تم کرتے کیا؟ میں کسی لائیک (لائق) نہیں، تمہاری کھیتی میں اپج نہیں، ادھار کہیں مل نہیں سکتا، مہینے بھر کے لیے بھی گھر میں اناج نہیں، ایسی حالت میں تم اور کر ہی کیا سکتے تھے؟ کھیت نہ بچاتے تو رہتے کہاں؟ جب آدمی کا کوئی بس نہیں چلتا تو اپنے کو بھاگ ہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ نہ جانے یہ دھاندلی کب تک چلتی رہے گی۔ جسے پیٹ کی روٹی میسر نہیں اس کے لیے آبرو اور مریاد سب ڈھونگ ہے اوروں کی طرح تم نے بھی دوسروں کا گلا دبا دیا ہوتا، ان کا روپیہ مارا ہوتا تو تم بھی بھلے مانس ہوتے۔ تم نے کبھی دھرم کو نہیں چھوڑا، یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو یا تو جہل (جیل) میں ہوتا یا پھانسی پا گیا ہوتا۔ مجھ سے یہ کبھی نہ سہا جاتا کہ میں کما کما کر سب کا گھر بھروں اور آپ اپنے بچوں کے ساتھ منہ میں جالی لگائے بیٹھا رہوں۔''

دھنیا بہو کو اس کے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ ہوئی۔ جھنیا بھی چاہتی تھی کہ ابھی کچھ دن یہیں رہے۔ طے ہوا کہ گوبر اکیلا ہی جائے۔

دوسرے روز علی الصباح گوبر سب سے رخصت ہو کر لکھنو چلا۔ ہوری اسے گاؤں

کے باہر تک بھیجنے گیا۔ گوبر سے اتنی محبت اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ جب گوبر اس کے پیروں پر جھکا تو ہوری رو پڑا جیسے پھر اسے بیٹے کے درشن نہ ہوں گے۔ اس کی آتما میں خوشی تھی، غرور تھا اور عزم تھا۔ بیٹے سے عقیدت اور محبت پا کر اس میں رونق اور بالیدگی آ گئی ہے۔ کئی روز پہلے اس پر جو سستی سی چھا گئی تھی، ایک ایسی تاریکی سی جس میں وہ اپنا راستہ بھول رہا تھا، وہاں اب مستعدی ہے اور روشنی ہے۔

روپا اپنے سسرال میں خوش تھی۔ جس حالت میں اس کا بچپن بیتا تھا اس میں پیسہ سب سے قیمتی تھا۔ دل میں کتنی خواہشیں تھیں جو دل ہی میں گھٹ گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ وہ اب انہیں پورا کر رہی تھی اور رام سیوک ادھیڑ ہو کر بھی جوان ہو گیا تھا۔ روپا کے لیے وہ شوہر تھا۔ اس کے جوان، ادھیڑ یا بوڑھے ہونے سے اس کے نسائی جذبہ میں کوئی فرق نہ آ سکتا تھا۔ یہ جذبہ شوہر کے رنگ روپ یا سن پر منحصر نہ تھا، اس کی بنیاد اس سے بہت گہری تھی۔ اجلے نسلی رواجوں کی تہہ میں، جو صرف کسی زلزلے ہی سے ہل سکتی۔ اس کا شباب اپنے ہی میں مست تھا، وہ اپنے ہی لیے اپنا بناؤ سنگار کرتی تھی اور آپ ہی خوش ہوتی تھی۔ رام سیوک کے لیے اس کا دوسرا روپ تھا۔ تب وہ ترہستن بن جاتی تھی۔ کسی طرح کی خامی کا خیال اس کے دل میں نہ آتا تھا۔ اناج سے بھری ہوئی کھیتیاں اور گاؤں کے سرے تک پھیلی ہوئی کھیتی اور دروازے پر مویشی کی قطاریں، یہ سب اور کسی طرح کے عدم تکمیل والے خیال کو اس کے دل میں نہ آنے دیتی تھی۔

اور اس کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اپنے گھر والوں کو سکھی دیکھا۔ ان کی غریبی کیسے دور کرے؟ اس گائے کی یاد ابھی تک اس کے دل میں تازہ تھی جو مہمان

کی طرح آئی تھی اور سب کو روتا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ یاد اتنے دنوں کے بعد بھی شیریں ہوگئی تھی۔ ابھی اسکا بچپن اس نئے گھر میں نہ قائم ہو پایا تھا۔ وہی پرانا گھر اس کا اپنا گھر تھا۔ وہیں کے لوگ اپنے بیگانے تھے۔ ان ہی کا دکھ اپنا دکھ اور ان ہی کا سکھ اپنا سکھ تھا۔ اس دروازے پر مویشیوں کا ایک جھنڈ دیکھ کر اسے وہ خوشی نہ ہو سکتی تھی جو اپنے دروازے پر ایک گائے دیکھ کر ہوتی۔ اس کے دادا کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی جس دن وہ گائے آئی تھی، انہیں کتنی خوشی ہوئی تھی، جیسے آسمان سے کوئی دیوی آ گئی ہو۔ تب سے پھر انہیں اتنی سائی نہ ہوئی کہ کوئی دوسری گائے آئی تھی، انہیں کتنی خوشی ہوئی تھی، جیسے آسمان سے کوئی دیوی آ گئی ہو۔ تب سے پھر انہیں اتنی سائی نہ ہوئی کہ کوئی دوسری گائے لاتے۔ اب کی وہ جائے گی تو وہ اپنے ساتھ وہ دھوری گائے ضرور لیتی جائے گی۔ نہیں، اپنے نوکر سے کیوں نہ بھجوا دے۔ رام سیوک سے پوچھنے بھر کی دیر تھی۔ منظوری ہوگئی اور دوسرے دن ایک اہیر کی معرفت روپا نے گائے بھیج دی۔ اہیر سے کہا کہ دادا سے کہہ دینا، منگل کے دودھ پینے کے لیے گائے بھیجی ہے۔ ہوری بھی گائے لینے کی فکر میں تھا۔ یوں ابھی اسے گائے لینے کی کوئی عجلت نہ تھی۔ مگر منگل یہیں ہے اور وہ بلا دودھ کے کیسے رہ سکتا ہے؟ روپیہ ملتے ہی وہ سب سے پہلے گائے لے گا۔ منگل اب صرف اس کا پوتا نہیں ہے، صرف گوبر کا بیٹا نہیں ہے بلکہ مالتی دیوی کا کھلونا بھی ہے۔ اس کی پرورش و پرداخت اسی طرح ہونی چاہیے۔

مگر روپے کہاں سے آئیں؟ اتفاقاً اسی روز ایک ٹھیکہ دار نے سنا تو فوراً وہاں جا پہنچا اور آٹھ آنے روز پر کھدائی رکنے لگا۔ اگر یہ کام دو مہینے بھی چل گیا تو اسے

گائے بھر کو روپے مل جائیں گے۔ دن بھر لو اور دھوپ میں کام کرنے کے بعد وہ گھر آتا تو بالکل مرا ہوا تھا، لیکن تکان کا نام نہیں۔ اسی حوصلے سے دوسرے روز پھر کام کرنے جاتا۔ رات کو بھی کھا پی کر کپی کے سامنے بیٹھ جاتا اور سُتلی کاتتا، کہیں بارہ ایک بجے سونے کی نوبت آتی۔ دھنیا بھی پاگل ہو گئی تھی۔ اسے اتنی محنت کرنے سے روکنے کے بدلے وہ خود اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی سُتلی کاتتی۔ گائے تو لینی ہی ہے، رام سیوک کے روپے بھی تو ادا کرنے ہیں۔ گوبر کہہ گیا ہے اسے بڑی فکر ہے۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ دونوں بیٹھے سُتلی کات رہے تھے۔ دھنیا نے کہا تمہیں نیند لگی ہو تو جا کر سو رہو، تڑکے سے پھر تو کام کرنا ہے۔

ہوری نے آسمان کی طرف دیکھا۔ چلا جاؤں گا۔ ابھی تو دس بجے ہوں گے، تو جا، سو رہ!''

''میں تو دوپہر کو تھوڑی دیر سو لیتی ہوں۔''

''میں بھی چبینا پر کر کے پیڑ کے نیچے سو لیتا ہوں۔''

''بڑی لو لگتی ہو گی۔''

''لو، کیا لگے گی، اچھی چھانہہ ہے۔''

''میں ڈرتی ہوں کہ کہیں تم بیمار نہ ہو جاؤ۔''

''چل، بیمار وہ پڑتے ہیں جنہیں بیمار پڑنے کی پھرصت (فرصت) ہوتی ہے۔ یہاں تو یہ دھن ہے کہ اب کی گوبر آوے تو رام سیوک کے آدھے روپے جمع رہیں۔ کچھ وہ بھی لاوے ہی گا۔ بس اس سال اس روپے سے گلا چھوٹ جائے تو

دوسری جندگی (زندگی) ہو۔''

''گوبر کی اب کی بڑی یاد آتی ہے۔ کتنا بھلا بن گیا ہے۔''

''چلے سمے میرے پاؤں پر گر پڑا۔''

''منگل وہاں سے آتا تو کتنا موٹا تھا۔ یہاں آ کر دبلا ہو گیا ہے۔''

''وہاں دودھ، مکھن، کیا نہیں پاتا تھا، یہاں روٹی مل جائے تو بہت ہے۔ ٹھیکہ دار سے روپے ملے اور گائے لایا۔''

گائے تو کبھی کی آ گئی ہوتی، مگر تم جب کہنا مانو۔ اپنی کھیتی تو سنبھالے نہ سنبھلتی تھی، بنیا کا بوجھ بھی اپنے سر پر لا دلیا۔

''کیا کرتا؟ اپنا دھرم بھی تو کچھ ہے۔ ہیرا نے نالائقی (نالائقی) کی تو اس کے بال بچوں کی سنبھالے کرنے والا بھی تو کوئی چاہیے تھا۔ کون تھا میرے سوائے؟ بتا! میں نہ مدد کرتا تو آج کی کیا گت ہوتی، سوچ! اتنا سب کرنے پر بھی منگرو نے اس پر نالس (نالش) کر ہی دی۔''

''روپے گاڑ کر رکھے گی تو نالش نہ ہو گی؟''

''کیا بکتی ہے۔؟ کھیتی سے پیٹ بھر کو ہوتا جائے، یہی بہت ہے۔ گاڑ کر کوئی کیا رکھے گا۔''

''ہیرا تو جیسے سنسار ہی چلا گیا۔''

''میرا من بولتا ہے کہ وہ آوے گا، کبھی نہ کبھی جرور (ضرور)''

دونوں سو گئے۔ ہوری منہ اندھیرے اٹھا تو دیکھا کہ ہیرا سامنے کھڑا ہے، بال بڑھے ہوئے، کپڑے تار تار منہ سوکھا ہوا، بدن میں گوشت اور خون کا نام نہیں،

جیسے قد بھی چھوٹا ہو گیا ہو۔ دوڑ کر ہوری کے پیروں پر گر پڑا۔

ہور نے اسے سینے سے لگا کر کہا۔ ''تم تو بالکل گھل گئے ہیرا! کب آئے، آج تمہاری بار بار یاد آ رہی تھی۔ بیمار ہو گیا؟''

آج اس کی آنکھوں میں وہ ہیرا نہ تھا جس نے اس کی زندگی تلخ کر دی تھی بلکہ وہ ہیرا تھا جو بے ماں باپ کا چھوٹا سا بچہ تھا۔ درمیانی پچیس تیس سال مٹ گئے تھے، ان کا نشان بھی نہ تھا۔

ہیرا نے کچھ جواب نہ دیا۔ کھڑا رو رہا تھا۔

ہوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بھرے گلے سے کہا۔ ''کیوں روتے ہو بھیا؟ آدمی سے بھول چوک ہوتی ہی ہے، کہاں رہے اتنے دن؟''

ہیرا نے بیچارگی سے کہا۔ ''کہاں بتاؤں دادا، بس یہی سمجھ لو کہ تمہارا درسن بدا تھا سو بچ گیا۔ ہنیا سر پر سوار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گئو میرے سامنے کھڑے ہے۔ ہر دم سوتے جاگتے کبھی آنکھوں کی اوٹ نہ ہوئی تھی۔ میں پاگل ہو گیا اور پانچ سال تک پاگل کھانے (پاگل خانے) میں بند رہا۔ آج وہاں سے نکلے چھ مہینے ہوئے۔ مانگتا کھاتا پھرتا رہا۔ یہاں آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ دنیا کو کون منہ دکھاؤں گا؟ آکھر (آخر) جی نہ مانا۔ کلیجہ کڑا کر کے چلا آیا۔ تم نے میرے بال بچوں کو....''

ہوری نے بات کاٹی ''تم ناحک (ناحق) بھاگے۔ ارے، دروگا (داروغہ) کو دس پانچ روپے دے کر معاملہ دبوا دیا جاتا اور ہوتا کیا؟''

''تم سے تو جیتے جی ارن نہ ہوں گا دادا۔''

''میں کوئی گیر (غیر) تھوڑے ہی ہوں بھیا۔''

ہوری خوش تھا۔ زندگی کی ساری تکلیفیں اور ساری مایوسیاں گویا اس کے قدموں پر لوٹ رہی تھیں۔ کون کہتا ہے کہ زندگی کی جدوجہد میں وہ ہارا ہے؟ یہ خوشی، یہ غرور، یہ حوصلہ، کیا ہار کی علامت ہے؟ ایسی ہی شکستوں میں اس کی فتح ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ہتھیار اس کی فتح کے جھنڈے ہیں۔ اس کا سینہ پھول اٹھا ہے اور چہرے پر چمک بھرا ہوتا، اس کی ہانڈی میں ہزار پانسو روپے گڑے ہوتے، لیکن اس سے یہ جنت کی خوشی کیا مل سکتی تھی؟

ہیرا نے اسے سر سے پیر تک دیکھ کر کہا ''تم بھی تو بہت دبلے ہو گئے ہو، دادا!''

ہوری نے ہنس کر کہا ''تو کیا یہ میرے موٹے ہونے کے دن ہیں؟ موٹے وہ ہوتے ہیں جنہیں روپے کی سوچ ہوتی ہے نہ مریادکی۔ اس جگ میں موٹا ہونا بے حیائی ہے۔ سو کو دبلا کر کے ایک موٹا ہوتا ہے۔ ایسے موٹاپے میں کیا سکھ؟ سکھ تو تب ہے کہ سبھی موٹے ہوں۔ سو بھا سے بھینٹ ہوئی؟''

''اس سے تو رات ہی کو بھینٹ ہو گئی تھی۔ تم نے تو اپنے کو بھی پالا اور جو تم سے بیر کرتے تھے ان کو بھی پالا اور اپنی آبرو بنائے بیٹھے ہو۔ اس نے تو کھیتی باڑی سب بیچ باچ ڈالی اور اب بھگوان ہی جانے اس کا نباہ کیسے ہوگا۔''

آج ہوری کھدائی کرنے چلا تو بدن بھاری تھا۔ رات کی تھکن دور نہ ہو پائی تھی مگر اس کے قدم تیز تھے اور چال میں بے پروائی کی اکڑ تھی۔

اج دس ہی بجے سے لو چلنے لگی اور دوپہر ہوتے ہوتے تو آگ برس رہی تھی۔ ہوری کنکر کے ٹوکرے اٹھا اٹھا کر کان سے سڑک پر لاتا تھا اور گاڑی پر لادتا تھا۔

جب دوپہر کی چھٹی ہوئی تو وہ بے دم ہو گیا تھا۔ ایسی تھکن اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں تک نہ اُٹھتے تھے۔ بدن اندر سے جھلسا جا رہا تھا۔ وہ نہ نہایا اور نہ کچھ چبایا۔ اسی تکان میں اپنا انگوچھا بچھا کر ایک پیڑ کے تلے سو رہا۔ مگر پیاس کے مارے گلا سوکھا جاتا ہے۔ خالی پیٹ پانی پینا ٹھیک نہیں۔ اس نے پیاس کو روکنے کی کوشش کی مگر ہر لمحہ اندر کی جلن بڑھتی جاتی تھی۔ اس سے نہ رہا گیا۔ ایک مزدور نے بالٹی بھر کر رکھ لی تھی اور چہ بن چبا رہا تھا۔ ہوری نے اٹھ کر ایک لوٹا پانی خوب کھینچ کر پیا اور پھر جا کر لیٹ رہا۔ مگر آدھ گھنٹے میں اسے قے ہو گئی اور چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔

اس مزدور نے کہا۔ ''کیسا جی ہے ہوری بھیا؟''

ہوری کا سر چکرا رہا تھا۔ بولا ''کچھ نہیں اچھا ہوں۔''

یہ کہتے کہتے اسے پھر قے ہوئی اور ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ وہ گھبرایا۔ یہ سر میں چکر کیوں آ رہا ہے؟ آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھایا جاتا ہے۔ اس کی ۲۹ آنکھیں بند ہو گئیں اور زندگی کی ساری باتوں کی یاد مجسم ہو کر دل میں آنے لگی ہگر بے سلسلہ، خواب کی تصویروں کی طرح بے ربط اور بگڑی ہوئی، وہ خوشگوار بچپن آیا، جب وہ گلیاں کھیلتا تھا اور ماں کی گود میں سوتا تھا۔ پھر دیکھا کہ جیسے گوبر آیا ہے اور اس کے پیروں پر گر رہا ہے۔ پھر منظر بدلا، دھنیا دلہن بنی ہوئی سرخ چوندری پہنے اسے کھانا کھلا رہی ہے۔ پھر ایک گائے کی تصویر سامنے آئی۔ اس نے اس کا دودھ دوہا اور منگل کو پلاتا رہا تھا کہ گائے ایک دیوی بن گئی اور.....

اسی مزدور نے پھر پکارا۔ ''دوپہری ڈھل گئی ہوری، چلو جھوا اٹھاؤ۔''

ہوری کچھ نہ بولا۔ اس کی روح تو جانے کس کس دنیا میں اڑ رہی تھی۔ اس کا بدن جل رہا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے، لو لگ گئی تھی۔

اس کے گھر آدمی دوڑا گیا۔ گھنٹہ بھر میں دھنیا دوڑی ہوئی آ پہنچی۔ سوبھا اور ہیرا پیچھے پیچھے کھٹولے کی ڈولی بنا کر لا رہے تھے۔

دھنیا نے ہوری کا بدن چھوا تو اس کا دل دھڑک اٹھا، چہرہ اتر گیا، کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کیسا جی ہے تمہارا؟''

ہوری نے مضطربانہ اور مجنونانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''تم آ گئے گوبر میں نے منگل کے لیے گائے لے لی ہے۔ وہ کھڑی ہے، دیکھو!''

دھنیا نے موت کی صورت دیکھی تھی۔ اسے پہچانتی تھی۔ اسے دبے پاؤں آتے بھی دیکھا تھا اور آندھی کی طرح آتے بھی دیکھا تھا۔ اس کے سامنے ساس مری، سسر مرا۔ اس کے دو بچے مرے۔ گاؤں کے پچاسوں آدمی مرے۔ دل میں ایک دھچکا سا لگا۔ وہ بنیاد جس پر زندگی قائم تھی، گویا مٹی جا رہی تھی۔ لیکن نہیں یہ صبر کرنے کا وقت ہے، اس کا اندیشہ بے بنیاد ہے، لو لگ گئی ہے، اسی سے بیہوشی ہے۔ امڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر بولی۔ ''میری طرپھ (طرف) دیکھو میں ہوں، کیا مجھے نہیں پہنچانتے؟''

ہوری کو کچھ ہوش آیا۔ موت قریب آ گئی تھی۔ آگ جل اٹھنے والی تھی، دھواں دور سا ہو گیا۔ دھنیا بیکسانہ انداز سے دیکھا۔ آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکل پڑے۔ کمزور آواز میں بولا۔ ''میرا کہا سنا ما پھ (معاف) کرنا دھنیا! اب جاتا ہوں۔ گائے کا ارمان من ہی میں رہ گیا۔ اب تو یہاں کے روپے کریا کرم میں لگ

جائیں گے۔ رومت دھنیا! اب کب تک جلائے گی؟ سب طرح کی درگت تو ہو گئی، اب مرنے دے۔''

اور اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ اسی وقت ہیرا اور سوبھا ڈولے لے کر پہنچ گئے۔ ہوری کو اٹھا کر ڈولی پر لٹایا اور گاؤں کی طرف چلے۔

گاؤں میں خبر ہوا کی طرح پھیل گئی۔ سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ ہوری چارپائی پر پڑا شاید سب کچھ دیکھتا تھا، سب کچھ سمجھتا تھا، مگر زبان بند ہو گئی تھی۔ البتہ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو بتلا رہے تھے کہ موہ (رغبت) کا بندھن توڑنا کتنا مشکل ہو رہا ہے، جو کچھ اپنے سے نہیں بن پڑا، اسی کے دکھ کا نام تو موہ ہے۔ ادا کیے ہوئے فرائض اور پورے کیے ہوئے کاموں کا کیا موہ؟ موہ تو ان بیکسوں کے چھوڑ جانے میں ہے جن کے ساتھ ہم اپنا فرض نہ نبھا سکے، ان ادھورے منصوبوں میں ہے جنہیں ہم پورا نہ کر سکے۔

مگر سب کچھ سمجھ کر بھی دھنیا امید کے مٹتے ہوئے عکس کو پکڑے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مگر مشین کی طرح دوڑ دوڑ کر کبھی آم بھون کر پنا (جو شاندہ) بناتی اور کبھی ہوری کے بدن پر گیہوں کے چوکر کی مالش کرتی۔ کیا کرے، پیسے نہیں ورنہ کسی کو بھیج کر ڈاکٹر بلاتی۔

ہیرا نے روتے ہوئے کہا۔ ''بھابھی، دل کو کڑا کرو، گئو دان کرا دو، دادا چلے۔''

دھنیا نے اس کی طرف حقارت سے دیکھا۔ اب وہ دل کو اور کڑا کتنا کرے؟ اپنے شوہر کے ساتھ اس کا جو دھرم ہے کیا یہ اس کو بتانا پڑے گا جو زندگی کا ساتھی تھا اس کے نام کو رونا ہی کیا اس کا دھرم ہے؟

اور کئی آوازیں آئیں۔ ''ہاں گئودان کرادو، اب یہی سمے ہے۔''

دھنیا مشین کی طرح اٹھی۔ آج جو ستلی بیچی تھی، اس کے بیس آنے پیسے لائی اور ہوری کے ٹھنڈے ہاتھ میں رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے ہیرا سے بولی۔ ''مہراج! گھر میں نہ گائے ہے، نہ چھیا، نہ پیسہ۔ یہی پیسے ہیں، آج ان کا گئودان ہے۔''

اور غش کھا کر گر پڑی۔

---------The End-------ختم شد----------